

سینئر سٹوڈنٹ
مفتی
نمبر 3059
کراچی
مفتی محمد علی
عید مبارک

PDFBOOKSFREE.PK

ہندوستانی کائناتی فلسفہ دار اور دلچسپ کہانی "شکول" اندرونی صفحات پر مداح فرمائیں



حالات کی گہنی اور دریاؤں کی روانی
کھلازیں پر بھاری ایک انٹری کی کھٹا



لا متناہی انتظار..... اور نازک
احساسات کا خواہ صورت اختیار



آپ کے ہاتھوں ہی ایک آجمن رنگ رنگ
آپ کی پینٹا آپ کے ذوق سے ہم آہنگ



کامیاب مقصد برآری کے لیے
منصوبہ سازوں کا دلچسپ ماجرا



بنی اسرائیل کی سرکشیت پرستی اور
انبیائے کرام کی جہد مسلسل کا احوال



ہوشیاری کے رستے پر چلے چلے
بے دہائی کی راہ اپنانے والوں کا قصہ



دنیا بھر کے لڑکے لڑکیاں
سکڑائیں اور تھکے بچے آپ کے لیے



قدیمہ پرخطر بلبل خوف و ہراس
کے درمیان گہی حیرت کا حشر و انداز



عشق کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار
انسانوں کے جہت اثر و واقعات



سپنس کی محسوسات کا زمین کی تلخیوں
ہاتھوں کے شکوے اور پر خلوص مشورے



جمہوریت کے ارتقا پر ایک
دانش مند کی خوش کھاسیاں



ہوس پرستی کی دھار ایک
دو شیرہ کا پر فکر ماجرا



اسرار اور تعمیر کے پردے میں
پیدا ایک منفرد طویل سلسلہ



کسی کے اعتبار کچھ لکھنا
والوں کا اذیت ناک انجام



ذرا سی جان بچکان
بن گئی وبال جان



قد و بند کی معیوبتوں سے نجات آسان
نہی یک صاحب کا ایک اور کارنامہ



بنائیں رحمتوں کا مہینہ - لذت بھرا



Kashmir
BANASPATI
بس یہی ہے اچھی زندگی!

بیونائیڈ اینڈ سسٹریلیٹڈ
کشمیری سسٹریٹڈ
فون: 041-2601607، فیکس: 041-3601732

اب سے گیارہ سو برس پہلے کا قصہ ہے کہ شہروں کے شہر بغداد میں ایک بہت ہوشیار اور علم دوست نوجوان رہتا تھا۔ اس کا نام زہیر ابن جندب تھا۔ وہ اکثر اس عہد کے ایک جید عالم شیخ مکمل ابن داؤد کی صحبت سے فیض یاب ہونے کے لیے بغداد کے مشہور علاقے کرب میں جایا کرتا تھا۔ وہ جب بھی شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے مصافحہ کرتا اور زانوئے ادب سے ان کے حضور بیٹھا تو شیخ مکمل ابن داؤد اس کی طرف متوجہ ہو کر یہ دو شعر پڑھا کرتے تھے۔

رضینا قسمة الجبار فینا
لنا علم وللجهل حال

فان العمال یعنی عنقریب
وان العلم باقی لایزال

یعنی خدائے ہمارے بارے میں جو یہ بات مقدر فرمائی ہے کہ ہمارے لیے علم اور جاہلوں کے لیے مال تو ہم اس قدر پر راضی ہیں۔ مال یقیناً عنقریب ختم ہو جائے گا اور علم تو ہمیشہ باقی رہے گا۔

دنوں میں سے ایک دن جب زہیر ابن جندب، شیخ مکمل ابن داؤد کی خدمت میں حاضر ہوا تو شیخ اپنے ارادت مندوں کے حلقے سے مخاطب تھے اور فرما رہے تھے کہ جس کے دل میں کفر ہو اور یوں پر ایمان، وہ دوزخ کے بدترین درجے میں دھکیلا جائے گا اور جس کے دل میں ایمان ہو، خواہ وہ اس کا اظہار نہ کرے، وہ یوم حساب جنت کے بہتر درجے کا حق دار قرار پائے گا۔ جب شیخ کا ارشاد تمام ہو گیا تو زہیر ابن جندب نے زمین خدمت چوئی اور کمرے ہو کر شیخ سے مصافحہ کیا۔ شیخ نے حسب معمول وہی دو شعر پڑھے۔ مکمل نے انہیں سن کر پہلی بار قدرے توقف کیا اور پھر بے حد ہمت سے کام لے کر عرض کیا کہ یا شیخ!

آپ کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم رہے، میں آج حضرت سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ شیخ مکمل ابن داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ شفقت فرمایا کہ ہاں اسے فرزند بلا تذبذب ایٹامہ عابیان کرو۔ خدا مجھے تمہارے سوال کا جواب دینے کی توفیق عطا فرمائے اور وہی توفیق عطا کرنے والا ہے۔

ابن جندب نے آداب خدمت بجالا کر عرض کی کہ اے ہمارے شیخ! میں جب بھی حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل کرتا ہوں تو آپ مجھے ہمیشہ انہما دو شعروں سے مستفید فرماتے ہیں، میں اسی امر کا سبب جاننا چاہتا ہوں۔ شیخ مکمل ابن داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اسے فرزند اخدا تھے اس سوال کی جزا عطا فرمائے۔ بات یہ ہے کہ ان شعروں میں اتنی بیش بہا حکمت پوشیدہ ہے جس کو دنیا کے سارے خزانے دے کر بھی نہیں خرید جاسکتا۔ ابن جندب تو مجھے بغداد کے سارے حکمت طلب نوجوانوں سے زیادہ عزیز ہے۔ اس لیے اگر تو روزانہ کی بارہی میرے پاس آئے تو میں تجھے سب سے پہلے یہی دو شعر سنائوں اور حق سبحانہ تعالیٰ کی طرف سے اجر عظیم کا حق دار قرار پاؤں۔ اسے فرزند، جو لوگ میرے پاس آتے ہیں ان میں سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو حقیقت کے پھلکے مع کرنے کی ہوس میں میرے پاس آتے ہیں اور تجھے میں حقیقت کی طلب کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے، خدا تیرے ماں باپ پر رحمت نازل کرے۔

جس بات میں بھی شک پوشیدہ ہو وہ دن اور رات کے ہر لمحے پر اپنے اظہار کا حق رکھتی ہے اور کسی بھی دیانت دار اور حساس ادیب کا یہ فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کو اپنے دل کی گہرائی کے ساتھ محسوس کرے۔

ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ ہمارے بارے میں یہ سوچتے ہوں کہ یہ لوگ ہر مینے ایک جیسی باتوں سے اپنے رسالے کا آغاز کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جس بات میں بھی شک پوشیدہ ہو، وہ بات دن اور رات کے ہر لمحے پر اپنے اظہار کا حق رکھتی ہے، ایسا حق جس سے کسی بھی مہذب معاشرے کا کوئی فرد بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اور وہ بات ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔

افراد کی اور سماجی نیکی، نیکو کاری، فرائض و ملی اور وسیع الشہرتی، یہ وہ صفات ہیں جن سے اگر کوئی معاشرہ واسعی اختیار کر لے تو وہ دنیا کا مثالی معاشرہ قرار پائے گا۔ تاریخ کے تمام برگزیدہ ترین اشراف اور اکابر نے اسی حقیقت کی تعلیم دی ہے۔ ان صفات کا جامع نام جمہوریت ہے۔ ہمیں اس موقع پر یہ سوچنا ہے کہ اب جبکہ ہم اپنی سیاسی اور سماجی زندگی کا پونہواں برس شروع کر رہے ہیں تو ہم نے گزشتہ تیرہ سو برس تک اپنے تاریخی ارتقا کا کتنا سطر طے کیا۔ یہاں ایک بہت بے رحمانہ سوال بھی ذہن میں پیدا ہو رہا ہے، اور وہ یہ کہ ہم اس دوران میں آگے بڑھے ہیں یا پیچھے ہٹے ہیں؟ اسی طرح کے بہت سے سوال ہمارے ذہن میں ادمم چماتے ہیں اور پھر یہ کہ خود زندگی سب سے بڑا سوال ہے۔

☆

آپ کس کے پیارے ہیں ضرور بتائیے گا اور ماہ کو بھی زیادہ شک مت کیا کریں۔ قدرت اللہ تباری آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ کبھی موت کے دوا کر Repeat، کروا رہے ہیں کبھی "شیطان بمقابلہ انسان" دو بار شائع کروا رہے ہیں۔ بہر حال وہ ارا وقت دوت آپ کے حق میں ہے۔ "شیطان بمقابلہ انسان" دو بار شائع ہوئی چاہے محمد عبداللہ آپ اپنے بھی "کاکے" نہیں ہیں کہ ماہ کو دوا دی گئیں، ہاں حسین خان بلوچی کو بے شک اٹکل وادوا مانا کہہ دیں کوئی حرج نہیں۔ ماہ ایمان! جس طرح آپ صنف کثرت کے خلاف فنی ہوئی ہیں، اس نے ہمیں ایشیہ بخاری کی یاد دلادی ہے۔ وہ بے ایشیہ صاحب! آپ ہیں کہاں؟ کچھ تو دیر اپنی۔ حسین عباس صاحب قبروں خط پر اللہ کا شکر ادا کرتے آپ خود کو شامی دینے لگے۔ مغل شاعر وطن شاعر حسین عباس ہاں کا شعر بہت پیارا لگا۔ عون عباس ہاں برکی کنڑن "ترکیب" نے بے اختیار مسکرائے یہ مجبور کر دیا۔" (انتخاب و سورت جہرہ..... وادول خوش ہو گیا)

محمد قدرت اللہ ناز، ریجنل مینیسٹر، ضلع جالندھر - 150001

میں ماورِ صفحہ کی مبارک یاد و سرور قیرونی کی تھی۔ ہماری طرف سے شیر مبارک ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو رمضان کی تمام برکتیں نصیب فرمائے اور دنیاغیر کے مسلمانوں کو اللہ پاک آمین و دعا و عطا فرمائے۔ آمین۔ سرور قیرونی کو خیر خواہوں میں سے سمجھ کر اگر آپ کے لئے یہ سچا جان

ایک نیا معاہدہ برقیات و نصیب ہو جائے۔ یہ آئی ہے تو آئی ہے کہ ان پر کام پانے کے لیے سائنسدانوں کا ذکر کیا ہے، ہماری دعا ہے کہ یہ کامیں کامیاب ہوں اور پاکستان کی لوزیٹک جو غربت و بھلائی کی صورت اختیار کر چکی ہے، اس سے جان چھوٹ جائے۔ "آپ کے خط" میں روشنی و شہید کو صدارت کی کرسی پر دیکھا، ہماری طرف سے آپ کو مبارکباد ہو۔ ہمیں یہ قسم صاحب کے والد کے ایصالِ ثواب کے لئے آپ کو

میں نے کہا: "میرا اس میں کچھ نہیں ہے۔" اس سے جواب میں یہ کہی: "ابا ایمان کو بھی کچھ سمجھانے کی کوشش کریں یہ بہت اچھا ہے۔" چنانچہ میں نے کہا: "میرا صاحب امیر اور صاحب اس بار تشریف لائے ہیں۔ سچ کہتے ہیں۔" دل کو دل سے مراد ہوتی ہے۔ "میرا ہیتم آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں اس وقت واقعی بڑا دکھ ہوتا ہے جب ایک ماہ کے شدید انتظار کے بعد کو عمل میں شامل نہ کیا جاسکے۔ بہر حال ادارے کی طرف سے سعادت قبول کریں کیونکہ آپ کے خط ان تک پہنچے ہی نہیں۔ سیدہ فرین یہ قائل ہے۔ آپ کے رسالہ کے بارے میں عملی خطوط ان ہی اور میر و لکھ کر بھیج دیے۔ صاحب! کہانیان بھی اسی لیے شائع کی جاتی ہیں کہ ان کو پڑھا جائے اور ان پر تبصرہ کیا جائے۔" سندھ خیال رکھیے گا۔ "محمد عبداللہ دانش آپ کے تیسرے خاصے خطوں تک ہیں۔ یعنی آتے ہی انکی اور دواویا بنائی شروع کریں۔ ذرا سچ کے کہ صاحب!۔ "میرا صاحب! آپ کے والد اور والدہ کی کئی بعد کے وقت کا سن کہ بہت افسوس ہوا۔ واقعی یہ حادثہ کسی کو بھی بڑا بڑا کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی "نارنگ کی گھٹت" پڑھ کر خیال آیا کہ یہ کہانی انگریز کی کہانی سے پہلے شائع ہونی چاہیے تھی بہر حال مسلمانوں کو جتنا انتھان خود مسلمانوں نے بھگایا ہے انتہائی دوسرے نے نہیں۔ "ماہیت کی خواہش سے عمل شروع اور شہزادہ خرم کو لیے عرصہ کے لیے آپس میں برسرِ پیکار رکھا۔" "واپسی" کی آخری قسط کا پڑھ کر بہت خوشی ملی۔ "جوان ہونے کے ذم میں تھری ایس بڑھا ہے۔ یہ بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔" "شکلوں" شروع سے ہی زبردست ہے۔ کیا تم حسین کا کردار بہت پسند آتا ہے۔ اللہ ہر اس کا قیام جزاں فرمائیں اس کے کردار کی سب سے بڑی خوبصورتی ہے۔ "عیم احمد اور سراج کے کردار بھی اچھے گئے۔" "دکھ" اور صاحب اینڈ ویلڈن۔ "انڈی" میں نے کئی ہتھ پڑھ کر قید میں ہیں۔ ہاں ان کے ساتھ ہر دفعہ یہ حادثہ کیوں ہوجاتا ہے، انکے چاہیں یا نہ کیوں یہ جہنم میں انو اموان کی قسمت ٹھہری، راجہ کا فرار بھی کتنی خیر نہ رہا۔ ڈاکٹر عبدالرب "مٹی کی" "ستار" پڑھ کر دواویا ذہن میں سنا سنا سا چھایا۔ "سات سال قبل میں گزرا ہے کہ بعد سا میں گل کے کھر کے جو حالات ہوئے ان سے ہمارے معاشرے کی سنگ دلی کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔" "تاہم سا میں گل کی خوشی ابھی نہیں لگی۔" "میرا آزادی جمی میں" "ڈیرک ایگل" ابابا چھیل وائے" "کامفری ورژن (Version)" لکھے۔ "دن عوام کو بے خوف بنانے میں مصروف کا نظر آئے۔" "خانہ خراب" میں مندرجہ جٹ اور راجا جٹانیت ہے یہی سے اپنی جانوں سے ہاتھ دھو لیکن باہم کی بد قسمتی کہ وہ ملک صاحب کے علاقے میں وارداتیں کر بیٹھا اور انکے گیا۔" ابا ایمان! آپ کا شعر پسند آیا تاہم اسے "ڈاکٹر" کے کہنے والی جس طرح غلط طور پر غلط فہمی پھیل رہی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



مقام نور کے ناصر باورالائی سے تعریف لائے ہیں ”اس دفعہ کا سرورق ہی ماہنامے کے خاص الحاح سے ہونے کی نشا نگاہی کر رہا تھا۔ کوئے محمدی روٹی سے ماحول کو جگمگانے کی زنجیر دہری بھار ہوا تھا۔ جون اٹیا کو کر اس کے خطوط کی مغل میں پہنچے تو وہاں بھی کچھ ایسی ہی مڈھی ریشہ صاحبہ کی صدارت پر پیشہ کوہری مغل کو اپنی باتوں سے جگمگانے میں مصروف تھیں، مزہ تو سب آچا جب انہوں نے ہمارا نہ ہونے کا بھیجی کیا لیکن سطوات کے لیے عرض ہے کہ یہ دروغی کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ سب (ڈاک والوں کی) کارستانی ہے کیونکہ ہمیں پہلے ہی خط چند دن میں پہنچانے کا عندیہ دے کر بلکٹ کر دیا تھا۔ خبر یاد کرنے کا شکر ہے آگے بڑھتے ہو دیکھا کہ ایک عورت کی کپڑی کا سارا قصہ ادارے پر نکال رہی تھیں تو یہ باتی گری میں اتنا غصہ بالکل اچھی بات نہیں تھیر اصحاب۔ ہاویں صاحب کو جس میں دیکھ کر خود کو جگمگاتے میں دیکھنے سے بھی رہا تجربہ تھا کیونکہ میرے ٹیوٹ ہیں۔ کہا میں سب سے پہلے واہسی پریمی اور ہم کو جسے کہ فریاد چڑا یا پاب بند کر کے مشکول کے لیے جگہ چھوڑ دے گا لیکن یہ کیا؟ خیر واہسی کی یہ قیاد تمام مشنوں میں سب سے بہترین مشکول واقعی واہسی کا خیر اہل ہے۔ نیچے کی کہانی میں اب کچھ نہیں رہا قیاد اور بھاری واہی ہوا ہے پھر سے کبھی خیر سے نہیں نکل سکتے۔ ایسا ہوتا ہے۔ منظر امام صاحب قرق کا راز کے ساتھ حاضر تھے بہت اچھی اور چپکاتے والی کہانی تھی۔ راز دار بھی بہت اچھی اور سنسنی اور کیا کہانی تھی۔ بات کی کہانیاں ابھی ڈاکوں کے ذریعے نہیں پرچیں اس لیے کہ اس دفعہ ہم مغل میں اپنی انٹری دینا چاہتے ہیں۔ میری اور شیواؤں کی طرف سے آپ سب کا اور پورے ایمان وطن اور نعتان الہبارک اور 14 اگست کی خوشیاں مبارک۔ (خیر مبارک)

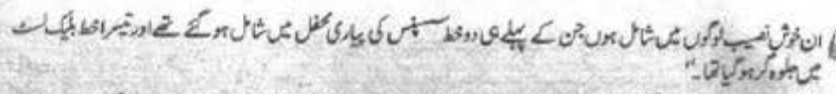
بقیہ عمر فراز کا قصیدہ "درداں پر تحصیل شہر کوٹ سے پہلے آرہے ہیں" سرورق پر حیرت انگیز مست حال ملک کو دکھ رہی ہے۔ خوبصورت سحرین سرورق بہت اچھا لگا۔ اشتہارات کو چھوڑتے سیدھے نکلے یا راں میں آئے۔ اس سینے کی بادشاہت روشنی رشید کے ہاتھوں میں بہت مبارک ہو، زمین ماس بلوچ کیسے ہیں آپ؟ لگتا ہے زمین کے بغیر آپ کا دل نہیں ٹک رہا بلبل میں حیران شاہ بہت زیادہ فیس ملے ہیں۔ آپ نے خطوط کو کتنے بار اٹھا کر دیکھے ہانے کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ انہیں سب پر عطا فرمائے آمین۔ سیدہ فرین آپ نے ملک لکھا کر کیا ہے کہ ایم کے انسان نہیں ہیں تو پھر آپ کے خیال میں وہ کیا ہیں؟ محمد نعمان پیارے ہم تو کسی صدارت کے بالکل بھی درجے نہیں ہیں اور نہ ہی کسی کے لیے کوشش کی ہے۔ ملایا ایمان اور یا فہم اب اور نصیر ماس باہر کے تیسرے اچھے لگے۔ مجھے سب سے زیادہ انتظار تاریخی کہانی کا ہوتا ہے دفعہ قلع کی شکست میں شیخہ اور غرم سے شہناز شاہجہاں بنے تک کا سفر لکھنا کہ ڈاکٹر مساجد احمد سے گزارش ہے کہ وہ شیخہ اور غرم کی داستان محبت بھی پیش کریں۔ نجوی میں سب کو بے خوف بنانے والے نجوی اصل کو ایک بیڑے مارک نے بے وقوف بنایا۔ ترقی کا چیلنج پیر کا زمانہ بیان کیا گیا۔ ایسے ہی کئی کردار ہمارے آس پاس موجود ہوتے ہیں جن پر لوگ اندھا دھند کرتے ہیں۔ 16 ماہ کے سفر کے خروا پس کا اختتام ہوا کہانی کو بہت جگت میں ختم کیا گیا ہے۔ بہر حال آخری قطعہ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ بے پناہ انیمیشن نے آخری لمحے پر سحر میں جکڑے رکھا۔ قلع اور مطلق میں این نے بہت عمدہ کاری اور گھنٹی سے بے نیل کو اس بات پر قائل کیا کہ پریڈ ہوئی جائے اور محلی ایک نہیں ہو سکتا۔ جہت نے زیادہ مزے نہیں کجاس میں کبیر کا اور اس کے ساگی اپنے پاس کی موت کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں جو وزن ایک ایسے شخص کی کہانی تھی جس کی سوچ سختی تھی اور محض ملک کی بنیاد پر اپنا ہنسا بہت مہر اجاڑ دیا اور اپنی جان سے بھی باہر دھو کر دفعہ تیرہویں کا کتاب لاجواب تھا۔" (شکریہ)

۱۱۱۱ اور میں احمد خاں، عالم آباد کراچی سے گئے ہیں۔ آگست کا سہنس ملا جلد ہی ختم ہو گیا۔ نئے ہی سردی کو دیکھتے ہوئے
سے مستعد ہوئے۔ انجمن کی یاد میں پہنچے مگر یہ کیا؟ تو اترا اور دُعا داری سے پیچھے ہوئے خطوط کی جگہ اس سے بھی نظر نہ آئی۔ اس بات
کو دیکھتے ہی پرہیزگاروں کی پستی کے خلاف ہماری تحریر جو جس کی وجہ سے ہمارا خط شامل اشاعت نہ ہو سکا۔ شکوے شکایت
نہ ہوئے۔ تاہم یہی پہنچے اور اس میں سے تازہ واقعات سے روشناس ہوئے۔ اس کے بعد تاریخی واقعات کے درجوں کی سیر کی اور
اس کے فرما دہائی دور کے حالات سے آگاہ ہوئے۔ ڈاکٹر صاحبہ احمد مبارک ہاؤس کے قریب کی دیکھی کوئی نئی آخری سطر تک
رہی ہے۔ وہ اس کی آخری قسط پر بھی شروع کی قسطوں میں مسلسل اور دلچسپی نہ زیادہ کی مگر بعد میں وہ یہ بتائی کہ کوئی جی الدین

نواب کی تحریروں کا غامض ہے۔ مختار آزاد کی نجوی بھی اچھی تھی جس میں ایک کامیاب برائیس میں کا قصہ تھا۔ سمبار برائیس میں صرف یہ دیکھتے ہے کہ کاردار میں کتنا فائدہ ہوگا مگر کاردار میں طبع کے ساتھ ساتھ نقصان بھی لازم و ملزوم ہے۔ یہاں اس نفل میں کے ساتھ ہوا کہ اس سے بھی بڑا برائیس میں ملا جس کی شاطرانہ چال سے اے نفل میں کو نقصان ہوا۔ مگر اس سے جس کا رد بار میں مات کھائی اسی کاردار کو از سر نو شروع کرنے کا عزم کر لیا۔ مگر امام کی ترقی کا رد بار بھی پہلے ہی میں حراج تحریر تھی۔ کاشف ذہیر کی قانع اور مفتوح بھی اچھی رہی۔ حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد جو جوانوں نے احتجاج ترک کر دیا۔ آج بھی میں حالات ہیں اور اس سے پہلے میں بھی ہوتا چلا آ رہا ہے کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہونے کے باوجود ان کا استحصال جاری و ساری ہے۔ فائدہ خراب بھی ٹھیک بھی۔ ہجرت سے بھی اچھا تاثر کا گیا۔ درمیان میں "کٹرلوں" سے بھی لطف اندوز ہوئے۔ محفل شعروں میں شعروں سے بھی محظوظ ہوئے۔ وچوڑا بھی ایک اچھی تحریر بھی کہ خشک کے زہر نے غلام قادور کی جان لی۔ قہقہہ کا کچ آ کر پو جاے تو کانٹے ہی کانٹے اگتے ہیں۔ تین تینا انسان خسارے میں رہتا ہے۔ خشک کا زہر دور دور تک اپنا اثر پھیلاتا ہے۔ پھر پھر انتقام بھی اچھی رہی جس میں ہیر کہ پیسے پر غلط دوست نے جبر الہی کی گھر لہ زندگی کی ٹوٹی ہوئی ڈور کو اپنی بروقت پیش قدمی سے سلجھا دیا جس سے جبر الہی دیا پھر روشن ہوئی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ سچا، پر غلطوں اور سبیدار دوست دنیا میں اللہ کا انعام ہے وہ شخص بھی غفلت نہیں ہوگا جس کا ایسا دوست ہو۔ سہمی کھائی راز دار بھی اچھی تھی۔ جس میں آنے والی صدیوں میں ایسے ہی حالات اور واقعات انسان کی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ یرمیاہ علیہ السلام کے حالات و واقعات جاری ہیں۔ جن کو پڑھ کر ایمان کی روشنی تازہ ہوئی ہے۔ سنا بھی ایک عبرت انگیز تاثر ہے ہونے لگی ہے۔

[illegible]

عمر ان حیدر بلوچ کو سرگودھا کے قتلے تھا۔ "اس ماہ کا شمار 16 تاریخ کو سوانہ کی پہلی بارش کے ساتھ ہے۔ بہت



۱۹۸۱ء میں آریس آرشد، ہلدیہ ٹاؤن، کراچی سے تیسروں کے ہیں "انست 2011ء کا شمار 16 جولائی کو ہوا۔ شائزہ یک پلڑے کو فروغ دیا۔ سرور قریب حسینہ گری سے بیڑا ارباب کو لے اپنے حبیب کے خیالوں میں کوئی ٹھکانہ آئی۔ محفل میں حاضر ہوا، واقعی حسین اطلاق ہے 6 سال قبل اور 64 سال بعد یہ دونوں ماہ پھر یکجا ہوئے جب بھی خون پہلا آج بھی بہرہ بہرہ خصوصاً کراچی میں۔ بکری صدقات پر شید خیریت فرمائیں۔ آپ کا بہت شکر ہے جو آپ نے میرے لیے اور ہر قسم کے لیے خط لکھا۔ میں یہ کہوں گا کہ ہر قسم کے اس محفل کا دوسرے کو یاد کرنا چاہتا ہوں کہ وہ شہر ہوئے ہیں۔ عمداً سائل اچھا کر بہت شکر ہے۔ حسین ماس بلوچ ہے میری اہلی عرفی نہیں بلکہ آپ خود اپنے ظاہر و باطن اللہ میں اب کافی بخت ہو جس اللہ تعالیٰ کے کاموں میں کوئی مشغول ہوتی ہے اس لیے میری شادی پر اتنا بھوکا ہوا میرا راز نہ صرف میں آئی ہیں اپنے خط نے شائع ہونے کا شکوہ لے کر۔ ماہا ایمان کا شعر بھی پڑھا یا۔ عید عباسی آپ کو بڑے بھائی کی شادی مبارک ہو۔ نیاز می آپ کی دعاؤں کا شکر ہے، ویلکم بیک۔ قاسم نصیب آپ نے تعزیت بھی کرنی، عیادت بھی کرنی اور مبارکباد بھی دے دی۔ خوش ڈاکٹر سید احمد کی فارغ کی شکست، مشائخاں ممتاز علی اور ملک نور جہاں کے گرگھوٹتی ہے۔ ممتاز علی نے اہلی عرفی کا ثبوت دیتے ہو۔ پہلی کو صاف کر کے جنگ جیت لی اس کہانی میں جہاں جہاں اور رنگ بک کا ذکر آیا اس کی دلیری اور تیر ہمارے تھے کہ یہ مقلیدہ دور۔ ستارہ ہوا جو کہ ثابت ہوا۔ منظر امام کی ترقی کا راز گراؤ سے لائی تھی۔ کاشف زبیر قانع اور مفتوح سے کر کے شاعر کہانی تھی۔ جگر اس اس پر برتری اور زوال دیکھا۔ اتحادی فوج نے بھی اپنا مفاد دیکھا۔ آج بھی دھوکا دہی فراڈ اور مفاد کی سیاست کرتے ہیں۔ خانہ خراسان کے لیے خود غلام اس اچھی تحریر ہے۔ ویسے اس میں دوا کرتی دلو کوئی نہ ہوتی نہیں تھی۔ چوبیس کیس تھا مفرد و قلیہ

۱۹۹۱ کٹر و ستم خاق..... کجرات سے تشریف لائے ہیں۔ اس بار ہم حسینہ روضی کی تعریف کو نظر انداز کر کے اہلک جی اور بد مرد
آئی کو گرا دلا دیں تو یہ سرسرا اٹھائی ہوئی جس طرح ہم نے دن و نئے فارمیٹ کی طرز کا خاکہ لکھا اور آپ نے فنی فنی کی بدعت ہوئی مقبولیت
کے پیش نظر اسے اسی شکل میں و حال دیا اور اس میں سے فیض روضی کا حق کو حذف کر کے دوسرے ساتھیوں کو بھی محفل میں شامل ہونے کا موقع
دیا۔ بہت خوب انٹائی میں جن انٹیپایم آزادی کے موقع پر بھی و اعلا و صحت کرتے ہوئے پائے گئے۔ اچھا لگا۔ محفل یا پاراں میں پہنچے تو ہم
سامل اچا کر کے خوبصورت تھمرے کو دیکھا۔ ان سے پہلے روضی اپنی پورے آب و تاب کے ساتھ کڑی صدارت پر برہان بھی۔ جی ہاں میں
روضی شید کی بات کر رہا ہوں مبارک ہو۔ باقی رمضان یا شاور سید عباسی بھائی آپ کا شکر ہے جو مجھ کا چچا کا ہے اپنے شہر میں دیکر کیا۔ ماما ایمان
ساجاں با بہریت ہی زبردست تھمرے کے ساتھ محفل کی روضی بنی ہوئی تھی۔ اچھا لگا۔ اس بار صنف ڈاک کی تعداد 5 تھی۔ صنف ڈاک محفل
میں آدھی دو جن ہی آری تھیں کرمان میں سے ایک داتے سے بھاگ گئی صنف ڈاک کی کسر پھر سے چٹا چٹا کر بھاگنے والی ٹھیکہ بھجی تھی۔ سب
سے پہلے علی الدین نواب کی و اہسی پڑھی جس میں راکھ نے یہ بات باور کرائی کہ جب آدھی حق کا راستہ چھوڑ دے اور سچائیوں کے مقام کا اپنی منزل
مور کرے تو پھر اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ اس کے بعد نظر ہے چین کا وائی کی رنگینیوں کے دیار کرائے جس میں فیض
کو کھانا فیض تو جی اس بار تو خدا بہت محفل منہ پایا۔ ملک مفرد حیات نے خانہ خراب میں مفرد و ظلم کی عیاریاں بہت اچھا انداز میں شریپ کیں۔
بہت طویل انتظار کے بعد آخر کار انوار صدیقی نے مشکوک ہمارے ہاتھوں میں تھما دیا و اچھا لگا۔ اس بار خاق کی نکست کی صورت میں ڈاکٹر
ابید صاحب نے بہت اچھی شروعاتی انگلی صلی۔ کاشیف زبیر کی کہانی خاق اور مفتوح بریں قوم کے عروج و زوال پر مبنی زبردست تحریر تھی۔ سنا ڈاکٹر
بدلارب بھائی کی ایک سبق آموز اور پراثر تحریر تھی۔ وجہ و زور، عمران درویش کی ایک بہترین کاوش تھی۔ منظر ہام کی کہانی ترقی کا راز میں
حاضر سے کی ہمسایہ حقیقت کو اجاگر کیا اور آخر میں اہلک جی سے ایک اچلی جیلز بھارتیہ نوکر کریں۔ بند و چار ایک سبق آموز اور معیاری کہانی
کہ کہ بیچ سکتا ہے اگر وہ اس قابل ہو کہ وہ شائع ہو سکے تو ضرور کریں۔ (شہرے کا شکر ہے، کہانی اگر تھلا شاعت ہوئی تو ضرور شائع ہوگی)

قاسم نصیب۔ صفدر آباد، محمد انوار ندیم۔ حویلی کھسا (اوکاڑہ)، محمد حبیب۔ مخین آباد، سعید عباسی۔ بہاولپور، طاہر الدین میر۔ رحمان، نصر حیات لک۔ ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا، سیدہ نسرین۔ ضلع نارووال، طاہرہ مختار۔ پشاور، رضا علی گری۔ سرگودھا، مرزا منظر علی گوندل، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا۔



عشق پیچاں

ڈاکٹر ساجد امجد

مغل فرمانرواں جلال الدین محمد اکبر... اپنے عید کی ایک مکمل داستان... ایک ایسا طاقتور بادشاہ... جس نے بڑی بڑی طاقتوں کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا مگر اس کی زندگی میں ایک موقع ایسا بھی آیا جب وہ شہنشاہوں کے شہنشاہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کے مزار کے سامنے تھا اور دنیا دیکھ رہی تھی کہ وہ زائرین کے ہم قدم پیدل چلتے چلتے دل میں کہہ رہا تھا... ”میں نے منت مانی ہے کہ اگر میرا وارث مجھے مل گیا تو میں ننگے پاؤں اجمیر تک آؤں گا۔ میں فقیر ہوں، بادشاہت مجھ پر تہمت ہے۔ ایک شہزادہ میری جھولی میں ڈال دو۔“ اور جب یہ منت پوری ہوئی تو ایک اور داستان نے جنم لیا... اور شہزادہ سلیم کے روپ میں جلال الدین محمد اکبر کی زندگی آزمائش بن کر رہ گئی۔ بالآخر محبت کی رہ گزر پر سفر کرتے کرتے شہزادہ سلیم جہانگیر کے لقب سے جب بادشاہت کے تخت پر بیٹھا تو ایسا کارنامہ انجام دیا جو رہتی دنیا تک فراموش نہیں کیا جاسکے گا... اس نے چار من سوئے کی ایک زنجیر بنوائی جس میں ساٹھ گھنٹیاں بندھوا لیں۔ اس کا ایک سیر اقلے کے شاہ برج میں لگوا دیا اور دوسرے کو دریا کے کنارے ایک کھوٹے سے بندھوا کر یہ اعلان کروایا ”جس مظلوم کو بھی حصول انصاف میں رکاوٹ ہو وہ اس زنجیر کو کھینچ کر بادشاہ کو دادرسی کے لیے پکارے“ تاریخ کے اوراق آج بھی عدلی جہانگیری کو دہراتے ہیں۔

ماسٹی کا آئینہ۔ بال اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

رن اور حضور دو پہاڑ آئے سانسے سینے تانے، سر اٹھائے کھڑے تھے۔ دونوں کے درمیان ہندوؤں کا سب سے مضبوط قلعہ بازو پھیلایا۔ پہاڑوں کو سہارا دیے کھڑا تھا۔ ان پہاڑوں کی رعایت سے اس قلعے کو قلعہ نرن تصور رکھا جاتا تھا۔

قلعہ کیا قلعہ یہ جنت کا مسکن تھا۔ محاصرے کو کئی مہینے ہو گئے تھے۔ قلعے میں کون ہے یہ دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں؟ فسیل پر کوئی نظر نہیں آتا تھا اور تیروں کی بارش ہوتی رہتی تھی۔

قلعے میں جنت تھی یا کوئی اور لیکن قلعے کے باہر منغل فرمانروا جلال الدین محمد اکبر موجود تھا جس کا لشکر قلعہ چٹوڑی فتح کے بعد قلعہ نرن تصور کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ چٹوڑی کی فتح سے سرشار یہ لشکر کسی کے ہاتھ سے نکلے والا نہیں تھا۔ اکبر کے سپاہی تو اس انفس میں ہاتھ مل رہے تھے کہ مقابلے پر آنے والا کوئی نہیں۔ قلعہ ایسا مضبوط تھا کہ قیامت کا زلزلہ ہی اس میں کوئی دراڑ ڈال سکتا تھا۔ اب کھیل تھا تو ثابت قدمی کا۔ مسلسل خبریں آ رہی تھیں کہ باغیوں نے سر اٹھایا ہے اور احمد آباد سے نکل کر مالوہ میں داخل ہو گئے ہیں لیکن اکبر محاصرہ اٹھانے کو تیار نہیں تھا۔ ایک مہینے سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا اور کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

لشکر میں ابھی صبح نہیں ہوئی تھی کہ اکبر نے اپنے سرداروں کو طلب کیا اور انہیں حکم دیا کہ تو جوں رن پہاڑ کے اوپر پہنچا دی جائیں۔ کسی کو انکار کی جرأت نہیں تھی لیکن وہ سوچ ضرور رہے تھے کہ توپ خانے کو اوپر لے جانا کتنا دشوار ہوگا؟ بظاہر کوئی فائدہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

اکبر کو بشارت ہوئی تھی۔ کوئی بزرگ اس سے کہہ رہے تھے کہ رن پہاڑ دشمن کے لیے مورچے کا کام دے رہا ہے۔ اگر تم اس مورچے سے گولہ باری کرو تو یقیناً کامیابی ہوگی۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آنے لگی تھی کہ حیر کہاں سے آتے ہیں؟ یہی پہاڑ ان کے لیے مورچے کا کام دے رہا ہے۔

یہ دشوار کام انجام دے لیا گیا۔ توپیں اوپر پہنچا دی گئیں۔ اکبر نے حکم دیا کہ گولہ باری اس طرح کی جائے کہ گولے قلعے کے اندر جا کر گریں۔ یہ قاصد بھی زیادہ نہیں تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ پہلا ہی گولہ حاکم قلعے کے محل پر جا کر اس کے محل کا دھواں مہدم ہو گیا۔ وہ ایسا سراسیمہ ہوا کہ فوراً قلعے سے نکلا اور اکبر کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اس کی خدمت میں چہ بزار کا لشکر موجود تھا لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مقابلہ کرنا۔ قلعے کی چابیاں اکبر کے قدموں میں

رکھ دیں۔

اکبر اسی وقت کے انتظار میں تھا۔ رن تصور کی فتح کے بعد اس نے ایک آراستہ فوج مالوہ کی طرف روانہ کی اور خود اجیر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے خیال کے مطابق اسے بشارت دینے والے خواجہ اجیر ہی تھے لہذا اب ان کی خدمت میں پہنچنا ضروری تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب اکبر کے ایمان میں فتنہ نہیں آیا تھا۔ اولیائے کرام کے مزارات پر حاضری دیتے رہتا اس کے معمولات میں شامل تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اس کا دامن ابھی اولاد کی نعمت سے خالی تھا۔ فرزند کی آمد کو کسے نہیں ہوتی اور جب سوال وارث تاج و تخت کا ہوتا تو یہ آرزو مزید شدید ہو جاتی ہے۔ اس کی عمر اٹھائیس سال ہوئی تھی اور وہ ابھی تک تخت کے وارث کے انتظار میں تھا۔ بزرگان دین کے مزارات اس کی انتہاؤں سے گونج رہے تھے۔

آگرہ سے باہر ہو۔ اجیر سے قریب ہو۔ خواجہ اجیر کی بشارت نے اسے دلالتی ہو۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ مزار پر نہ جاتا۔

وہ شہنشاہوں کے شہنشاہ حضرت خواجہ معین الدین اجیرؒ کی مزار کے سامنے تھا اور دنیا دیکھ رہی تھی کہ وہ زائرین کے ہجوم میں پیدل چل کر مزار کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہر طرف غریب نوازی کی صدا میں گونج رہی تھیں۔ چند گستاخوں نے اسے گرنے پر آمادہ کیا لیکن خدام نے آگے بڑھ کر اسے قیام لیا۔ وہ بڑھتا گیا۔

روضہ مبارک کے قریب پہنچ کر گھٹنوں کے شے بیٹھ گیا۔ جلال شاہی جو تیاں اتار کر باہری نظر کیا تھا۔

”خواجہ اتم پر روشن ہے۔ میں تخت کے وارث سے محروم ہوں۔ مجھے وارث عطا ہوتا کہ میرے بعد بھی اس کفرستان میں اسلامی بادشاہت کا چراغ جلتا رہے۔ میں نے منت مانی ہے کہ اگر میرا وارث مجھے مل گیا تو میں نکلے گاؤں اجیر تک آؤں گا۔ میری اس منت کی لاج رکھ لو۔ میں فقیر ہوں، بادشاہت مجھ پر تہمت ہے۔ ایک شہزادہ میری جموی میں ڈال دو۔“

وہ اس وقت واقعی بادشاہت پر تہمت معلوم ہو رہا تھا۔ گڑگڑا رہا تھا، آنسو بہا رہا تھا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے لوگ، کچھ قاصد پر کھڑے ایک بادشاہ کو فقیر کے روپ میں دیکھ رہے تھے۔

اجیر سے آگرہ واپس ہوتے ہوئے جب آگرہ بارہ کوئی کی مسافت پر رہ گیا تو ایک ویران مقام نے اس کے

قدم جکڑ لیے۔ حکم ہوا کہ یہاں پڑاؤ ڈالا جائے۔ بھلا اب پڑاؤ کی کیا ضرورت؟ آگرہ بارہ میل دور ہی تو رہ گیا ہے۔ اس ویرانے میں کوئی ایسی شے نہیں تھی لیکن اکبر کے قدم یہاں بے اٹھ نہیں رہے تھے۔ کوئی بھی آواز نہ تھی جو اس سے کہہ رہی تھی، یہاں پڑاؤ ڈالو۔ کچھ ظہور میں آنے والا ہے۔

اکبر یہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اس مقام کا نام سیکری تھا۔ چند پہاڑوں کے سوا یہاں کچھ نہیں تھا۔ سیر و شکار کا بھی کوئی موقع نہیں تھا لیکن اکبر کی آنکھیں جیسے کسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ کوئی تھا جو آنے والا تھا اور پھر ایک دن چند بزرگ قیام گاہ کی طرف آتے دکھائی دیے۔ پہرے داروں نے انہیں لوکا۔ وہ بعد ازاں کہ وہ اکبر بادشاہ سے ملے بغیر نہیں جائیں گے۔ ممکن تھا کہ انہیں باریابی میسر نہ آتی لیکن اکبر اسی وقت نیچے سے باہر نکل آیا اور اس غمراہ کو یہ چشم خود ملا دیا۔

”کون لیا یہ لوگ اور کیا چاہتے ہیں؟“

”افنی تیں حضور اور آپ سے ملنے کے خواہنگار ہیں۔“

”پھر قباحت کیا ہے، انہیں ہمارے پاس کیوں نہیں آنے دیتے؟“

”حضور کی اجازت بھی تو ضروری تھی۔“

”ہماری طرف سے اجازت ہے، انہیں آنے دو۔“

یہ کہہ کر اکبر حیرت شای کی طرف لوٹ گیا اور ان بزرگوں کو بارگاہ شای میں پیش کر دیا گیا۔ ان بزرگوں نے جو کچھ ان پر گزری تھی، بیان کیا۔

”حضور عجیب بات ہے، ہم چار دوست ہیں اور چاروں نے ایک ہی خواب دیکھا ہے جو آپ سے متعلق ہے، اس لیے ضروری سمجھا کہ آپ کے گوش گزار کیا جائے۔“

”کو کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”حضور، ہمیں قطعی معلوم نہیں تھا کہ آپ سیکری میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ ہم اجیر میں اپنے اپنے گھروں میں سو رہے تھے کہ عالم خواب میں بتانے والے نے بتایا کہ سیکری میں شاہی لشکر جمعہ زن ہے۔ وہاں جاؤ اور اکبر بادشاہ سے مل کر اسے بتاؤ کہ سیکری میں ایک بزرگ حضرت شیخ سلیم تشریف فرما ہیں۔ کتنی عجیب بات ہوگی کہ بادشاہ وہاں غم سے اور ان بزرگ سے ملاقات کے بغیر چلا جائے؟ اب ہمیں یہ نہیں معلوم کہ اس میں کیا عہد ہے؟ ہمیں تو حکم ملا تھا۔ ہم نے پیغام آپ تک پہنچا دیا۔ ہم چاروں دوست جب آپس میں ملے اور چاروں نے ایک ہی خواب بیان کیا تو

اکبر نے ان چاروں کو پیش قیمت انعامات سے نوازا۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد اس نے اپنے مصاحبوں کو طلب کیا اور ان کے سامنے اس خواب کو بیان کیا۔ اتفاق سے ایک مصاحب ایسا بھی تھا جو اس علاقے کو جانتا تھا اور حضرت شیخ سلیم کے ٹھکانے سے واقفیت رکھتا تھا۔ اس نے اپنی خدمات پیش کیں کہ وہ انہیں اس پہاڑ تک لے جائے گا جہاں وہ بزرگ تشریف فرما ہیں۔

اکبر نے ان بزرگوں کی آمد اور اپنے خواب سے آگاہ کرنے کو حضرت معین الدین چشتی کی کرامت خیال کیا اور کچھ گیا کہ اس کی دلی آرزو پوری ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ اسے کسی خاص اہتمام کے تحت حضرت شیخ سلیم کی خدمت میں بھیجا جا رہا ہے۔

وہ ان مصاحبوں کے ہمراہ حضرت شیخ سلیم سے ملاقات کے لیے روانہ ہوا۔ وہ یہ سوچ کر روانہ ہوا تھا کہ سڑا پر بیٹھے ہوئے کسی تارک الدنیا فقیر سے ملاقات کرے گا لیکن اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ صاحب حال ضرور ہیں لیکن تارک الدنیا نہیں۔ ان پہاڑوں میں ان کی خانقاہ ضرور ہے۔ ایک مسجد بھی تعمیر کر لی ہے لیکن صاحب اولاد ہیں۔ قریب ہی ایک مکان ہے جس میں ان کے اہل خانہ رہتے ہیں۔

یہ بزرگ روشن ضمیر ایسے تھے کہ بادشاہ کی آمد سے پہلے ہی اپنے سر بیٹوں کو آگاہ کر دیا کہ بادشاہ وقت آنے والا ہے۔ اس بادشاہ کو کسی نے ہمارے پاس بھیجا ہے اس لیے اس کی تعظیم ہم پر لازم ہے چنانچہ جب بادشاہ کی سواری وہاں پہنچی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ حضرت شیخ سلیم کے مرید دورو یہ محض باغی، بادشاہ کے استقبال کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ ایک نمے کے لیے کئی، اس کے دل میں یہ خیال ضرور آیا ہوگا کہ وہ بادشاہ ہند سے اس لیے اس کا استقبال کیا جا رہا ہے۔ اس مرد درویش کو بھی مجھ سے کچھ تو تھا تو وابستہ ہوں؟

حضرت شیخ سلیم کی روشن ضمیری نے اکبر کی اس نیت کو یقیناً بھانپ لیا ہوگا۔ اسی لیے مریدوں کے رخصت ہونے اور کسی خاطر مدارات سے پہلے ہی انہوں نے اکبر کی قلعہ نشینی دور کر دی۔

”ہم دنیا دار نہیں ہیں کہ بادشاہوں کا استقبال ہمیں زیب دے لیکن آپ جس کے پیچھے ہوئے ہیں اس کا قضا تھا کہ ہم آپ کا استقبال کریں۔“

”ہمیں بھی کوئی خواہش نہیں کہ فقیروں کے دربار میں

شان و شوکت کے ساتھ حاضر ہوں۔ ہمیں تو یہ خوشی ہے کہ آپ سے ملاقات ہوئی۔ آپ سے ملے بغیر ہم سکری سے روانہ ہو جاتے تو ہمیں افسوس رہتا۔

”اب یہ افسوس نہیں رہے گا۔ یہاں جو آتا ہے ہم اسے تین روز کے لیے اپنا مہمان ضرور بناتے ہیں۔ یہاں آپ کو شای آرام تو نہیں ملے گا لیکن ہم ہر طرح آپ کا خیال رکھیں گے۔“

بادشاہ نے اس وقت اپنی دلی آرزو کو بیان کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے حق میں فتوحات کا خطاب ہوا۔ حضرت شیخ سلیم نے فتوحات کے لیے اور خصوصاً دکن کی فتح کے لیے دعا فرمائی۔

بادشاہ کے لیے خانقاہ کے ایک حجرے میں انتظام کر دیا گیا۔ اس حجرے میں حضرت شیخ کے علاوہ بھی ملاقات کے لیے آ جاتے تھے۔ حضرت شیخ کے داماد شیخ ابراہیم خاص طور پر بادشاہ کے بہت قریب ہو گئے تھے۔ ایک روز بادشاہ نے اپنی دلی مشاغل کے سامنے بیان کی۔

”میں اولاد سے محروم ہوں۔ چاہتا ہوں کہ حضرت بارگاہ الہی میں میرے لیے دعا فرمائیں۔“

”دعا کے لیے عشا کے بعد کا وقت نہایت موزوں ہوتا ہے۔ حضرت جب نماز اور اردو وظائف سے فارغ ہو جائیں گے میں آپ کو ان کے پاس لے چلوں گا۔“

اسی روز جب حضرت شیخ نماز اور وظائف سے فارغ ہوئے تو شیخ ابراہیم، بادشاہ کو اپنے ساتھ لے کر ان کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔

”ہم دیکھ رہے ہیں ہمارا بادشاہ ہم سے کچھ کہنا چاہتا ہے؟“

”آپ مقرب الہی ہیں۔ آپ پر سب روشن ہے۔ میں اولاد سے محروم ہوں اور اس فکر میں رہتا ہوں کہ میرے بعد تخت نشانی کا وارث کون ہوگا؟“

”انسان بہت بے صبر ہوتا ہے۔“ حضرت شیخ نے کچھ دیر مراقبے میں رہنے کے بعد فرمایا۔ ”آپ فکر مند کیوں ہوتے ہیں؟ آپ کے حسب میں ایک نہیں کئی شہزادے ہیں۔“

”میں چاہتا ہوں مجھے جو شہزادہ عطا ہو وہ علم و فضل میں بھی یکساں ہو اور میرے تخت کے شایان شان بھی ہو۔“

”اللہ کی ذات سے مانوس نہ ہوں۔ اللہ آپ کو حسب مشافرت عطا کرے گا۔“

”میں نے یہاں آنے سے پہلے منت مانی ہے کہ اگر

اللہ تعالیٰ مجھے فرزند عطا کرے گا تو میں اس کی پرورش کے لیے اسے آپ کے سایہ عاطفت میں رکھوں گا تاکہ وہ آپ کی دینی دینی برکات سے مستفید ہو اور میرے تخت پر جلوہ گر ہو۔“

حضرت شیخ نے اس کی اس خواہش کو قبول کر لیا اور فرمایا۔ ”ہم نے اس کو نہال کنا پنا ہم نام بنایا۔“

اکبر نے حضرت شیخ کی خانقاہ میں میں روز تک مہمان داری کا لطف اٹھایا اور پھر رخصت کی اجازت چاہی۔ حضرت شیخ نے چلنے وقت ایک مرتبہ پھر فرزند کی خوش خبری سنائی اور عہد لیا کہ وہ اس نیک بخت فرزند کو ان کا ہم نام بنائے گا۔

شہنشاہ اکبری نیت نیک اور عقیدہ محکم تھا۔ تھوڑا سی عرصہ گزر رہا تھا کہ شہنشاہ اکبری نیک امید سے ہوئی۔

جب ولادت کے دن قریب آئے تو کمال عقیدت سے اکبر نے اس بچہ کو حضرت شیخ سلیم کے گھر بھجوا دیا کہ بیٹے کی ولادت مقام سکری میں ہو۔

وہ ایک ایک دن کن کر گزرا اور ہاتھ کا ایک روز شیخ سلیم کے داماد شیخ ابراہیم آگرہ تشریف لائے اور فرزند (جہاگیر) کی ولادت کی خبر پہنچائی۔ وہ شاہانہ لوازشوں سے مالا مال ہوا۔ بادشاہ نے اس نعمت عالی کے شکرانے میں حقوق کو انعام سے مالا مال کر دیا۔ قیدیوں کو آزاد کیا۔ شاہانہ جشن منعقد ہوئے اور سات روز تک شیش و عشرت کا دور رہا۔

سکری روانہ ہوا تو اسے جیسے کوئی برات آگرہ سے سکری روانہ ہو رہی ہو۔ شیخ سلیم کی خدمت میں پہنچا اور ان کے خادموں اور مسکن لوگوں کو منی بھر بھر سونا تقسیم کیا۔ سب وعدہ لڑے کہ نام شیخ سلیم کے نام پر ”سلطان سلیم“ رکھا۔ یہی لڑکا آگے چل کر نور الدین محمد جہاگیر کے لقب سے تخت اکبر پر جلوہ افروز ہوا۔

شہنشاہ اکبر نے یہ منت بھی مانی تھی کہ اگر اس کی مراد پوری ہوئی تو وہ آگرہ سے امیر تیک پیدل منزلیں طے کرے گا۔ اس نے یہ منت بھی پوری کی اور آگرہ سے امیر پانچواہ روانہ ہوا۔ بارہ بارہ کون کی منزلیں طے کرتے ہوئے سترھویں دن روضہ مبارک پر حاضر ہو گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ سفر اس نے ننگے پاؤں طے کیا تھا۔

اس ولادت کی ایک کرامت اکبر نے اور بھی دیکھی۔ کالج کے قلعے کو شیر شاد نے فتح کیا تھا۔ اس کے بعد یہ قلعہ دوبارہ کافروں کے قبضے میں چلا گیا۔ اکبر نے اس کو فتح کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ اس وقت کالج پر راجا جہاگیر خود بھی راجا بن چکا تھا۔ شہزادہ سلیم کی ولادت کے سونے پر

اس ولادت کی ایک کرامت اکبر نے اور بھی دیکھی۔ کالج کے قلعے کو شیر شاد نے فتح کیا تھا۔ اس کے بعد یہ قلعہ دوبارہ کافروں کے قبضے میں چلا گیا۔ اکبر نے اس کو فتح کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ اس وقت کالج پر راجا جہاگیر خود بھی راجا بن چکا تھا۔ شہزادہ سلیم کی ولادت کے سونے پر

اس ولادت کی ایک کرامت اکبر نے اور بھی دیکھی۔ کالج کے قلعے کو شیر شاد نے فتح کیا تھا۔ اس کے بعد یہ قلعہ دوبارہ کافروں کے قبضے میں چلا گیا۔ اکبر نے اس کو فتح کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ اس وقت کالج پر راجا جہاگیر خود بھی راجا بن چکا تھا۔ شہزادہ سلیم کی ولادت کے سونے پر

اس ولادت کی ایک کرامت اکبر نے اور بھی دیکھی۔ کالج کے قلعے کو شیر شاد نے فتح کیا تھا۔ اس کے بعد یہ قلعہ دوبارہ کافروں کے قبضے میں چلا گیا۔ اکبر نے اس کو فتح کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ اس وقت کالج پر راجا جہاگیر خود بھی راجا بن چکا تھا۔ شہزادہ سلیم کی ولادت کے سونے پر

اس ولادت کی ایک کرامت اکبر نے اور بھی دیکھی۔ کالج کے قلعے کو شیر شاد نے فتح کیا تھا۔ اس کے بعد یہ قلعہ دوبارہ کافروں کے قبضے میں چلا گیا۔ اکبر نے اس کو فتح کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ اس وقت کالج پر راجا جہاگیر خود بھی راجا بن چکا تھا۔ شہزادہ سلیم کی ولادت کے سونے پر

اس نے قلعے کی چابی تحائف اور بذرانے شہزادے کی ولادت کی مبارک باد کے تحفے کے طور پر جیسے اور اطاعت کا اظہار کیا۔

یہ باتیں اس کی محسوس نہیں وہ آسانی سے نظر انداز کر دیتا۔ اسے اتنی تیزی سے فتوحات حاصل ہو رہی تھیں کہ اس نے اسے شیخ سلیم کی دعاؤں کا نتیجہ تصور کر کے سکری کو پایہ تخت بنانے کا ارادہ کر لیا۔

شہر پناہ اور مکانات کی تعمیر کے احکامات صادر فرمائے۔ تمام امراء اور اراکین سلطنت نے بھی اپنے اپنے معیار اور مرتبے کے مطابق اپنے اپنے مکانات کی اساس رکھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں ایک بہترین شہر آباد ہو گیا۔

مسجد، مدرسے، خانقاہیں، چوک، بازار سب کمال نفاست اور آراستگی سے ترشے ہوئے سرخ پتھروں سے بنائے گئے اور سیر و تفریح کی غرض سے سیوہ دار باغات اس شہر جنت نشاں میں لگائے گئے۔ یہ شہر سچ پور سکری کے نام سے موسوم ہوا۔

شہنشاہ اکبر نے اسے اپنا دار السلطنت بنایا۔ اسی نام کی برکت سے شہنشاہ اکبر جنگ میں کامیابی حاصل ہوئی۔

شیخ پور میں حضرت شیخ سلیم کی درگاہ کے بڑے دروازے کے پہلو میں ایک کتبہ لگا ہوا ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت شہنشاہ فلک بارگاہ جل جلالہ الدین محمد اکبر بادشاہ ملک دکن اور خاندانیں کو فتح کر کے سچ پور ہو کر آگرہ تشریف فرما ہوئے۔

جب سلطان سلیم کی عمر چار برس چار مہینے اور چار دن ہوئی تو غلام اور بچوں کے اصولوں کے مطابق نیک ساعت میں شہزادے کو پڑھنے کے لیے بٹھایا گیا اور اس خوشی میں ایک بہت بڑا جشن کر کے لوگوں پر سخاوت کے دروازے کھول دیے۔ سولانا میر کلاں ہروی جو اپنے وقت کے ایک فاضل دانش مند تھے، شہزادے کے استاد مقرر ہوئے۔ جب جہاگیر کی عمر صرف آٹھ سال تھی شہنشاہ نے اسے دس ہزاری منصب سے سرفراز کیا اور فرمایا کہ سلطان سلیم کی نیک سیرتی، بیدار دلی اور بردباری سے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی خوشیاں وابستہ ہیں۔

☆ ☆ ☆

غیاث بیگ، خواجہ محمد طہرانی کا بیٹا اور ایران کے ایمان والا کبارین میں سے تھا۔ شاہ طہماسپ کے زمانے میں خراسان کا حاکم تھا لیکن وہ جو کہتے ہیں ناں کہ وقت بگڑے دیر نہیں لگتی، اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کے خلاف کچھ ان کی سازشیں پروان چڑھیں کہ اس پر فتن کا الزام ثابت

ہو گیا۔ اپنے آپ کو بچانے کے لیے اس نے بے پناہ دولت خرچ کر ڈالی۔ امارت، محنت میں بڑل گئی۔ غربت اور گمناہی کی زندگی بھی اسے گوارا ہو جاتی لیکن شای حکم یہ آگیا کہ وہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ایران کی سرحدوں سے باہر نکل جائے۔ اس جیسا عالم فاضل اور اس کے ساتھ یہ سلوک! وہ رات کے وقت گھر پہنچا تو اس کی بیوی عصمت النساء اپنے تینوں بچوں کو سینے پیٹی بیٹھی۔ ایک نادیہ خوف تھا جو اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس کا شوہر آئے گا تو کوئی اچھی خبر اس کے ساتھ نہیں ہوگی۔

”بیگم، مجھے تو خراسان سے جانا ہوگا۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہو جائے گی۔ میں جہاں بھی رہوں گا تمہاری خبر گیری کرتا رہوں گا۔ کہیں پاؤں جم گئے تو تم کو کون کو بلا لوں گا۔“

”میں آپ کے بغیر کیسے رہ سکوں گی؟“

”رہنا تو ہوگا۔ ملک بدری کے احکام مجھے ملے ہیں، میرے اہل خانہ کو نہیں۔“

”اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ احکام صادر کرنے والے یہ ضرور جانتے ہوں گے کہ جہاں آپ جائیں گے وہاں آپ کے اہل خانہ ضرور جا جائیں گے۔“

”عصمت بیگم یہ ممکن نہیں۔“

”کیسے ممکن نہیں؟“

”تم جس حال میں ہو اس میں تمہارے لیے سفر کرنا مشکل ہوگا۔ ولادت میں چند ہی روز باقی ہیں اور میں ہندوستان جانا چاہتا ہوں۔ تمہارے پیٹ میں جو بھی کی جان ہیں رہی ہے وہ ہندوستان پہنچنے کا انتظار نہیں کرے گی۔“

”آپ کو چاہیے کہ بچے کی ولادت کے بعد سفر کا ارادہ بنا لیں۔“

”کاش! ایسا ہو سکتا۔ مجھے چہم میں گھسنے کا وقت دیا گیا ہے۔ جا کر ادویہ عطی کے احکام بھی صادر ہوئے ہیں، تم لوگ یہاں رہو گے تو کم از کم یہ مکان بچا رہے گا ورنہ تن کے کپڑوں کے ساتھ ہی ہمیں روانہ ہونا پڑے گا۔“

”کچھ بھی ہو جائے۔ میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔“

”خیر اللہ مالک ہے۔ تمہاری یہی خدمت ہے تو یہی سہی۔ تیاری کرو، ہلکا ہلکا سامان اور کھانے کے لیے جو گھر میں ہے ساتھ لے لو۔ گھر میں دو اونٹ اور ایک گھوڑا ہے۔ یہ ہمارا ہمارے کام آئیں گے۔“

”ابھی تو بچوں کی فیند کا وقت ہے۔ ہم کچھ دیر بعد

☆ ☆ ☆

غیاث بیگ، خواجہ محمد طہرانی کا بیٹا اور ایران کے ایمان والا کبارین میں سے تھا۔ شاہ طہماسپ کے زمانے میں خراسان کا حاکم تھا لیکن وہ جو کہتے ہیں ناں کہ وقت بگڑے دیر نہیں لگتی، اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کے خلاف کچھ ان کی سازشیں پروان چڑھیں کہ اس پر فتن کا الزام ثابت

☆ ☆ ☆

غیاث بیگ، خواجہ محمد طہرانی کا بیٹا اور ایران کے ایمان والا کبارین میں سے تھا۔ شاہ طہماسپ کے زمانے میں خراسان کا حاکم تھا لیکن وہ جو کہتے ہیں ناں کہ وقت بگڑے دیر نہیں لگتی، اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کے خلاف کچھ ان کی سازشیں پروان چڑھیں کہ اس پر فتن کا الزام ثابت

خراسان چھوڑ دیں گے۔“ عصمت اٹھانے کہا۔
 ”دن کے اجالے میں خراسان کی سڑکوں سے
 گزرتے ہوئے مجھے شرم وادھن گہری ہوئی۔ قسمت نے جو سیاق
 میرے چہرے پر مل دی ہے اس کے لیے رات کا اندھیرا ہی
 مناسب ہے۔“

”اس وقت شہر کے دروازے بند نہیں ملیں گے؟“
 ”میں اس شہر کا گناہ آدمی نہیں ہوں کہ میرے لیے
 دروازے بند ہوں اور پھر سب کو معلوم ہو چکا ہے کہ میں ملک
 بدر کر دیا گیا ہوں۔“

کسی تجارتی قافلے کا انتظار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کھوار کمر
 پر بندھی تھی اسی پر بھروسہ کیا جاسکتا تھا۔ ایک اونٹ پر سامان
 لاوا، دوسرے پر بیوی بچوں کو بٹھایا۔ گھوڑے پر خود سوار
 ہوئے اور رات کے اندھیرے میں نکل کھڑے ہوئے۔
 صبح کے آٹھ گھنٹہ گزرے تو ایک ہستی میں پہنچ گئے۔
 یہاں سے کچھ کھانے پینے کا سامان لیا، کچھ دیر آرام کیا اور
 آگے بڑھ گئے۔

عصمت انسان کو اونٹ کی سواری بہت تکلیف دے
 رہی تھی۔ وہ اپنی ضد سے آئی تھیں اس لیے اپنی تکلیف ظاہر
 کر کے شوہر کو پریشان بھی نہیں کرنا چاہتی تھیں لیکن جب
 تکلیف بڑھتی تو مرزا غیاث نے انہیں اونٹ سے اتار کر
 اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھالیا۔ کچھ دیر کے لیے آرام ملا لیکن
 تکلیف پھر بڑھنے لگی، سورج سر پر تھا۔ زمین لوہے کی طرح
 چم رہی تھی۔ مرزا غیاث چاہتے تھے کہ جلد سے جلد اس
 ویرانے سے نکل جائیں لیکن گھوڑے کو دوڑا نہیں سکتے تھے۔
 گھوڑا بھی بھجور تھا۔ وہ بھی اوپر چڑھتا، بھی پیچے اترتا تھا۔
 اتنے جھکے لگ رہے تھے کہ عصمت کی حالت خیر ہوگئی۔ یہ
 وہ وقت تھا کہ اسے ہسٹ پر لے رہا تھا چاہے تھا لیکن وہ اس
 ویرانے میں ٹھوکرین کھانے پر مجبور ہوئی تھی۔ اس کے
 اندازے کے مطابق ابھی ولادت کا وقت آنے میں چندہ
 دن باقی تھے لیکن اسے لگتا تھا وہ وقت سے پہلے ہی فارغ
 ہو جائے گی۔ اس کی حالت دیکھ کر مرزا غیاث نے گھوڑا
 روک لیا۔ ایک چارو زمین پر بچھا دی۔ وہ ایک چٹان کا سہارا
 لے کر زمین پر بیٹھ گئی۔ تیوں بچے اس کے ارد گرد بیٹھے ہوئے
 تھے۔

”اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟“
 ”جان لیوں پر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اس
 ویرانے ہی میں مر جاؤں گی۔ اب بھی آبادی کی شکل نہیں
 دیکھ سکوں گی۔“

”نہیں عصمت، بہت بکراؤ۔ اچھے دن ہمارا انتظار کر
 رہے ہیں۔ ہندوستان میں اکبری حکومت ہے۔ وہ جوہر قافلے
 کی قدر کرتا ہے۔ ہندوستان دیکھنے ہی میں دربار تک رسائی کی
 کوشش کروں گا۔“

”کیا میں ہندوستان پہنچ سکوں گی؟“
 ”ہم قندھار کے قریب پہنچنے والے ہیں۔ وہاں ہمیں
 آبادی بھی ملے گی اور ہندوستان کی سرحد بھی قریب ہو جائے
 گی۔“

”میں تو اس بچے کا سوچ رہی ہوں جو اس دنیا میں
 آنے والا ہے۔“
 ”قندھار پہنچ کر ہم وہاں کچھ دنوں کے لیے رک
 جائیں گے۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن
 پیٹ میں درد کی ایک ٹپ سی اٹھی اور وہ دوبارہ لیٹ گئی۔
 اس کی بیٹی اس کے سر ہاتھ بیٹھی تھی۔ وہ اتنی چھوٹی تھی
 کہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ دونوں بیٹے ادھر ادھر بیٹھے گئے۔

سوچ کی شدت ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔
 مرزا غیاث نے ایک چارو کا سایہ کر دیا تھا لیکن قنات کم نہیں
 ہو رہی تھی۔ پھر بے پروا کہ کسی نہ کسی طرح سفر جاری رکھا
 جائے۔ شاید شام تک قندھار پہنچ جائیں۔ کھانے پینے کا
 سامان بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ تھوڑا سا شہد اور چند روٹیاں رہ
 گئیں تھیں۔ قندھار پہنچنے کے بعد اس کی کو بھٹی پورا کرنا تھا۔

سفر پھر شروع ہو گیا لیکن ذرا سے ٹھکے پر عصمت کی تھک
 نکل جاتی۔ مجبور ہی کہ گھوڑے کو تیز نہیں دوڑایا جاسکتا تھا۔
 اتنا آہستہ چلا جا رہا تھا کہ شام ہو گئی اور قندھار ابھی دور تھا۔
 قریب میں کوئی اور ہستی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

عصمت انسان کی تکلیف بڑھنے لگی تھی اور اب وہ ایک
 قدم بھی آگے بڑھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ مجبوراً سفر روکنا
 پڑا۔

مرزا غیاث نے اسے گھوڑے سے اتار کر ایک پتھر
 کی آڑ لے کر زمین پر لٹا دیا۔
 ”پیدائش کا وقت نزدیک آ گیا ہے۔ آپ بچوں کو
 لے کر یہاں سے دور چلے جائیں۔“

”عصمت! کیا بے بسی ہے۔ یہاں تو کوئی عورت بھی
 نہیں ہے۔ جہیں سنبھالے گا کون؟“
 ”یہ میرا پہلا بچہ نہیں ہے۔ میں خود سب کچھ سنبھال
 لوں گی۔ جس نے یہ وقت ڈالا ہے وہی میری مدد بھی کرے
 گا۔ جب آپ کی سبھی بیوی ہوگی، میں آپ کو ملا دوں گی۔“

مرزا غیاث بچوں کو لے کر وہاں سے کچھ فاصلے پر چلے
 گئے۔ وہ دور تھے لیکن کان عصمت کی آواز پر لگے ہوئے
 تھے۔

اب اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ مرزا غیاث کی مرتبہ آکر
 عصمت کو دیکھ چکے تھے۔ وہ شدت تکلیف سے کروٹیں بدل
 رہی تھی۔ بلی بلی کر رہی آس پاس کی جگہ میں گونج رہی
 تھیں۔

مرزا غیاث ایک ہی مشعل ساتھ لے کر آئے تھے۔
 اسے روشن کیا اور بیوی کے سر ہاتھ رکھ دیا اور خود چاند کی بجلی
 روشنی میں بچوں کے پاس چلے گئے۔ انہیں یہ خوف بھی تھا کہ
 کوئی جنگی درندہ اس طرف نہ آئے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ
 لٹیروں کو ان کی موجودگی کی سن ممکن مل جاتی۔ ان دنوں تجارتی
 قافلوں کو گونے کا دستور عام تھا۔ ان کے پاس مال تو ایسا قیمتی
 نہیں تھا لیکن جانوں کا خوف تو بہر حال تھا۔ ان کے پاس
 ایک تلوار اور ایک خنجر تھا۔ انہوں نے خنجر بڑے بیٹے ابوالحسن
 کے ہاتھ میں دے دیا کہ اگر کوئی ایسا ویسا واقعہ پیش آجائے تو
 وہ اپنا دفاع کر سکے اور خود تلوار ہاتھ میں لے لی۔

وہ انہی گھروں میں تھے کہ ایک دلدوز پہنچا بھری۔
 بچے گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”ای کو کیا ہوا؟ یہ تو امی کی
 آواز ہے۔“

دوسری پہنچ ابھری اور پھر خاموشی پھیل گئی۔ مرزا
 غیاث نے بچوں کو وہیں بیٹھ رہنے کی تلقین کی اور خود وہاں
 پہنچے جہاں ان کی بیوی تھی۔

قریب پہنچے تو بچے کے رونے کی آواز نے انہیں
 اطمینان سا دلایا اور قریب گئے تو زمین پر ایک بچی پڑی تھی۔
 اللہ نے انہیں بیٹی دی تھی۔ عصمت بے سندھ بڑی ہوئی تھی۔
 مرزا غیاث کے آواز دینے پر اس اللہ کی بندی نے آنکھیں
 کھولیں۔ اس کے چہرے پر دھڑکیاں مسمراہٹ تھی جو ہر
 اس عورت کے ہونٹوں پر ہوتی ہے جو ماں بننے کا اعزاز
 حاصل کرتی ہے۔

”مبارک ہو، اللہ نے ہمیں بیٹی دی ہے۔“
 ”یہ ویرانے میں پیدا ہوئی ہے۔ اللہ اسے ملوں میں
 رکھے۔“

”آمین۔“
 ”تم نے اسے دودھ پلایا؟“
 ”ابھی کہاں۔ آپ گھوڑا سا پانی لے آئیں۔ میں
 اسے نہلا دوں۔ آپ اس کے کان میں اذان دینے گا۔ پھر
 میں اسے شہد چٹاؤں گی۔ اس کے بعد دودھ پینے کی میری

بیٹی۔“
 ”میں اس کا نام مہر النساء رکھوں گا۔ میں نے پہلے ہی
 سوچ لیا تھا۔“

”اچھا نام ہے۔ چلو یہ آج سے مہر النساء ہے۔“
 اس وقت کون جانتا تھا کہ قندھار کے قریب ایک
 ویرانے میں پیدا ہونے والی یہ بچی جس کا نام مہر النساء رکھا گیا
 ہے، نور جہاں بن کر پورے ہندوستان پر حکومت کرے گی
 اور اسکی ذہین ہوگی کہ اس کی مثالیں دی جائیں گی؟

دور سے گیدڑوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔
 ان میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی شامل ہوئی تھیں۔
 عصمت نے گھبرا کر بچی کو گود میں سیٹھ لیا۔

”یا تو کوئی تجارتی قافلہ اس طرف آ رہا ہے یا پھر کوئی
 بستی قریب ہے۔“ مرزا غیاث نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔
 ”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ آپ پانی کو چھوڑیں نہیں
 میرے پاس بیٹھے رہیں لیکن میرے بچے۔“ عصمت کو
 اپنے بچوں کا خیال آیا۔

”میں ابھی پانی لے کر آتا ہوں بلکہ بچوں کو بھی سسلیں
 لے آتا ہوں۔ وہ بھی اکیلے میں ڈر رہے۔“
 بچے آئے تو اس بھٹی کی جبر ہوئی کہ کچھ کر جیراں رہ

گئے۔ سرخ و سپید رنگ، پھولے پھولے گال، بڑی بڑی
 روشن آنکھیں جنہیں کھول کر مشعل کی روشنی میں وہ اپنے
 دونوں بھائیوں اور بہن کو دیکھ رہی تھی۔ یہ تھی ان بچوں کی نئی
 بہن۔ عجیب بات یہ تھی کہ خدائے اسے بھی مبر دے دیا تھا۔
 اب اس نے رونا بند کر دیا تھا۔

بچوں کے اٹل سیدھے سوالوں کے جواب دینے کے
 درمیان عصمت نے مہر النساء کو بٹھالیا۔ مرزا غیاث نے اذان
 دی اور اپنے ہاتھ سے شہد چٹا دیا۔

شہد چٹانے کے بعد عصمت کی مانتا نے چاہا کہ بچی
 کے منہ سے دودھ لگادے لیکن یہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں
 آنسو آگئے کہ اس کی چھاتیوں میں دودھ ہی نہیں۔ چہر
 قطرے کے شہد روئیں یہ دودھ اتنا نہیں تھا جس سے بچی کا
 پیٹ بھر سکے۔

”میری چھاتیوں میں دودھ خشک ہو گیا ہے۔ بچی کا
 پیٹ کیسے بھرے گا؟“
 ”ہم ابھی سوار ہوتے ہیں۔ قندھار تک پہنچ کر گائے

وغیرہ کا دودھ مل جائے گا۔“
 ”اس وقت تک تو میری بچی ہاتھوں میں آجائے گی۔“
 یہ عجیب امتحان تھا۔ ماں کی چھاتیوں میں دودھ نہیں

تھا۔ بچی بلک رہی تھی۔ عصمت ابھی اس قابل بھی نہیں ہوئی تھی کہ کھوڑے پر سوار ہو سکے۔ رات گہری ہوئی جاری تھی۔ خطرات اور گرفتار رہے تھے۔ اچانک گھنٹیوں کی آوازیں پر مرزا غیاث چوکنے لگے۔ یہ کوئی تجارتی قافلہ تھا۔ ان کے جانوروں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیاں شور مچا رہی تھیں۔ اس زمانے کا قاعدہ تھا کہ قافلے میں شامل اونٹوں کے گلوں میں گھنٹیاں باندھ دی جاتی تھیں جنہیں ”جرس“ کہتے تھے۔ رات کے وقت قافلے کے لوگ اپنی اپنی سواریوں پر سوار ہو جاتے تھے۔ ابھی ان گھنٹیوں کی آوازیں ان کے کانوں میں آئی تھیں۔ کوئی خطرہ ہوتا اور جانور رک جاتے تھے تو گھنٹیوں کی آوازیں بند ہو جاتی تھیں۔ قافلے والے ہوشیار ہو جاتے کہ کوئی خطرہ ہے۔ راستہ بھٹکنے کی صورت میں بھی جانور رک جاتے تھے۔

مرزا غیاث اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ”ایران کی طرف سے کوئی قافلہ آ رہا ہے۔ شاید اس قافلے میں کوئی عورت ہو جو ہماری مہر النساء کو دودھ پلا سکے۔“

گھنٹیوں کی آوازیں قریب سے قریب تر ہوتی جاری تھیں۔ پھر قافلے میں شامل جانوروں کے دھندلے سائے نظر آنے لگے۔ پھر اتفاق یہ ہوا کہ گھنٹیوں کی آواز ختم ہو گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قافلہ نہیں کہیں پڑاؤ کرنے والا ہے۔

”قافلے نے یہاں پڑاؤ کیا ہے۔“ مرزا غیاث نے بیوی کو بتایا۔ ”وہ دیکھو ان لوگوں نے کچھ مشعلیں بھی روشن کی ہیں۔ فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ وہ ہماری موجودگی سے بے خبر ہیں لیکن میں نے انہیں دیکھ لیا ہے۔ تم مہر النساء کو ایک کپڑے میں لپیٹ دو۔ میں اسے قافلے میں لے کر جاتا ہوں۔ کوئی عورت ضرور مل جائے گی جو اسے دودھ پلا سکے۔“

”ہم سب چلتے ہیں۔ کوئی عورت وہاں نہ بھی ہوئی تو دودھ تولی ہی جائے گا۔ ہم اسی قافلے کے ساتھ ہندوستان تک بھی جا سکتے ہیں۔“

”تم کس طرح جاؤ گی؟“

”مجھے سواری پر بیٹھنے میں تکلیف ہوگی لیکن پیدل کسی زکسی طرح چلی ہی جاؤ گی۔“

مرزا غیاث نے اپنے جانوروں کو قافلے کی طرف ہٹا دیا۔ ایک ہاتھ میں مشعل پکڑی دوسرے ہاتھ سے بیوی کو سہارا دیا اور قافلے کی طرف چلے۔

”اے۔ کون اس طرف چلا آ رہا ہے؟ اس ویرانے میں کیا کر رہے ہو۔۔۔ اپنی شناخت کراؤ۔“ مرزا غیاث کو دیکھ کر قافلے کے قریب کسی نے اسے لکارا۔

”یہاں مسافر ہوں۔ مصیبت کا مارا ہوں۔ بیوی بچے بھی میرے ساتھ ہیں۔ تم مجھے اپنے قافلہ سالار کے پاس لے چلو۔ شاید اسے میری حالت پر کچھ رحم آجائے۔“

یہ قافلہ ہندوستان کے مشہور تاجر ملک مسعود کا قافلہ نیکڑوں اونٹوں پر لدا ہوا ایرانی سامان وہ ہندوستان لے جا رہا تھا۔

مرزا غیاث بیگ کو اس کے آدمیوں نے ملک مسعود کے سامنے پیش کر دیا۔ مرزا غیاث نے اپنا تعارف کرایا تو ملک مسعود کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ ایسے کی تلاش دیکھ چکا تھا۔ بادشاہی کے کارخانے میں جب کوئی محتوب ہوتا ہے تو اس پر کیا گزرتی ہے۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ مرزا غیاث جو کبھی خراسان کا حاکم تھا۔ بیوی بچوں سمیت اس ویرانے میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ نومو لوہی اس کے ساتھ گئی اور دودھ کے ایک قطرے کو ترس رہی تھی۔ مرزا غیاث کپڑے میں لپیٹی ہوئی مہر النساء کو بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ ملک مسعود نے کپڑا ہٹا کر دیکھا۔ ایسی بیاری بیوی کو دیکھ کر اس کا دل ہمدردی سے بھر گیا۔

”مرزا اس قافلے میں کوئی عورت تو نہیں جو اس بیوی کو دودھ پلا سکے لیکن اونٹنی کا دودھ مل جائے گا اگر یہ ہضم کر سکے۔“

”اس وقت تو جو مل جائے وہی قیمت ہے۔“

”تم اپنی بیوی سے بھی کہو کہ وہ بھی خوب دودھ پیے۔ اچھی غذا اسے تو دودھ آپ ہی آپ اتر آئے گا۔“

”میرے پاس ایک اونٹ ہے۔ آپ کے چلے جانے کے بعد ہمیں دودھ کہاں ملے گا؟ اگر کوئی عورت آپ کے قافلے میں ہوئی تو اس بیوی کو ہم اسے دے دیے۔ اس کی جان تو بچ جاتی۔“

”آپ اس ویرانے میں کیا کریں گے؟ آپ بھی قافلے کے ساتھ ہندوستان چلیں۔ آپ جیسا عالم قافلے میں یوں خانماں برباد ہو جائے، یہ میری بدبختی ہوگی۔ آپ میرے ساتھ ہندوستان چلیں۔ شہنشاہ اکبر کے دربار تک میری رسائی ہے۔ آپ کی قسمت نے پادری کی تو ملازمت کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ جب تک کوئی بندوبست نہیں ہوگا آپ میرے مہمان ہوں گے۔“

عصمت النساء کچھ قاسطے پر کھڑی یہ گفتگوں رہی تھی۔ اس وقت بیوی اس کے ہاتھوں میں نہیں تھی۔ اس نے تصوری تصور میں اسے چوم لیا۔ میری بیوی خوش قسمت ہے۔ ابھی ہندوستان پہنچی نہیں کہ باپ کی ملازمت کا بندوبست بھی

کر دیا۔

ملک مسعود نے بیوی کے لیے دودھ کا بندوبست کر دیا۔ اب اسے پلانے کا مسئلہ تھا۔ ایک بیگ کے ذریعے یہ دودھ اس کے حلق میں اتارا گیا۔ خود عصمت النساء نے بھی پیٹ بھر کے دودھ پیا۔ ملک مسعود نے اپنے پڑاؤ کی مدت بڑھا دی۔

”ہم دو دن بعد یہاں سے کوچ کریں گے۔ اس عرصے میں جہادری بیوی کی خدمت بھی کچھ کم ہو جائے گی۔“

ملک مسعود نے مرزا غیاث سے کہا۔

وہ مرزا غیاث سے ایسا متاثر ہوا تھا کہ ان دونوں میں اس نے ایک مل کے لیے بھی اسے خود سے جدا نہیں ہونے دیا۔ ان نشستوں نے اسے مرزا غیاث کا عاشق بنا دیا۔ مرزا غیاث کو کفر و شر میں کمال حاصل تھا۔ دیگر شعرا کے ہزاروں اشعار حافظے میں تھے۔ خط کوئی اور خط نشانی میں بیڑی بٹھائی رکھا تھا۔ گفتگو ایسی کر گھنٹوں سنا کر وہ۔ معاملہ بھی ایسی کر خاموشی کو الفاظ پر پنا دے۔ ملک مسعود جاتا تھا، نیکڑوں سفر کر چکا تھا لیکن مرزا غیاث جیسا عالم اس نے دوسرا نہیں دیکھا تھا۔

پانی خود بخود پانچ راست بناتا جا رہا تھا۔ مرزا غیاث کی یہ ملاقات ملک مسعود سے دوستی میں بدل گئی۔ ہندوستان پہنچنے تک دونوں شیر و شکر ہو گئے۔

ملک مسعود کا محل آگرہ میں تھا۔ اکبر نے ان دونوں کو پور سیکری کو دار السلطنت بنایا ہوا تھا اس لیے اس کا زیادہ تر قیام حج پور میں ہی تھا۔ ملک مسعود نے مرزا غیاث اور اس کے بیوی بچوں کو اپنے محل میں ٹھہرایا اور خود حج پور روانہ ہو گیا۔ وہ جب بھی کسی سفر سے لوٹتا، اکبر کے دربار میں ضرور حاضر ہوتا تھا اور تحائف بادشاہ کی نذر کرتا تھا۔ اس مرتبہ اس نے اصل تحفہ آگرہ میں چھوڑا اور چند معمولی تحائف لے کر اکبر کی خدمت میں پہنچ گیا اور تحائف پیش کیے۔ بادشاہ نے ان تحائف پر ایک نفروانی۔ اس نے ان تحائف کو اپنے ہاتھ سے چھو کر یہ غلطی بھی دے دیا کہ اس نے یہ تحفے قبول کیے لیکن یہ اظہار بھی کیا۔

”اس سال کیا بات ہے، تم ہماری سرکار کے قابل کوئی ایچا تحفہ لے کر نہیں آئے؟“

ملک مسعود قباب شاہی کے خوف سے لرز کر رہ گیا۔ ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ ”ہم کمزوری فروش اس بارگاہ کے لائق آفرین ساتھ پیش کر سکتے ہیں؟ البتہ اس سفر میں دو عین ہے بہا جان دار جو اب میرے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ اگر بادشاہ پسند فرمائیں تو چھپا کر دیں؟“

”کیا کوئی نایاب پرندہ لے آئے۔“

”پرندوں کی کیا مجال جو انسانوں کی ہم سری کا دعویٰ کریں۔“

”پرندوں کے انسانوں سے ہمارا دربار بھرا پڑا ہے۔“

”ایران و توران سے بھی ہندوستان کے بادشاہوں کے لیے ایسا تحفہ پیش نہیں ہوا ہوگا۔“

”ہمارے دربار کی اہمیت سے واقف ہو ملک مسعود؟“

”میں نے دنیا کے دربار دیکھے ہیں مگر اس شان کا دربار نہیں دیکھا۔“

”پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ ابوالفضل جیسا بہرا ہمارے تاج کی زینت ہے۔“

”نعل المہی! ہر پھل کا ذائقہ انگ اور خوشبو جدا ہوتی ہے۔“

”تم نے مابدولت کا اشتیاق بڑھا دیا ہے۔ ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ وہ نایاب تحفے جلد ہماری خدمت میں پیش کیے جائیں۔“

”یہ بندہ آپ کی اجازت کا شہنشاہ تھا۔“

ملک مسعود جاتے جاتے دربار سے واپس آیا۔ اسے وہ دودھ پورا ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا جو اس نے مرزا غیاث سے کیا تھا۔ آگرہ آنے کے بعد اس نے یہ خوشخبری مرزا غیاث تک کو سنائی۔ انہیں اور ان کے بیٹے ابوالحسن کو لے کر ایک مرتبہ حج پور آیا۔

حج پور میں قدم رکھتے ہی مرزا غیاث کی آنکھیں فرط حیرت سے پھیل گئیں۔ یہاں کی عمارات دیکھ کر انکشت بدندان رہ گیا۔ وہ ایران کے چپے چپے میں گھوم چکا تھا۔ ایسی شاندار عمارتیں کہیں اس کی نظر سے نہیں گزری تھیں۔

وہ اکبر کے سامنے پیش ہوا۔ اکبر کو اس کے حالات سے واقفیت ہوئی اور وہ اس کی قابلیت اور معاملہ بھی سے متاثر ہوا تو اسے بادشاہی ملازموں میں شامل کر لیا۔ یہ شخص اپنی قابلیت اور خوش اقبالی سے ترقی کے مدارج طے کرتا رہا۔ بعد میں اس کا بیٹا ابوالحسن بھی خدمت شاہی میں شامل ہوا۔

ملازمت کی کامیابی خوش حالی کے دروازے کھل گئے۔ حج پور میں شائد اعلیٰ رہنے کے لیے محل بنایا۔ وہ سب کچھ مل گیا جس کی آرزو کی جا سکتی تھی۔ مہر النساء کی خوش اقبالی نے ماں باپ کو ویرانے سے محل میں پہنچا دیا۔

کچھ عرصے بعد اکبر نے دار السلطنت حج پور سے آگرہ منتقل کر دیا۔ انسانوں کا دیکھ کر آگرہ کے باغات میں ضم

مہر النساء کی سب سے بڑی بات



ستمبر 2011ء

مہر النساء کی سب سے بڑی بات

مصطفیٰ محمد اللہ خان نواب

محبت کے لیے لوگ تخت و تاج ٹھکراتے ہیں لیکن ان دیوانوں پر جان لینے اور بے کس و صوابی۔

لکاکا طاہر جان بیدار

جان لاکا... عمران کی زندگی کے کشیدہ اوراق جس کی ہر سطر میں جوش جستجو اور سنسنی پناں تھی

گرواں اسٹافوری

چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر... بے درپے رونا ہونے والے حادثات کی یادگار داستان

سرور خان رکن

لمحہ کا فیصلہ... احمد اقبال

وہ فیصلہ کن لمحات... جن میں زندگی کی بھارتی

بے بس اختیار... پرویز زبیر

اختیارات رکھنے والے اختیار بخش کا قصہ دل دوز

جرم کھائیں

ہر جرم کے پیچھے کوئی نہ کوئی واقعہ مضمر ہوتا ہے... انہی

تغییرات سے جنم لینے والی... ناقابل فراموش کہانیاں

جینی نکتہ جینی

آپ کے تہرے... مشورے... محبتیں... سحر

شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں... آپ کے قلم سے

ہوئی۔
”معاف کیجئے گا، ہم بے اختیار ہو گئے تھے۔ آپ نے بات ہی ایسی کی تھی۔ باتوں باتوں میں ہمارا دوسرا کیوٹر بھی اڑا ڈالا۔“

”یہ ہندی تفسیر کی معافی چاہتی ہے۔“

”آپ ہیں کون؟ اس سے پہلے تو ہم نے آپ کو کل

میں نہیں دیکھا؟“

”ہم مرزا غیاث بیگ کی بیٹی مہر النساء ہیں۔“

”آپ اپنے نام کی طرح بہت خوبصورت ہیں۔“

”ہندی اس ذرہ نوازی کے لیے شکر ہے بھالانی ہے۔“

”آئیے اس فوارے کے پاس چل کر بیٹھتے ہیں۔“

آپ سے اور بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“

”دیکھیے وہ کوئی آرہا ہے۔“ مہر النساء نے کہا اور

شہزادے نے جیسے ہی گردن ہٹا کر دیکھا وہ بھاگ کھڑی

ہوئی۔ یہ بے ادبی تھی لیکن شہزادے نے جس گستاخی کا

مظاہرہ کیا تھا اس کے بعد وہ گستاخ ہونے پر مجبور ہوئی تھی۔

اس نے یونہی کہہ دیا تھا کہ کوئی آرہا ہے لیکن چندانی

واقعی اس طرف آ رہی تھی اور اس نے یہ سب دیکھ بھی لیا تھا۔

چندانی شہزادے کی دودھ شریک تھی اور مہر النساء سے اس کی

بے تعلقی تھی۔

”کہاں بھاگ جا رہی ہو۔“

”دیکھ نہیں رہی ہو۔ شہزادہ حضور آرہے ہیں۔ انہیں

دیکھ کر رک نہ کی؟“

”کہاں ہیں شہزادہ حضور؟ ہمیں تو کہیں نظر نہیں

آ رہے۔“

”ابھی تو تھے کسی طرف مڑ گئے ہوں گے۔“

”وہ سب ہم سب کچھ دیکھ چکے ہیں۔ ان کی آغوش آپ

کے لیے کھلی دیکھی ہے۔“

”جل ہٹ، دوو، دوو۔“

”جھٹکائی کیوں ہو؟ ان کی نظروں میں آگئیں تو

موتوں میں جل جاؤ گی۔“

”ہمیں موتوں سے غرض نہیں۔“

”یہ شادی قلعہ ہے۔ یہاں انکار کو قرار میں بدلتے

مجال نہیں تھی کہ اس کا نام زبان پر لایا۔ خود مہر النساء کا حال یہ تھا کہ ایک مرتبہ سے زیادہ اس نے شہزادے کو نہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

وہ اس روز بھی اپنی ماں کے ساتھ شادی محل گئی ہوئی

تھی۔ عورتیں باتوں میں لگی ہوئی تھیں کہ اچانک اسے نہ

جانے کیا سوجھی کمرے سے نکل کر راہداری میں آگئی۔

فواروں کو غور سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی کہ اسے

احساس ہوا کہ کوئی سامنے سے آرہا ہے۔ اس نے پیکوں کی

جھانک لی۔ اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ یہ شہزادہ سلیم

تھا۔ وہ نہ تو وہاں پلٹ تھی کہ بے ادبی ہوئی، نہ آگے بڑھ

سکتی تھی کہ یہ بھی بے ادبی ہوئی۔ ایک ہی طریقہ تھا کہ رک

جائے اور جب شہزادہ قریب آئے تو جھک کر تسلیات بجا

لائے اور جب شہزادہ گزر جائے تب آگے بڑھے۔ وہ رک تو

گئی لیکن تسلیات کی بجائے آدھری کی رسم بھول گئی یا یہ ہوا کہ

شہزادے نے اسے سوجھی ہی نہیں دیا۔ شہزادے کے ہاتھ

میں دو کیوٹر تھے۔ اس نے وہ دونوں کیوٹر مہر النساء کی طرف

بڑھا دیے۔

”انہیں مضبوطی سے پکڑ کر رکھنا۔ ہم ابھی آکر لینے

تھا۔“

مہر النساء کچھ بھی تو نہ کہہ سکی۔ دونوں ہاتھ بڑھائے اور

کیوٹر پکڑ لیے۔ شہزادہ لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے راہداری

پر چلا گیا۔

مہر النساء اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ کچھ ایسی گم

ہوئی کہ یہ ہوش ہی نہیں رہا کہ کیوٹر اس کے ہاتھ میں ہیں اور

گرفت و صلی دیکھ کر ایک کیوٹر پھڑپھڑایا اور ہاتھ سے نکل

گیا۔ مہر النساء کو پہینا آگیا کیا خبر کتنا مٹی کیوٹر تھا؟ شہزادہ

اسے کیا سزا دیتا ہے؟ اس نے دوسرے کیوٹر کو مضبوطی سے

پکڑ لیا کہ کہیں وہ بھی نہ اڑ جائے۔ اسی دیر میں شہزادہ آگیا

اور کیوٹر لینے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھا دیے۔

”یہ کیا ایک کیوٹر کہاں گیا؟“

”وہ تو اڑ گیا۔“

”اڑ گیا۔ کیسے؟“

”ایسے۔“

مہر النساء نے دوسرا کیوٹر بھی اڑا دیا۔ شہزادے کو اس

لڑکی کی سادگی پر بے اختیار ہنسی آگئی۔ اس نے ادھر ادھر

دیکھا اور مہر النساء سے ہم آغوش ہو گیا۔

”شہزادہ حضور! مہر النساء کی چٹائی لیکن آلود

ہو گیا۔ قلعہ آگرہ میں باادب با ملاحہ کی صدا میں گونجنے لگیں۔ مرزا غیاث اور ان کا خاندان بھی آگرہ منتقل ہو گیا۔

آگرہ کا قلعہ سکندر رومو نے بنایا تھا۔ اسی کے زمانے

سے آگرہ کی آبادی بڑھنے لگی اور وہ ملک کا پایہ تخت کہلایا۔

جب تک قلعہ شاہ جہاں آباد تھا نہیں ہو گیا، آگرہ ہی شاہان

دہلی کا پایہ تخت رہا۔ آگرہ کا قلعہ پہلے پتھر، اینٹ اور چوڑے

سے بنایا گیا تھا۔ اکبر نے اپنے ملکوں کے گیارہویں سال

میں قلعے کی سنگ سرخ سے تعمیر شروع کرائی۔ قلعے کی مسجد

سنگ مرمر سے بنائی گئی۔ دوسری بہت سی خوبصورت عمارتیں

بنوائی گئیں۔ اس یادگار قلعے پر جس لاکھ روپے کا خرچ آگیا۔

ملک مسعود کی بیوی کو شادی محل میں آمدورفت کی

اجازت تھی۔ وہ بھی بھی مہر النساء کو بھی اپنے ساتھ لے جایا

کرتی۔ مرزا غیاث بیگ کی بیوی تھی اس لیے وہ بیگمات کے

لے ابھی نہیں تھی۔ مہر النساء کی بیوی مٹی تھی کہ اس کی بیٹی

بیٹی بائیں سننے کے لیے بیگمات اسے خود بلالیا کرتی تھیں۔

شہزادہ سلیم (جہانگیر) پنج پور میں مقیم تھا اس لیے بھی اس کے

ساتھ کھیلنے کا موقع نہیں ملا البتہ یہ دونوں تعلیم و تربیت کی

منزلیں ایک ساتھ ملے کرتے رہے۔

قلعے سے تعلق نے مرزا غیاث کو یہ مواقع عطا کیے کہ وہ

مہر النساء کے لیے بہترین اساتذہ کا انتخاب کر سکیں۔ وہ ڈھن

بھی تھی۔ بہت تیزی سے تعلیم کی منزلیں طے کرتی چلی گئی۔

شاب آیا تو ایسا کہ شہزادوں کو شرمندہ کرنے لگی۔ قلعہ میں

اتنا آجائے تھا کہ سیاسی دانوں کو خوب واقف ہوئی۔ جب

بیگمات آپس میں باتیں کرتیں تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی

کہ ان عورتوں کو دنیا کی ہر نعمت میرے لیکن مگر بھی ایک

دوسرے کی ہانگ کھینچنے میں مشغول رہتی ہیں۔ خوبصورت

کنیزوں کی تو دنیا ہی نرالی تھی۔ ہر ایک چاہتی تھی کہ کسی طرح

بادشاہ کی نظروں میں آجائے یا کسی شہزادے کے ہنر کی

زینت بن کر خوب دولت سمیٹے۔ بیگمات کی زبانی یہ رنگین

داستانیں دور و درستا کرتی تھیں۔ وہ یہ دیکھ رہی تھی کہ شہزادہ سلیم

کا نام ان کہانیوں میں بار بار آتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا

کہ شہزادہ سلیم شراب کا عادی ہے۔ چند سال کی عمر میں دو

بیویوں کا شوہر بن چکا ہے لیکن اپنی پیش پرستی کے لیے ایک

الگ محل قلعے کے ایک ایسے حصے میں بنوایا ہے جہاں ہر وقت

اندھیرا رہتا ہے۔ کون سی کنیز کس وقت آئی اور کس وقت چلی

گئی، کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ پھر سے دار بھی صرف اتنا دیکھتے

تھے کہ ایک سایہ تھا جو شہزادے کی پیش گاہ میں داخل ہوا اور

رات وسطیٰ تو وہاں چلا گیا۔ کوئی سایہ پہچان بھی جاتا تو کسی کی

رمضان کی رحمتیں مبارک ہوں



Facebook: www.facebook.com/dawnfoods

www.dawnfoods.com

شہزادہ سلیم کی سوتیلی ماں سلیہ بیگم کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ بھی وہیں بیٹھی تھی۔ اس کا انتظار کب سے ہو رہا تھا۔ سواری لگ گئی تھی۔ خواجہ سردار وازے پر کھڑا تھا۔ وہ بس کچھ ہی دیر وہاں بیٹھی اور پھر ماں کے ساتھ پاکی میں سو رہی تھی۔

اپنی حویلی پہنچ تو شام ہوئے کونجی۔ ابو الحسن آصف خاں گھر پر ہی تھے جبکہ مرزا غیاث کے بارے میں اسے معلوم ہی تھا کہ وہ بادشاہ کے ساتھ شکار پر گئے ہیں۔ اس کی طبیعت میں عجیب سی بے چینی تھی۔ اس نے سر ہانے رکھی ایک کتاب اٹھائی اور پڑھنے کے لیے لپٹ گئی۔ مٹھے دو مٹھے کے بعد الفاظ کاٹنے کے لیے دوڑنے لگے۔ اس نے بے زاری سے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ کتاب رکھی تو شہزادے کا دھیان آ گیا۔ اب یہ بھی معلوم ہو گیا کہ طبیعت میں بے چینی کیوں تھی؟ اس نے خرما کراپے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے۔ پھر وہ خود بخود دھنسنے لگی۔ اسے ان کبوتروں کا خیال آ گیا جو اس نے اڑا دیے تھے۔

اسی فکری کا زور میں ٹوٹا نہیں تھا کہ چند لمحوں کی باتیں یاد آنے لگیں۔ کیا اسے بھی کسی روز شہزادے کی غفلت میں جانا ہوگا؟ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اگر مجھے جانا بھی پڑا تو میں معمولی کبوتر نہیں ہوں جس پر صاحب عالم اشرفیاں پھمکاو کریں اور وہ خوش ہو کر لوٹ آئے۔ میں ان کا حکم نہیں ٹال سکتی لیکن اپنی بات تو منوا سکتی ہوں۔

اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ حویلی میں دسترخوان بچھانے کا اہتمام ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ مرزا غیاث تشریف لائے ہیں۔ بھائی بہن سب باپ کے سلام کو حاضر ہو چکے ہوں گے اور وہ یہاں جمہا بیٹھی ہے۔ اس نے جلدی جلدی حلیہ درست کیا اور باپ کی خدمت میں پہنچ گئی۔

”آپ تو بادشاہ سلامت کے ساتھ شکار پر گئے تھے۔“

”شکار کرنے گئے تھے، شکار ہونے تو ڈی گئے تھے کہ واپس ہی نہ آتے۔“

”خدا ندر کرے، ہمارا مطلب یہ نہیں تھا۔“

”اب اس گستاخی کی سزا یہ ہے کہ ہماری عالم فاضل بیٹی کھانے سے فراغت کے بعد مشغولی مولانا دم کے کچھ حصے اپنی خوبصورت آواز میں سنائے گی۔“

”یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی ابا جان۔“

”اس کے بعد ہم تمہیں ایک خوش خبری سنائیں گے۔“

”یہ بھی ہمارے لیے اعزاز ہوگا۔“

”پلو دسترخوان پر انتظار ہو رہا ہوگا۔ آپ کی والدہ کو

قلعہ آگرہ مہرالنسا کے لیے بنائیں تھا۔ وہ یہاں آتی جاتی رہی تھی۔ بہت کچھ سیکھ چکی تھی۔ بیگمات کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اسے معلوم ہو چکا تھا کہ یہاں کوئی کسی کا وفادار نہیں۔ سب مختلف سیزہاں لگا کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ جو فوژ کا بازار ہر وقت گرم رہتا ہے۔ قلعے کی پوری سیاست بادشاہ اکبر اور ولی عہد شہزادہ سلیم (جنگجو) کے گرد گھومتی ہے۔ بادشاہ تک تو ہر کسی کی رسائی نہیں لیکن شہزادے تک پہنچنا آسان ہے لہذا ہر سازش ہمیشہ سے شروع ہوتی ہے اور مستقبل کی امیدیں ہر مہرہاں کے ہمارے پلا جاتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ شہزادے کی پہلی شادی صرف پندرہ سال کی عمر میں کر دی گئی تھی اور اس کے دوسرے سال ہی اس نے دوسری شادی رچائی تھی۔ دو شادیوں کے باوجود اس کا ذوق حسن پرستی کم نہیں ہوا تھا۔ اس کی رائیں اس خاص گل میں گزرتی تھیں جو اس کی خلوت گاہ بھی تھا اور عیش گاہ بھی۔ یہاں شراب کے دور بھی چلتے تھے اور خوبصورت چہروں کے چاند بھی اترتے تھے۔ اس کے یہ شے بادشاہ کی نظروں سے اوجھل نہیں تھے لیکن سلیم سے اسے جو محبت تھی اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اس کی حرکتوں کو نظر انداز کرتا رہے۔

مہرالنسا کو قلعے میں آنے ہوئے پندرہ دن سے زیادہ ہو گئے تھے۔ اس کی توقع کے برخلاف شہزادے نے ملاقات کے لیے کوئی پیغام نہیں بھیجا تھا۔ وہ تو کبھی بھی کسی کے قلعے میں جانے کے پیچھے بھی شہزادے کا ہاتھ ہے لیکن اب تو جیسے وہ اسے بھول ہی گیا تھا۔ مہرالنسا کے جتنے منصوبے تھے، خاک میں ملنے نظر آرہے تھے۔ اس عرصے میں اس نے صرف ایک مرتبہ شہزادے کو دیکھا تھا لیکن وہ جان بوجھ کر اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔

مہرالنسا اس شام اپنے محل کے پائین باغ میں گل گشت کے شے میں مصروف تھی کہ شہزادے کی ایک کیز اس کے پاس یہ پیغام لے کر حاضر ہوئی کہ شہزادے نے اسے شرف ملاقات کے لیے طلب فرمایا ہے۔

”آپ کو صاحب عالم نے طلب فرمایا ہے۔ رات کے وقت جب محلوں میں فانوس روشن ہوتے ہیں۔ یہاں سے شہزادے کے محل تک اندھیرا ہوتا ہے۔ یہ اندھیرا آپ کو چھپانے کا اور آپ شہزادے کے حضور پہنچ جائیں گی۔“

”شہزادے نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ رات کے وقت ہم کیسے ٹھل سکتے ہیں؟“

”شہزادے سوچنے کے لیے نہیں ہوتے۔ وہ صرف حکم جاری کرتے ہیں۔ کیزیں حکم ماننے کے لیے ہوتی

ہیں۔“

”ہم کیز نہیں، مرزا قیامت الدین کی بیٹی مہرالنسا ہیں۔“

”شہزادے کو بھی معلوم ہے۔ اس کے باوجود آپ کو طلب کیا گیا ہے۔“

”ہم راستہ بھٹک کر کہیں اور نکل گئے تو؟“

”اس راہ میں رہنمائی کے لیے مجھے ذمے داری سونپی گئی ہے۔ میں آپ کو وہاں تک پہنچا دوں گی۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ انعام و اکرام کا حصول آپ کی راہ تک رہا ہے۔“

وہ خود یہ چاہتی تھی کہ شہزادہ اس سے ملاقات کرے لیکن اب اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ اسے ایک معمولی کیز کے ذریعے طلب کیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ کسی کیز کو طلب کرتے ہوں گے۔ اس کیز کو بھی معلوم ہوگا کہ مجھے کیوں طلب کیا جا رہا ہے؟ یہ سب باتیں اپنی جگہ لیکن شہزادے کے حکم سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ خوش قسمتی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ کیسے انکار کر سکتی تھی؟ آخر اس نے اس ملاقات کے لیے وقت طے کر لیا۔

محل میں فانوس روشن ہو گئے تھے۔ قلعے میں روشوں پر، راہروں میں بڑے بڑے ہندے روشن ہو گئے تھے۔ گویا ملاقات کا وقت آ گیا تھا۔ اس نے اپنا کمر بند کیا اور کھڑکی کے ذریعے باہر نکل گئی۔ وہی کیز جو اس کے لیے شہزادے کا پیغام لائی تھی اس کی منتظر تھی۔ وہ اسے لے کر ایک طرف روانہ ہوئی۔ کچھ دیر روشنی میں رہنے کے بعد وہ اندھیرے میں داخل ہوئی۔ یہاں سے شہزادے کے محل تک اندھیرا مسلط تھا۔ کہیں کہیں کوئی خواجہ سرا چہرے دار کے طور پر کھڑا نظر آ جاتا تھا۔

کوئی اور لوگ ہوتی تو اس کے قدم کا پ رہے ہوتے لیکن وہ مہرالنسا تھی اور یہ تھاں جگہ تھی کہ اسے ایک روز ملکہ ہندوستان بننا ہے۔ مردانہ دار، خوف و خطر اس کیز کے ساتھ چلے جا رہی تھی۔ محل کے قریب پہنچ کر وہ کچھ بھیجی ضرور تھی لیکن محل کے صدارت دروازے سے شہزادے کے کمرے تک اتنا فاصلہ ضرور تھا کہ وہ اپنے حواس پر قابو پا سکتی۔

”جانیے مہرالنسا۔ صاحب عالم آپ کے منتظر ہوں گے۔“ ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر اس کیز نے مہرالنسا سے کہا۔

مہرالنسا نے اسے بھی اپنی توجہ نہ کیا کہ وہ خود محل کر شہزادے کے سامنے پیش ہو رہی ہے لیکن وہ سیکھ چکی تھی کہ

مقتد کے حصول کے لیے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو بہت سے قانونی لکھے ہوئے تھے لیکن صرف ایک روشن تھا۔ نیم تاریک کمرے کے ایک گوشے میں جمہرات سے مزین کرسی پر شہزادہ تشریف فرما تھا۔ قریب ہی شراب کے ظروف چمک رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی شہزادہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”آؤ مہرالنسا آؤ۔ ہم آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔“ شہزادے نے کہا اور اپنے ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیے۔ مہرالنسا نے جواب میں ہاتھ نہیں بڑھائے بلکہ ایک دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ شہزادہ ناراض ضرور ہوا لیکن اس نے اس وقت کسی رد عمل کا اظہار مناسب نہیں سمجھا۔

”کمال ہے! صاحب عالم کو ہمارا نام اب تک یاد ہے۔“

”آپ کا نام تو ہمارے دل پر لکھ دیا گیا ہے۔“

”اسی لیے میں یاد کرنے میں آپ نے پندرہ دن لگا دیے۔“

”ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ آپ کے بغیر کتنے دن زندہ رہ سکتے ہیں؟ اب احساس ہوا کہ یہ دوری ہمیں زندہ نہیں رہنے دے گی۔“

”ہم پوچھ سکتے ہیں کیز کو کیسے یاد کیا؟“

”یہ پوچھنے کے لیے کہ آپ نے ہمارے قیمتی کیوز کیوں اڑا دیے؟“

”ہم اس کے ازالے کے لیے تیار ہیں۔“

”آپ کی سزا یہ ہے کہ ہمارے لیے شراب کا پیالہ آپ اپنے ہاتھ سے بنائیں گی اور اپنے ہاتھ سے پیائیں گی۔“

”ہمیں یہ کہنے میں کوئی شرم نہیں کہ ہم نے آج تک شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ شراب کی کتنی مقدار پیالے میں ڈالی جاتی ہے۔“

”ہمیں اپنا اتنا تیل مقرر کیجیے۔ ہم آپ کو سکھائیں گے۔“

شہزادہ اسے اپنے ساتھ لے کر اس چوکی تک گیا جہاں ظروف رکھے تھے۔ شہزادے نے چاندی کا پیالہ اپنے ہاتھ میں پکڑا۔ مہرالنسا نے چاندی کی سرسائی اٹھائی۔ شہزادے نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پیالے کو جہاں تک بھرنا تھا بھرا۔

”اب آپ گھونٹ دو گھونٹ کر کے ہمیں پلائی رہیں

گی۔“

شہزادے نے دو گھونٹ ہی میں پیالہ خالی کر دیا، مہرالنسا نے پیالہ بھر کے ایک مرتبہ پھر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پھر تیسرا اور پھر چوتھا۔

جب نقشہ کچھ گہرا ہوا تو شہزادے نے مہرالنسا کا ہاتھ پکڑ کر اس زور سے اپنی طرف کھینچا کہ وہ اس کی کرسی پر آ گئی لیکن نورانی تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔

”صاحب عالم۔ گستاخی معاف، ہم آپ کے محل کی کیز نہیں ہیں۔“

”ہم نے کب یہ کہا؟ آپ تو ہمارے دل کی جگہ ہیں۔ ہم نے بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ہمیں آپ سے محبت ہے۔ ہم آپ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔“

”محبت کرتے تو اس طرح رات کے وقت ہمیں یہاں طلب نہ فرماتے۔“

”ہم خود یہ نہیں چاہتے تھے لیکن ملاقات کی اور کوئی صورت بھی تو نہیں تھی۔“

”اب ہم آئی گئے ہیں تو آپ ہم سے ایک وعدہ کیجیے۔ آپ ہمیں وہ جائز مقام دیں گے جس کے ہم حقدار ہیں۔“

”ہم سمجھتے ہیں؟“

”آپ ہم سے شادی کریں گے۔“

”ہم ظل الہی سے آپ کو نامک لیں گے۔“

”آپ کی دو شادیاں اور بھی ہیں۔“

”مطل شہزادے جس کو گھر میں ڈال لیتے ہیں پھر اسے طلاق نہیں دیتے۔“

”ہم بھی یہ نہیں چاہتے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ امور سلطنت میں آپ کا ہاتھ بنائیں ملکہ ہندوستان ہم ہوں۔“

”ایسا ہونا مشکل نہیں۔“ شہزادے نے کہا اور ایک مرتبہ پھر اسے اپنی طرف کھینچا چاہا۔ مہرالنسا نے پھر مزاحمت کی۔

”ہم آپ کے لیے ایک اور جام بناتے ہیں۔“

”آپ کا وجود خود ایک جام ہے۔ آپ بس ہمارے پہلو میں بیٹھی رہیں۔“

”صاحب عالم، ہم کوئی کیز نہیں جسے آپ یوں مسل کر پیٹ کر دیں۔ پہلے ہماری شرط پوری کیجیے۔“

”ہم آپ سے وعدہ کر چکے ہیں۔“

”ہم اس وعدے کی عملی صورت دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”ہمارے سامنے آج تک کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہوئی۔ یہ مٹاؤی محبت ہے کہ ہم اس انکار کو برداشت کر رہے ہیں۔“

”آپ کی اس محبت ہی نے ہمیں حوصلہ بخشا ہے۔“

”اگر آپ کے سینے میں ہمارا دل دھوکا رہا ہو تو خدا کی قسم آپ خود کو ہمارے حوالے کر چکی ہوتیں۔“

”ہم بھی اسی طرح بے تاب ہیں لیکن ہم عورت ہیں، کھلو نا نہیں۔“

”ہم نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ ہم آپ سے شادی کریں گے۔“

”ہم بھی آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم آپ کو وہ راحت بخشیں گے جو آپ کے شایان شان ہے لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔“

”مہر النساء اس وقت تک ہم زندہ نہیں رو سکیں گے۔“

”ہم آپ کی ساقی گری کے لیے آتے رہیں گے۔“

”آج سے ہم آپ کی محبت بھی لیں اور ساقی بھی۔“

”شہزادے نے آگے بڑھ کر مہر محبت جیت کر دی۔“

”اب ہمیں اجازت دیجیے۔“

”اس وعدے کے ساتھ کہ جب ہم بلائیں گے آپ کو آگاہ ہوگا۔“

”ہندی آپ کے حکم سے باہر نہیں ہے۔“

”شہزادہ بہت کچھ چاہتا تھا لیکن ہاتھ سوچ کر اسے جانے دیا۔“

”مہر النساء باہر نکلی تو وہی سبزی اس کی منتظر تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ ایسے کئی مناظر دیکھ چکی تھی۔ آج اس کی فہرست میں مہر النساء کا نام بھی شامل ہو گیا تھا۔“

”آئیے، میں آپ کو آپ کے محل تک چھوڑ دوں۔“

”آپ بہت تھک گئی ہوں گی۔“

”ہاں، ہم بہت تھک گئے ہیں۔ انکار کا نکتہ بہت بھاری ہے۔ ہم یہ بوجھ اٹھا کر رہے ہیں۔“

”آپ نے انکار کر دیا اور وہ بھی شہزادے کے روبرو۔“

”ہاں۔“

”کوئی اپنی قسمت کے دروازے خود بند کر لے تو کوئی کیسے کر سکتا ہے؟“

”کنیز نے کہا اور بے دلی سے اس کے ساتھ چلتی رہی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ مہر النساء کو انعام میں جو کچھ ملا ہوگا اس میں کچھ حصہ اس کا بھی ہوگا۔“

عورت اگر آسانی سے اپنے آپ کو پیش کر دے تو اس کی قدر و منزلت میں کمی آ جاتی ہے۔ وہ کم عمر ہونے کے باوجود اس نکتے کو جانتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شہزادے کو اسی طرح ترسائی رہے تاکہ اس کا شعلہ شوق سرد نہ پڑنے پائے اور وہ اس سے اپنی شرطیں منوانے لگی۔

دو دن نہیں گزرے تھے کہ شہزادے نے اسے پھر طلب کر لیا۔ اس مرتبہ بھی اداؤں کا حیا د چکا یا، ساقی گری کے منجھڑے دکھائے اور شہزادے کو ترسا کر وہیں آگئی لیکن اس مرتبہ شہزادے کے حیر بدلے ہوئے دیکھے۔ شہزادے تو اپنی شرطیں منوانے کے لیے مشہور تھا اور یہاں شرطیں ماننے کا مرحلہ درجش تھا۔ اس کا نتیجہ بھی ہی ملاقات میں ظاہر ہو گیا جب شہزادہ زبردستی پر اتر آیا۔ مہر النساء بھی پوری تیاری سے آئی تھی۔ اس نے چھپایا ہوا منجھڑا نکالا اور اپنی گردن پر رکھ لیا۔

”جب عورت بے عزت ہو جائے تو اس کا سر جانا ہی بہتر ہے کیونکہ عزت ہی کا نام عورت ہے۔ اگر آپ ایک قدم بھی آگے بڑھے تو یہ منجھڑی گردن کے پار ہوگا۔“

”شہزادہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔“

”مہر النساء آپ ہماری محبت ہیں۔“

”ہم بھی آپ کی امانت ہیں۔ اپنی امانت کو یوں رسوا نہ کیجیے۔“

”گردن سے منجھڑا اٹھائیے۔“

”پہلے وعدہ کیجیے۔“

”ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آپ سے شادی کریں گے۔“

”مہر النساء نے گردن سے منجھڑا ہٹا لیا۔ شہزادے نے اسے اپنی آغوش کی زینت بنا لیا لیکن اس مرتبہ اس حرکت میں ہوس نہیں شفقت تھی، چھٹاوا تھا۔

”ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ سے شادی کریں گے۔“

”شہزادے، میرے شہزادے؟“

اس ملاقات کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ شہزادہ اس کے ساتھ کھیل نہیں رہا ہے بلکہ وہ واقعی اس سے محبت کرتا ہے۔ اگر شادی کا سوال آیا تو وہ باپ کے خلاف سیدتان کر کھڑا ہو جائے گا۔ اس کی ذہانت نے اسے ایک عجیب راستہ دکھایا۔ وہ جیسے بھی تھی دیے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ قلعے میں رہ کر جوتوڑ کے جتنے طریقے سکھے تھے اسے آزمانے کا موقع آ گیا تھا۔ وہ تیار ہوئی اور شاہی زنان خانے میں چندالی کے پاس پہنچ گئی۔ جس راستے پر اسے چلنا تھا، چندالی اس کی

بہترین رفیق ثابت ہو سکتی تھی۔ حروف کی بنی ہوئی تھی۔ چغل خوری میں مشہور تھی۔ ادھر سے ادھر بات پہنچانے میں مانی نہیں رکھتی تھی۔ بیگمات اس کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتیں۔ مہر النساء کو ایسے ہی کارندے کی ضرورت تھی۔

وہ چندالی کو ساتھ لے کر پائیں باغ میں آگئی۔ چندالی بھی حیران تھی کہ مہر النساء تو اس کے نام سے بھاگتی تھی، یہ آج اسے مجھ پر اتار پیا کیوں اتر آیا ہے؟

”کچ کہہ مہر النساء، آج بات کیا ہے۔ ہمیں تو یہاں کیوں لائی ہے؟“

”اگر وعدہ کر کہ کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی تو ہم ایک راز کی بات تمہیں بتائیں۔“

”مجھے تو یاد نہیں کہ میں نے کبھی کسی کی بات کسی کے آگے کی ہو جبکہ یہ بھی کہہ دیا جائے کہ یہ بات کسی کو بتانا نہیں۔“

”نہیں پہلے وعدہ کرو۔“

”اچھا بھائی وعدہ کیا۔ کوئی پوچھے گا بھی تو نہیں بتائیں گے۔ جو کہنا ہے وہ کہہ بھی چکو۔“

”کیسے بتائیں چندالی۔ شرم دامن گیر ہے۔ شہزادہ سلیم نے ہم سے دست دراز کی کو شش کی ہے۔“

”اس میں غاراش ہونے کی کون سی بات ہے۔ ان کا تو تیرا ہی ہے بلکہ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ اتنا کچھ دین گے کہ تمہارا گھر بھر جائے گا۔“

”چندالی، پھر ہم میں اور ایک ہاندی میں فرق کیا رہ جائے گا؟“

”فرق تو رہے گا۔“ چندالی نے کہا۔ ”تمہیں کچھ زیادہ انعام ملے گا۔“

”چندالی۔“ مہر النساء نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ ”ہماری جان پر بن گئی ہے اور تمہیں مذاق کی سوجھ بوجھ ہے۔“

”ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اس سے پہلے کہ شہزادہ انتقام پر اتر آئے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دو۔ شہزادے کا انتقام ہم سے نہیں مرزا غیاث بیگ سے لیا جائے گا۔“

”مجھ سے نہیں ہوگا۔“

”پھر جو ہوگا اس کے لیے تیار ہو۔“

”اگر شہزادے کی والدہ سے شکایت کی جائے؟“

”قلعے میں رہ کر تمہیں یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ یہاں کوئی کسی کی والدہ نہیں۔ قلعے کے تمام معاملات ولی مہد کے ہاتھ میں ہیں مگر بادشاہ سلامت انجام دیتے ہیں۔ اپنی

رسوائی کے سوا تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔“

”رسوائی کا انتخاب خیار ہے تو تم بھی کسی سے کچھ نہ کہنا۔“

”میری طرف سے بے فکر رہو۔“

وہ بے فکر ہونے کے لیے نہیں آئی تھی۔ وہ تو آئی ہی اس لیے تھی کہ یہ بات چندالی تک پہنچ جائے اور پھر اس کے چرے عام ہو جائیں۔ یہ ماجرا بادشاہ کے کانوں تک بھی پہنچ جائے۔ پھر وہ شہزادے کو خود بلائیں گے اور اس پر شادی کے لیے زور دیں گے۔

اس کا خیال لگا نہیں تھا۔ چندالی اس سے رخصت ہوتے ہی شہزادے کی ماں مریم زبانی حکم کے پاس پہنچی اور پھر مختلف بیگمات کو یہ قصہ نمک مرچ لگا کر سنائی رہی۔ صرف ایک دن گزر رہا تھا کہ یہ چرچا عام ہو گیا۔

اڑتی ہی بیگم مہر النساء کی والدہ کے کانوں تک بھی پہنچی۔ بات رسوائی کی بھی تھی اور تشویش کی بھی۔ انہوں نے مہر النساء سے پوچھا۔ مہر النساء انکار نہیں کر سکتی تھی۔ سراپا اقرار بن گئی۔

”صاحب عالم نے ہم سے زبردستی کرنا چاہی تھی۔ ہم نے ان کے سامنے یہ شرط رکھ دی کہ وہ ہم سے شادی کریں تاکہ جب وہ بادشاہ بن جائیں تو ہم ملکہ ہندوستان کہلائیں۔ اب جان کو بھی یہ بات بتا دیجیے کہ ہم نے ان کی عزت پر آج نہیں آنے دی ہے۔“

”تمہارا انکار اپنی جگہ لیکن رسوائی تو ہو گئی۔“

”اس رسوائی میں ہی میری حیات ہے بلکہ یہ موقع میں نے ہی فراہم کیا ہے تاکہ بادشاہ تک یہ بات پہنچ جائے۔“

”بادشاہ کیا تمہیں سونے کا تاج پہنا دے گا؟“

”آپ دیکھتی رہیے۔ بادشاہ سلامت آپ کو بلا کر کہیں گے کہ آپ مہر النساء کی شادی شہزادہ سلیم سے کر دیں۔“

بعض اوقات زیادہ خود اعتمادی اور ذہانت بھی آدمی کو مصیبت میں ڈال دیتی ہے۔ یہی کچھ مہر النساء کے ساتھ بھی ہوا۔

بادشاہ کے مصاحبوں نے یہ خبر جو بھی بادشاہ تک پہنچائی اس نے تصدیق کے لیے شہزادے کو طلب کر لیا۔

”یہ ہم کیا سن رہے ہیں شیخو۔“

”تمس بارے میں قفل بھائی؟“

”تم نے مرزا غیاث کی بیٹی مہر النساء کو اپنی غلطی میں طلب کیا تھا؟“

”صرف اس لیے کہ ہم ان سے محبت کرتے ہیں۔“

دو گے؟ نادان دوستوں کے کہنے میں مت آؤ۔ اس سے پہلے کہ باپ کو خبر ہو واپس لوٹ جاؤ۔ جس ہم پر چھیں بھیا گیا ہے اسے انجام دو۔ باپ کی خوشنودی میں تمہاری دنیا بھی ہے اور آخرت بھی۔

شہزادہ شرمندہ تو بہت ہوا لیکن اپنے ارادے سے باز نہیں آیا۔ خاص خاص آدمیوں کے ساتھ کسی میں سوار ہوا اور دریائے سندھ کے کنارے گیا۔ اس کا لشکر لشکر کے راستے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

الہ آباد پہنچنے کے بعد اس نے یہ جہازت کی کہ شاہی قلعے اپنی سرکار کے آدمیوں میں ترقی، اضافہ اور خطاب دے کر تقسیم کر دیے اور ہر جگہ اپنے حکام مقرر کر کے خود مختار بن گیا۔ بادشاہی خزانے میں نقد میں لاکھ روپے تھے جسے وہ اپنے تصرف میں لے آیا۔

اس خبر کو سن کر لشکر کا ہنگ بکنے میں دیر نہیں لگی کہ سلیم نے بغاوت کر دی ہے۔ سلیم سے بادشاہ کی محبت نے یہاں بھی اس کے قدم پڑ لیے۔ مشورے تو یہ دل رہے تھے کہ شہزادے کے خلاف سخت قدم اٹھایا جائے لیکن اس نے کسی مشورے کو قابل عمل نہیں سمجھا۔ اسے رنج ضرور تھا لیکن پیرانہ شفقت نے جلال شاہی کو روک لیا۔ اس نے نہایت مختصراً فرما کر لکھا اور قاصد کے حوالے کر دیا۔ نہانی بھی محبت آئینہ کھاتے کہے اور شہزادے کو پیغام بھجوایا کہ وہ اس کی خدمت میں حاضر ہو جائے تاکہ مفیدوں کو شر انگیزی کا موقع نہ مل سکے۔

شہزادے سے یہ حرکت سرزد ہوئی کہ اس پیغام کا جواب بھجوانے یا باپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے بجائے قاصد کو اپنے پاس روک لیا۔

شہزادے کے اس فعل سے اکبر کو معائنے کی نزاکت کا احساس ہوا۔ دکن کی مہم قریب آگئی تھی اور یہ امید تھی کہ بہت جلد جیش شہر اور قلعے اس کے قبضے میں آجائیں گے۔ اس نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ شیخ ابوالفضل کو برہان پور میں منتھیں کر کے آگرہ کی طرف کوچ کر لیا۔

شہزادے کو جب اطلاع ملی کہ بادشاہ نے آگرہ کی طرف کوچ کر دیا ہے تو اس نے بھی زیادہ سے زیادہ فوج جمع کرنی شروع کر دی۔ جتنی دیر میں اکبر آگرہ پہنچتا، اس نے بھی تیس چالیس ہزار فوج اور جنگی ساز و سامان کے ساتھ کوچ کر دیا۔ منزلوں پر منزلیں مارتے ہوئے انارک کے قریب پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ مشہور ہے کہ شہزادہ کو وہاں سے ملاقات کے لیے جا رہا ہے لیکن اتنا بڑا لشکر صاف بتا رہا تھا کہ اس کے مقاصد کیا ہیں۔

جب سے شہزادہ الہ آباد سے روانہ ہوا تھا اکبر کو اس کے کوچ کی خبریں برابر مل رہی تھیں۔ جن امیروں کی جاگیروں پر شہزادے نے قبضہ کیا تھا ان کی فریادیں برابر بادشاہ کے حضور پہنچ رہی تھیں۔ یہ سب بڑی نا فرمانی تھی کہ جو جاگیریں بادشاہ نے عطا کی تھیں، شہزادہ انہیں چھینتا چلا آ رہا تھا۔

جب یہ فریادیں حد سے بڑھ گئیں تو بادشاہ کو بھی تشویش ہوئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر شہزادے کے نام فرمان لکھا۔

”اپنے فرزند کے دیدار کا اشتیاق حد سے زیادہ ہے لیکن اس شان و شکوہ کے ساتھ اس کا آنا ہمارے عبت پھرے دل پر شاق گذر رہا ہے۔ اگر اس کا مطلب اظہار وکیل اور لشکر کا مظاہرہ ہے تو یہ بات تو بخوبی ظاہر ہو چکی۔ اب بہتر یہ ہے کہ اس بھڑے باز کو ہٹاؤ۔ لوگوں کو ان کی جاگیروں پر رخصت کر دو اور مقررہ طریقے پر جریدہ پہنچ کر باپ کی آنکھوں کو کھنڈا کر دو اور اگر بدخواہوں کی ہرزہ سرائی سے تم کسی دوسرے اور اندیشے میں گرفتار تو نہیں کرو، ہمارے دل میں تمہاری طرف سے کوئی میل نہیں ہے، تم الہ آباد واپس چلے جاؤ۔ جس وقت تمہارے دل سے یہ وہم نکل جائے خدمت میں حاضر ہو جانا۔“

وہ جب کس کس میں کا شکار تھا۔ ایک طرف مہرالنسا کی محبت تھی جو اسے باپ کے خلاف اکسار دیتی تھی۔ اس کی محبت پہنچ پہنچ کر کہہ رہی تھی کہ اس کے باپ نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ مہرالنسا اس کی آرزو تھی جسے اس کے باپ نے پورا نہیں ہونے دیا۔ اسے ایک معمولی آدمی کے حوالے کر دیا گیا۔ ہم اسے چھین نہیں سکتے لیکن اپنے باپ کو یہ بتا سکتے ہیں کہ ہم مہرالنسا کے لیے اپنی جانیں کوئی شکر اکتے ہیں۔ مہرالنسا نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ ایک طرف یہ خیالات تھے، دوسری جانب باپ کی شفقت تھی جو اس کی نا فرمانیوں کو برداشت کیے جا رہی تھی۔ اس موقع پر بھی وہ باپ کے حکم کو نال نہیں سکا۔ پیش قدمی کی جرأت نہ کر سکا۔ کچھ دن اور وہی میں ضمیر بار بار پھر آگرہ جانے کے بجائے الہ آباد کی طرف کوچ کر گیا۔

اس کے واپس ہوتے ہی اکبر نے ازراہ شفقت صوبے بنگال اور اڑیسہ کو شہزادے کی جاگیر میں شامل کرنے کا فرمان جاری کر دیا۔ یہ حکم بھی دیا کہ تم اپنے آدمیوں کو ہر جگہ متعین کر کے خاطر جمع کے ساتھ ملک کے نظم و نسق میں مصروف

شہزادے نے اس عنایت پر شرمگزارگی کا اظہار ضرور کیا لیکن اپنے آدمیوں کی نصیحتی کو قبول نہیں کیا کیونکہ وہ اپنے سرداروں کو خود سے جدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ان سرداروں کو بھیجے کا مطلب یہ تھا کہ وہ ان کے ماتحت جمیوں سے بھی محروم ہو جائیں۔ اس کا دل بادشاہ کی طرف سے صاف نہیں تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اسے ایکل کرنے کے لیے اس کے گرد جال تو نہیں پھیلا جا رہا ہے۔ اس کا فشر جب جھٹکنے لگا تو وہ اسی طرح کی باتیں کرنے لگا تھا۔

”جو باپ ہماری مہرالنسا کو ہم سے چھین سکتا ہے وہ ہماری طاقت بھی ہم سے چھین سکتا ہے۔ ہم نے پہلی مرتبہ محسوس کیا تھا کہ ہم کسی سے محبت کرتے ہیں لیکن غل اٹھانے اس کی پروا نہیں کی۔ جب ہم چھین سے نہیں تو انہیں بھی چھین سے کیوں رہنے دیں۔ وہ چاہتے ہیں ہم اکیلے ہو جائیں لیکن ہمارے سردار اور ہماری فوج ہمارے ساتھ رہے گی۔ قل اٹھانے اپنے بچپنا سے کوئی بات کا نام دے رہے ہیں۔ اب انہیں بچکتا رہنا پڑے گا۔“

اس کی یہ باتیں راز نہیں رہ سکتی تھیں، نہ وہ انہیں راز رکھتا تھا۔ شراب کی کھلونوں میں یہ باتیں اس سے احتیاطی سے بلند ہوتیں کہ انہیں الہ آباد سے باہر پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ اس کے سردار اس کی آواز میں آواز ملاتے۔ بادشاہ کو اب خود احساس ہونے لگا تھا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے لیکن کھلونے ٹوٹ چکا تھا۔ بچے چل رہا تھا۔ اسے وہی کھلونے چاہیے تھا لیکن کھلونے اس بری طرح ٹوٹا تھا کہ اب جوڑائیں جا سکتا تھا۔ ایک طرف بادشاہ کی ضد تھی، دوسری جانب شہزادے کی اتنا جتنا وقت گزرتا جا رہا تھا کوئی نہ کوئی واقعہ غلطی میں اسانے کا سبب بن رہا تھا۔

اکبر جب دکن سے آگرہ واپس آیا تو شیخ ابوالفضل کو برہان پور میں چھوڑ آیا تھا۔ اب شہزادہ سلیم کے جاسوسوں نے خبر دی کہ ابوالفضل بادشاہ کے طلب کرنے پر دار الحکومت واپس جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ شہزادے کے دل میں یہ خیال پہلے ہی سے موجود تھا کہ شیخ ابوالفضل اور شیخ مبارک جیسے لوگوں نے بادشاہ کو بے راہ روی کا شکار کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ بادشاہ نے ”دین الہی“ کے نام سے نیا مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اکبر کو خوش کرنے کے لیے درباری امرا بھی سہا دین ہو گئے تھے۔ شہزادہ اکبر کے دین الہی سے ناخوش تھا اور اس کا ذمہ دار شیخ ابوالفضل کو سمجھتا تھا۔ اب جو اس کے دار الحکومت کی طرف جانے کی خبریں تو ضرور یہ سمجھا کر کہ ”بادشاہ تک پہنچ گیا تو اس کے خلاف ریشہ دانیوں سے باز

نہیں آئے گا۔ بادشاہ پر اس کا اتنا اثر ہے کہ وہ اس کی باتوں میں آکر شہزادے کے خلاف ضرور کوئی کارروائی کرے گا۔ اس نے ایک درویش کی فیصلہ کیا اور راجا ترنگ راؤ کو اپنے حضور طلب کر لیا۔

”میرے باپ کو بھانے والوں میں شیخ ابوالفضل سرفہرست ہے۔ اس شخص کی وجہ سے مملکت کا نظام درہم برہم ہو رہا ہے۔ اب یہ میرے خلاف سازشوں کا پیشارہ ہے کہ دار الحکومت جا رہا ہے۔ موقع اچھا ہے، اسے بادشاہ تک نہیں پہنچنا چاہیے۔ تم اس کے گواہیاں دینے سے پہلے وہاں پہنچ جاؤ اور راستے ہی میں اسے روک کر اچانک حملہ کر دو اور اس کا کام تمام کر دو۔“

راجا ترنگ راؤ نے اثبات میں گردن ہلائی۔ شیخ ابوالفضل سے اس کی پرانی دشمنی تھی اور اب اسے انتقام لینے کا بہترین موقع مل رہا تھا۔ اس نے اپنے وطن جانے کا بہانہ کیا اور شہزادے سے رخصت ہو کر حسب الحکم گوالیار پہنچ گیا اور شیخ ابوالفضل کا انتظار کرنے لگا۔

شیخ ابوالفضل ایک چھوٹی سی جمیعت کے ساتھ گوالیار کے قریب پہنچا تھا کہ راجا کے آدمیوں نے، جو کھاتے لگے بیٹھے تھے، حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ شیخ ابوالفضل کو فرار کا موقع بھی نہ مل سکا۔ موٹے پر ہی اس کا کام تمام ہو گیا۔

اس سانحے کی اطلاع اکبر کو ملی تو شاید سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ کل شہزادہ سلیم کے حکم پر ہوا ہے۔ سانحہ ایسا تھا کہ اکبر کا بیٹا نہ مہر لیز ہو جاتا چاہے تھا لیکن شہزادے کی خوش قسمتی کہ جس وقت یہ اطلاع پہنچی، بادشاہ اپنی والدہ عہدہ سلیم کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ اطلاع ملنے ہی کر اس کی گردن دار آواز سے گونج اٹھا۔

”گستاخ سلیم نے جلال اکبری کو آواز دی ہے۔ اس نے ہماری زری کا قلعہ فائدہ اٹھایا ہے۔ ہم اپنی فوجوں کو حکم دیں گے کہ وہ سلیم کا سر تار کر ہماری خدمت میں پیش کریں۔“

”بیٹا، کیا میں نے اپنے پوتے کو اسی دن کے لیے گودوں میں کھلایا تھا کہ وہ جو ان کو اس کا باپ اسے قتل کرنے کی باتیں کرے؟“

”آپ دیکھ رہی ہیں کہ اس نے کیسی مذموم حرکت کی ہے۔“

”بے شک اذہ منہ قتل کا مرتکب ہوا ہے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ قتل اس کے حکم سے نہ ہوا ہو۔ دونوں حالتوں

میں میرے سلیم اور ابو الفضل کا کوئی مقابلہ نہیں۔
 ”اکبر کے عدل کا تقاضا ہے کہ ہم قاتل کو سزا دیں۔“
 ”ہم سلیم کی طرف سے خوبی بہا دینے کو تیار ہیں۔“
 ”ہمارے امرا اسی طرح قتل ہوتے رہے تو ہماری
 دولت کا چناؤ کھل جائے گا۔“
 ”سلیم ابھی بچہ ہے۔ مقصدوں کے درمیان گھرا ہوا
 ہے۔ اسے پیار سے سمجھایا جاسکتا ہے۔ ہم خود اس کے پاس
 جا کر اس کے اور اسے سمجھائیں گے۔“
 ”اب وہ سمجھانے کی حدود سے باہر نکل چکا ہے۔ ہم
 نے اس پر رعایت کی بارش کر دی اور اس نے یہ صلہ دیا۔“
 ”تم ہم تمہاری ماں ہونے کی حیثیت سے کہیں حکم دیتے
 ہیں کہ شہزادے سے ہماری ملاقات کا بندوبست کیا جائے۔“
 اکبر کا غصہ بھانگ کی طرح بیٹھ گیا۔ گردن جھکا کر ماں
 کے پاس سے اٹھ آیا اور شہزادے کی سوتیلی والدہ سلیمہ
 سلطان بیگم کے گل میں پہنچا۔ یہ خاتون دانائی اور سخن سنجی میں
 بے مثل تھیں۔ اکبر اکثر اوقات ان سے مشورے لیا کرتا تھا۔
 اس وقت غصے میں بھرا ہوا ہوتا تھا ہی، شہزادے کو
 غائبانہ خوب سخت سنا نہیں۔ والدہ سے ہونے والی گفتگو
 بھی دہرا دی۔
 ”مریم مکانی درست فرماتی ہیں۔ جوانی کا غصہ انھوں
 کی شہنہ ہی سے ٹھنڈا ہو سکتا ہے۔ عشق کی ناکامی کسی بھی بڑے
 طوفان کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ وہ مہرالنسا کو نہیں بھول سکا
 ہے۔ ہم اسے اس کا اچھا برا سمجھائیں گے۔“
 ”کیا مصیبت ہے۔ ہر ایک کے سر پر مہرالنسا کیوں
 سوار ہو گئی ہے؟“
 ”اس لیے کہ وہ شہزادے کی جوانی کی بھول ہے۔
 سرکش طوفانوں کے رخ تلواروں سے نہیں موڑے جاتے،
 ماں کے لیے تدبیر سے کام لیا جاتا ہے۔“
 ”تدبیر تو ہم نے بھی کی تھی۔ مہرالنسا کی شادی کر دی
 گئی ہے۔“
 ”وہ تدبیر نہیں لگتی تھی۔ ہم نے اس وقت بھی آپ کو
 روکتا پایا تھا۔ اس کی شادی ہو جانے کے بعد سلیم کی محبت،
 خد میں بدل گئی ہے۔ وہ ہندی بیچ کی طرح ہر چیز کو توڑ پھوڑ
 دینا چاہتا ہے۔ مریم مکانی بیگم کے مہراہ میں بھی سلیم کے پاس
 جاؤں گی اور اسے سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ بچہ جب
 روتے روتے تھک جاتا ہے تو چاہتا ہے کہ کوئی اسے چپ
 کرے۔ یہی حال اس وقت سلیم کا ہے۔“
 یہ دونوں خواتین آگرہ پہنچیں تو شہزادے نے پہلی

طرح خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔ ان میں سے ایک
 وادی تھیں اور ایک والدہ۔ شہزادے پر استقبال فرض تھا
 لیکن جس کیفیت سے وہ گزر رہا تھا اس کی روشنی میں یہ
 استقبال ان دونوں خواتین کے لیے حوصلہ افزا تھا۔
 جب شہزادہ خاطر مدارات سے فارغ ہو چکا تو وادی
 نے آغاز کلام کیا۔
 ”بیٹا، تم نے جو روش اختیار کی ہے وہ تمہارے باپ
 کے دل کو بہت رنج پہنچا رہی ہے۔“
 ”انہیں یہ دکھ ہو رہا ہوگا کہ میں ان کی دسرس سے باہر
 کیوں ہوں؟“
 ”تم نے ایک عورت کی خاطر اپنے باپ کی طرف
 سے بدگمانیاں پیدا کر لی ہیں۔“
 ”ہم آپ سے پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ مہرالنسا صرف
 ایک عورت نہیں، ہماری محبت تھی۔“
 ”مغل شہزادوں کو زیب نہیں دیتا کہ اپنی محبت کے
 لیے ملک کا سکون غارت کر دیں۔ باپ بیٹوں میں اختلاف کا
 فائدہ اٹھا کر شورش پند سر اٹھا رہے ہیں۔“
 ”یہ شورش ہم نے پیدا نہیں کی۔ ہم تو ابا حضور سے
 ملاقات کا ارادہ کر چکے تھے۔ ابا وہ تک پہنچ گئے تھے لیکن
 انہوں نے ملاقات کا موقع نہیں دیا۔ ہمیں گھر پہنچا کہ ہم الہ
 آباد پہلے جا سکیں۔ وہ خود نہیں چاہتے کہ ہم ان کے قریب
 رہیں۔“
 ”تم پالیس ہزار کے لشکر کے ساتھ آئے تھے۔ اس
 سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ تم جنگ کے ارادے سے آئے
 ہو۔“
 ”ہم اگر چاہا بھی تو خوف و امن گیر ہے کہ ہمیں قید
 کر لیا جائے گا۔“
 ”میں تمہاری وادی ہوں اور یہ تمہاری والدہ۔ ہم
 دونوں تمہاری حفاظت کی ذمہ داری لیتے ہیں۔ تم ہمارے
 ساتھ چلو۔“
 ”ابا حضور کو کون سمجھائے گا کہ وہ ہمیں اپنا دشمن سمجھتا
 چھوڑ دیں؟ وہ تو شیر افکن چیسے لوگوں کو عزیز رکھنے کے عادی
 ہیں۔“
 ”وہ ایک مصلحت تھی کہ شیر افکن کی شادی مہرالنسا سے
 ہو گئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہو گیا کہ شیر افکن کی قدر و قیمت
 بادشاہ کی نظر میں تم سے زیادہ بڑھ گئی۔ بادشاہ بچنے کے بعد
 چنگیزی قانون کے مطابق تم مہرالنسا کو طلب کر سکتے ہو لیکن تم
 جس راستے پر چل رہے ہو تمہارا بادشاہ بننا محال ہے۔ میں تو

یہی کہوں گی کہ باپ سے مصالحت کر لو۔ جب بادشاہ بن جاؤ
 تو جونی چاہے کرنا۔“
 شہزادہ تو یہ سمجھ رہا تھا کہ ابوالفضل کے قتل کے بارے
 میں اس سے باز پرس کی جائے گی لیکن اس ساری گفتگو میں
 اس کی کاتھیں ذکر نہیں آیا۔ یہ شہزادے کے لیے اطمینان کا
 باعث تھا۔ پھر دونوں خواتین نے اس کی حفاظت کی ذمہ
 داری قبول کی اور شہزادہ آگرہ واپسی کے لیے تیار ہو گیا۔
 ان وعدوں کے بعد دونوں خواتین واپس آ گئیں۔
 اب دیکھنا یہ تھا کہ شہزادہ آگرہ کی طرف کوچ کرتا ہے یا
 نہیں؟ ایک دن خبر ملی کہ شہزادے نے کوچ کر دیا ہے۔ جب
 شہزادے کی سواری دارالخلافہ سے ایک منزل دور رہ گئی تو
 مریم مکانی خود اس کے استقبال کے لیے نکلیں اور نہایت
 اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے گھر لے آ گئیں۔ عرصہ دراز کے
 بعد اکبر اور فرزند اکبر ایک ہی شہر میں تھے لیکن اس حال میں
 کہ باپ کی آنکھیں ابھی بیٹے کے دیدار سے روشن نہیں
 ہونے پائی تھیں۔ پہلے یہ سوچا گیا کہ سلیم، اکبر سے ملاقات
 کے لیے جائے لیکن مریم مکانی کا تجربہ اور دانائی معاملے کی
 تھک بھٹی گئی۔
 ”اگر شہزادہ ملاقات کے لیے خود گیا تو یہ کوئی نئی بات
 نہیں ہوگی۔ بیٹے باپ سے ملنے جایا ہی کرتے ہیں اگر باپ
 اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے آئے تو اس سے ظاہر ہوگا کہ
 باپ کا دل صاف ہے بلکہ اسے اپنے سابقہ فیصلے پر عداوت
 بھی ہے۔“
 چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ اکبر خود اس سے ملنے آئے گا تو
 شہزادے کے دل میں زیادہ جگہ بنے گی اور شرمندگی کا
 احساس بھی ہوگا۔
 باادب باحلا خط کی صدا بھی بلند ہو گئی تو شہزادہ اٹھ کر
 کھڑا ہو گیا۔ چٹنی ریش میں وہ کھینچنے کی کوشش کرتا، اکبر اس کے
 سامنے تھا۔ پیرانہ شفقت نے جوش مارا۔ اکبر نے اپنے بازو
 پھیلا دیے۔ شہزادے نے عقیم میں اپنا سر بادشاہ کے
 قدموں میں جھکا دیا۔ بادشاہ نے اسے سینے سے لگا لیا۔
 ”جان پدر! اپنے باپ کو معاف نہیں کرو گے؟“
 ”غل ای! انصاور تو ہم ہیں۔ معافی تو ہم آپ سے
 طلب کرتے ہیں۔ داد بخشی میں ہم نے آپ کا بہت دل
 دکھایا ہے۔“
 ”ہم نے جو کچھ کیا تمہاری اور مملکت کی بہتری کے
 لیے کیا۔ لیکن ہے ہمارے فیصلے غلط ہوں۔“
 ”آپ ہمیں شرمندہ نہ کریں۔“

حصول واستعمال دولت

ہیڈوز آزدادی ہے، افلاس لغای ہے مثل مشہور ہے
 کہ غالی تھیلا سید عاکھو انش ہو سکتا۔
 امیر چاہتا ہے کہ غریب وطم سے تمام دنیا کی
 دولت بیٹے کے لیے سمیٹ کر چھوڑ جائے اور بیٹا خطر ہے کہ
 کب باپ وفات پائے اور وہ مال و دولت پر قبضہ نہ کرے۔
 ہیڈوز امیروں کا یہ خیال کہ غریب مسرت و شادمانی
 سے مالا مال ہیں اتنا ہی احمقانہ ہے جتنا غریبوں کا یقین کہ
 امیر خوش ہیں۔
 ہیڈوز دولت مند بیوہ کے آنسو بہت جلد خشک
 ہو جاتے ہیں اور اس کا نصف سہاگ قاتل رہتا ہے۔
 ہیڈوز دولت ہونے سے آدمی اپنے آپ کو بھول جاتا
 ہے اور دولت نہ ہونے سے لوگ اس کو بھول جاتے ہیں۔
 ہیڈوز دولت مند مغفلوں کو کھاتے ہیں اور دولت
 مندوں کو شیطان کھاتے ہیں، اس طرح دونوں کھائے
 جاتے ہیں۔
 ہیڈوز دولت خوش گفتگو ہوتی ہے تو کوئی قطع کلائی
 نہیں کرتا۔

مصنف

کائنات کا سب سے پہلا اور بڑا مصنف اللہ تعالیٰ ہے
 اس کی شہرہ آفاق کتاب قرآن مجید ہے یہ واحد مصنف ہے جس
 کا جتنی بھی کبیری کتاب جیسی کوئی کتاب لکھ سکتا۔

مرسلہ مہالایمان، حافظہ آباد

شہزادے نے خزانے میں ہزار مہریں اور سات
 اچھی پیش کیے۔ اکبر نے بھی بیٹے کو ہانسی دیا اور طرح طرح
 کے جواہرات اور مرغ صمان عطا فرمایا۔ اپنی چھڑی سر سے
 اتار کر بیٹے کے سر پر رکھ دی، دوبارہ مستقل ولی عہدی دینے کا
 اعلان کر دیا اور اشار دیا نے بھانے کا حکم دیا۔
 ملاقات کا یہ جشن سات روز تک جاری رہا۔ پورا آگرہ
 جھمک رہا تھا۔ حاجت مندوں کی حاجتیں پوری ہوئی تھیں۔
 امر اور سرداروں کو نئے نئے خطابات سے نوازا جاتا رہا۔
 اس جشن کے گزر جانے کے بعد اکبر کو ہم کام کا خیال
 آیا جسے شہزادہ اور چھوڑ کر الہ آباد کی طرف روانہ ہو گیا
 تھا۔ ایک مرتبہ پھر شہزادے کو راجہ کی ہم پر مامور کر کے نامور
 امرا کی ایک جماعت کے ساتھ رخصت کیا۔

سازشوں کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ باپ بیٹوں میں اتفاق ہو جائے؟ انہوں نے شہزادے کے رخصت ہوتے ہی سازشوں کے حال پچھلے شروع کر دیے۔

سلیم نے پہلا پڑاؤ آج پور (سیکری) میں رکھا تاکہ غزا اور لشکر جس کی منظوری دی جا چکی تھی وہاں پہنچ جائے۔ شاہی کارندوں نے جان بوجھ کر غفلت دکھائی۔ ساز و سامان کے پہنچنے میں تاخیر ہوئی۔ دن پر دن گزرتے جا رہے تھے۔ شہزادہ اس سازش کو سمجھ رہا تھا۔ بادشاہ کی طرف سے اس کے دل میں پھر بدگمانی پیدا ہونے لگی۔ اس نے اسے اپنی توہین سمجھا کہ وہ یہاں پڑا ہوا ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔

اس نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا۔
”آخر اس بندے کا قصور کیا ہے کہ سرکاری دفتری اور گماشتے ضروری ساز و سامان کے مہیا کرنے میں غیر ضروری سستی کر رہے ہیں؟ میری سبکی ہو رہی ہے اور سخن طرازیوں کو دراندازیوں کا موقع مل رہا ہے۔

روپے کے بغیر اور لشکر و توپ خانے کے خاطر خواہ انتظام کے بغیر یہ مہم سرانجام نہیں پاسکتی۔ ان انتظامات کے لیے بار بار منت سماجت کرنے سے آپ کو بھی ملال ہوگا اور میری بھی فحش ہوگی۔ اس لیے حضور مجھے کچھ عرصے کے لیے جاگیر پر جانے کی اجازت دے دیں تاکہ وہاں جا کر لڑائی کی خاطر خواہ تیاری کر لوں۔“

اس عرضداشت پر بادشاہ نے شہزادے کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ مجبور ہو کر بادشاہ نے اسے الہ آباد جانے کی اجازت دے دی۔

الہ آباد میں اسے روکنے اور دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایسے خوشامدنی اور موقع پرست مہیا ہو گئے تھے جو اسے ہر وقت شراب اور افیون میں غرق کئے رکھتے تھے۔ اس فتنے بازی میں اس سے عجیب و غریب حرصیں سرزد ہو جانے لگی تھیں۔ بادشاہ تک یہ اطلاع پہنچ چکی تھی لیکن وہ اپنی محبت سے مجبور تھا۔ جسے تھانف پہنچ کر شہزادے کو خوش کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ اس نرمی نے شہزادے کو بے خوف کر دیا تھا۔

☆☆☆

ایک خوبصورت لڑکا شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوا اور ملازمت کا خواہشکار ہوا۔ یہ لڑکا صرف خوبصورت ہی نہیں بلکہ ذہن انداز بھی تھا اور لسانی ادائیں بھی رکھتا تھا۔ شہزادہ اسے دیکھتے ہی اس کی قابلیت سے زیادہ اس کے حسن

و جمال پر فریفتہ ہوا اور اسے اپنی ملازمت میں رکھ لیا۔ اس نے بھی دولت کے لالچ میں شہزادے کو جھانٹا شروع کر دیا۔ حالت یہ ہو گئی کہ وہ ہر وقت شہزادے کے ساتھ رہنے لگا۔ کچھ دنوں کے لیے شہزادے کو کچھ بھول گیا تھا۔ وہ لڑکا شہزادے کی ساقی گری کے فرائض انجام دیتے لگا۔ اس کے چہرے پر سبزے کا آقا، بڑی بڑی دھنیں شانوں پر بھینکی ہوئی دکر کا لونچ، پاتوں کی مٹھاس۔ یہ سب ایسی چیزیں تھیں جنہیں شہزادہ نظر انداز کر دیتا۔ لوگوں میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہو رہی تھیں لیکن شہزادے کو کسی کی پروا نہیں تھی۔

کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ اس لڑکے کا ایک اور عاشق پیدا ہو گیا۔ یہ شہزادے کا ایک واقعہ نکرتا تھا۔ وہ لڑکا بھی ایسا برہان تھا کہ شہزادے کے ساتھ ساتھ اس واقعہ نکار کا دل بھی خوش کرنے لگا۔ شہزادے کے امیروں کی نظروں سے یہ باتیں چھپی نہیں رہیں۔ اس لڑکے کی شکایتیں شہزادے تک پہنچنے لگیں۔ واقعہ نکار کو بھی معلوم ہو گیا کہ رقابت کا کھیل شروع ہو گیا ہے۔ معاملہ کھل چکا ہے۔ کسی نہ کسی دن دردناک سزا مل کر رہے گی۔ اس نے اس لڑکے کو ایسے سبز باغ دکھائے اور سزا سے ایسا ڈرایا کہ وہ اس کے ساتھ دن بھاگ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

”وہاں شہزادہ دانیال ہے۔ وہ ہمیں پناہ دے گا، خوب پیش کریں گے۔“

”ہمیں فرار ہونے کا موقع مل جائے گا؟“ لڑکے نے کہا۔

”ابھی تو مل جائے گا لیکن اگر کچھ اور وقت گزرا تو شہزادہ ہوشیار ہو جائے گا۔“

”شہزادے نے اب بھی کوئی نہ کوئی انتظام کیا ہوگا کیونکہ وہ مجھ پر بری طرح مرہن ہے۔ آسانی سے نہیں جانے دے گا۔“

”میں تمام خفیہ راستوں سے واقف ہوں۔ کچھ لوگ میری مدد کرنے والے بھی موجود ہیں۔ تم فکر مت کرو۔“ وہ لڑکا باتوں میں آ گیا اور وہ واقعہ نکار کے ساتھ وکن کی طرف بھاگ گیا۔

ان کے فرار ہوتے ہی شہزادے کو خبر مل گئی۔ شہزادے نے ان دونوں کو گرفتار کر کے لانے کے لیے آدمیوں کو مقرر کر دیا۔

ابھی یہ دونوں چار پانچ منزل ہی گئے ہوں گے کہ شامت اقبال نے گھبرایا۔ شہزادے کے آدمی پہنچ گئے اور

دونوں کو گرفتار کر کے لے آئے۔ شہزادے نے ان دونوں کی اپنے روبرو کھال کھنچوا دی۔

اب تک ان مظالم کی کہانیاں اکبر کے سامنے پیش کی جا رہی تھیں جو شہزادے نے جاگیرداروں پر روا رکھے تھے۔ شہزادے کی شراب نوشی کے قصے بھی اس تک پہنچ رہے تھے۔ وہ اب تک ان قصوں کو معاف کرتا چلا آ رہا تھا لیکن اس دردناک سزا کا سن کر وہ بے چین ہو گیا۔

”ہم تو اپنے سامنے ذبح کی ہوئی بکری کی کھال کھنچوانے پر بھی راضی نہ ہوں۔ معلوم نہیں ہمارے بیٹے میں یہ سخت دلی کہاں سے آئی؟“

حاضرین نے عرض کیا کہ شہزادہ سلیم شراب میں گھے گئے تک غرق ہو چکے ہیں، اس کے علاوہ افیون بھی کھاتے گئے ہیں۔ وہ بھی ہوش ہی میں نہیں رہے۔ اسی لیے ظالمانہ اقدامات ان سے سرزد ہوتے رہتے ہیں۔
”کوئی کا بندوبست کیا جائے۔“
”حضور!۔“

”ہم خود الہ آباد جا سکتے ہیں۔ ہمارا فرمان اور مہندی پناہ دے علاوہ کسی کی زبان نہیں سمجھے گا۔“ قلعے میں کھینچ لی گئی۔ حرم کی خواتین سراپا ہو گئیں۔ اکبر کے جانے کا مطلب یہ تھا کہ باپ بیٹے کے درمیان جنگ چھڑ جائے لیکن اب اکبر کسی کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے والدہ کی سفارش کو بھی ٹھکرا دیا۔ اتفاق سے مہرالنسا (نور جہاں) ان دنوں اپنے بھائی کے گھر آئی ہوئی تھیں۔ تمام باتیں اس کے کانوں میں بھی پڑی تھیں۔ اس کے دل سے شہزادے کا خیال تک نکال گیا تھا لیکن سر پر کھڑی جنگ نے اسے ٹھکر کر دیا۔ شہزادے کی حالت کان کنہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔

اس نے بہت دن بعد قلعے میں قدم رکھا۔ گزری ہوئی ایک بات یاد آگئی۔ یہ بھی یاد آ گیا کہ شہزادے نے ایک مرتبہ اس سے کہا تھا۔ ”ہمیں جو چیز نہیں ملتی ہم اسے چھین لیتے ہیں۔ ہم چھین بھی چھینیں گے۔“ اگر وہ جھیننے پر تیار ہی گیا ہے تو کبھی میرے شوہر کی جان خطرے میں نہ پڑ جائے۔ شہزادے کا قصہ کسی نہ کسی طرح ٹھنڈا ہونا چاہیے۔ وہ شہزادے کی والدہ کے پاس بیٹھی تھی اور اپنی خدمات پیش کر رہی تھی۔

”اگر کسی طرح شہزادے سے میری ملاقات کرادی جائے تو ممکن ہے میں اسے سمجھا سکوں۔“

”وہ اس حال کو تمہاری بدولت پہنچا ہے، تم چاہو تو وہ رادرست پر آ سکتا ہے لیکن وہ تمہیں طلب کرے گا اور اب تم

کسی کی جھوٹ نہ ہو۔“
”میں کوشش کروں گی کہ وہ مجھے طلب کیے بغیر مجھے بھول جائے۔“

”ناممکن ہے۔“
”آپ کوشش تو کریں۔“

”قل الہی کی اجازت کے بغیر یہ ملاقات کیونکر ممکن ہوگی؟“

”آپ بادشاہ سلامت سے اجازت لیں۔“
بادشاہ کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی لیکن اس نے سختی سے اس کی مخالفت کر دی۔ اس مرتبہ بھی اس نے والدہ کی سفارش سے انکار کر دیا۔

اکبر نے دارالرحمت اکبر آباد (آگرہ) سے کشمیر پر کوچ کیا۔ اتفاق سے کشمیر کے ایک قلعے پر چڑھ گئی۔ ملاوٹوں کی کوششوں کے باوجود وہاں سے نکل نہیں سکی۔ آخر کار دوسری سختی لائی گئی اور اکبر اس پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔

اکبر کے ساتھیوں نے اسے بدھونی قرار دیا۔ وہ پیش خانہ کی منزل پر جا کر اترا ہی تھا کہ سخت بارش شروع ہو گئی۔ یہ بارش دوسرے دن تک مسلسل جاری رہی۔ ستارہ شناسوں نے اسے بھی کسی آفت کا پیش خیمہ قرار دیا۔

اس بدھونی کا نتیجہ جلد ہی ظاہر ہو گیا۔ خبر پہنچی کہ بادشاہ کی والدہ مریم مکنی کی شہادت کا ایک خراب ہو گئی ہے۔ اکبر کے ساتھ شہزادہ سلیم (جہانگیر) کا بیٹا شہزادہ غم بھی سفر کر رہا تھا۔ جب غم بعد میں شاہ جہاں کے قلب سے تخت پر بیٹھا۔ اکبر نے اسے روانہ کیا کہ وہ آگرہ جائے اور دادی کی خبریت معلوم کر کے فوراً اطلاع دے۔ غم نے کشمیر دریا میں ڈالی۔ ملاج اسے آگرہ کی طرف لے چلے۔

اس نے واپس آ کر اطلاع دی اور دادی کی زبانی عرض کیا۔

”اگر آخری دیدار کا ثواب حاصل کرنا چاہتے ہو تو لوٹ آؤ اور ماں کی خوشنودی حاصل کرلو۔ دونوں جہاں کی بھلائی اسی میں ہے کہ ماں کے سر ہانے اس کے آخری وقت میں حاضر ہو۔“

اکبر کو یہ سنتے ہی اپنی کوتاہی یاد آئی۔ اس کی والدہ اس کے الہ آباد جانے کی مخالفت کر رہی تھیں۔ وہ ان کی ہم عدولی کر کے رخصت ہوا تھا۔ اسی لیے راستے میں مشکلات سے دوچار ہوتا رہا تھا اور اب یہ خبر آگئی تھی۔ اس نے الہ آباد جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اکبر فوراً لوٹ آیا۔ والدہ کی جان بھی اسی میں لگی ہوئی تھی۔ جس دن وہ آخری دیدار سے فیض

یاب ہوا اسی دن ان کا انتقال ہوا۔ مرتے وقت شہزادہ سلیم کا نام ان کے لبوں پر تھا۔

”میرے بچے سلیم کا خیال رکھنا۔ اسے جس نہ پہنچے۔“

شہزادہ سلیم الہ آباد میں تھا۔ اسے یہ خبریں تو مل رہی تھیں کہ اکبر اس سے ملاقات کے لیے کوچ کر گیا ہے، اب یہ خبر پہنچی کہ دادی کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ اپنی دادی سے بے حد محبت کرتا تھا۔ دادی نہ رہیں تو باپ کی محبت اچانک جاگ اٹھی۔ باپ کا غمزدہ چہرہ یاد آیا۔ وہ اپنے تصور معاف کرانے کے لیے باپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ غمزدہ باپ نے پشیمان ہونے کو کھٹے سے لگا لیا۔ سارے قصور آنسوؤں میں بہہ گئے۔ ہاتھ پکڑا اور حرم سرا میں لے آیا۔

”مستقل سفر میں رہے ہو۔ شرانگیزیوں کے متحمل ہو جانے سے اتنی سیدی حرکتوں میں مبتلا رہے۔ اب کچھ عرصہ غلوٹ خانے میں آرام کرو تا کہ اعلیٰ درجہ کے علاج کو مستعمل کرنے کے لیے تدبیر کریں۔“

اس حکم کا مقصد شہزادے کو محفل میں نظر بند کرنا تھا۔ یہ مقصد بھی تھا کہ کثرت شراب نوشی سے اس کے دماغ میں جس نور نے جگہ بنائی ہے، اس کا علاج ہو سکے۔

اس اچانک نظر بندی کا نتیجہ یہی ہوا تھا کہ شہزادہ یہ سمجھا کہ باپ نے اسے دھوکے سے نظر بند کر دیا ہے۔ اس وقت اس کے پرکے ہوئے تھے۔ وہ اپنا انگڑاپا نہ سنا تھا۔ لایا تھا اس لیے بے ہوش تھا۔ حرم کی عورتیں اسے برابر تھپتھپا دے رہی تھیں کہ اس کی یہ نظر بندی بہت جلد ختم ہو جائے گی لیکن وہ کبھی سمجھے بیٹھا تھا کہ اب یہ نظر بندی باپ کے مرنے پر ہی ختم ہوگی۔ بالآخر کچھ عرصے بعد بادشاہ نے دوبارہ اسے اپنی عنایت سے نوازا اور اس کے اختیارات بحال کر دیے۔

سلیم کی بے اعتدالیوں نے اکبری صحت پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ اب ڈر آتے تھے کہ جیسا کہ چارہ راست پر آگیا ہے کہ دکن سے شہزادہ دانیال کے انتقال کی خبر پہنچی۔ ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کی شادی ہوئی تھی۔ نوجوانی کی اس ناگہانی موت نے سب کو دھکی کر دیا۔ اکبر کو تو ایسا لگتا ہوا کہ ہنسنے سے لگ گیا۔ سب کو چین ہو گیا کہ اب بادشاہ کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔

اکبری کی آنکھیں ابھی بند نہیں ہوئی تھیں کہ سازشوں نے سرا بھارا۔ لطف یہ ہے کہ یہ سازش خود سلیم کے گھر سے چلی۔ اس کا چھوٹا بیٹا غرم (شاہ جہاں) دادا کی تیار داری کے لیے اس کے چنگ سے لگا بیٹھا تھا لیکن اس سے تین سال بڑا خسرو تخت پر قابض ہونے کے خواب دیکھنے لگا۔

دربار میں دو امیر بہت زیادہ بااثر تھے۔ ایک خان اعظم کوکلاش دوسرا راجا مان سنگھ۔ خسرو کی دونوں سے رشتہ داری تھی کیونکہ خان اعظم کی لڑکی اس سے منسوب تھی اور وہ راجا مان سنگھ کی بھانجی تھی۔ خسرو نے ان امیروں سے مدد کے تحت نہیں ہونے کی صورت میں ان امیروں کو کھٹے لٹے والا نہیں تھا جبکہ خسرو کے بادشاہ بن جانے کے بعد پٹن پر وہ بھی حکومت چلاتے اور سیاہ سفید کے مالک ہوتے۔ اب سوال یہ تھا کہ سلیم (جہانگیر) کو کیسے راستے سے ہٹا جائے؟

”سلیم باپ کے خلاف بغاوت کر چکا ہے اس لیے بادشاہ سلامت بھی تین چالیس کے کہ تاج اس کے سر پر رکھا جائے۔“ خان اعظم نے کہا۔

”یہ ضروری تو نہیں۔ وہ سلیم سے محبت کرتے ہیں اور اس کی ہر جائز و ناجائز بات مان لیتے ہیں۔ اگر وہ اسے بادشاہ بنانے پر بعد ہوئے تو ان کا حکم قانون بن جائے گا۔“ راجا مان سنگھ کہہ رہا تھا۔

”اس حالت میں تو یہی ہو سکتا ہے کہ باپ حضور کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔“ خسرو نے تجویز پیش کی۔

”یہ مت بھولو کہ بادشاہ ابھی زندہ ہے۔ اگر ہم نے سلیم کا قصہ پاک کر دیا اور بادشاہ صحت یاب ہو گیا تو ہمارا کیا حشر ہوگا؟“ راجا مان سنگھ نے ایک مرتبہ پھر دہرایا۔

”ہم فی الحال کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔“ اعظم خان نے کہا۔ ”سلیم پر نظر رکھتے ہیں۔ ایسے بااثر آدمیوں کا انتخاب کرو جو تیار رہیں۔ بادشاہ کی آنکھیں جیسے ہی بند ہوں، سلیم کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا جائے۔“

”اگر وہ رہو گی۔“ خسرو نے تپ ہو رہا تھا۔

”اس سے فرق نہیں پڑے گا۔ سلیم کی فوج دار الخلافہ سے بہت دور ہے۔ وہ ہمارا مقابلہ ہی نہیں کر سکے گا۔“

”کوشش یہ بھی کرتے رہو کہ بادشاہ صحت یاب نہ ہونے پائے۔“

”اس کے لیے ہمیں طبعیوں میں سے کسی کو اپنے ساتھ لانا ہوگا۔“

”یہ کوئی مشکل کام نہیں۔“

جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں، اعظم خان کی ایک کنیز ستون کے پیچھے چھپی تھی۔ کنیز بھی ساری باتیں سن رہی تھی۔ یہ وہی کنیز تھی جو بھی مہر النساء اور سلیم کے درمیان ملاقات کا وسیلہ بنی تھی۔ شہزادے کے چلے جانے کے بعد اسے اعظم خان نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

وہ کنیز ستون کے پیچھے سے ہٹ گئی اور کسی بہانے سے باہر نکل کر شہزادے کے پاس پہنچ گئی۔ کنیز بھی شہزادے کی منظور نظر رہ چکی تھی۔ وہ بھی سمجھا ہوگا کہ اس کی محبت اسے کھچ لائی ہے لیکن اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔ اس سے بھی زیادہ پریشان اس وقت ہوا جب اس نے زبان کھولی۔

”صاحب عالم! آپ کی جان کو سخت خطرہ ہے۔“

”کس سے خطرہ ہے، کیا بقی ہے؟“

”حضور کے دشمن حضور کو قید کر کے تخت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔“

”کل کر کیوں نہیں بتاتی۔ بات کیا ہے؟“

کنیز نے وہ ساری گفتگو شہزادے کے گوش گزار کر دی جو وہ سن کر آ رہی تھی۔ شہزادے نے تمام باتیں سکون سے سنیں اور اپنے گلے میں پڑا ہوا ہار کنیز کی طرف اچھال دیا۔

”بدوقت اطلاع دینے پر یہ تمہارے لیے ہماری طرف سے انعام ہے۔“

اس کے چلے جانے کے بعد سلیم تمام حالات پر غور کرنے لگا۔ اس وقت وہ سازشیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

اس کی تمام فوج احمد آباد اور دوسری جاگیروں میں متفرق تھی۔ راجا مان سنگھ اور اعظم خان سے ٹکراتی الوقت دانش مندی نہیں تھی۔ اس اطلاع کے بعد قلعے میں رہنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ وہ قلعے سے نکلا اور اپنی حویلی میں خانہ نشین ہو گیا۔ اتنا محتاط ہوا کہ قلعے میں باپ کی تیار داری کے لیے آمد و رفت تک بند کر دی۔

اس کا بیٹا غرم، دادا کی تیار داری کے لیے قلعے میں رکھا رہا۔ سلیم نے اسے کئی مرتبہ پیغام بھجوایا کہ وہ دشمنوں کے نرے میں نہ رہے۔ وہاں سے نکل آئے لیکن وہ اپنے دادا سے اتنی محبت کرتا تھا کہ دادا کے جیسے ہی قلعہ چھوڑنے کو تیار نہیں ہوا۔

دشمنوں کے نرے میں امید کی ایک کرن تھی جو جنگجو رہی تھی۔ یہ ذات تھی بخشی مرخصی خاں کی۔ یہ بڑا بااثر امیر تھا اور شہزادہ سلیم کا خیر خواہ تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ شہزادے کے خلاف سازش تیار کی جا رہی ہے تو اس نے شہزادے کی مدد کا حکم کیا اور جاں نثروں کی ایک جماعت لے کر شہزادے کی حویلی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

عاقبت نا امانی خسرو نے باپ کو راستے سے ہٹانے کا منصوبہ تو تیار کر لیا تھا لیکن اس نے کوئی فوج بنا کر نہیں رکھی تھی

ایک کتاب، تین فن پارے

محی الدین نواب کی کہانیوں کی سرائیکی و ہندی و اردو اشعار کی ایک ہی کتاب میں

پارہ

رنگین تصاویر نے اس کتاب کو رنگین اور نگین بنا دیا ہے

محی الدین نواب مصنف بھی، مصور بھی اور شاعر بھی

آپ کا ایک نظر پڑھیں گے پھر کتاب ہر گز میل پا نہیں گے

قیمت - 250 روپے

سرکروڈ چوک انڈوبڈار لاہور
042-37668958, 042-37652546

القریش پبلی کیشنز

ملنے کا پتہ

کوئی اور نہیں صوفی سوپ جیسا

- ☆ صرف صوفی سوپ کی ایک کیک 40 سے 50 کلو گرام تک
- ☆ صرف صوفی سوپ کپڑوں سے سارا میل نکالے
- ☆ صرف صوفی سوپ کپڑوں کو ہر بار نیا بنائے
- ☆ صرف صوفی سوپ مٹھوں کی جلد کو نرم دیکھائے
- ☆ کیچک میں کھانسی کا شل سے
- ☆ دھنک میں کھانسی کا شل سے
- ☆ لہو میں کھانسی کا شل سے
- ☆ لہو میں کھانسی کا شل سے

صوفی سوپ پیش کوالٹی



تمام پودوں اور
حبیبوں سے بہتر



دیکھا جائے۔
تمام ملک میں مسلمان یا ہندو جو کوئی فوت ہو جائے،
اس کا مال و متاع اس کے وارثوں کو دے دیا جائے۔ کوئی
عالم یا شاہی ملازم اس کی وراثت میں مداخلت نہ کرے۔
شراب اور تمام نشہ آور اشیا جس کی شرع میں ممانعت
ہے نہ تو کوئی تیار کرے اور نہ فروخت۔ میں خود شراب پیتا
ہوں اسی لیے اس کے معزز اثرات سے واقف ہوں۔
سرکاری حکام کو اجازت نہیں کہ کسی شخص کے گھر پر
قیام کرے کیونکہ خدا کی مخلوق کو بے گھر کرنا اور بلا وجہ ستانا
بہتر نہیں۔
کوئی شخص کسی مکتبہ کے بدلے میں کسی دوسرے شخص
کی ناک اور کان نہ کاٹے۔
کوئی سرکاری عامل اور جاگیردار رعیت کی زمین نہ
چھینے اور نہ اس کو چھین کر اس کی زمین پر خود کاشت کرے۔
سرکاری عامل اور جاگیردار جہاں کہیں ہوں، شاہی
اجازت حاصل کیے بغیر آپس میں شادی بیاہ اور رشتہ داریاں
پیوانہ کریں۔

بڑے بڑے شہروں میں مریضوں کے علاج معالجہ
کے لیے اسپتال قائم کیے جائیں جن کا خرچ سرکاری محاصل
سے پورا کیا جائے۔
اکبر بادشاہ کے زمانے میں جن ملازموں کو عہدے
اور جاگیریں دی گئی تھیں وہ برقرار رکھی جائیں اور ان کے
حسب حال ان میں اضافہ کیا جائے۔
جو قیدی جیلوں اور قلعوں میں عرصہ دراز سے مقید
ہیں، انہیں رہا کیا جائے۔
ابھی ان احکامات کی سیاسی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ
اس کے پچھلے خسرو نے، جو پہلے بھی بادشاہت کے خواب دیکھ
رہا تھا، بغاوت کا راستہ اختیار کیا۔ اس نے ایک جماعت کو
ساتھ لیا اور تلع آگرہ سے نکل کر لاہور کی طرف چلا گیا۔
ارادہ یہ تھا کہ لاہور کے قلعے پر قبضہ کر کے اپنی بادشاہت کا
اعلان کر دے گا۔ لاہور کا صوبہ دار، جہانگیر کے دربار میں
حاضری کے لیے چل پڑا تھا کہ اسے خسرو کی بغاوت کا علم
ہوا۔ اس نے قتل مندی کی کہ وہاں لاہور کی طرف لوٹ
گیا۔ جتنی دیر میں خسرو لاہور پہنچتا، وہ قلعے میں محصور ہو چکا
تھا۔

خسرو کے ہمراہ دس بارہ ہزار سوار تھے۔ ان کے قتل
ہوتے ہی اس نے قلعہ لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے پاس ایسا
بھاری جنگی سامان نہیں تھا کہ قلعے کی دیواروں کو گرا سکے۔ وہ تو

جو اس وقت اس کے کام آتی۔ اعظم خان کے ساتھ جاں نثار
مرد تھے لیکن شہزادے کے معاملے میں ان کے درمیان
پھوٹ پڑ گئی۔ اب رہ گیا ان سب کے۔ مرنے والے نے اس کا
علاج یہ کیا کہ بادشاہ سے کہہ کر بنگالہ کی صوبے داری کی
خلعت دے کر اسے دارالحکومت سے رخصت کر دیا۔
خسرو کے پاس اتنی طاقت نہیں رہی کہ وہ کوئی موثر
کارروائی کرتا۔
شہزادے کی قسمت میں بادشاہت لکھی تھی کہ رکا نہیں
ایک ایک کر کے دور ہوتی جا رہی تھیں۔
جب قلعے پر سے مخالفوں کا تسلط ختم ہو گیا تو شہزادہ سلیم
باپ کی تیار داری کے لیے حاضر ہو گیا۔ اندرونی اور بیرونی
راستوں پر بھروسے کے آدمی متعین کر دیے۔
جلال الدین اکبر آخری سائیں لے رہا تھا۔ اس نے
خود شہزادے کو اپنا جانشین مقرر کیا اور تقریباً نصف صدی
کرور کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد دنیا سے رخصت
ہو گیا۔

اب کوئی طاقت باقی نہیں رہ گئی تھی جو شہزادہ سلیم کو تخت
شاہی پر قدم رکھنے سے روکی۔ اس نے جہانگیر کا لقب اختیار
کیا اور ابوالفضل نور الدین محمد جہانگیر کے نام سے تخت شاہی
پر جلوہ گر ہو گیا۔
تخت چھٹی کے فوراً بعد جہانگیر نے سب سے پہلے یہ
اہتمام کیا کہ چار من سونے کی ایک زنجیر بنوائی اور اس میں
ساتھ گنتیاں بندھوا لیں۔ اس کا ایک سرا قلعے کے شاہ برج
میں لگوا دیا اور دوسرے کو دریا کے کنارے ایک کھوٹے سے
بندھوا دیا اور یہ اعلان کروایا کہ جس مظلوم کو بھی حصول
انصاف میں رکاوٹ ہو وہ اس زنجیر کو کھینچ کر بادشاہ کو اداری
کے لیے پکارے اور بادشاہ کے کانوں تک اپنی فریاد پہنچا
دے۔

اس کے ساتھ ہی اس نے بارہ مشہور احکام صادر کیے
تاکہ تمام ملک میں ان پر عمل درآمد ہو۔
جنگلی اور دیہات کے راستوں میں محصول نہ لیا جائے۔
چوگی اور دیگر محصول جو جاگیرداروں نے اپنے اپنے صوبوں
میں اپنے خاکسے کے لیے لگائے ہیں، فوری بند کیے
جائیں۔

جن راستوں میں چوہری اور ڈاکا زنی ہو اور وہ جگہ
آبادی سے دور ہو تو قرب و جوار کے جاگیردار وہاں سرائے
اور مساجد تعمیر کریں، کنوئیں کھدوائیں تاکہ وہاں لوگ آباد
ہوں اور تاجروں کے مال تجارت کو ان کی مرضی کے خلاف نہ

اس امید پر محاصرہ کیے ہوئے تھا کہ دلاور خاں، قلعہ خود اس کے حوالے کر دے گا۔
جہانگیر کو اطلاع ملی تو اس نے خود خسرو کے قنائب میں جانے کا ارادہ کر لیا۔ میر بخش مرعشی خاں کو ہراول کے طور پر رخصت کیا اور خود پیچھے روانہ ہوا۔
خسرو کو معلوم ہوا کہ میر بخش اس کے قنائب میں آ رہا ہے تو اس نے بھی بہتر سمجھا کہ محاصرہ اٹھا کر مرعشی خاں کے مقابلے پر چلا جائے لیکن مرعشی خاں سے معمولی سی جھڑپ کے بعد ہی اس کے پاؤں اکھڑ گئے۔

خسرو کے بھاگنے کے بعد اس کی سواری کی پالکی، جواہرات کے صندوقے کے ساتھ مرعشی خاں کے ہاتھ آئی۔
جہانگیر کو معلوم ہوا تو وہ خود مرعشی خاں کے کیمپ میں گیا اور حالات سے باخبر ہوا۔ دوسرے دن راجا باسو، جو اس نواح کا سب سے بڑا زمیندار تھا، خسرو کے قنائب میں روانہ کیا۔

فحش کے بعد خسرو نے اپنے ہمراہیوں سے مشورہ کیا۔ اسے مشورہ دینے والوں کے دو واضح گروپ بن گئے۔
پنھان تو اسے آگرہ اور بہار کی طرف جانے کا مشورہ دے رہے تھے لیکن ایک امیر حسن بیگ نے کاش پلنے کی صلاح دی۔ اس نے یہ پیشکش بھی کی کہ قلعہ ریتاس میں چار لاکھ روپے نقد اور سامان جنگ موجود ہے۔ یہ سب وہ خسرو کی نذر کر دے گا۔ خسرو اس لالچ میں آ گیا اور اس نے پنھانوں کی بات نہیں مانی۔ اس پر وہ سب اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔

اس بحث و مباحثہ میں اتنا وقت گزر چکا تھا کہ جب وہ چناب پر پہنچا تو اس طرف کے تمام حاکموں کے نام خسرو کی راہ بندی کے احکام پہنچ چکے تھے۔ زمینداروں نے ملاحوں کو خبردار کر دیا تھا کہ وہ خسرو کو دریا عبور کرانے میں مددگار نہ بنیں۔ وہ گھاٹ پر پہنچا تو ملاح بھاگ چکے تھے۔ بڑی جگہ دود کے بعد ایک ملاح ہاتھ لگا جسے دریا پار کرانے پر مجبور کیا گیا۔ خسرو اپنے خاص ساتھیوں کے ساتھ بھی پر سوار ہو گیا۔ ان ملاحوں نے بھی یہ کیا کہ سختی کو ریت کے ایک ٹیلے پر چڑھا دیا اور خود دریا میں کود کر بھاگ گئے۔
شاہی کارندوں کو بھی خبر مل چکی تھی۔ حسن بیگ اور خسرو دونوں گرفتار ہو گئے۔

جہانگیر اس وقت تک لاہور کے قریب "کامران باغ" میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے غم دیا کہ کامران باغ سے قلعہ لاہور تک پھانسیاں گاڑ دی جائیں اور باغیوں کو ان پر چڑھا دیا جائے۔ جب پھانسیاں دے دی گئیں تو غم ہوا کہ

شہزادہ خسرو کو باقی پر بٹھاؤ، اس کے گلے میں طوق ڈالو اور ان پھانسیوں کے درمیان سے گزاری۔ غم کی قلیل ہوئی۔
خسرو کو باقی پر اس طرح بٹھا دیا گیا جیسے وہ کوئی بادشاہ ہو۔ جب اسے ان پھانسیوں کے درمیان سے گزرا تو کیا تو قنائب آوازیں لگا رہے تھے، یہ کوئی سزا نہیں تھی بس خسرو کو ذلت آمیز احساس دلانا تھا۔ بعد میں خسرو کے ہاتھ پاؤں سونے کی زنجیروں میں جکڑ کر ایک امیر اعتبار خاں کی گھرائی میں دے دیا گیا۔

☆☆☆

مہرا نسا دارالکھانے سے بہت دور تھی لیکن حالات پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ اکبر کی وفات اور جہانگیر کے تخت پر قدم رکھنے ہی اس نے سوچ لیا تھا کہ اس کی زندگی اب کسی بڑی تبدیلی سے دو چار ہونے والی ہے۔ وہ شہزادہ جس نے اس کی خاطر اکبر سے غم لے لی تھی، بادشاہ بننے کے بعد اسے فراموش نہیں کرے گا۔ وہ اس پیچیدگی قانون سے بھی واقف تھی جس کا سہارا لے کر بادشاہ اسے طلب کر سکتا تھا۔ وہ فرصت کے اوقات میں اپنے دل کو ٹھونکی رہتی تھی۔ جس میں شہزادے کی محبت بھی آباد تھی، ملکہ ہندوستان بننے کی خواہش بھی۔ اور اپنی بیٹی الاؤنی بیگم کا مستقبل بھی لیکن اب وہ شیر افکن کی بیوی بھی تھی۔ وہ کسی تبدیلی کی منتظر تھی لیکن شیر افکن کو کوئی نقصان پہنچے، یہ بھی اسے برداشت نہیں تھا۔ چاہے نقصان پہنچانے والا خود جہانگیر ہی کیوں نہ ہو۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پیچھے پیچھے چنک جاتی جیسے کوئی خطرہ اسے آواز دے رہا ہو۔ اس دن بھی یہی ہوا تھا۔ وہ اپنی خواب گاہ میں مسمری پر آڑی تر جمی لیٹی ہوئی تھی کہ شیر افکن کسی کام سے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اس طرح خوف زدہ ہو کر اٹھی کہ شیر افکن بھی گھبرا گیا۔

"میں دیکھ رہا ہوں، آپ کچھ دنوں سے گھبرائی ہوئی رہنے لگی ہیں۔"

"نہیں تو۔ ہم کیوں گھبرانے لگے؟"

"آپ اس وقت بھی اپنی حالت پر غور کریں۔"

"اس وقت تو ہم کچھ سوچ رہے تھے۔"

"آپ کو کس چیز کی ہے جس کے بارے میں سوچتی رہتی ہیں؟"

"شیر افکن اس کے قریب ہی مسمری پر بیٹھ گیا۔"

"آپ ایک ماحول میں رہتے رہتے اس کی ہوا کی۔ آپ"

"کہیں تو ہم آپ کو آگرہ بھیج دیں کچھ دنوں کے لیے؟"

"ہم آپ کو تباہ چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔"

"آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے ہماری حفاظت پر مامور ہوں۔"

"ہمیں آپ کی حفاظت ہی تو مقصود ہے۔"

"میں شیر افکن ہوں۔ دو چار کوار کے ہی مروں گا لیکن آپ کو یہ کیا وہم ہو گیا ہے؟"

"نہ جانے میں کیوں احساس ہوئے لگا ہے کہ آپ کی جان خطرے میں ہے۔"

"آپ جیسی ذہین خاتون کو بھی اگر وہم ستانے لگے تو پھر اللہ ہی حافظ ہے۔ آپ کو خانا اس دن سے یہ وہم ہو گیا ہے جس دن اسے شکار کے دوران میں ہندو کی کوئی ہمارے قریب سے گزری تھی اور ہم بال بال بچے تھے۔"

"یہ کوئی معمولی بات تھی۔ آخر اس کوئی نے آپ کی یاد چھپا کیوں کیا؟"

"میں محض اتفاق تھا۔ میں جان پر تھا اور جان کی دوسری طرف شیر نے چھلانگ لگی تھی۔ کوئی چلانے والے نے شیر پر گولی چلائی تھی۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی چلانے والے اور شیر کے درمیان آپ تھے۔"

"بالکل۔"

"کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو اس وقت گولی چلائے گا۔"

"وہ بے وقوف ہی تو تھا۔ بعد میں اس سے باز پرس بھی ہوئی تھی۔"

"اور یہ شخص شاہی ملازم ہوگا۔"

"شاہی ملازم کیا مطلب۔ قلب الدین کو کٹا ش تھا بادشاہ کا دودھ شریک بھائی تھا۔ اسی وقت اسے واپس بھی بلا لیا گیا تھا۔"

"یہ گولی جان بوجھ کر چلائی گئی تھی۔ آپ فک کر گئے یہ آپ کی قسمت۔"

"اُسی لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ وہم میں مبتلا ہیں۔"

"قلب الدین سے میری کیا دشمنی؟ یہ محض اتفاق تھا۔ شکار میں ایسا ہوا جاتا ہے۔"

"آپ ہی کے ساتھ کیوں ہوا؟"

"محض اتفاق۔"

"یہ اتفاق پھر نہ ہو جائے۔ آپ کو اپنا خیال رکھنا چاہیے۔"

"مجھے تو اپنا خیال ہے۔ آپ بھی اپنا خیال رکھیں۔"

"شوہر کی محبت میں آپ بادشاہ پر چل کر رہی ہیں۔"

شیر افکن کو کہیں جانا تھا۔ گھوڑے پر سوار ہوئے اور نکل گئے۔ مہرا نسا نے خیالوں کی چادر پھر تان لی۔ یہ محض اتفاق نہیں، جہانگیر جیسے حاصل کرنے کے لیے شیر افکن کی جان کے درپے ہے۔ پھر اسے یاد آیا، اس واقعے کو تو بہت دن ہو گئے۔ اگر اس حرکت کے پیچھے جہانگیر ہوتا تو کوئی دوسرا واقعہ ضرور ظہور میں آچکا ہوتا۔ کم از کم ہم اپنی جاگیروں سے تو بے دخل ہو چکے ہوتے لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔

دن پر دن گزر رہے تھے۔ اب مہرا نسا کو ایک اور فکر نے گھیر لیا تھا۔ وہ طرح دار عورت تھی۔ اسے بھی اپنی ذات تصور کیا کہ جہانگیر نے تخت پر بیٹھنے کے بعد اس کی غیریت تک روایت نہیں کی۔ وہ امور مملکت میں مشغول ہے لیکن کوئی رشتہ تو خیر کر سکتا تھا۔ اس نے کتنے وعدے کیے تھے اب ایک وعدہ بھی یاد نہیں رہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی بغاوت میرے لیے نہیں تخت کے لیے تھی، جو اسے مل گیا۔

مہرا نسا عجیب دور سے گزر رہی تھی۔ ایک طرف شوہر کی محبت تھی، دوسری جانب یہ احساس کہ جہانگیر اسے نظر انداز کر رہا ہے۔ یہ اس کے بے پناہ حسن کی توہین تھی۔

اسے اس احساس بخردی کو جھیلنے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ جہانگیر کے ہاتھ سے لکھا ہوا قہرے ملا۔

"تمہیں وہ رات اچھی طرح یاد ہوگی جب ہم نے تمہیں اپنی ظلوت میں طلب کیا تھا اور تم نے مفت مآب عورتوں کی طرح شادی پر اصرار کیا تھا اور ملکہ ہند بننے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم تمہاری اس خواہش کو پورا کر سکیں۔ ہم پیچیدگی تو را کے قانون کا سہارا لے سکتے ہیں لیکن ہم تمہیں حاصل کرنا چاہتے ہیں، چھیننا نہیں چاہتے۔ اب تم خود سوچو کہ تمہیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے؟ شیر افکن ہمارا ادنیٰ جاگیردار اور ملازم ہے لیکن ہم تمہاری رضا چاہتے ہیں۔"

اس خط نے مہرا نسا کے جذبہ خود پرستی میں تو اضافہ کر دیا لیکن اس کے اندیشوں میں بھی اضافہ کر دیا۔ اس خط میں عجیب ہوئی دھمکی نے اسے ہوشیار کر دیا تھا۔

اس نے جہانگیر کے نام خط لکھا۔

"اب ہم غیاث الدین بیگ کی صاحب زادی نہیں بلکہ شیر افکن کی بیوی ہیں۔ ہماری شادی آپ کے والد کے ہاتھوں انجام پائی تھی ورنہ میں تو آپ سے محبت تھی۔ آپ کو اسی محبت کا واسطہ کوئی ایسا کام نہ سمجھیں جس سے ہمارے سہاگ کو نقصان پہنچے۔ ہمیں یہ گوارا نہیں ہوگا کہ شیر افکن کو کوئی نقصان پہنچے کیونکہ وہ بے قصور ہے۔ ہاں وہ خود

ہی نہیں چھوڑ دے تو یہ الگ بات ہے۔

یہ رتھ جہاں تک پہنچا تو اسے ایک سیڑی راہ سوجھی۔ اس کے بعد بھی نامہ و پیام ہوتے رہے اور جہاں تک یہ ظاہر ہوتا رہا کہ میرا لٹاکہ دل میں اس کی محبت اب بھی قائم ہے اور یہ کہ شیراقلن سے گفت و شنید کے بعد یہ معاملہ بہ آسانی طے کیا جاسکتا ہے۔ پہلے اس نے سوچا کہ شیراقلن سے وہ خود بات کر لے لیکن یہ اسے اپنی شان کے خلاف معلوم ہوا۔ پھر وہ کسی ایسے آدمی کے نام پر غور کرنے لگا جسے وہ اپنا پیغام دے کر بھیج سکے۔ اس کی نظر ایک مرتبہ پھر قطب الدین خاں پر پڑی۔ یہ شخص اس کا دودھ شریک تھا۔ دونوں کے درمیان بے لنگھی تھی۔ اس راز سے واقف بھی تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ شکار وغیرہ کے مواقع پر شیراقلن کے ساتھ رہا تھا۔

اس نے قطب الدین خاں کو طلب کیا اور خلوت میں بلا کر کچھ ہدایات دیں اور اسے بنگال کی طرف رخصت کر دیا اور خود سیر و شکار کے لیے کابل کی طرف کوچ کیا۔

اس کے کوچ کرنے کے بعد قطب الدین بنگال کی طرف رخصت ہو گیا اور سیدھا شیراقلن کی جائگیر پر پہنچا۔ شیراقلن کے آدمیوں نے اسے ایک محل میں ٹھہرایا اور شیراقلن کو خبر کر دی۔

شیراقلن کو کیوں اور محروم کی زبانی کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ قطب الدین اس کے لیے کیا پیغام لایا ہے۔ اسی لیے جب وہ گھر سے نکلنے لگا تو ایک عجیب جملہ اس کی زبان سے ادا ہوا۔

”آج سے میں شادی ملازم نہیں ہوں۔“

مہرا لٹاکہ نے اس جملے کو بڑی تشویش کے ساتھ سنا تھا لیکن یہ سوچ کر مطمئن بھی ہو گئی تھی کہ اس کے شوہر کی جان کو خطرہ نہیں۔ بادشاہ نے قطب الدین خاں کو بھیجا ہے تو ضرور گفت و شنید کے لیے بھیجا ہوگا جو بھی فیصلہ ہوگا باہمی رضامندی سے ہوگا۔ اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ شیراقلن نے ہتھیار نہیں باندھے ہیں۔ کسی کشت و خون کا امکان ہی نہیں۔ شیراقلن، قطب الدین خاں کی قیام گاہ پر پہنچا تو قطب الدین خاں نے باہر نکل کر اس کا نہایت پر تپاک استقبال کیا اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اسے مہمان خانے تک لے گیا۔ ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد وہ اصل مطلب پر آ گیا۔

”شیراقلن، معاملہ ایسا تھا کہ شہنشاہ کو خود یہاں آنا چاہیے تھا لیکن وہ امور سلطنت کی انجام دہی میں ایسے مصروف ہیں کہ دارالحکومت میں چھوڑ گئے۔ اس لیے اپنا

پیغام دے کر انہوں نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔“

”مجھے حکم دیتے، میں حاضر ہو جاتا۔“

”شاید انہوں نے یہ بہتر سمجھا ہو کہ یہ پیغام لے کر میں تم تک آؤں۔“

”میں اتنا اہم کب سے ہو گیا کہ ان کا پیغام کوئی قاصد نہیں بلکہ آپ جیسا معتبر امیر مجھ تک پہنچائے؟“

”یہ نہیں پوچھو گے کہ وہ پیغام کیا ہے؟“

”میری جائگیر میں اضافہ کرنا ہوگا یا اس کی خطی کے احکام لے کر آئے ہو گے۔“

”اس پیغام میں دونوں باتیں پوشیدہ ہیں۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ کس بات کو پسند کرتے ہو۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں قطب الدین خاں۔“

”آپ چنگیزی تورا کے قانون سے تو واقف ہوں گے۔ اس قانون کی رو سے شہنشاہ معظم نے یہ پیغام بھیجا ہے کہ آپ اپنی زوجہ مہرا لٹاکہ کو طلاق دے دیں۔ بادشاہ کی حیثیت سے وہ اسے اپنے نکاح میں لانے کا ارادہ کر چکے ہیں۔“

”قطب الدین خاں، ایسے پیغام کو میں اپنی شوکر پر رکھتا ہوں۔ شہنشاہ کو میرا پیغام بھی پہنچا دیں کہ میں مہرا لٹاکہ کو طلاق نہیں دوں گا، مجھے جو جائگیر ملی ہے وہ جلال الدین محمد اکبری عطا کر دے۔ وہ اسے واپس نہیں لے سکتے کیونکہ وہ اس کا عہد کر چکے ہیں۔“

”مجھے سے کہا گیا ہے کہ اگر نرزی سے کام نہ چلے تو میں زبردستی کروں۔“

”وہ یہ حکم دیتے ہوئے کیوں بھول گئے کہ ان کا رقیب شیراقلن ہے؟ میں مرنے کو ترجیح دوں گا لیکن طلاق نہیں دوں گا۔“

”تمہارے مرنے کے بعد بھی وہ اس سے شادی کر لیں گے۔“

”اس وقت وہ میری بیوی نہیں میری بیوہ ہوگی۔“

”تمہاری جائگیر میں اضافہ کر دیا جائے گا۔“

”یہ پیشکش کسی غیرت کو کرنا۔ اپنے بادشاہ سے کہنا وہ آئندہ اپنی زبان پر مہرا لٹاکہ کا نام بھی نہ لائے۔“

”مت بھولو کہ میں تمہیں گرفتار بھی کر سکتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے قطب الدین خاں نے تورا سونت لی۔

شیراقلن نے جب یہ دیکھا کہ وہ گرفتار کیا جاسکتا ہے تو اس نے وہی فیصلہ کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ وہ ہتھیار باندھ کر نہیں آیا تھا لیکن کسی ایسے ہی موقع کے لیے آئین میں

خنجر چھپا کر لے آیا تھا۔ اس نے خنجر نکالا اور قطب الدین خاں کے پیٹ میں ٹھونک دیا اور پھر کئی مہلک وار کڑا لے۔ وہ ٹھوڑے پر سوار ہو کر یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا کہ قطب الدین کے ساتھیوں میں سے ایک کشمیری نوجوان اس کے پیچھے لگ گیا۔ ایک جگہ پہنچ کر پیچھے سے تھوڑا کھڑک دیا۔ اس نے پلٹ کر اس کشمیری نوجوان کا بھی کام تمام کر دیا۔ بری طرح زخمی ہونے کے باوجود اپنی غیرت کے سہارے ٹھوڑا دوڑاتا رہا اور گھر کے دروازے تک پہنچ گیا لیکن قطب الدین کے آدمی بھی وہاں تک پہنچ چکے تھے۔ ان سب نے گھر کو کر کے اسے دروازے پر قتل کر دیا۔

مہرا لٹاکہ نے شور مچا کر باہر بھاگا تو شیراقلن آڑھا تر چھاڑا ہوا تھا۔

مہرا لٹاکہ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ شیراقلن اور قطب الدین خاں کے درمیان کیا باتیں ہوئی ہیں؟ اس نے تو صرف یہ دیکھا کہ اس کا شوہر شادی عہد سے قتل کر دیا گیا ہے۔ اس نے التجا کی تھی کہ اس کے شوہر کی جان کو نقصان نہ پہنچے۔ جہاں تک اتنا خود غرض بھی ہو سکتا ہے کہ میری التجا کے باوجود میرے شوہر کی جان لے لی۔

وہ ملکہ ہندوستان بننے کے لیے تیار تھی لیکن یہ چاہتی تھی کہ معاملہ گفت و شنید سے طے ہو لیکن شیراقلن کے قتل نے اسے برمجم کر دیا۔ اس نے سیاہ مانتی لباس پہن لیا اور عہد کر لیا کہ وہ زندگی بھر اس لباس کو نہیں اتارے گی۔

جہاں تک کابل کی بات تھی اسے یہ خبر ملی۔ قطب الدین اس کا دودھ شریک بھائی تھا۔ اس کے قتل کا اسے بے حد افسوس ہوا۔ اس نے کابل سے احکام بھیجے کہ چونکہ شیراقلن اس کے بھائی کا قاتل تھا اس لیے اس کی تمام جائیداد ضبط کر لی جائے اور اس کی بیوہ کو شادی حرم میں پہنچا دیا جائے۔

سب سمجھ رہے تھے کہ شیراقلن کو قتل کرانے میں جہاں تک کچھ تھا وہ یہ کہ اس کی کینے کی جرات نہیں تھی۔ صرف مہرا لٹاکہ تھی جو بے دھوکہ بیتی تھی کہ اس کے شوہر کو بادشاہ کے حکم سے قتل کیا گیا ہے۔ اس کا سیاہ مانتی لباس میں رہنا ایک خاموش انتقام تھا جو وہ بادشاہ سے لے رہی تھی۔ ملکہ ہندوستان جتنا اس کا خواب تھا۔ اب یہ خواب پورا ہونے کا وقت آیا تو اس نے اپنے حیرتوں میں خند کے قطرے باندھ لیے۔

جہاں تک کابل سے واپس آیا تو اس نے مہرا لٹاکہ کو اپنے حضور طلب کیا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا۔ کس کی مجال تھی جو بادشاہ کا حکم ماننے کی جسارت کرے لیکن مہرا لٹاکہ نے اس کے انکار کو سہرا کر دیا اور اس سے

پوچھا کہ اس نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا۔ اس نے اسے سانسے آنے سے انکار کر دیا۔

”ہم عدت میں ہیں۔ کسی غیر محرم کے سامنے نہیں آ سکتے۔“

”ہمارے قانون کے مطابق بادشاہ کسی کے لیے باعزم نہیں ہوتا۔“

”خدا کے قانون کے سامنے آپ کا قانون کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔“

”تم عدت کے دن گزار لو اس کے بعد ہم جہیں اپنی ملکہ بنائیں گے۔“

”ہم عہد کر چکے ہیں کہ تم عمر شیراقلن کا سوگ منائیں گے۔“

”ہماری محبت جہیں ایسا نہیں کرنے دے گی۔“

”ہم نے آپ سے التجا کی تھی کہ ہم شیراقلن کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”اس کے قتل میں ہمارا ہاتھ نہیں۔ نقصان تو ہمارا بھی ہوا ہے۔ ہمارا بھائی مارا گیا ہے۔“

”ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ ہم بیوہ ہوئے ہیں۔ ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں طلاق گوارا ہوگی، بیوہ ہونا ہمیں قبول نہ ہوگا۔ لیکن مہرا لٹاکہ نے وہی کیا۔“

”ہم کہہ چکے ہیں کہ شیراقلن کی موت میں ہمارا ہاتھ نہیں۔ باقی باتیں تمہاری عدت گزارنے کے بعد ہوں گی۔“ بادشاہ نے کہا اور اس کے پاس سے ہٹ گیا۔

جب عدت کے دن پورے ہو گئے تو بادشاہ نے اسے عقد کا پیغام بھیجا۔ وہ پھر شیراقلن کی موت کا تہ کر کے لے کر چلی گئی اور بادشاہ کی پیشکش کو نہایت حقارت سے ٹھکرا دیا۔ بادشاہ ہر موقع پر اس کے نازاٹھا جا رہا تھا لیکن اس کے صاف انکار پر وہ غضب ناک ہو گیا اور مستحب کنیزوں کے جرمے میں اسے اپنی سوتیلی ماں سلطان سلیمہ بیگم کی عمرانی میں دے دیا۔ اب وہ آسمان سے زمین پر آ گئی۔ اس کی حیثیت معمولی کنیز کی ہو گئی جو سلیمہ بیگم کی خدمت پر مامور تھی۔

سلیمہ بیگم حکم طرازی میں کمال رکھتی تھیں۔ مہرا لٹاکہ کے حالات سے واقف بھی تھیں۔ وہ اسے سمجھاتی رہیں کہ بادشاہ کی بات مان لے لیکن اسے یہ گلہ تھا کہ بادشاہ نے اس کی التجا کو ٹھکرا کر اس کے شوہر کو قتل کر دیا۔ یہ بات وہ اس انداز میں کہتی تھی جیسے اسے شیراقلن کی موت دکھانا دکھ نہیں جیتا اس بات کا دکھ ہے کہ بادشاہ نے اس کی بات نہیں رکھی اور شیراقلن کو قتل کر دیا۔ وہ ایک خود پرست عورت ثابت

ہوری تھی۔

خسرہ نے دوبارہ بغاوت کر دی تھی۔ بادشاہ اس طرف متوجہ رہا۔ پھر دکن سے شورش کی خبریں آنے لگیں۔ اس شورش کو دبانے کے لیے فوجوں کو روانہ کرنا تھا۔ حالات پر نظر رکھتی تھی۔ راجا مان سنگھ کے بیٹے بکت سنگھ کی لڑکی سے بادشاہ نے عقد کیا۔ کامل اور قندھار کے حالات بھی کچھ ٹھیک نہیں تھے۔ ان جھیلوں میں پڑ کر اس کے دل سے مہرالنسا کا خیال بالکل ہی نکل گیا۔

مہرالنسا کی خود پرستی کو ایک مرتبہ پھر چمکا لگا۔ بادشاہ کی عدم توجہی نے اس کے جذبہ خود پرستی کو ختم نہیں پہنچائی۔ سلطان سلیم بیگم طبل تھیں۔ بادشاہ ان کی مزاح پر ہی کے لیے زنان خانے میں آیا۔ اس نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا۔ سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک کیز تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کی یہ حرکت دیکھ کر بادشاہ کی تیوری پر تل پڑ گئے۔

”کون تھی یہ کسٹل؟“ اسے اتنا بھی نہیں معلوم کر بادشاہ سے پردہ نہیں کیا جاتا۔“

”فیث الدین بیگ کی صاحبزادی مہرالنسا بیگم تھی جسے آپ نے ہماری گھرانی میں چھوڑ دیا تھا۔“

”اس نے اب تک سیاہ ماتی لباس نہیں اتارا؟“

”ہم نے بہت سمجھا لیکن ماتی ہی نہیں۔“

”اس سے کہنا یہ لباس اتار دے۔ محل کی فضا سوگوار ہوتی ہے۔“

وہ کچھ دیر والدہ کی مزاح پر ہی کے لیے بیٹھا ہوا اور پھر اٹھ کر چلا گیا۔ بہت دن ہو گئے تھے، اس نے دن کے وقت شراب کو اتھار لگا تاڑک کر دیا تھا لیکن اس وقت دل پر ایسی چوٹ لگی تھی کہ گل میں آتے ہی کیزوں کو طلب کیا اور جام پر جام پڑھا تا رہا۔

اس نے تقریباً دو سال بعد مہرالنسا کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس جھلک میں اس کا زخم پھر تازہ کر دیا۔ اس نے اس عالم سے فوجی میں جتنی زیورات مہرالنسا کے پاس روانہ کیے اور اس سے استدعا کی کہ وہ ماتی لباس اتار چھوٹے۔ بادشاہ کی طرف سے بھیجے ہوئے تحفے واپس کیے ہوئے تھے؟ نہ صرف وصول کیے بلکہ پائین کر بھیج دیئے۔ دوسرا احسان بادشاہ نے یہ کیا کہ اسے اپنی والدہ کی خدمت سے

آزاد کر کے اس کے بھائی آصف خاں کے گھر بھیج دیا۔

نامہ و پیام کا سلسلہ بھی چلا رہا اور حائف بھی جیسے جاتے رہے۔ پھر ایک روز بادشاہ کا پیغام ملا کہ بادشاہ سر و شکار کے لیے اجیر جا رہا ہے۔ بیگمات بھی ساتھ ہوں گی۔ مہرالنسا کو بھی چلنا ہے۔ شہم شاہی سے انکار کی مجال نہیں تھی۔ اسے بھی اس جلوس میں شامل ہونا پڑا۔ بادشاہ نے اس کی سواری کے لیے الگ ہاتھی مخصوص کیا تھا۔ یہ بڑا اعزاز تھا۔

بادشاہ یہ دیکھ کر پر امید ہو گیا کہ اس نے ماتی لباس اتار دیا تھا۔ چنانچہ شکار سے واپس آتے ہی اس نے آصف خاں کے ذریعے اسے عقد کا پیغام بھیجا۔ مہرالنسا نے اپنے عاشق کو بہت ترسایا تھا اب مزید انکار اس کے غضب کو دعوت دیتا تھا۔ اس کے سامنے اپنی بیٹی کا مستقبل بھی تھا۔ اس نے سوچا اگر وہ گل میں پہنچ گئی تو بادشاہ سے کہہ کر لاڈلی بیگم کی شادی شہزادہ غرم (شاہ جہاں) سے کرادے گی۔ جہانگیر کے بعد شاہ جہاں تخت پر بیٹھا تو اس کی بیٹی ملکہ ہندوستان ہوگی۔ اس نے پیغام قبول کر لیا۔ جہانگیر رات لے کر آصف خاں کے گھر گیا اور مہرالنسا کو بیاہ کر لے آیا۔

ایک بڑے جشن میں اس نے مہرالنسا کو نور محل کا خطاب دیا۔ بعد میں نور جہاں بادشاہ بیگم کا خطاب دے کر پورے حرم پر اسے امتیاز عطا کیا۔

نور جہاں ایسی قابل اور ذہین ثابت ہوئی کہ بہت جلد بادشاہ اس کی صلاحیتوں کا معترف ہو گیا۔ آہستہ آہستہ تمام ملکی امور پر نور جہاں قابض ہو گئی۔ اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ دربار میں بھی وہ پردے کے پیچھے بادشاہ کی پشت پر موجود رہتی تھی۔ سکے پر بھی اس کا نام موجود تھا۔

پہلے شاہ جہانگیر یا فنت شد زبور تمام نور جہاں بادشاہ بیگم زر

☆ ☆ ☆

ای نور جہاں کی سازشوں نے ایک عرصے تک مملکت کے شیرازے کو درہم برہم کیے رکھا۔ غرم کو داماد بنانے کی خواہش میں اس نے سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور پھر یہ اعزاز نظر بندی میں تھمیل ہو گیا۔ جہانگیر کے انتقال کے بعد وہ اٹھارہ سال تک زعمہ رہی اور پھر لاہور میں شاہدہ کے مقام پر جہانگیر کے برابر دفن کی گئی۔

ساخات

منتخب الملباب، خافی خان، لڑک جہانگیری (ترجمہ)، احمد علی وام پوری، طبقات اکبری (ترجمہ)، ایوب لادوی



بازگشت

نامہ سلطان اختر

چاہیے حقوقی ہوں یا غرائض... آگے پیچھے انا کرتے ہی پڑتے ہیں... اور جہاں ان کی ادائیگی میں رکاوٹ آجائے وہاں زندگی بے توقیفی کا شکار ہو کر بکھر جاتی ہے... بکھر تو اس کے خواب بھی گلے تھے جب اس کی غفلت کے باعث تمام خوبصورت رشتوں میں دراڑ اگتی... اور پھر اس کا یقین کسی رشتہ پر کبھی بحال نہ ہو سکا۔

کسی کے اعتبار سے کملاؤ کرنے والوں کا اذیت ناک انجام

تین بیٹے والے تھے۔ شاہجی تک اسکول سے گھر واپس نہیں لوٹی تھی۔ جبکہ اسکول کی چیمپی ایک بچہ ہو جاتی۔ زیادہ دور کا قاصد تو نہیں تھا۔ ممو، ڈیڈ، بے تک وہ گھر واپس آ جایا کرتی تھی البتہ کبھی بکھار جب اسکول دین کسی وجہ سے چمکی کے وقت اپنے مقررہ وقت تک اسکول نہ پہنچ پاتی تو اسے گھر پہنچنے میں تھوڑی بہت دیر سویر ہو جایا کرتی تھی۔ گاڑی پرانی تھی، کبھی بھی خراب بھی ہو جاتی۔ ایسے موقع پر آئے یا راستے میں شراب ہو جائے تو محلے کی ہم کتب بچیوں

کے ساتھ گھر آ جایا کرے۔ ایسے میں وہ زیادہ سے زیادہ
دوسوا دو پہر تک گھر آ جاتی مگر آج تو بہت دیر ہو گئی تھی۔
اس کا چنانچہ بھی مشکل بندل رہا تھا۔
دھانی بچے کے الگ بھگ اسی نے اسکول فون کر کے
یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کئی کی اسکول وین چھٹی کے وقت
بچوں کو لینے کے لیے اسکول آئی تھی یا نہیں؟ چونکہ دار نے
جوڑی فنی میچر کے جانے کے بعد میڈم کے دفتر کا دروازہ لاک
کرنے کا ہی رہا تھا، اسی کو بتایا کہ تمام لڑکیاں اسکول سے
چاکی ہیں اور اب اسکول خالی پڑا ہے۔
”آج بھر گاڑی نہیں خراب ہو گئی ہوگی؟“ اسی نے
بہت یقین سے سوچا۔ ”نہوئی ہوگی اتنی دھوپ اور گرمی میں
بچوں کی پیدل چلنے کی ہمت۔“
مزید پندرہ بیس منٹ اسی اسی انتظار میں رہیں کہ ٹا
اب پہنچی کہ تب پہنچی۔
اسی انتظار میں تھن بج گئے۔
چھوٹی چچی اور پرانے پورشن سے نیچے اتریں تو انہوں
نے اسی کو شکستہ دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے بھابی! کچھ
پریشان دکھائی دے رہی ہو؟“
”ٹا کی وین نہیں آئی ابھی تک۔“
”اب تک؟“ چھوٹی چچی کے لہجے میں تشویش تھی
”خدا خیر کرے۔ یہ گاڑی والے بغیر دیکھے بھالے چلاتے
ہیں کہنت۔“
”آئے دن خراب بھی تو ہو جاتی ہے وین۔۔۔ کتنی
دفعہ کہا میں نے ڈرائیور سے، ارے بھابی ایک مرتبہ اچھی
طرح ٹیک کرالے مگر اسے کوئی اثری نہیں۔“
”ارے وہ کہاں سنتے ہیں؟ انہیں تو بس اپنی جیبیں
بھرنے کی رہتی ہے۔“ چچی نے اظہار بڑی درد مندی سے
کہا پھر ہوتا ہوئیں۔ ”چھڑو ادا بھابی، میرے بچوں کی وین
گلو ادا ہو چکی۔“
”تھوڑے سے دنوں کی بات اور ہے زریں۔ اللہ خیر
رکھے! حد سے حد جارہے ہیں۔ اپریل کے سینے میں تو شہ
اسکول سے فارغ ہوئی جائے گی۔“
”پریشانی تو ایک دن کی بھی بڑی بھابی۔ اللہ جانے
بچوں کے دیر سویر سے گھر آنے پر مامیں کیسے اطمینان سے
بٹھی رہتی ہیں؟ میری ٹوشن یا چو میں سے کسی کو پاؤں در
منٹ بھی دیر ہو جائے گھر آنے میں تو میرا دل بولنے لگا
ہے۔ اللہ برے وقت سے بچائے۔“ اپنے آخری فقرے پر
چھوٹی چچی نے اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے۔

منہبوط محسوس کرتی۔ مٹا کے ابو پڑھے کھئے ہوتے، یہیں کہیں کوئی چھوٹی موٹی لوہری کر رہے ہوتے تو اچھا تھا۔ یقین کرو کہ جب چٹھیاں گزار کر واپس پڑوس چلے جاتے ہیں تو ان کی سلامتی کی دعا میں مانگتے مانگتے میری زبان خشک ہوجاتی ہے اور دوبارہ ان کے آنے کا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پتھر جاتی ہیں۔ مرد کے بغیر عورت کمزور اور محتاج ہوتی ہے۔ اب دیکھو، اس وقت اگر وہ ہوتے تو اب تک باہر جا کر مٹا کو ٹھہرا بھی لیتے ہوتے۔" امی کی آواز بھرا گئی۔

"اے بٹے بھائی تین میں ہونے کو آئے۔" چچی نے سعودیہ سے آئے دیوار گیر کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم کتنے آرام سے بیٹھی ہو۔"

دیواری کا دوسرا جملہ امی کے دل پر تیری طرح لگا، انہیں کیا چاہو کتنی بے سکون اور مضطرب تھیں اس وقت۔ بول کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور امدادی کھول کر اپنی ہایا نکال لی۔

"دیکھنے جا رہی ہو؟" چھوٹی چچی نے کہا۔

"ہاں نا، باہر جا کر دیکھوں۔" کہیں راستے میں گاڑی خراب نہ ہوئی کھڑی ہو۔

"ڈرائیور کا فون نمبر ہوتا ہے فون کر کے دیکھو۔"

"اس کے پاس فون ہی نہیں ہے۔"

"ہوگا تو کسی، آج کل تو جھدر بھی ہاتھوں میں سواہل اٹھائے پھرتے ہیں۔ چالاک ہے، بھانہ کرتا ہوگا کہ نہ نمبر دوں گا نہ لوگ کھڑکا دیں گے۔" شاکی کسی سبیلی کا فون نمبر نہیں ہے؟"

"میرے پاس تو نہیں البتہ مٹا نے اپنی ڈائری میں لکھ رکھے ہیں۔" امی نے ہایا کے بن لگتے ہوئے جواب دیا۔

"وقت بے وقت کے لیے جھارے پاس بھی ہونا چاہئیں۔۔۔۔۔ ہاں اس کا سواہل ہوگا، اس میں سے دیکھو۔"

"پتا نہیں کہاں رکھ کر گئی ہے؟" امی نے بھانہ کیا حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا مٹا اپنا سواہل جو اس کے ابو نے اسے سعودی عرب سے لا کر دیا تھا، میچروں کے صخ کرنے کے باوجود اپنے اسکول بیگ کے اندرونی حصے میں چھپا کر اسکول لاتی لے جاتی تھی۔

"اچھا مزینہ میں جا رہی ہوں۔"

چچی بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ہاں ہاں تم اپنا کمرالاک کر کے جاؤ میں خدا نخواستہ یہاں بیٹھی ٹھوڑی رہوں گی۔" چچی نے کہا۔

امی تھلا کر رہ گئیں۔ دیواری کی زبان میں تو انکار سے بھرے تھے۔

امی دروازے کی سمت بڑھیں اور ان کے پیچھے پیچھے چھوٹی چلی گئی۔

”اے ہاں بھالی ایشا کے اسکول ٹوفون کر کے پوچھا تھا تمہیں کہ آج اس کی وین آئی بھی تھی کہ نہیں؟“ بیٹی نے کہا۔

”پوچھا تھا۔۔۔ آئی تھی۔“ امی نے غلت میں کہا اور سکرے کے دروازے سے نکل آئیں۔ چھوٹی بیٹی کے باہر آتے ہی انہوں نے دروازہ لاک کر دیا اور کھن عبور کر کے دروازہ کھولا اور گھر سے نکل گئیں۔

☆☆☆

گلی ٹھگ ہونے کے باعث اسکول دین ٹا اور اس کی ہم کتبہ محلے دار بچیوں کو مین روڈ سے ملتی تھی۔ ٹا اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلتی تو امی گھر کے دروازے پر کھڑی ہو جاتیں اور ٹا کو اس وقت تک دیکھتی رہتیں جب تک وہ گلی پار کر کے مین روڈ پر نہ نکل جاتی۔ وین اسے ایک پان ہاؤس کے نزدیکیں سے پک کرتی جہاں اس کی دیگر ہم کتبہ لڑکیاں بھی اکٹھی ہوا کرتی تھیں۔

گلی کے ٹکڑ پر جاکر وین گھر میں رہا نہیں پڑ رہا کی پہلی عکس پر امی دین سے اسکول جاتی تھی۔ اسکول سے واپسی پر بھی وین ڈرائیور ان بچیوں کو دھیں اتارتا۔ پان سگریٹ کی وہ دکان گویا ان بچیوں کے لیے پک اینڈ ڈراپ ہوا تھا۔ اس پانکٹ سے وہ بشمول ٹا اس محلے کی چار لڑکیوں کو اسکول لاتا اور لے جاتا تھا۔ صبح ساڑھے چھ بجے بچیوں کو اپنے پانکٹ پر موجود رہا بلا دیتا تھا۔ جسے دیر ہو جاتی وین واپس اس کا انکار نہ کرتا۔ بقول اس کے صبح کے وقت ایک ایک سینکڑ جیتی ہوتا تھا۔

امی کو نہ چاہتے ہوئے بھی عکس کے گھر چلا جاتا جو ٹا کی ہم کتبہ امی نہیں ہم بھاعت بھی تھی۔ امی کے استفسار پر عکس نے بتایا کہ شائد تو صبح کے وقت وین میں بھی تھی اور نہ ہی ایسی پر آئی تھی۔

ان کے جسم سے تو بھیجے جان جاتی رہی۔

”بیٹا صبح تو میں نے اسے خود پانی نظروں کے سامنے گلی سے باہر نکالا تھا۔“ امی کے لہجے میں رقت تھی۔

”آخری شام اسٹاپ پر آئی ہی نہیں۔“ عکس اپنے وقت پر ڈوٹی رہی۔

”میں کیسے چھین کر لوں؟“ امی کی نگاہوں میں صبح ٹا کا اسکول کے لیے روانہ ہونے کا منظر تازہ تھا۔ روز بھکی طرح اس نے مہایا پھنسی جی جواس کے ابواس کے لیے سودھی عرب سے لے کر آئے تھے۔ اسٹارف سر پر اوڑھ کر اس نے

”کیس میڈم۔“

"میڈم جی لڑکی کا معاملہ ہے۔" سحرش کی ماں نے

11

سنتمبر ۲۰۱۱ء

شاید کوئی سراغ اچھا لگ سکے۔ گھر سے کوئی چیز غائب نہ تھی کہ جس سے شاپر اڑخو کہیں چلے جانے کا شبہ کیا جاسکتا۔ وہ اسکول یونیفارم میں گھر سے نکلی تھی۔ اسکول بیک اس کے ساتھ اور موبائل فون اس کے بیک میں تھا۔ اسکول جاتے وقت اس نے امی سے حسب معمول میں روپے بطور جیب خرچ لیے تھے اور بس!

تفتیشی افسر نے آس پڑوس کے لوگوں سے بھی تفتیش کی۔ وہ شا کے اسکول بھی گیا۔ اس کے بارے میں ہر ایک سے یہی سننے کو مل رہا تھا کہ وہ ایک اچھی لڑکی تھی۔

اس اچھی لڑکی کے بارے میں اس کے والدین اور دیگر متعلقین کسی بری خبر کے متکثر تھے۔ اب اچھی خبر کہاں سے آسکتی تھی؟ اسے سم ہوئے ہلے بھر ہو چکا تھا۔ اخبارات اس کی کشمکش کی سرخیاں جھکا کر اس خبر کو ختم بھی کر چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

آخوں دن کوئی شب بارہ کا مکمل ہوگا جب شا کی امی کو ان کے سر ہانے دھرے موبائل فون کی سیپ نے یک لخت اٹھا کر بٹھا دیا۔ شا کی کشمکش کے بعد اس فون کا اور ان کا دن رات کا ساتھ ہو گیا تھا۔

شا کی امی نے فہرہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور فوراً کال ریسیو کی۔

”ہیلو“ امی کے لہجے میں بیٹائی کے ساتھ خوف کا عنصر بھی تھا۔

جواب بہت دبیسی آواز سنائی دی۔ ”ای“

ای کا دل اچھل کر مقل میں آن اٹھا۔

یہ تو شا کی آواز تھی جسے وہ دنیا جہان کے انسانوں کی آوازوں میں بھی پہچان سکتی تھیں۔

”شا! امی اٹھ اٹھائی کہہ سکیں۔“

”کلی امی“ مجھے معاف کر دیں۔ آپ پریشان ہوئی ہوں گی۔ ”وہ کہہ رہی تھی۔

شا کے اب بھی جاگ گئے تھے۔

”کہاں بوترہ؟“ امی نے پوچھا۔

”بتا دوں گی مگر ابھی نہیں۔ میں اپنی مرضی سے آئی ہوں امی۔“

”شا... شا... شا...“ امی دیوانوں کی طرح چیختی چلاتی رہ گئیں۔

کال منقطع ہو چکی تھی۔

امی سوچ رہی تھیں، سچ وہ خبر کس منہ سے اپنے پر ایوں کو سنائیں گی کہ آٹھ دن گھر سے باہر رہ کر بھی شازندہ تھی۔

شا کے ابو سر جھکائے مغموم، متکثر اور شرمندہ بیٹھے تھے۔ آٹھ دن گھر سے باہر رہنے والی بیٹی کے ذمہ ہونے کی خبر کے ساتھ لوگوں کا سامنا کرنے کا تصور ہی روح فرساتھا۔ مگر سامنا تو بہر حال کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

”مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ دو چار دن میں، اور ہر اکس سے خبر آجائے گی۔ لڑکیوں کو یہ یاد کرنا ہوتا ہے کہ ساتھ میں موبائل پکڑ دو۔“ چھوٹی چچی جو ہمیں کھا کھا کر تفتیشی افسر کو شا کی مصیبت کے بیانات رقم کرائی رہی تھیں شا کے فون کی خبر سن کر بولیں۔

”ابھی فون آیا ہے، دو چار دن میں خود بھی آجائے گی۔“ چھوٹی ممانی نے کہا۔

”دیدہ دلیری تو دیکھو، میں اپنی مرضی سے آئی ہوں۔“ بڑی چچی نے فون پر کسے گئے، شا کے وہ الفاظ دہرائے جو امی کو نہ چاہتے ہوئے بھی تفتیشی پولیس افسر کو بتاتے پڑے تھے۔

”اس سے بھتر تھا کہ اس کے سر نے کی خبر آئی ہوتی۔“ چھوٹے ماموں پکارتے۔

”خاندان کی ہاک کنوا دی۔“ پچانے زور سے زمین پر پاؤں پٹتے۔

”ارے یہ تو بچہ پچھا ہوتا اس بے حیا سے کہ ہے کہاں اور کس حال میں ہے؟“ شا کی ممانی کے لہجے میں درد مندی تھی۔

”اس نے منٹ بھر تو بات کی تھی۔“ امی بولیں۔

”دو گھر کرے گی۔ گھر سے جانے والی لڑکیوں کو گھر کی یاد بھی آتی ہے جب انہیں باہر والوں کی لاتیں پڑتی ہیں۔“ چھوٹی جوا اپنے بیٹے سے شا کا رشتہ مانگنے کا ارادہ رکھتی تھیں، زہرہ بیٹھ لہجے میں بولیں۔

تفتیشی افسر نے ایک انجینی سے گھات لگوای اور فون ٹریک سسٹر کے ذریعے شا کا پتا لگا لیا۔ وہ گرجا نوالہ کے ایک ہوٹل میں اس شخص کے ساتھ بیٹھ گئی، جوا سے اپنے ساتھ بھاگ لے گیا تھا۔ چھاپے کے دوران میں وہ کسی طرح بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

پولیس پارٹی شا کو حراست میں لے کر اس کے اپنے گھر لے آئی۔

تین چار دن اسے حوالات میں رکھا گیا۔

اس سے پوچھ گچھ ہوتی رہی۔

شرمناک استفسارات!

بے شری کی حدیں پار کر جانے والی حرکتیں! دن میں ہر آدنی والی اس سے اپنی آنکھوں کی پیمائش بچانے کی کوشش کرتا۔

رات کو وہ حوالات سے باہر افسر بالا کے حضور ہوئی۔

گھر سے بھاگتے وقت اس کے سامان گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ سب ہوگا! اس کی مصیبت اور سادہ لوحی نے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی باتوں کے حال میں پھنسانے اور سبز باغ دکھا کر اسے اجاڑنے کے لیے بھاگ لے جانے والا وہ میار شخص جس کا نام امان تھا اسے یوں بے امان کر کے چوروں کی طرح نکل بھاگے گا۔ اس کا کیا بکڑا تھا۔ وہی لٹ گئی تھی۔ جسے کہیں کی۔

اس کی بے عقلی کی سزا امی کو بھی بھگتنا پڑ رہی تھی۔ ابو

امی کو سوراخ لڑا مگر پھر ارہے تھے۔

”میں تو روزی کی خاطر پردیس میں تھا، جنہیں اس کا خیال رکھنا تھا۔“

بہروردی اور دل داری کرنے والوں کی نگاہیں بدل گئی تھیں۔ گئے ماموں نے ممانی سے کہہ دیا تھا۔ ”اگر تم نے اپنی

اس بیٹی اور نواسی سے کوئی تعلق رکھا تو ہمارا تہہ راتھ لٹھکتا۔“

چھوٹی جوا اپنے بیٹے سے شا کا رشتہ کرنا چاہتی تھی، کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتی۔ ”فکر ہوا جو میرے مالک نے نہیں

اس کند میں بھٹنے سے بچا لیا۔ ارے اسکی لڑکیاں کسی شریف آدمی کا گھر توڑ رہی ہسائی ہیں۔“

اس کی ناچھی اور عاقبت نااندیشی نے امی ابو کو کسی کو شرمکھانے لائق نہ چھوڑا تھا۔ ابو کی شرمندگی کا تو یہ عالم تھا کہ انہوں نے قاتلے بکھری سے اس کی گھر خواہی کے لیے ان

جنگیوں کا رخ ہی نہ کیا۔ امی انکی بھاگ دوڑ کرتی رہیں۔ جس روز اسے گھر آنا تھا، ابو نے چپ چاپ ٹکٹ کٹا اور سودی

عرب واپس چلے گئے۔ جاتے ہوئے پچاسے کہہ گئے۔ ”بس یہ آخری بار آنا تھا، اب زندگی موت سب پروں میں۔“

وہ تھا نے بکھری کے خدا یوں سے گزر کر گھر آئی تو سب نے تماشا بنا لیا۔ بس ماموں تو نہ آئے باقی سب اسے کسی

گھوسے کی طرح دیکھنے پہنچے۔ نگاہوں میں تحقیر اور چوروں پر استہزاء بے مسکراہٹ لیے۔ ممانی مات کے اندھیرے میں

ماموں سے چپ چپ چپا کر کھلے آئیں۔ ہماری دنیا میں اس کے لیے جیسے ایک ہی رشتہ رہ گیا۔ امی نہ تو تیں تو وہ کہاں جاتی؟

چھوٹی چچی من سے بالائی منزل کو جانے والے لڑنے سے اپنی گردن لٹکا کر بچے دیکھنے جاتیں۔ اس نے اور امی نے محن میں لٹکائی ترک کر دیا۔ اپنے پر ایوں سے ملنا

موقوف ہو گیا۔ امی سودا سلف لانے کے لیے گھر سے باہر نکلتیں تو پورا چہرہ ڈھانپ کر واپس لوٹیں تو کسی نہ کسی زبان کے کشتے سے گھاؤ کھا کر۔

اس سے بڑی مصیبت یہ بکھری ہوئی کہ اس کا پاؤں

بھاری ہو گیا۔ امی نے یہ جانے ہوئے بھی کر شا کو بھاگ لے جانے والا پہلے سے شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ بھی تھا، اپنے دل پر پتھر رکھ کر شا سے اس کا نمبر لیا اور اسے فون کیا کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا، اب وہ شا کو وہ معاشرتی تحفظ تو دے جو اس کے بطن میں سمو پانے والے بچے کے لیے ذرا حال بن سکے۔

وہ آقا تو امی صدمے سے بے حال ہو گئیں۔

لاڈوں کی پٹی، پری چھس پٹی کے لیے وہ بوٹ!

کریمہ الصدورت اور خیر مہذب جسے بات کرنے کا ڈھنگ تھا نہ اٹھنے بٹھنے کی تیز۔ کوئی مقبول روزگار تھا، نہ شا کے محفوظ مستقبل کی کوئی ضمانت۔

امی کی بے بسی کی انتہا یہ تھی کہ وہ شا سے یہی سن نہ پوچھ

پائیں کہ اس شخص میں اسکی کون سی خوبی دیکھی تھی اس نے، جو وہ اس کی خاطر عزت اور وقار کی ساری حدیں ہی بھلا نک گئی تھی؟

شا کے جیز کے لیے اٹھا کر رکھا گیا وہ سارا سامان جو وہ بڑی محبت اور چاہت سے سنت سینٹ کر رکھتی رہی تھیں، انہوں نے پوچھل دل کے ساتھ جہازی ساز کے مشقی ٹریک

اور چرمی صندوقوں سے نکال کر بھاروا پھٹا اور دوبارہ بیک کیا۔ امان نکاح خواں اور گواہوں کو ساتھ لے کر آیا۔ ابو جو

دلی تھے، قطع تعلقی کا اظہار کر چکے تھے۔ امی نے چار کھلے داروں کو بلایا اور اپنی دل و جان اپنی گواہی سے دینی مگر مرد کی زوجیت میں دے دیا۔

امان اسے اس وعدے پر کہ پہلے وہ اپنے گھر والوں کو

اپنی دوسری شادی پر آمادہ کرے گا پھر اپنے ساتھ لاہور اپنے گھر لے جائے گا، رخصت کر کے کرائے کے ایک مکان

میں لے گیا۔ مکان کا تین ماہ کا شقی کرایہ بھی امی نے دیا۔

تقریباً ایک ماہ وہ شا کے ساتھ رہا نہ مکان نہ دھانا۔

تمام دن بستر پر پڑا چار پائی توڑتا رہتا اور سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جاتا یا پھر چائے کی طلب۔ شا امی سے ملنے جاتی یا امی اس سے ملنے کے لیے آئیں تو خاموشی سے اس کی مٹی میں کچھ

بیسے دبا جاتیں۔ ابو نے تو اپنے قطع تعلقی کیا تھا کہ امی فون بھی کر تیں تو کال ڈراپ کر دیتے۔

میں بھر شا کے ساتھ گزار کر وہ ایک روز بھر کہہ کر گھر سے چلا گیا کہ میں اپنی بیوی اور گھر والوں کو دوسری شادی کے لیے منانے جا رہا ہوں۔ دو چار دن میں واپس آ جاؤں گا۔



دھک دھک دل سے بول... مَرَحَبَا اسپغول

مرحبا اسپغول بدن میں لائے طاقت اور باقی کیونکہ صحت نہ بھرتا ہے
معدے کی جلن اور کولیسٹرول بھی بھرتا ہے آپ دیکھیں اس قدر صحت اور طاقت



میٹرک کرنے والوں کو نرسنگ میں داخلہ جاتا ہے۔ میں بھی
نرسنگ کروں گی۔

امی نے پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ کیا سوچا تھا اور
کیا ہو گیا؟

ماں باپ اولاد کے لیے کیسے کیسے خوشنوا ہوں گے
جال بننے ہیں اور قسمت اولاد کے ساتھ بھی سبھی ماں باپ کو
بھی یہی ولدل میں اتار دیتی ہے؟

ٹٹا کو میٹرک میں سائنس اس لیے دلوائی تھی کہ اگر اس
کی پھوٹی نے ٹرکے کی تعلیم کی وجہ سے رشتہ مانگنے میں دیر کی
تولہ کے کی طرح وہ بھی سائنس پڑھ کر ڈاکٹر بنے گی۔

”اچھا تو تم نہ کر، میں جاؤں گی میڈم کے پاس بلکہ تو
بھی ساتھ چلتا ہوں۔“ امی نے اسے دلا سا دینے کی کوشش کی۔
”مجھے شرم آتی ہے۔ لڑکیاں نہیں کی۔“

”بھینا جس کے لوگ اب اس سے زیادہ کیا نہیں کی
لڑکیاں؟“ امی کے کچھ میں ملال تھا مگر ٹٹا کو شرمندہ دیکھ کر
انہوں نے اپنا لہجہ بدل لیا۔ ”یہ تو سوچ کر اگر اسکول نہیں گئی تو
پڑھے گی کیسے اب اس ایک دفعہ کی جھگ ہے پھر سب ٹھیک
ہو جائے گا۔“

ٹٹا کچھ دیر چپ رہی پھر دیر سے بولی۔ ”ٹھیک
ہے تو پھر کل ہی نہیں۔“

”انشاء اللہ۔۔۔ ہاں مگر ایک بات۔۔۔ میڈم کو اپنے
کٹاج اور اس بات کا نہ بھانا۔“

”اس بات“ سے امی کی مراد اس کا امید سے ہونا تھا۔
☆☆☆

اگلے دن امی اسے اپنے ہمراہ لے کر اسکول گئیں۔
دو دنوں کا حجاب تھیں مگر پھر بھی ٹٹا کی استانیوں اور اسکول کی
لڑکیوں نے اسے پہچان لیا۔ میڈم کچھ مصروف تھیں۔ ان
سے ملاقات کے انتظار میں ان دونوں کو دفتر سے ملنے ایک
پھوٹی سی انتظار گاہ میں بیٹھنا پڑا۔ اس انتظار کے دوران
میں دو تین استانیوں اور ٹٹا کی چند ہم جماعتوں نے انتہائی
تجسس سے انتظار گاہ میں جھانکا۔ ایک لڑکی بھلیت تمام اندر
بھی چلی آئی اور ٹٹا سے مل کر واپس چلی گئی۔

میڈم تک رسائی ہوئی تو امی اور ٹٹا دونوں اپنے چہروں
سے حجاب ہٹانے کی کوشش نہ ہوئیں۔ ان کی صرف آنکھیں
دھکی ہوئی تھیں۔ ٹٹا میڈم سے نظریں ملانے کی ہمت نہ کر
پا رہی تھی۔ امی بھی ان سے ٹٹا کی چار بات کر رہی تھیں۔ ٹٹا
کی کشمکش سے لے کر اس کی بازاریابی تک کے حالات حسب
مصلحت تو ضرور ذکر بیان کیے۔ اس کے کٹاج اور امید سے

”میں اکیلی کیسے رہوں گی؟ مجھے ڈر لگے گا۔“ ٹٹا نے
کہا۔

”اپنی امی کو یہاں بلا لیتا یا تم خود ان کے پاس چلی
جاتا۔“ اس نے جواب دیا۔

”آپ خود ہی مجھے امی کے ہاں چھوڑتے جائیں۔“
”تاہم کب تک ہے میرے پاس۔“ اس نے سر دھری سے
کہا۔

وہ چلا گیا تو اس نے پوچھل دل سے امی کو فون کیا۔ امی
آئیں اور اسے اپنے ساتھ لے گئیں۔ دو چار دن میں وہ اپنی
کاوندہ کر کے جانے والے نے چار ہفتوں تک پلٹ کر خبر نہ
لی تو امی کو تشویش لاحق ہوئی۔

”ٹٹا مجھے تو وہ واپس آتا نہیں لگتا۔“ امی کے دل کا
خوف زبان تک آ گیا۔

”نہیں امی وہ ضرور آئیں گے، اگر وہ بھاگنے والے
ہوتے تو آپ کے بلانے پر کیوں آتے؟“ ٹٹا نے اس کی
طرف داری کی۔

”آیا بھی تو اس نکلے کے ساتھ تیری زندگی کیسے
گزرے گی؟“

امی کے اس سوال کا ٹٹا کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔
اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ امی ماں تھیں، ان کا دل
بھرا آیا۔

”نہرو، میرا دل کتنا ہے۔“ امی نے اس کا سراپے
پینے سے لگا لیا۔

”ان کے کماے بغیر گزارا کیسے چلے گا، امی؟“ آنسو
رکے تو اس نے کہا۔

”میں سوچ سوچ کر نہیں پریشان ہوئے جاتی
ہوں۔“ امی نے ایک سرد آہ بھینکی۔ ”ایسا کر بیٹا تو اپنی
پڑھائی شروع کر دے۔ پڑھ لکھ لے گی تو اپنا اور دنیا میں
آنے والے کا بوجھ اٹھائے گی۔ استخوانوں میں تین چار مہینے
ہی تو رہ گئے تھے مگر تونے پڑوانہ کی، اپنے بچہروں پر خود
کھانا ڈال ماری۔“

ٹٹا نے سر جھکا لیا اور اپنی بے گشت شہادت کو تخت پر بچے
تخت پوش پر آڑا تر چھا ٹھانے لگی پھر چھتاوے سے عمارت
لجھ میں ہوئی۔ ”اب تو استخوانوں میں تین چار مہینے بھی نہیں
بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ آپ جا کر میڈم سے بات کریں۔
اگر وہ مجھے بیٹھنے کی اجازت دے دیں تو میں کم از کم میٹرک تو
کمال لوں۔ میری کلاس میں ایک لڑکی تھی، اس کی امی نرس
تھیں۔ پتا نہیں کچ یا لفظ، وہ بتاتی تھی سائنس کے ساتھ



پاکیزہ

ستمبر 2011ء کا شمارہ

عمیرہ احمد عکس

عکس و رنگ پچھلے سلسلہ زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کی کھوج و جستجو کا سفر

شیریں حیدر

شیشوں کا مسیحا کونسی نہیں

مسائل حیات کے مختلف زاویے نظر کو اجاگر کرتا ایک پرتاثر ناول

عالیہ بخاری خوشبو کا سفر

محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز سمجھ لینے والے دیوانوں کا ماجرا سلسلے دار ناول کی ایک اور کڑی

راحت وفا ایک تھنی نیناں

انسانی ذہن کی نفسیاتی الجھنوں احساسات و خیالات سے مزین ناول

رضوانہ پرنس اور سدرۃ المنتہی

کے دلکش و خوب صورت جذبول میں ڈھلے ناولت

فریدہ اشفاق عطیہ ہدایت اللہ

سیما یاسمین مجتبیٰ غزالہ فرخ

قرۃ العین رائے نزہت حبیب رفاقت

جاوید اور دیگر مصنفات کی دلچسپ اور یادگار تحریریں

آپ کی آراء و رائے مجھے متسل سلسلے

کتاب سے منسلک موضوعات پر

افورڈ کر ہی نہیں سکتیں، اب تو ہمیں بہادری سے حالات کا سامنا کرنا ہے۔ دو مین آف آئینل بننا ہے، فولادی خاتون۔ جب ہی کامیاب رہو گی اور جب ہی جی بھی پاؤ گی۔ ہم نے سنا تھا تمہاری شادی ہو گئی؟

اس نے یک لخت تڑپ کر میڈم کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں گھائل برائیوں کی وحشت تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے نظریں جھکا لیں اور مومہ سی آواز میں بولی۔ ”نومیم۔“ ”دس سال تم اس ادارے کی اسٹوڈنٹ رہی ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جموت مجھے بالکل پسند نہیں۔ سچ پر میں بڑی سے بڑی غلطی معاف کر دینے کو تیار رہتی ہوں۔“ ”جی میم۔ ہو گئی ہے۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”ای سے؟“ اس نے دھیرے سے سر اٹھاتے میں بلایا۔ ”کون ہے وہ؟ کیا کرتا ہے؟“ وہ چپ رہی۔

”بولو۔ تم تو بڑی اچھی لڑکی تھیں، تمہارے بارے میں ہمیں کبھی کوئی شکایت، کوئی اتنی سیدھی بات سننے کو نہیں ملی۔ حد یہ ہے کہ اس واقعے کے بعد بھی جب تمہاری کلاس نیچر نے تمہاری گمشدگی کے اگلے دن صرف اس لیے کہ شاید کوئی سراغ مل سکے تمہاری کلاس کی لڑکیوں سے پوچھ گچھ کی تو تمہارے بارے میں کسی نے کوئی ٹیکو بات نہیں کی۔ کون تھا وہ جو تم بھی اچھی لڑکی کو بھڑکا کر اپنے ساتھ لے گیا؟“ ”آپ کو جموت پسند نہیں تا میم۔“ وہ دھیمے سروں میں بولی پھر اس نے اعترافی لہجے میں کہا۔ ”میں خود ہی تھی۔“ میڈم نے چونک کر اسے دیکھا۔

سچ بولنے کی طاقت رکھنے والی لڑکی کے کردار میں جھول نہیں ہو سکتا۔

”نیم۔ میں سائنس کیمیکس میں بہت اچھی نہیں تھی ناں۔ اس لیے امی نے مجھے مکے کی ایک باجی کے ہاں لیوٹن لگوا دی تھی۔ باجی اچھی تھیں مگر ایک دن جب وہ مجھے میٹ دے کر اپنے گھر کے ایک کمرے میں میٹھو بٹھا گئی تھیں اور دوسرے کمرے میں وہ بانی بچوں کو پڑھاری تھیں کہ باجی کے ایک کزن آ گئے اور۔۔۔ انہوں نے مجھ سے بدتمیزی کی باتیں شروع کر دیں پھر مجھے دھمکی دی کہ اگر کسی سے کچھ کہا تو میں تمہارے گھر کو آڑا دوں گا۔ پھر وہ روز روز آنے لگے۔ کبھی مجھے اشارہ کر کے پانی پینے کے بھانے کچن میں بلا لیتے کبھی کسی اور بھانے سے کمرے میں۔ وہ مجھے دھمکیاں بھی دیتے تھے، کبھی ابو کو قتل کروا

”پلیز!“ میڈم کے اس ایک لفظ میں ان کا چہرہ امداد چھپا تھا۔ وہ جانتی تھیں ای ان کے دفتر سے اٹھ کر انتظار گاہ میں چلی جائیں اور انہیں شاہ سے بات کرنے کا موقع دیں۔ امی انہیں۔ ثنائے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔ ”مت جائیں۔“ امی ہلکی گئیں۔

”ادھر میرے سامنے آکر بیٹھو۔“ میڈم نے اپنی میز کے دوسری طرف ملاقاتیوں کے لیے پڑی کرسیوں کی جانب اشارہ کیا۔ ”ناموٹے پر سے اٹھ کر میڈم کے دروازے پر بیٹھی۔“ ”اپنے چہرے سے حجاب کچھ کر لو اور بالکل اطمینان سے بیٹھو۔“ ”میں ایڑی۔۔۔ اوکے!“ ”میں نیم۔“ ثنائے میڈم کی ہدایت کے مطابق حجاب نیچے کر لیا۔

میڈم نے دیکھا اس کا چہرہ لیٹے سے تر تھا۔ گرمی کی حدت سے اس کی شہابی رنگت اور دھکی دھکی اٹھی تھی۔ جوڑوں جیسی سیاہ آنکھوں میں گہری شاموں کی سی اداسی تھی۔ سیاہ بالوں کی چھوٹی چھوٹی ٹیسٹ نیو لیں کی صورت اس کی پیٹنے میں میٹھی گردن سے لیٹا پڑی تھیں۔

میڈم نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا تو اس نے جھینپ کر نظریں چرائیں۔ ”تمہیں معلوم ہے؟“ ”نہا خدا اپنے بندوں کی بڑی بڑی غلطیاں معاف کر دیتا ہے لیکن اس کے بندے اپنے ہی جیسے بندوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں بھی معاف نہیں کرتے۔ میٹرک کی اسٹوڈنٹ کو یہ بات سمجھنے میں دشواری تو نہیں ہوتی چاہیے۔“ ”میں نیم آؤ وہ دھیرے سے بولی۔

”بیٹا پھر کیوں کی ایسی غلطی، جس کی دوسرے بندے تمہیں شاید ساری زندگی معافی نہیں دیں گے۔ تمہیں یاد ہے ایک روز ایک بچی کی غلطی پر تم سب کو ایک لہبا پھر چلاتے ہوئے میں نے تم بچکوں سے کہا تھا کہ ایک شعر سنو اور اس کا مقیم اپنے دل پر لکھ لو۔۔۔ کبھی بھی ایک لمبے خطا کا عذاب صدیوں تک سہا پڑ جاتا ہے۔ یاد ہے تمہیں؟“ ”میڈم کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

”میں نیم۔“ اس کی نظریں اور جھپک گئیں۔ ”کیا میرے سمجھانے میں کمی رہ گئی تھی یا۔۔۔ تم نے مجھے کی کوشش ہی نہیں کی؟“ ”نہ۔۔۔ نہ۔۔۔ روٹنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ رونا تم

ہونے کی بات بالکل ہی چھپا گئیں پھر عرض دعا کی۔ ”میڈم، بچی کے مستقبل کا سوال ہے اگر آپ اسے کلاس میں بخادیں تو یہ امتحان دے لے گی۔ سال ضائع ہونے سے بچ جائے گا۔“ ”مجھے آپ سے اور اس بچی سے پوری بہادری ہے لیکن یہ ایک ایسا ٹیکس ہے جسے پریس میڈیا کافی ایکسپوز کر چکا ہے۔ شاکی اسکول سے طویل غیر حاضری اور ٹیس کی عدم ادائیگی کے باعث اس کا نام ہی خارج کیا جا چکا ہے۔ اسے دوبارہ کلاس میں بیٹھنے کی اجازت دینے کے لیے مجھے اپنے افسران بالا سے اجازت لینا ہو گی۔“ ”میڈم آپ سفارش کریں گی تو افسران اجازت کیوں نہ دیں گے بھلا؟“ امی نے انتہائی بجز سے کہا۔ ”لیکن ایک بات بتائیے۔“ ”جی میڈم۔“ امی ہر تین کوشش ہوئیں۔ ”ہمیں تو شاکی کلاس کی لڑکیوں سے یہ پتا چلا تھا کہ آپ نے اس کی شادی کر دی ہے۔“ ”نہیں میں میڈم۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ افواہ ہے۔“

میڈم نے ایک نظریں پر ڈالی پھر امی سے بولیں۔ ”مجھے آپ تنا سے علیحدگی میں بات کرنے کی اجازت دیں گی؟“

”جی میڈم کیوں نہیں۔“ امی ہچکچاتے ہوئے بولیں۔ ”آپ ویٹنگ روم میں تھریف رکھیں۔“ ”ای کچھ حذب بڈ ہی دکھائی دینے لگیں۔“ ”آپ مطمئن رہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ اصل میں والدین، اساتذہ اور بچے بڑی مضبوط کڑیاں ہیں۔ اگر یہ کڑیاں ہم آہنگ رہیں تو زنجیر بنی رہتی ہے لیکن جہاں کوئی کی دو کڑیوں کے سچے کمزوری آجائے یہ خوبصورت زنجیر ٹوٹ جاتی ہے۔ شاہجہلی جماعت سے اس اسکول میں پڑھ رہی ہے۔ تقریباً دس سال کا ساتھ ہے اس کا اور ہمارا۔ جس تا پندیدہ صورت حال کا آپ کو اور ہم سب کو تھکے سلسلے میں سامنا ہوا اس میں بحیثیت استاد میں بھی اپنی ذمہ داری محسوس کرتی ہوں۔ میں شاہ سے بات کر کے یہ اندازہ کرنا چاہتی ہوں کہ اگر ہم سے غلطی ہوئی تو کس مقام پر۔۔۔ شاید اس سے ہمیں اپنے معاملات درست کرنے میں مدد مل سکے؟ ذاتی طور پر میں اس بات کی قائل ہوں کہ ہم میں سے ہر انسان خطا کا پتلا ہے لیکن ہر انسان کو اپنی ہی نہیں دوسرے انسانوں کی غلطیوں سے بھی سبق لینا چاہیے۔“ ”ای قدرے مطمئن دکھائی دینے لگیں۔“

دینے کی، کبھی ای کو گاڑی سے گر مارنے کی اور کبھی میرے منہ پر تیزاب پھینکنے کی، میں امی سے کبھی کمرپوش کے لیے نہیں جاؤں گی تو ای ذاتیں کرتو پڑھائی چورنگی ہے۔ میم! وہ مجھے میرا سوا بل فون بھی بند نہ کرنے دیتے رات رات بھر باتیں کیے جاتے۔ گندی گندی، بری بری باتیں۔ پھر میم، انہوں نے امان کو بھی یہ سب کچھ بتا دیا اور اسے میرا نمبر بھی دے دیا۔

”امان کون؟“ میڈم نے پوچھا۔

”میم وہی جن سے میری شادی کی ہے امی نے۔“

”آئی سی۔“

”پھر میم امان میرے پیچھے پڑ گیا، فون کرتا اور کہتا فون نہیں سنو گی تو تمہارے گھر والوں کو شیراز کا اور تمہارا قصہ بتا دوں گا۔“

”شیراز وہی، ہائی کا کزن؟“

”جی ہاں۔“

”پھر۔۔۔؟“

”پھر میم وہ مجھ سے ملنے کے لیے بھی کہنے لگا اور ایک روز جب میں وین کے لیے اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی، وہ مجھے راستے سے اپنے ایک دوست کے گھر لے گیا۔ چھٹی کے وقت اس نے ہمیں اسکول گیٹ کے باہر چھوڑ دیا۔ ایک دن وہ مجھے اسکول سے آدھی چھٹی دلو کر پارک بھی لے کر گیا تھا۔“

”اسکول سے چھٹی دلو کر؟“ میڈم چوٹیں۔

”جی ہاں، اس نے کہا تھا کہ میں دادا کی فوننگی کی خبر لے کر تمہیں چھٹی دلوانے آؤں گا۔ تم کہنا یہ میرے چاچا ہیں۔۔۔۔۔ دو تین مرتبہ کبھی راستے سے مجھے پارک لے گیا تھا۔“

”امامانی گاؤ؟“ میڈم نے اپنا سر ہاتھوں سے قلم لیا پھر شاکو سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”گھٹی تمہاری ناہم کیوں جاتی رہیں اس کے ساتھ؟“

”میم وہ دھمکی دیتا تھا کہ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تمہارے گھر والوں کو تمہارا اور شیراز کا پتھر بتا دوں گا۔“

”اور وہ شیراز؟ وہ بد بخت کہاں گیا؟“

”اس نے کسی اور لڑکی سے دوستی کر لی تھی۔“

”پھر تم اس دوسرے شخص کے ساتھ گھر کی سے ملی گئیں؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ اس نے کہا تھا، لاہور میں میرے گھر والے رہتے ہیں، وہاں جا کر شادی کر لیں گے پھر واپس آجائیں گے۔“

”شادی کی اس نے؟“

”وہ تو مجھے ہوئی میں چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ پولیس مجھے اپنے ساتھ یہاں لائی۔ چار دن میں پولیس اسٹیشن میں رہی۔“

”میڈم سن رہ گئیں۔“

”شاکو کے چہرے پر بھری معصومیت دیکھ کر جینن نہ آتا تھا کہ وہ اتنی ہی عمر میں اسے عذاب سہہ چکی ہے۔“

”پھر امی نے اسی کو بلایا اور میرا اس سے نکاح کر دیا۔“

”کرتا کیا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔ امی خرچے کے لیے دیتی ہیں۔ ایک مہینے پہلے وہ اپنے گھر گئے تھے، اپنی مکی بیوی سے دوسری شادی کی اجازت لینے۔ ابھی تک واپس نہیں آئے۔“

”تم کہاں رہ رہی ہو؟“

”امی کے گھر میں۔“

”اوہ خدا یا!“

”میں نے امی سے کہا کہ میں بیڑک کر لوں تو نہ تنگ کر لوں گی۔ اب تو مجھے۔۔۔۔۔ بچے کو بھی پانا ہوگا۔“

”بچے کو کس کے بچے؟“

”اس کے چہرے پر بھرے حزن و ملال میں حیا کا رنگ بھی مثال ہو گیا۔“ میم۔۔۔۔۔ بریکفٹ ہوں میں۔“

”مکی کی کسی ایک نو عمر لڑکی، اپنے چہرے پر جہان بھری صوبھوں کی سختی لیے میڈم کے رو برو کھڑی تھی اور اس لڑکی کے لیے ان کا دل بے تحاشا دکھ رہا تھا۔

”اسی نہ جانے تھی لڑکیاں ہوں گی۔۔۔۔۔ خود غرض، بے رحم اور بد کردار مردوں کے ہاتھوں لپٹی ہوئی۔“

”میڈم نے گھٹنی بجا کر چڑھ اسی کو بلایا اور کہا۔ ”ویننگ روم میں شاکو والدہ چھٹی ہوں گی، انہیں سمجھو۔“

”امی دوبارہ میڈم کے دفتر میں آئیں تو ان کے بیٹھے کے بعد میڈم نے کہا۔ ”آپ یہاں سے جانے کے بعد شاکو اس بات پر ہرگز کچھ نہیں سمجھیں گی کہ اس نے مجھے سب کچھ سچ کیوں بتا دیا؟“ امی نے بھی اور کسی نہ کسی کے سامنے توجہ یونانی پڑتا ہے۔ ”میڈم نے توقف کیا، پھر بولیں۔ ”یہ بچی جس نا پسندیدہ صورت حال کی شکار ہوئی اس کی ذمہ داریہ اپنی نہیں، ہم سب ہیں بلکہ بچہ بچیں تو پورا معاشرہ۔۔۔۔۔ معاف کیجیے گا ماں ہونے کے ناتے ہنی کے سلسلے میں آپ کی بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ آپ نے

سوچے کچھ بغیر، اوروں کی دیکھا کبھی جوان بیٹی کو ٹیوشن کے لیے دوسرے گھر بھیجا شروع کر دیا۔ جوان بچیوں کو تو پوس آگئیں بند کر کے اپنے گھر رشتے داروں کے ہاں بھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اسکول نے کسی تقدیق کے بغیر اسے چھٹی دلوانے کے لیے آنے والے خود سامعیت چکا کے ساتھ گھر بھیجے میں کوئی قاحت محسوس نہیں کی۔ وہ محض اسے کئی بار ادھر ادھر لے گیا لیکن معاشرے کے افراد میں سے کبھی کسی نے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اسکول یہ نیفا روم میں ٹیوشن لڑکی، کسی شخص کے ساتھ پارک میں کیوں بیٹھی ہے؟ ہم سب اندھے، بہرے اور گونگے بنے اپنے روز و شب گزار رہے ہیں۔ سب کی سزا صرف ایک لڑکی کو دینا انصافی ہوگی۔ شاکو کے لیے تعلیم حاصل کرنا پہلے ضروری تھا، اب ضرورت بن گئی ہے کیونکہ اسے اب اپنے ساتھ اس بچے کی ذمہ داری بھی اٹھانی ہے جو دنیا میں آنے والا ہے۔“

”ای چوٹیں۔“

”کیا اس حد تک بول گئی تھی شاکو!“

”میڈم! آپ اس کا نام دوبارہ داخل کر لیں گی؟“

”امی نے پرامید لہجے میں کہا۔

”آپ اس کی فکر نہ کریں۔ سمجھیں کہ اس کا نام خارج ہوا ہی نہیں۔“

”بہت بہت شکریہ۔“ امی سر تاپا منوں احسان و کمائی دینے لگیں۔

”میرے بچے اسکول آجائیں؟“ شاکو کے لہجے میں گھٹی گلی کی سی چٹک تھی۔

”دیکھو شاکو، میں تمہیں کلاس میں بیٹھنے کی اجازت تو نہ دے سکوں گی کیونکہ اس سے بہت سارے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔ تمہارے لیے بھی اور ادارے کے لیے بھی۔ یہاں سب کو معلوم ہے، ہر شخص کریدے گا۔ تفصیل جانا چاہے گا تم ڈسٹرب ہوگی اور تمہارے کلاس میں بیٹھنے سے دوسری لڑکیوں کو گویا یہ پیغام ملے گا کہ ہم کچھ بھی کر لیں اسکول کا راستہ تو کھلا ہے۔ بہتر ہے تم گھر پر بیٹھ کر امتحان کی تیاری کرو۔ میں تمہاری سنجیدگی سمجھتے ہو کہ دوں گی کہ تمہیں گھر پر بیٹھنے میں کوئی مشکل ہو تو آکر ان سے رہنمائی لے سکتی ہو۔ پرائیکٹس بھی کروادیں گے ہم۔ تم گھر پر رہ کر امتحان کی تیاری کر دے گی مگر ایک ریگولر اسٹوڈنٹ کے طور پر امتحان میں شریک ہو سکتی ہو۔ کیا یہ سہولت کافی نہیں؟“

”جی ہاں۔“ وہ اداسی اور نیم دلی سے بولی۔

”اور ہاں، ایک بات اور سمجھ لو اس مہربانی کو اپنا حق مت جانتا۔ میری جگہ تمہارا ساجھ کی ایسی خاتون سے بھی تو بڑھ سکتا تھا جو تمہاری اس گھٹی کے بعد تمہیں اپنے آس میں داخل ہونے کی اجازت بھی نہ دیتی۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں میڈم۔“ امی نے تائبہ کی۔

”میں نے کہا تھا خدا ہماری غلطیاں معاف کر دیتا ہے۔“

”گھر ہم بندھے، بندوں کی غلطیاں معاف نہیں کرتے۔ ہماری ایک غلطی کے طعنے اکثر ساری زندگی ہمارا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔“

”شاکو! آنکھوں میں آنسو اُڑ آئے۔

”امی کا جی کھٹنے لگا۔ ”میڈم جی کیا بتاؤں، سارے رشتے داروں نے نظریں پھیر لی ہیں۔“

”میں نے بھی بھائیوں نے میری والدہ پر پابندی لگا رکھی ہے کہ ان دونوں سے نہ ملنا اور تو اور اس کے ابو بھی میرا فون نہیں سنتے۔ ہمارے لیے دعا کریں میڈم۔“

”میری دعا میں آپ دونوں کے ساتھ ہیں۔ خدا کرے کبھی کوئی لڑکی ایسی لغو نہ کاٹکار نہ ہو کہ زندگی اس کے لیے ہی نہیں، اس کے ارد گرد گھر سے رشتوں کے لیے بھی سزا بن جائے۔“ میڈم نے شاکو کی طرف دیکھا اور صدقہ دل سے بولیں۔ ”میں تمہارے لیے دعا کرتی رہوں گی شاکو۔“

”تھیک یو میم۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میڈم کے دفتر سے نکل کر امی کے ساتھ مین گیٹ کی طرف جاتے ہوئے، اسکول بلڈنگ کی بالائی منزل پر واقع کمروں میں سے ایک کی کھڑکی سے کسی لڑکی کی آواز امی اور شاکو تک پہنچی۔ وہ خاصی بلند آہنگی سے غائباً اپنی ہم جماعتوں سے کہہ رہی تھی۔ ”اے اے جلدی آؤ۔۔۔۔۔ وہ دیکھو شاکو! جاتی۔۔۔۔۔ وہی جن کی تصویر آئی تھی اخبار میں۔۔۔۔۔ جو اپنے گھر سے کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھیں۔“

”شاکو کو یوں لگا جیسے اس کے کانوں میں پھلکا ہوا سمیرا اُنڈل دیا گیا ہو۔

”اس کا دل پیسے دھڑکنے لگی بھول گیا۔

”قدم من من بھر کے ہو گئے۔

”مگر چلنا تو تھا، سو وہ چل پڑی۔

”شاکو! جاتی۔۔۔۔۔ وہی جن کی تصویر آئی تھی اخبار میں۔۔۔۔۔ جو اپنے گھر سے کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھیں۔“

”اس بازگشت کو تو اب نہ جانے کہاں تک ٹھہر سکتی دے تک اس کے تعاقب میں رہتا تھا!“

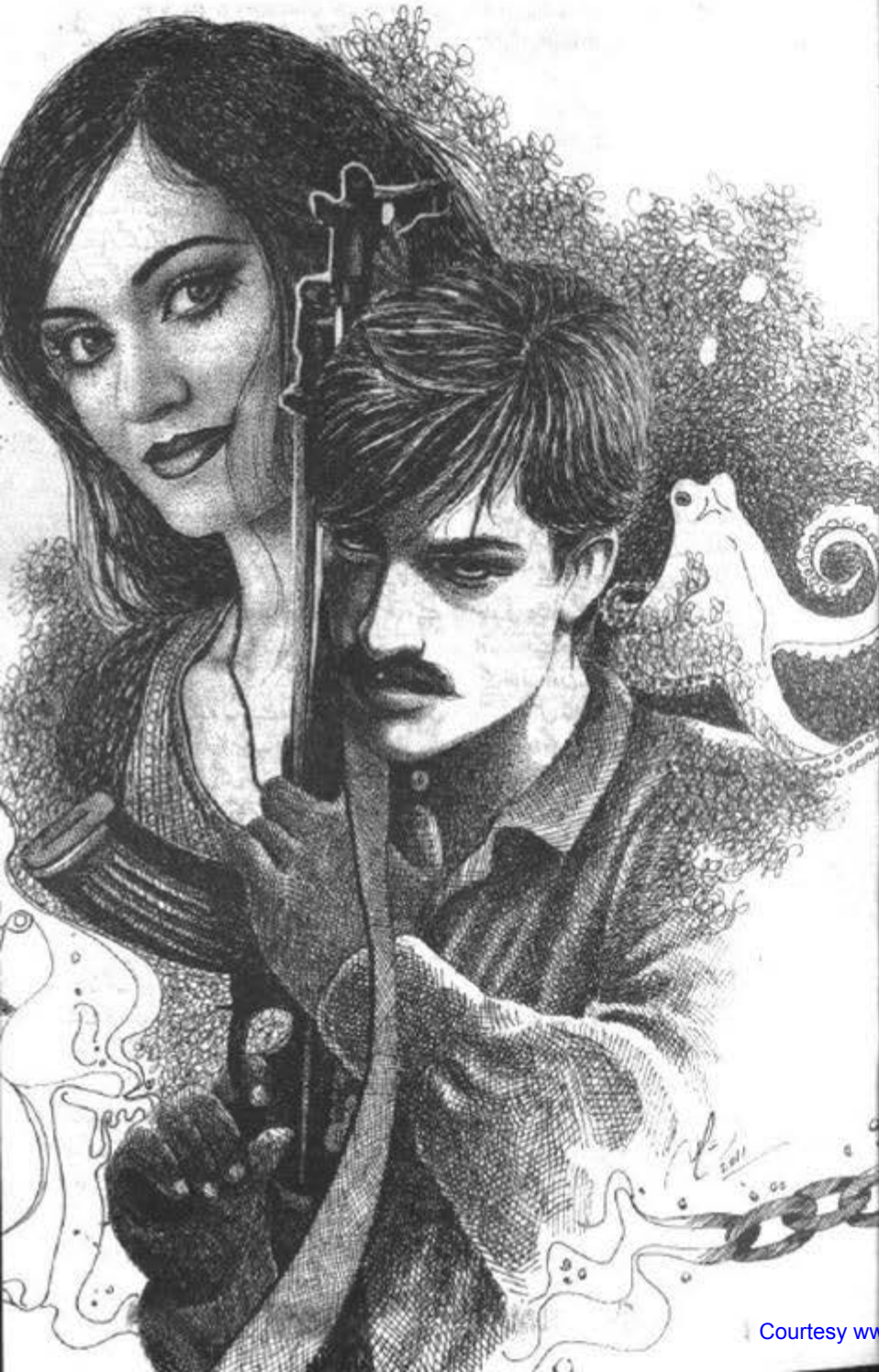


کشکول

انوار صدیقی

قسط نمبر: 2

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو ستوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو پر تنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں پوش رہا حسن کے طلسم گدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیراثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنوڑتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شہنشاہی پہلوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ ساز یوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔



”گو کیا مجھے جو اطلاعات ملی تھیں وہ غلط نہیں تھیں۔۔۔۔۔ بہر حال تم کام جاری رکھو، مجھے ہر ہفتہ رپورٹ چاہیے۔“ شیخ حامد نے حکیمانہ انداز میں کہا پھر سوبائے آف کر کے جیب میں ڈالتے ہوئے افضل خان کو اتنی گہری نظروں سے دیکھا کہ وہ بھی دہل کر رہ گیا۔

”تمہاری معلومات میری سوچ سے مختلف تھیں۔“ اس نے افضل خان کو مخاطب کیا۔ ”سینئر مین تفریق کی غرض سے باہر نہیں گیا۔ وہ بیرونی منڈی میں بڑی پارٹیوں سے مل کر یہ حکوم لگانے کی کوشش کر رہا ہے کہ خاص آڈر اسے براہ راست دیا جائے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے سر۔۔۔۔۔؟“ افضل پہلو بدل کر بولا۔ ”یہاں باقاعدہ بڈ (Bid) ہوتی ہے، سر، پھر مخصوص لفافوں میں آفر دی جاتی ہے جو بعد میں سب کے سامنے ملتی ہے پھر۔۔۔۔۔“

”یہ ضروری نہیں ہوتا کہ بڑی پارٹی ہر چھوٹی بڈ کو تسلیم کر لے۔“ شیخ حامد نے ہنست چہانتے ہوئے کہا۔ ”وہ اگر چاہے تو کسی آزماہی ہوئی پارٹی کو بغیر بڈ دے بھی ٹھس پرانی ساکھ کی بنیادوں پر ڈائریکٹ بھی دے سکتی ہے۔ یہ تاجر کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے جس کے خلاف کچھ نہیں کیا جاسکتا، پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔“

”مجھے کیا سر۔۔۔۔۔“

”پھر یہ بھی سمجھ لو کہ سامنے والا کتنی گہری جال چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر کامیاب ہو گیا تو۔۔۔۔۔“ شیخ حامد نے جان بوجھ کر اپنا جملہ مکمل نہیں کیا۔

”نہیں ہونے دوں گا سر۔۔۔۔۔“

”کیا سوچا ہے۔۔۔۔۔؟“

”محنت یا تھمت۔“ جواب میں افضل خان نے بھی مختصراً انداز اختیار کیا۔

”نہیں۔۔۔۔۔“ شیخ حامد کچھ دیر چھت پر نظر جمائے کسی سوچ میں گم رہا پھر مسکرا کر بولا۔ ”عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ تمہیں بھی اس کا ذائقہ تجربہ ہو گا۔“

”بی۔۔۔۔۔ سر۔۔۔۔۔“ افضل خان شہنشاہ کر رہ گیا۔

”اس کی واپسی میں میرے حساب سے ابھی چھ ماہ سے چھ مہینے باقی ہیں۔“ افضل کو پھر اشاروں کنایوں میں ہدایت ملی۔ ”جو بھی قدم اٹھانا سوچ کچھ کر اٹھانا، میں اس معاملے میں تا کامی برداشت نہیں کروں گا۔“

”اوکے۔۔۔۔۔ سر۔“ افضل خان نے بغیر دیر لگائے جواب دیا پھر اس نے اسی بجائے ڈی ایس بی سراج کا

معاملہ بھی بڑی تھکد سے سمجھ دیا۔ ”میں آپ کو ایک اہم اطلاع دینا چاہتا ہوں۔“

”کیوں۔۔۔۔۔“

”ڈی ایس بی سراج اور ہمارا متعلقہ شخص ایک دوسرے کے کاس فیورہ بچے ہیں۔“

”پھر۔۔۔۔۔؟“

”انسان زندگی میں اکثر کسی موڑ پر آکر مجبور یوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ میری اطلاع کے مطابق آج کل سراج صاحب کو کچھ رقم کی ضرورت پیش آگئی ہے گویا ان کے قدم بھی ڈنگ رہے ہیں۔“

”یہ افکار مشن تمہیں کسی اور سے ملی ہے یا۔۔۔۔۔“

”سراج نے مجھے حند والی فائل کے سلسلے میں بلایا تھا۔“ افضل خان سمجھ گیا کہ شیخ حامد کو اپنے اجداد و ذرائع سے اپنے کارندوں کے بل بل کی شکل و حرکت کی اطلاع ملتی رہتی ہے، اس لیے اس نے صاف کوئی سے کام لینا مناسب سمجھا۔

”میں نے آپ کو اس سلسلے میں یوں پریشان نہیں کیا کہ ایسے چھوٹے افسروں کو میں خود بھی ڈیل کرتا جانتا ہوں۔“

”مجھے خوشی ہوئی کہ تمہیں پچھلا سبق یاد رہا۔۔۔۔۔“ شیخ حامد کی پیشانی فکون آلود ہو گئی۔ ”میں سمجھتے پسند نہیں کرتا اور۔۔۔۔۔ ایسے لوگوں کو وہ تین ماہ سے زیادہ مہلت دینے کے بھی خلاف ہوں۔“

”افضل خان جبر جبری لے کر رہ گیا۔ وہ بگ باس کی وارنٹ کو ابھی طرح سمجھ رہا تھا۔“

”کیا سراج نے تم سے کسی رقم کی ضرورت کی بات کی تھی؟“ شیخ حامد نے بدستور تنبیہ سے پوچھا، اس کی پیشانی پر تل جتنی تیزی سے ابھرے تھے اتنی ہی جلد دور بھی ہو گئے۔

”نہیں باس۔۔۔۔۔ میں نے اپنی جیب خاص سے اس کی مدد کا منصوبہ بھی دیا تھا لیکن۔۔۔۔۔“

”لیکن کیا۔۔۔۔۔؟“

”وہ آپ سے ایک ملاقات کا خواہش مند ہے۔“ افضل خان نے بڑی خوبصورتی سے بات بنائی۔ ”ممکن ہے اسے کوئی ایسی مشکل درپیش ہو جس کا حل صرف آپ ہی نکال کر اسے چھٹکارا دلا سکتے ہوں۔“

”ہوں۔“ شیخ حامد ایک لمبی خاموشی ہوا۔۔۔۔۔ پھر سرسراتے لہجے میں بولا۔ ”حند کی فائل کا تذکرہ کس طرح درمیان میں آگیا؟“

”ہوسکتا ہے کہ سراج نے لحد بیانی سے کام لیا ہو لیکن اس نے یہی کہا تھا کہ مرنے والی کا کوئی عاشق اس فائل کو

دوبارہ زندہ کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

شیخ حامد کے ہونٹوں پر ایک نہ ہر لی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”اس کا باپ بھی اس فائل کو ری اوپن نہیں کر سکتا۔“

”میں جانتا ہوں کہ آپ کے مقابلے میں سراج صاحب کی حیثیت کسی بیٹنی سے زیادہ نہیں ہے جسے جب چاہے قدموں سے۔۔۔۔۔“

”ون منٹ۔“ شیخ حامد نے ہاتھ اٹھا یا تو افضل خان کی زبان کو بریک لگ گیا۔ شیخ حامد پھر چھت کی طرف دیکھنے لگا، شاید کوئی آخری نتیجہ اخذ کرنا چاہتا تھا۔ کچھ توقف کے بعد اس نے افضل خان کی طرف دیکھا۔ ”تمہارا کیا مشورہ ہے؟“

”میں آپ کے مقابلے میں کیا رائے دے سکتا ہوں۔“ افضل خان نے اعکاسی سے کام لیا۔ ”جو آپ کا حکم ہو گا اسی پر عمل بھی ہو گا۔ کہیں تو میں اسے بھی۔۔۔۔۔“

”جلدی بازی نہیں۔“ شیخ حامد نے زہر خند لہجے میں جواب دیا۔ ”تم اسے جب چاہے یہاں آنے کا کہہ دو لیکن ظاہر یہی کرنا کہ میں تمہاری خوشامد کے بعد ہی اس ملاقات پر آمادہ ہوا ہوں۔“

”راہت سر۔۔۔۔۔“

شیخ حامد نے انعام کا اٹھا کر ہیٹل اسسٹنٹ سے اپنا شیڈول معلوم کیا پھر ریسیور کرکھ افضل خان سے کہا۔

”کل چار بجے کا وقت ہے میرے پاس۔۔۔۔۔ تم سراج کو بلا سکتے ہو تو آؤ۔“

”اوکے، باس۔۔۔۔۔“

مخصوص کمرے سے نکل کر افضل خان نے سکون کا سانس لیا پھر اسی دن اس نے فون پر سراج کو اس کی اطلاع بھی دے دی۔ دوسری جانب سے کوئی واضح جواب نہیں ملا لیکن اگلے دن ٹھیک چار بجے ڈی ایس بی سراج سادہ لباس میں شیخ حامد کے ساتھ اس کے مخصوص کمرے میں موجود تھا۔

”افضل خان نے بتایا تھا کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ شیخ حامد نے جیسے ہوئے انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

”اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے مجھے مایوس نہیں کیا۔“ سراج نے بھی اعکاسی سے جواب دیا۔

”یہ حند اور اس کی کسی کس فائل کا کیا معاملہ ہے؟“ شیخ حامد نے بڑی مصصیت سے پوچھا۔ ”افضل بتا رہا تھا کہ آپ نے۔۔۔۔۔“

”جی ہاں۔“ سراج نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”آپ تک پہنچنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ تو اختیار کرنا تھا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ آئی۔ی۔۔۔۔۔ پولیس والا جھٹکا، اکڑ کا سیاب

ہوتا ہے۔“ شیخ حامد نے بے تکلفی سے کہا پھر دوبارہ گہرے لہجے پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کو بین منٹ اور دے سکتا ہوں، ایک ضروری مینٹگ میں جانا ہے۔“

”میں پھر کسی وقت آ جاؤں گا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ اب آگئے ہیں تو بلا تکلف یہ بھی بتا دیں کہ آپ کو کتنی رقم کی ضرورت ہے جس کی خاطر آپ کو کسی حند کیس کا حوالہ دینا پڑا۔“ شیخ حامد نے پھر تجاہلی عارفانہ سے کام لیا۔ ”میں ہمیشہ سے پولیس والوں سے دوستی رکھنے کا قائل ہوں، آپ کے ایس بی صاحب سے بھی ابھی خاصی سلام دعا ہے۔“

”ضرورت تو تقریباً پچاس ہزار کی ہے لیکن اپنے لیے نہیں۔“ سراج اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ ایس بی والی بات وہ جان بوجھ کر گول کر گیا۔

”میں سمجھتا ہوں۔ اگر آپ کو اپنے لیے ضرورت نہیں ہے تو کسی دوسرے کے لیے۔“

”میں عرض کرتا ہوں۔“ سراج نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”دراصل ایک بچہ کا پٹا زندگی اور موت کے درمیان پر کھڑا ہے، اگر اس کا فوری آپریشن نہ ہو تو وہ بچہ لاوارث ہو جائے گی۔“

”اگر یہ بات ہے تو آپ مجھے خدمت کا موقع دیں، میں صرف آپ سے اس کا نام اور ایڈریس دریافت کروں گا، اس کے بعد آپریشن کے جتنے بھی اخراجات ہوں گے وہ میں اپنی جیب خاص سے دوں گا۔“

”سوری بات تمھاری ہے کہ میں اس کا نام بھی نہیں لے سکتا۔“

”ایسی صورت میں تو، میں یہی سمجھوں گا کہ ضرورت دراصل آپ ہی کو ہے؟“

”مجھے سمجھ نہیں۔“ سراج نے لمبی سانس لی۔

جواب میں شیخ حامد معنی خیز انداز میں مسکرایا پھر اس نے دراز کھول کر بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میز پر اس طرح ڈال دی کہ خود سراج بھی حیران رہ گیا۔ ”مگر لیجئے، پورے ایک لاکھ ہیں۔“ شیخ حامد نے سراج کے چہرے کے تاثرات بھانپ کر کہا۔

”لیکن میں تو صرف پچاس ہزار۔۔۔۔۔“

”تکلف نہ کریں۔“ شیخ حامد نے الفاظ چپاتے ہوئے ایک خاص انداز میں کئی میز پر ٹیک کر قدرے مدھم آواز میں

کہا۔ ”دوستوں کا حساب کتاب دل میں ہوتا ہے، میں آپ سے اس سیر رقم کی واپسی کا مطالبہ بھی نہیں کروں گا۔ آپ

اسے ہماری اور اپنی دوستی کی پہلی قسط سمجھ لیں۔
سراج نے ایک لمبے کو بکھڑو چاچر اس نے گڈی کو اٹھا کر ایک نظر غور سے دیکھا، پھر اسے بڑی بے پروائی سے پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ ”مجھے آپ سے یہی امید تھی کہ آپ انکار نہیں کریں گے۔“ شیخ حامد پھر معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”مرکز کی حکومت کے کچھ دوستوں سے بھی میری دوستی ہے، ان کے ساتھ بھی لیکن دین کا حساب بغیر کھاتے کے چلتا رہتا ہے، آپ کو بھی اگر کبھی مشکل درپیش آجائے تو میں بھی آپ کے کسی کام آنے سے گریز نہیں کروں گا، ابھی آزما کر دیکھ لیں۔“

”میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔“ سراج دوبارہ اس طرح انکاری پر اتر آیا جیسے اس ایک لاکھ کے عوض وہ اپنی ایمانداری کا سودا کر رہا ہے۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا خاص خیال رکھوں گا۔“
”موصول بھی نہیں ہے۔“ تالی دونوں ہاتھ سے بچتی ہے۔ ”شیخ حامد نے کہا پھر اچھے ہوئے بولا۔ ”اب اجازت چاہوں گا اور ہاں۔ ایک بار واقعیت ہوگئی ہے تو اب آتے جاتے رہے گا۔“

”اس کے بل آؤں گا۔“ سراج بھی اٹھ گیا پھر بڑی گرم چوٹی سے ہاتھ ملا کر لائے قدموں داخل چلا گیا۔
شیخ حامد نے اس کے جاتے ہی سیدھا ہاتھ دروازے میں ڈال کر ان دونوں سوئچ کو آف کر دیا جو سراج کے کمرے میں داخل ہونے سے قبل اور رخصت ہونے وقت کی تمام کنکٹور اور مووی بھی ہلانے کا کام انجام دے رہے تھے۔ سراج کے باہر نکلنے ہی اس کے ہونٹوں کی زہریلی مسکراہٹ پھیل کر مزید گہری ہوتی چلی گئی۔ اسے اس بات کا شبہ بھی نہ ہو سکا کہ سراج کی ٹیپس کی دونوں آستیں پر لگے گولڈن کف انکس (Cuff-Links) اور ٹیپس میں لگے گولڈن ہن کے اندر آواز ریکارڈ کرنے اور مووی بنانے کے انتہائی حساس لیسر کے ذریعے تیار ہونے والے ٹیپس سراج کی پتلون کی علیحدہ علیحدہ جیبوں میں محفوظ ہو چکے تھے۔

اسی رات تقریباً دو بجے سراج حسب پروگرام ڈی آئی جی عظیم احمد کی رہائش گاہ پر موجود تھا، اس کام کے لیے اس نے اپنی گاڑی کے بجائے ایک دوست کی بندو بن کا استعمال کیا تھا۔ عظیم احمد نے ٹیپ کی گئی کنکٹور اور تیار شدہ مووی کو اپنے چھوٹے پروجنیکٹر کے ذریعے بڑی توجہ سے دیکھا پھر خاصی دیر خاموشی سے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض کرنے کے بعد بے حد تنہید کی سے کہا۔

”تم نے ایسی حیرت انگیز جرأت سے یہ کام انجام دیا ہے کہ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا، شیر کی کھجور میں ٹھس کر اسے گولی مار دینا اور بات ہے لیکن حال کے ذریعے قابو کرنا ایک خطرناک عمل ہے۔“

”میں ایک بات اور عرض کرنا چاہوں گا۔“ سراج نے بات جاری رکھی۔ ”مجھے یقین ہے کہ شیخ حامد جیسا چال باز اور خطرناک مگر پچھتی بھی مجھ سے ملا ہوگا تو وہ بھی کچھ سوچ کر کسی پلان کے تحت ملا ہوگا۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ میرے ایس بی صاحب بھی اس کی جیب میں چڑے ہیں۔“

”مجھے اس کا علم ہے،“ عظیم احمد کسمسا کر بولے۔ ”صرف وہی نہیں بلکہ ہمارے اور بھی بہت سے اہم افسران اس سے ماہانہ ملتا ہوتا ہے۔“

”جس کمرے میں شیخ حامد نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کمرہ صرف مخصوص موقعوں پر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔“ سراج پہلو بدل کر بولا۔ ”میری معمولی حس بتا رہی ہے کہ وہاں بھی کنکٹورس کرنے اور مووی تیار کرنے کا مکین نہ نہیں کوئی خفیہ سسٹم ضرور موجود ہوگا۔“

”یقیناً ایسا ہی ہوگا۔“ عظیم احمد نے تائید کی۔ ”پچاس کے بجائے ایک لاکھ دینا اور وہاں نہ لینے والی بات کے علاوہ بھی اس کی باتوں میں ایسے اشارے موجود ہیں جن سے بظاہر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تمہاری خدمات خریدنے کی خاطر سو دسے بازی کر رہا ہے۔“ مگر تم مطمئن رہو اب میں بھی تمہارا ایک گواہ موجود ہوں۔“

”اسی یقین کی وجہ سے میں نے اپنے اس ٹریپ پلان پر عمل کرنے سے ہچکچاہٹ، آپ سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔“
”تم نے دورانے کس کا ثبوت دیا تھا۔ اب میرا ایک مشورہ وار ہے۔“
”آپ حکم دیں سر۔۔۔۔۔“
”ان دونوں کی ایک ایک کیسٹ تم مجھے بھی فراہم کر دو، ایک سیٹ اپنے پاس رکھنا تاکہ ہم دونوں میں سے اگر کوئی ایک فریق تم کو ہوجائے تو دوسرا موجود ہے، کیسٹ کے ساتھ ہی تم نے جس ارادے سے یہ ٹیک کام کیا ہے اس کا تقاعدہ تحریری رپورٹ بھی اپنے دستخط کے ساتھ، ہاپ کالنی وینٹیل اور سیکرٹ لکھ کر مجھے دے دینا۔ وہی تمہاری ایمانداری اور صلاحیتوں کا ثبوت ہوگا۔“

”میں نے بھی یہی سوچا تھا سر۔۔۔۔۔ لیکن ایک لاکھ کی رقم

کہاں رکھی جائے گی؟“ سراج نے پوچھا۔
”اسے میرے پاس چھوڑ دو، میں اس کے ایک ایک ٹوٹ کی کافی ذاتی طور پر نوٹ اسٹیٹ کر کے اپنے دستخط اور سرکاری مہر کے ساتھ محفوظ کر دوں گا جس کی نقل تمہیں بھی دے دوں گا تاکہ بوقت ضرورت کام آ سکے، رہارٹ کا معاملہ تو میں اسے بھی اپنے خفیہ ریکارڈس کے ساتھ کسی ایماندار واقعہ کار کے لاکر میں محفوظ کرادوں گا، اس کام کی اطلاع بھی تمہیں ایک خاص اور ٹاپ سیکریٹ آفیشیل لیٹر کی صورت میں مل جائے گی۔“

”میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا سر۔“
”ایک بات کا خیال اور رکھنا۔“ عظیم احمد نے دوستانہ انداز میں تاکید کی۔ ”جب تک میں نہ کہوں، وہی الحال مجھ سے ملاقات سے گریز کرنا۔ ایک سیکریٹ اور ان لست (Un-listed) موبائل نمبر دے رہا ہوں، اسے بھی انتہائی ضرورت کے وقت استعمال کرنا۔“

سازمے تین بجے رات کو جب سراج واپسی کے لیے روانہ ہوا تو خود کو بہت ہلکا ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ کئی بار اس نے پشت کے دروازے میں لگے چوڑورنگین ٹیشے سے جھانک کر جائزہ لیا۔ عقب میں دور دور تک سڑک سنسان پڑی تھی، نقاب میں کوئی بھی نظر نہیں آیا۔

☆ ☆ ☆
جس رات فرحمن نے قبرستان میں ایک شخص کو ہنگامہ بناتے دیکھا تھا، اس رات سے اس کا سارا سکون بر باد ہو گیا تھا۔ وہ شاید ایک وقار دہی ہو ہونے کے ناتے شوہر کو بھی اس قبیل کی خبر نہ دینا۔ ذاتی طور پر بھی وہ بحالت مجبوری، قبرستان کے قریب رہنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ سر چھپانے کے لیے کوئی نہ کوئی چھت تو درکار تھی، ویسے بھی اس نے یہی سن رکھا تھا کہ پرانے قبرستانوں کو بدرومیں، بھوت پریت کے علاوہ جرائم پیشہ افراد بھی اپنا مسکن بنالیتے ہیں۔ اس رات شاید گل خان یا زریں نے بھی کھڑکی سے وہ سب کچھ دیکھ لیا تھا جو فرحمن دیکھ چکی تھی۔ فرحمن نے دورانے ٹیشے سے کام لیا، شوہر کو کھانا دینے کے بعد وہ پیار بھرے لمحات کا تصور کیے بیٹھی تھی لیکن لیاقت ہمیشہ کی طرح کچھ اس طرح مہربان ہوا کہ چانک گل نے اسے باہر سے آواز دی۔ نورین، گل خان اور لیاقت حسین کے درمیان جو کنکٹور ہوئی وہ اب فرحمن کے دل میں اٹھتے بیٹھتے کانٹوں کی طرح چبھتی رہتی۔

تین روز سے وہ سوتے سوتے اچانک اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ اسے خواب میں قبرستان کا وہ منظر دکھائی دیتا۔ کہیں

دور سے آنے والی ایک آواز اس کے کانوں میں ابھرتی تو وہ مضطرب ہو کر جاگ جاتی، ساری رات لیاقت کے قریب لپٹی اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتی رہتی، اس کی زندگی کی دعا میں لپکتی رہتی۔ ان باتوں کا ذکر اس نے زریں سے بھی نہیں کیا تھا، حالانکہ جب تک لیاقت حسین ڈیوٹی پر رہتا اور گل خان بھی اپنے کام پر چلا جاتا تو زریں کا کام کاج سے قاریغ ہو کر فرحمن ہی کی طرف آجاتی تھی۔

اس وقت بھی وہ اور فرحمن باہر سائیکل میں، تخت پر بیٹھی ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف تھیں۔ گل خان، لیاقت حسین کوئے کر ایک بزرگ کے پاس گیا ہوا تھا۔ ”خدا کرے لیاقت بھائی کا میاں ہو جائے۔“ زریں نے صدیقی دل سے کہا۔ ”ورنگ گل خان یہی بتاتا ہے کہ ادھر بیٹے کے جسم کے غلط لوگوں نے غریب بزرگ کو آمدنی کا دھندا بتایا ہے۔“ مگر کے ذریعے دس آدمیوں کو اندر جانے کی اجازت دے دیتی ہے اس کے علاوہ دس پندرہ ایسے افراد کو بھی اجازت مل جاتی ہے جو بد معاشرے کی مضامیں گرم کرتے ہیں۔

”کچھ کہہ رہی ہے؟“ فرحمن نے حیرت کا اظہار کیا۔
”اپنی طرف تو ایسا نہیں ہوتا۔“
”ادھر کا بات الگ تھا فرحمن لیکن ادھر سارا غلط کام پیسوں سے، ایک منٹ میں چودہ دروازے سے ہو جاتا ہے۔ جو لوگ سیدھا اور قانونی طریقہ اختیار کرتے ہیں وہ بار بار دیکھے کھانے کے بعد بھی کا میاں نہیں ہوتے۔“

”ہوسکتا ہے کہ اپنے لیاقت کے ساتھ کوئی بھڑو ہو جائے اور بزرگ بابا سے اس کی ملاقات ہو جائے۔“ فرحمن نے دل سے دعا کی۔
”کچھ دیر یہی موضوع زیر بحث رہا، اس کے بعد زریں نے کسمسا کر کہا۔

”ویسے اس روز لیاقت بھائی نے جو کیا، اچھا نہیں کیا۔“
”میں سمجھی نہیں۔۔۔۔۔؟“

”ادھر ایک دوبار پہلے بھی مٹلی کرنے والے آتے رہے ہیں۔ کئی واقعات مجھے معلوم بھی ہیں جنہیں سوچتی ہوں تو آج بھی دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔“
”ہوا کیا تھا۔۔۔۔۔؟“ فرحمن نے بے یقینی سے سوال کیا۔
”تفصیل سنانے کی ہمت نہیں ہے میرے اندر، لیکن اتنا بتا سکتی ہوں کہ جس نے بھی ان گندے عمل کے چھانچا ایک پھنسی اس کا انجام خطرناک ہی ہوا۔ مائیکہ نامی ایک خوبصورت دہن تو آج بھی مجھے یاد ہے۔“ زریں پھر بھری

سبب دلچسپ

لے کر بولی۔ "جتنی ہی دہن بن کر اس علاقے میں آتی تھی۔ اس کا مرد کسی ٹھیکیدار کے ہاں ملازم تھا، دونوں بڑے خوش رہتے تھے۔ عائشہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے اپنی پسند کی شادی کی ہے ورنہ شہر والوں کے علاوہ، کچھ ایسے قریبی رشتے دار بھی مخالفت کر رہے تھے جو عائشہ کا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے مانگ رہے تھے۔ مایوس ہونے کے بعد ان کم بختوں کے دل میں شیطاں نے انتقام کی آگ بھڑکادی۔ لڑکے نے کسی یا دوست کے کہنے پر ایک ایسے شخص سے ملاقات کی جو کنڈا مل کر تھا۔ عائشہ اور اس کا مرد ان باتوں سے بے خبر ابھی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن دو مہینے کے بعد جو کچھ ہوا اس نے پورے علاقے کو گواہ کر دیا تھا، دو روز تک تو گل خان نے بھی گھر میں چلپا نہیں جیلے دیا۔ ایمان سے کتنی ہوں کہ وہ بہت پیاری اور مصوم لڑکی تھی لیکن اس کا اور اس کے جوان شوہر کا جو انجام ہوا، اسے یاد کر کے آج بھی دل کا پٹھنا ہے۔"

پوچھا۔
 "ہاں کیا تھا؟"
 "فرمین نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔
 "ہاں روز عید کا دن تھا، سب لوگ نماز پڑھ کر لوٹے تھے۔ سبھی میں سارے مرد ایک دوسرے سے گٹھے ل رہے تھے جب عائشہ کے مرد کو ایک خون کا لٹی ہوا اور وہ غریب سب کے سامنے تڑپ تڑپ کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ عائشہ کو اس وقت کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ وہ اپنے خوبصورت لباس میں ہی تھی، مارتی باہر نکل آئی۔ خون میں لت پت، بے جان شوہر کی لاش سے لپٹ کر تین کر رہی تھی کہ پھر کسی حرام کے غم نے شیطانی جتر منتر پڑھ کر پھونک دیا۔ عائشہ ابھی شوہر سے لپٹی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی جب خدا جانے کہاں سے نیکی آگ کا شعلہ بلند ہوا جس نے مرنے والے کے ساتھ عائشہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا، باقی لوگ چیخ مارے دور ہو گئے۔ پورے علاقے میں ایک دھشت پھیل گئی تھی پھر۔۔۔۔۔ ان دونوں کی لاشیں جل کر اس طرح آہیں میں گند ہو گئی تھیں کہ انہیں الگ کرنا بھی ممکن نہ رہا۔ بزرگوں کے مشورے پر دونوں کو جیسے تیسے دفن کیا گیا۔"

فرمین کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی سانس سینے کے اندر ہی گھٹ کر رہ جائے گی۔ ذرینہ کو عائشہ کی روداد سنانے کے بعد اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے فرمین کی کیفیت پر غور کرتے ہوئے پریشان انداز میں کہا۔
 "خود کو سنہال فرمین اور مجھے معاف کر دے جو نہ جانے میں پاگل، کچھ سوچے بچھے بغیر تجھے دہری کہانی سنائی

میلی گئی، مگر خان کو خبر ہوئی تو وہ بھی ناراض ہو گیا۔"
 "مگر نہ کر رہا۔۔۔۔۔ فرمین خود کو سنہال کر بولی۔
 "میں کچھ دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔"
 ذرینہ نے ہاتھ قائم کر زبردستی فرمین کو کمرے میں لے جا کر چنگ پر لٹایا، اسے پانی لاکر پلایا۔ کچھ دیر بعد فرمین کی حالت قدرے سنبھل گئی تو ذرینہ اس لیے کمرے میں بولی۔
 "پیاری بہن، تو بھی لیاقت بھائی کو کچھ نہ بتانا۔"
 "پریشان مت ہو ذرینہ، میں حیرت بات کسی سے نہیں کہوں گی۔"

"میرا ایک مشورہ مانے گی۔" ذرینہ نے اس کی پیشانی کو آہستہ آہستہ مسلاتے ہوئے کہا۔ "اب تو لیاقت بھائی کی تنخواہ بھی ٹھیک ٹھاک ہو گئی ہے۔ تو ایسا کر کسی طرح انہیں سمجھا بھجا کر اس بستی میں ہی قبرستان سے مٹ کر کوئی دوسرا مکان لے لے۔ میں گل خان سے بھی کہوں گی۔"
 "ایک بات میں بھی تجھے بتا رہی ہوں ذرینہ لیکن تو بھی کسی سے کچھ نہ کہنا۔"
 "ذرینہ تو ہے۔" ذرینہ نے پیشانی پر

"ابھی تک تو خیر ہی ہے لیکن دو روز سے میں بھی بڑے ڈراؤنے خواب دیکھ رہی ہوں۔" فرمین نے چست پر نظر جماتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "خواب میں مجھے دیا پٹا، کالا جھنگ آدی نظر آتا ہے اس کے جسم پر بھی کوئی لباس نہیں ہوتا، وہ۔۔۔۔۔ وہ خیر پر قائم اپنا بڑا ذات لال کر ایک ہی بات بولتا ہے۔ پر تاب گھوش تمہارا اور تمہارے بچے کا ایسا کر یا کرم کرے گا کہ تمہاری آتما بھی سدا دیا کل رہے گی۔ وہ بعد میں جانے کیا ہے بھوانی کے نام بار بار دہرا کر خوشی سے تاپتے لگتا ہے، میں نے اتنا کالا اور کنڈا آدی پہلے بھی نہیں دیکھا۔"

ذرینہ نے فرمین کی بات سنی تو وہ بھی خوفزدہ ہو گئی۔ اسی وقت دروازے پر دھک ہوئی، اس کے ساتھ فرمین بھی اٹھ گئی۔
 "کون۔۔۔۔۔" جُز رہنے نے صحن میں آکر آواز لگائی تو باہر سے لیاقت حسین نے جواب دیا۔
 "میں ہوں۔"

ذرینہ نے سکون کا سانس لیا۔ فرمین کے دل سے اس وقت بھی یہی دعا گئی کہ "میرے مالک، لیاقت اور بزرگ کی ملاقات ہو گئی ہو۔" ذرینہ ایک طرف صحن میں پردے کے آڈ میں ہو گئی تو فرمین نے دروازہ کھول کر لیاقت کو اندر بلا لیا۔ ذرینہ لپک کر باہر نکل گئی جہاں گل خان موجود تھا۔ "کیا ہوا

لیاقت۔۔۔۔۔ فرمین نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔ "کیا تمہارا ملاقات بزرگ بابا سے ہو گیا؟"
 "آج بغیر تمہارے نہیں ہو سکا لیکن۔۔۔۔۔ گل گل خان فجر کے وقت خبر لے آئے گا تو وہ چار دن میں ضرور ملاقات بھی ہو جائے گا۔" لیاقت نے بزرگ کی ہدایت کے مطابق زبان بند رکھی مگر فرمین کی پشت چھپتا کر محبت سے بولا۔ "جوصلہ رکھو میرے دل کا بلبل، لیاقت کو کچھ نہیں ہوگا۔"
 "خدا کرے ایسا ہی ہو۔۔۔۔۔ فرمین نے دھڑکتے دل سے کہا پھر لیاقت کو منہ ہاتھ دھوئے گا کہہ کر وہ کھانا نکالنے چلی گئی۔ صبح سے اس نے خود دھاتا بھی نہیں کیا تھا۔

لیاقت نے پہلی ہی نظر میں فرمین کے چہرے کو پڑھ لیا تھا۔ وہ اس کی تجویز تھی جس کی خاطر اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ فرمین کسی وجہ سے پریشان ہے۔ وجہ کیا تھی؟ شاید صرف اتنی کہ اس نے نیو کے سلسلے میں اس کا کہا نہیں مانا تھا۔

فرمین کھانے لے کر آگئی۔ خود بھی شوہر کے ساتھ کھانے گئی، لیاقت حسین کچھ دیر بیوی کے ساتھ بیٹا بولتا رہا پھر اس نے فرمین کے دل میں بھاگنے کی خاطر اسے کر دیا۔
 "کیا بات ہے جان بھر۔۔۔۔۔ تم مجھے کچھ پریشان دکھائی دیتا ہے؟"

"وہ۔۔۔۔۔ ذرینہ نے ایک قصہ سنایا تھا۔ بس اسی وجہ سے ذرا افسوس ہو رہا تھا۔"
 "قصہ کیا تھا؟"

"خالص عورتوں کا بات ہے۔" فرمین نے زبردستی ایک قصہ سنایا۔ "مردوں کو بتانے والا نہیں ہے۔"

"ہم سے بھی پردہ کرے گا؟"
 "کیوں۔۔۔۔۔ کیا تم مرد نہیں ہے۔" فرمین نے اسے شوشی سے گھورا۔

لیاقت حسین نے مسکرا کر کہا۔ "ابھی ذیونی پر جانا ہے، رات کو تفصیل سے سوچ کر جواب دوں گا۔"

فرمین شرم کر لیاقت کی نظروں میں پھٹنے والے ہنر پاتی طوقان کو دیکھنے لگی۔ لیاقت حسین کھانا کھا کر اپنے کام پر چلا گیا، فرمین گھر کے کاموں سے فراغت پا کر چنگ پر پہنچی تو فرمین اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے ذہن میں ذرینہ کا سنایا ہوا، عائشہ اور اس کے مصوم شوہر کے بیاہٹ انجام والا واقعہ گونجنے لگا۔ دیر تک وہ اس بات کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کرتی رہی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ شاید اس

لیے کہ لیاقت کے ساتھ وہ کچھ ایسے حالات میں الجھ چکی تھی۔ تاہم وہ اپنے آپ سے ابھی رسی بچر نیند کا ایک جھونکا ایسا آیا کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔ کچھ دیر پر سکون نیند سوئی رہی۔ لیکن اس کی نیند میں غلط ڈال کر، اسی پر تاب گھوش کا مکروہ ہوا اس کے سامنے آگیا، اس کے دانت غیظانہ تازہ خون سے تھڑے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی کسی کا خون پی کر آ رہا ہو۔ فرمین نے عمارت سے اس کی طرف سے نظریں پھیرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کا وجود شل ہونے لگا، یوں جیسے کسی غیر مرئی قوت نے اس کے جسم کی ساری قوتیں سلب کر لی ہوں۔ "بہت دیا گل نظر آ رہی ہے تو سندی؟ مجھ سے ڈر لگ رہا ہے؟" پر تاب گھوش نے خباثت سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

فرمین نے اس پر لعنت بھیجے کا سوچا لیکن اس کی زبان نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ کسی بے جان بت کے مانند اتر کر رہ گئی لیکن آنکھوں اور دھڑکتے دل سے اس کے مکروہ لعلی کی منحوس صورت دیکھنے پر مجبور تھی جس کا سیاہ جسم اس وقت بھی لباس کی قید سے آزاد نظر آ رہا تھا۔ "تمہارے بچے کے بچاؤ کا کیوں ایک ہی طرح سے میری سندھ کٹا رہا۔۔۔۔۔ وہ تمہارے لیے ایک بالک پیدا کرے، تم ایک ماما کی طرح اس کو اپنی جھانی سے دودھ پلاؤ، اسے پال پوس کر بڑا کر دو اور۔۔۔۔۔ اور جب وہ چار سال کا گول منول ہو جائے تو میں اسے بھوانی کے چرنوں میں بیجھت چڑھا سکوں، اس کے بعد جھین کی ل جائے گی۔"

فرمین کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ پر تاب گھوش جو کچھ بکواس کر رہا تھا وہ کسی بھی ماں یا باپ کے لیے ممکن نہیں تھا، اس کا دل چاہا کہ اس کی بدقابل زبان سے نکلنے والے کا منہ نوچ لے، زبان گدی سے کھینچ لے لیکن وہ اس خواہش کو بھی پورا کرنے سے قاصر تھی۔ پر تاب گھوش اسے گھورتے ہوئے عمارت سے بولا۔

"جو کچھ تیرے من میں چل رہا ہے وہ میں سن رہا ہوں لیکن تو نہیں جانتی کہ پر تاب کی کتنی اہم پار ہے۔ بھوانی کی کرپا سے میں نے وہ شقی پر اپات کر لی ہے جسے کوئی اور پہنوں میں بھی نہیں سوچ سکتا۔ تو اگر میری شقی کا چکار دیکھنا چاہتی ہے تو بول، تیرا اپنی ابھی کیا ہے، میری شقی اسے دوبارہ ہالوں سے پکار کر تیرے سامنے لائے گی۔ پتو یہ تو برداشت نہ کر سکے گی کہ تیرا اپنی جس نے میرے جتر منتر کو کھینچنے کی بھول کی تھی، خود اپنے ہاتھوں میں اپنا کتا ہوا سر لے کر آئے اور پھر تیری نظروں کے سامنے تڑپ کر جیون سے سارے

Shezan

شمرقند

شمرقند

کے ساتھ
اعلیٰ کوالٹی گلاس مفت



PET

اس Summer میں صرف شمرقند اسٹاک کی دستیابی تک انتہیم جاری رہے گی

ہو۔ دونوں کی ملاقاتیں صرف سرکاری طور پر ہوتی تھیں یا اس وقت جب آغا منظور کی طرف سے اسے طلب کیا جائے۔

اس وقت بھی جب ایک کاشمیل نے اس کے کمرے میں آکر آغا منظور کے بلاوے کی اطلاع دی تو سراج نے اسے یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ ”ٹھیک ہے، میں دس منٹ میں آتا ہوں۔“ ان دس منٹ میں اس کے ذہن میں کئی ایسے مکالمے گزرے جس پر اس کے اور ایس بی کے درمیان دشمنی کی توقع تھی، وہ ہر بیس کے بارے میں مناسب جواب دینے کے لیے خود کو ذہنی طور پر آمادہ کرتا رہا پھر اچانک کسی خیال پر مسکراتے ہوئے اٹھا، اپنی کپ اٹھا کر سر پر سجائی اور قدم اٹھاتا ہیڈ کوارٹر کی سمت چل پڑا جہاں مختلف علاقوں کے ایس بیز اور ڈی آئی بی وغیرہ کے دفاتر تھے۔ اپنی گاڑی وہ خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔

پولیس ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوتے ہوئے بھی اسے بین گیٹ پر ٹھہرے ڈیوٹی گارڈ نے بھرپور سلامت پیش کیا، شاید اس لیے کہ پولیس کاشمیل کے معاملے میں وہ خاصا مہربان تھا۔ اسے علم تھا کہ کوئی بھی پولیس پارٹی یا تھا نہ بیرون جہاں جب ناکام ہوتا ہے یا گردش کا شکار ہوتا ہے تو سارا ملہ کاشمیل پر ڈال دیتا ہے۔ سراج کے ہمدردانہ رویے ہی کا نتیجہ تھا کہ شہر کے بیشتر کاشمیل اس کی بے حد عزت کرتے تھے اور کسی آڑے وقت میں اسی سے مشورہ بھی کرتے تھے۔

ہیڈ کوارٹر پہنچ کر سراج نے اپنی گاڑی ایس بی آغا منظور کے دفتر کے سامنے روکی۔ ایک کاشمیل نے لپک کر دروازہ کھولا، سراج نے اس کے سلام کا جواب مسکرا کر دوستانہ انداز میں دیا پھر مطلوبہ کمرے میں داخل ہو کر اس نے آغا منظور کو سلام کیا، لوہی اتار کر میز پر رکھی اور سامنے والی خالی کرسی پر بیٹھ گیا، اس کا چہرہ اس وقت اندرونی جذبات کی ترجمانی سے عکس گاری تھا، دونوں کمرے میں تباہی تھی۔

کچھ دیر ریگنٹنگ کے بعد آغا منظور نے کہا: ”میں ایک خاص فائل آپ کو مارک کرنا چاہتا ہوں، سوچا کہ اگر آپ سے مشورہ کر لوں تو زیادہ مناسب ہوگا۔“ ایس بی کے لب و لہجہ میں کچھ عجیب سا سسپنس تھا جسے سراج نے خاص طور پر محسوس کیا۔

”آپ مجھے بغیر مشورے کے بھی کوئی فائل مارک کر سکتے ہیں۔“ سراج نے مسکرا کر ہلکا سا لہجہ اختیار کیا۔ ”میں آپ کے ہر تحریری آرڈر پر عمل کرنے کا پابند ہوں۔“

”یہ فائل آزاد دوسری نوعیت کی ہے۔“ آغا منظور نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”یہ سمجھ لیں کہ اس کا کچھ تعلق مجھ

بندھن توڑے۔ پول سندی، کیا تو پر تپ کی شفتی کا تماشا دیکھنا پسند کرے گی؟“

جوزبان پر تپ کھوش بول رہا تھا وہ فرمین کی کچھ میں پوری طرح نہیں آ رہی تھی لیکن وہ اس کا مطلب کچھ کچھ سمجھ رہی تھی، جب شوہر کے کئے ہوئے سر اور تپ تپ کر مسوت کے منہ میں جانے کی بات اس کے کانوں سے گرائی تو وہ بے اختیار چٹخ اٹھی۔ اسی چٹخ سے وہ بیدار بھی ہو گئی۔ وہ اپنے ہلکے پر تھی۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ اپنا شبہ دور کرنے کی خاطر اس نے چھوٹے سے کپے کے گھر کا ایک ایک حصہ کھنگال ڈالا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ شاید اس نے پھر دس منٹ میں بھی کوئی خواب دیکھا تھا جس نے وجود کے ایک ایک جوڑ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

قوری طور پر فرمین نے دل میں لاجول پڑھی۔ وضو کیا اور جائے نماز چھپا کر دو رکعت نفل ادا کیے پھر سر بخود ہو کر خدا کے حضور گڑ گڑا کر لیاقت اور اپنی سلامتی کی دعا مانگی، باقی رہی۔ اس نماز کی برکت اور خدا سے لوگنے کے سبب ہی تھا کہ فرمین کے دل کا خوف کم ہونے لگا۔ بڑی دیر تک وہ سچے میں پڑی اللہ کے رحم و کرم اور نظر منایت کی ہدایت مانگتی رہی۔

☆☆☆

ایس بی آغا منظور اور ڈی ایس بی سراج ایک ندی کے دو ایسے کنارے تھے جو بھی نہیں مل سکتے تھے، اعلیٰ افسران کو بھی اس بات کا بخوبی علم تھا کہ آغا منظور، شیخ جاد کا خاص آدمی تھا، اس نے کئی مرتبہ اس بات کی کوشش بھی کی تھی کہ سراج کی جگہ کسی اور ڈی ایس بی کی تعیناتی اپنے ساتھ کرالے ہر اجازت چونکہ ایماء اور کھرا آفیسر تھا اس لیے کسی کے حکم سے بھی کوئی غلط قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ ہاں اگر کوئی احکام یا قاعدہ تحریری صورت میں ہوں اور کام کی نوعیت کی وضاحت بھی کر دی گئی ہو تو وہ اسے درگزر کرنے سے دریغ بھی نہیں کرتا تھا۔

ایس بی ایک دو معاملات میں آغا منظور نے اسے ملوث کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن سراج کے پاس چونکہ تحریری ثبوت موجود تھے اس لیے اس کے خلاف کوئی فائل نہیں کھولی جاسکتی۔

بحیثیت ماتحت وہ آغا منظور کے ساتھ اکثر میٹنگ میں شریک بھی ہوتا تھا لیکن دیدہ و دانستہ ایس بی کی کسی رائے پر اختتامی نوٹ نہیں لکھتا تھا۔ جانتا تھا کہ دریا میں رہ کر مگر کچھ سے بچ لینا بھی مناسب نہیں۔ بہر حال وہ کسی بھی ایسے کام میں ملوث نہیں ہوتا تھا جس میں پھنس جانے کا ذرا بھی خدشہ موجود

سے بھی ہے، رہا احکامات پر عمل کرنے کا مسئلہ تو میں آپ کو دوست زیادہ اور ماتحت کم سمجھتا ہوں۔“ آخری جملہ خاص طور پر ایک خاص انداز میں کہا گیا۔

”یہ آپ کی محبت ہے۔“ سراج نے انکساری سے جواب دیا۔

”آپ نے پچھلے دنوں غالباً افضل خان کو کسی وجہ سے دفتر طلب کیا تھا؟“

”جی ہاں۔“ سراج مختصر جواب دینے کے بعد سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”اس کے بعد آپ شاید شیخ حامد سے بھی اس کے دفتر جا کر ملے تھے۔“

”جی ہاں۔“ اس نے پھر صرف اقرار کیا۔

”مسز سراج، آپ کے علاوہ دوسرے افسران بھی اس بات سے ضرور واقف ہوں گے کہ شیخ حامد سے میرے دوستانہ مراسم ہیں، آج کے دور میں کسی بڑے آدمی سے دوستی قائم رکھنا وقت کی ضرورت ہے اور قانوناً جرم بھی نہیں ہے۔“

”میں آپ سے متفق ہوں سر۔“ سراج نے بھی مصلحتاً سنبھل کر کہا۔ ”اسی لیے میں نے بھی آپ کے شخص قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے۔“

آغا منصور، سراج کے ذہنی پہلو پر چونکا پھر سنجیدگی سے اصل موضوع کی طرف آگیا۔ ”آپ نے غالباً میڈم

روہی کا نام ضرور سنا ہوگا۔“

”جی ہاں۔“ سراج نے دلچسپی لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”میری اطلاع کے مطابق وہ ایک کروڑ پتی بیوہ ہے۔ شوہر کی زندگی میں وہ خاصی محتاط زندگی گزارنے کی عادی تھی لیکن اس کے بعد۔“ سراج نے اپنا جملہ دیدہ و دانستہ باکمل چھوڑ دیا۔

”آپ جو بات کہتے کہتے رک گئے وہ میں بھی جانتا ہوں۔“ انہی نے آغا منصور سے سنجیدگی سے کہا۔ ”اب وہ بے حد مازن اور آزاد خیال ہو گئی ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

”میں جانتا ہوں کہ آپ اگر کچھ وقت نکال کر اس کی سرگرمیوں اور نئے نئے چلنے والوں پر نظر رکھیں تو مجھے خوشی ہوگی۔“

”سر۔“ سراج نے کسمپاسہ سوال کیا۔ ”کیا میڈم روہی کسی خلاف قانون سرگرمیوں میں ملوث ہے؟“

”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن۔“ آغا منصور خاموش ہو گیا۔ پھر کچھ توقف سے بولا۔ ”سنا ہے ادھر کچھ

دنوں سے وہ ریڈیو کلب میں بھی نظر آ رہی ہے۔“

”آئی ہی۔“ سراج نے کریدنے کی کوشش کی۔ ”کیا اس کلب کے بارے میں کوئی خفیہ رپورٹ بھی مرتب کرنی ہوگی۔“

”جی نہیں۔ آپ کو صرف میری خاطر ان افراد کی فہرست تیار کرنا ہے جن سے میڈم روہی زیادہ بے تکلف ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں سر۔“ سراج نے اس بار بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ ”یہ کام تو میں بغیر فائل مارک کیے بھی آپ کی خاطر انجام دے سکتا ہوں۔“

”صحتاً۔“ ایک لمحے کی پرسوج خاموشی کے بعد آغا منصور نے دلی زبان میں کہا۔ ”شیخ حامد سے میری دوستی کی بات اور ہے لیکن یہ بات آپ بھی جانتے ہیں کہ افضل

خان کا ماضی کیا رہ چکا ہے۔“

”جی ہاں۔“ سراج، افضل خان کے نام پر چونکا تھا۔

”آج کل میڈم روہی اس شخص میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہی ہے۔“

سراج، افضل خان اور میڈم روہی کا نام سن کے دل ہی دل میں مسکرا دیا، وہ جانتا تھا کہ خود اس نے آغا منصور بھی اپنے ذاتی شوق میں کس قماش کا آدمی تھا۔ ابھی تک کوئی اسکینڈل اس لیے منظر عام پر نہیں آ سکا تھا کہ وہ ذاتی زندگی میں اس قدر محتاط تھا کہ خود اپنے سامنے سے بھی ہوشیار رہتا تھا لیکن بہر حال یہ بات سراج کے علم میں تھی کہ وہ کئی بڑی پارٹیاں میں میڈم روہی کے ساتھ بھی ملتے جلتے دیکھا گیا تھا۔ سراج نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”سر، کیا میڈم روہی اور افضل خان والی بات شیخ حامد کے علم میں بھی ہے؟“

”ہو سکتی ہے لیکن شیخ حامد نے اپنے کسی کارندے پر ایسی بندش بھی نہیں لگا رکھی کہ وہ اپنی سوشل لائف بھی اپنی مرضی سے نہ گزارے۔“ آغا منصور نے الفاظ چپاتے ہوئے دلی زبان میں کہا۔ ”البتہ وہ اس بات کو بھی پسند نہیں کرتا کہ کسی کارندے کی سوشل لائف اس کے ذاتی کاروباری معاملات، اس کے سخت اصولوں یا کسی مفاد سے ٹکرائے۔“

”میرے لیے اور کوئی خدمت۔“ سراج نے مسکرا کر پوچھا۔

”آپ کی اور شیخ حامد کی ملاقات اس کے کس آنکس میں ہوئی تھی؟“

”میرا ذاتی خیال ہے وہ ایک مخصوص آنکس تھا جس کی شیخ حامد غالباً خاص خاص موقعوں پر ہی استعمال کرتے

ہے۔“ سراج نے انہی نے سوال کی گہرائی بھانپ لیتے

کے باوجود بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔

”ایک مشورہ دوں۔ اگر آپ برا محسوس نہ کریں؟“

”میں کسی کے شخص مشوروں پر کبھی برا نہیں مانتا سر۔“ اور آپ تو۔“

”اس وقت میں ایک کولیک اور دوست کی حیثیت سے آپ کو ایک مشورہ دے رہا ہوں۔“ آغا منصور نے ایک طویل سانس لے کر بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”ہم سرکاری آفیسر ہونے کے باوجود بھی کبھی وقت کے دھارے کے ساتھ قدم مار کر چلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن ایک تجربہ میری زندگی کا نچوڑ بھی ہے۔ اگر پولیس افسران مل کر ایک جتنے کی صورت میں کام کریں تو عوام یا پریس بھی ان کے خلاف زبان نہیں کھول سکتے۔“

”میں آپ سے صدیقی صدیق ہوں سر۔“ سراج نے غلغلہ دل سے تائید کی۔

”آپ کی پناہ پسند کریں گے، چائے یا کافی؟“

”پھر کبھی سر۔“ سراج نے اٹھتے ہوئے کہا پھر کب سر پر رکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر انہی کی کو سیلیٹ کیا اور تیزی سے پلٹ کر اس کے دفتر سے باہر نکل گیا۔ اس کے ذہن میں اس وقت بھی بہت سارے جملے اپنے گونج رہے تھے جو آغا منصور نے میڈم روہی کی سرگرمیوں اور آزاد خیالی کے بارے میں کہے تھے۔ خاص طور پر اس نے جس سرگرمی انداز میں ریڈیو کلب میں افضل خان اور میڈم روہی کے ایک ساتھ دیکھے جانے والی بات کہی تھی، وہی سراج کی نگاہوں میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل تھی جسے سوچ کر اس کے ہونٹوں پر ابھرنے والی مسکراہٹ بھی بڑی شوخ اور مسیقی خیز نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

سیٹھ عثمان اور راجیلہ بیگم کے ملے جانے کے بعد لیاقت حسین کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی تھیں۔

راجیلہ بیگم نے گھر کی دیکھ بھال کے لیے اپنی ایک عزیز و کا بندوبست کرنے کے باوجود اسے خاص طور پر اس بات کی تاکید کی تھی کہ ان کی غیر موجودگی میں اسے تمام تر اقتصادیات حاصل ہوں گے۔ برا اعتبار سے ہر بات کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔ لیاقت حسین نے ایک پٹھان کی زبان سے قول دیا تھا کہ وہ زندگی میں بھی راجیلہ بیگم یا سیٹھ عثمان کو مایوس نہیں کرے گا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے اس کا وہ وعدہ بہت اہم تھا۔ اسی وعدے اور قول کو نبھانے کی خاطر وہ صاحب لوگوں کے جانے کے بعد اپنی ذمہ داریاں کو زیادہ

وقت دینے لگا تھا۔

اس کی ایک تنگی اور ذہانت کام آتی تھی جس نے بروقت اس گھر کو بچالیا تھا جہاں کا وہ نمک کھاتا تھا، اس کی ایک ذمہ داری نبھانے کا سیٹھ عثمان اور راجیلہ بیگم اتنا بڑا سلسلہ دیں گے، یہ اس نے خواب میں بھی نہیں سوا تھا، کہیں وحید ڈار انیورسٹی لیاقت حسین کو مل جاتا تو وہ اس نمک حرام کو بھی اس کے جرم کی پاداش میں زندہ درگور کر دیتا لیکن ڈی ایس پی سراج نے بتایا تھا کہ اس کی خدمات خریدنے والوں نے اسے ملک کی سرحد پار کر کے کئی دور بھجوا دیا تھا۔

لیاقت حسین کی جان ٹھاری اور ایما عمار کی کی وجہ سے سراج بھی اس پر خاصا مہربان ہو گیا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ شہر آتے ہی اسے قدم جمانے کا موقع مل گیا تھا، وہ ہر طرح سے اپنے معاشی حالات سے نہ صرف مطمئن تھا بلکہ خدا کا شکر ادا کرتا رہتا تھا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ محسوس کر رہا تھا کہ فرحین اس سے نیچے میں گندے علم کے ذریعے پھنسی جانے والی سونیاں نکالنے والی بات سے خوش نہیں تھی۔ کوئی اور بات بھی تھی جو وہ لیاقت کو بتانے سے کتر رہی تھی۔ دوپہر کو ڈیوٹی پر آنے سے پیشتر اس نے ملے کر لیا تھا کہ واپسی پر وہ فرحین کا دل ٹٹولنے کی بھرپور کوشش کرے گا۔ وہ فرحین کو بہر حال میں خوش دیکھتا اور رکھتا چاہتا تھا۔

سازے سات بچے ڈیوٹی ختم کر کے اور رات والے چوکیدار کو ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ گھر کے لیے نکل رہا تھا کہ سراج کی گاڑی اچانک اسے سامنے میں داخل ہوئی۔ لیاقت کو رکنا پڑا۔

”کیسے ہو لیاقت۔“ سراج نے گاڑی سے نکلے ہی بے تکلفی سے اس کی خیریت دریافت کی۔

”سب اوپر والے کی مہربانی اور آپ لوگوں کی

معاونت ہے۔“

”گند۔“ سراج مسکرایا۔ ”اب تو تم اچھی اردو بولنے لگے ہو۔“

”کوشش کر رہا ہوں صاحب کہ نئے شہر میں قدم بھایا ہے تو ادھر کے طور طریقے بھی اپنا سکوں۔“

”اور تو سب خیریت ہے نا۔“

”سب ٹھیک ہے صاحب لیکن۔“ لیاقت نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”میں وہ نمک حرام وحید واپس آ جاؤ تو مجھے ضرور بتا دیجیے گا۔“

”اگر وہ ابھی کیا تو تم کیا کرو گے؟“ سراج نے دوستانہ انداز میں سوال کیا۔

سیٹھ عثمان 31 ستمبر 2011

قرب نہیں آئے گا اور اگر وہ آیا تو کوئی رحمانی قوت اس کو دم دیا کر بھاگنے پر مجبور کر دے گا۔

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ فرمین نے شوہر کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پانی ڈالنے کے بعد سے کوئی بات ایسی ضرور ہے کہ میرا دل بھی گم گھبرا رہا ہے۔“

”اللہ کے حکام میں بڑی برکت ہوتی ہے۔“ لیاقت حسین نے صدق دل سے کہا پھر فرمین کو بانہوں کے حصار میں لے کر میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا۔

وہ رات سکون سے گزر گئی، صبح فرمین نے حسب معمول ناشتا تیار کیا۔ لیاقت حسین تیار ہو کر ذرا کڑی پر جانے لگا تو اس نے ایک بار پھر فرمین کو بڑے پیار سے سجھایا۔

”تم گھبرانا نہیں۔۔۔ سب ٹھیک ہی ہو گا ویسے میں نے گل خان کو یوں دیا ہے کہ زبردستی کام کاج سے فارغ ہو کر تمہارے پاس آ جائے پھر میرے آنے کے بعد ہی گل خان اسے واپس لے جائے گا۔“

”اور اگر ذریعہ نہ گل خان کے آنے کے بعد اس کے پاس جانے کا ضد کیا تو۔۔۔؟“ فرمین نے شوٹی سے سوال کیا۔ لیاقت حسین اس کی بات کا مطلب سمجھ کر مسکرا دیا پھر فرمین کے گالوں پر محبت سے ہاتھ پھیر کر اسے خدا حافظ کہا ہوا ڈیوٹی پر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

افضل خان اپنے تین کمروں کے کشادہ ٹکڑی اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو اس نے سکون کا سانس لیا، جب تک شیخ حامد شہر میں رہتا، وہ اس کے کاسوں میں رات گئے تک مصروف رہتا تھا۔ شیخ حامد جب بھی شہر سے کہیں باہر جاتا، افضل خان کو قبل از وقت آگاہ کر دیتا، چنانچہ آج بھی اس نے شام چھ بجے دفتر سے اٹھے وقت افضل خان کو اپنے کمرے میں بلا کر کہا تھا۔

”میں آج تین چار روز کے لیے ملک سے باہر جا رہا ہوں، میری غیر موجودگی میں ان باتوں کا خیال رکھنا جس کے لیے میں نے تاکید کر رکھی ہے۔“

”آپ مطمئن رہیں جگ باس، آپ کی غیر موجودگی میں ہمیشہ زیادہ محتاط رہتا ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ شیخ حامد نے کسی زہریلے ناگ کی طرح بلی کا سر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”واپسی پر مجھے سب کی تفصیلی رپورٹیں اپنے ایک اہم کارندے سے ملتی رہتی ہیں، بہر حال میرے جانے کے بعد شام چھ بجے کے بعد سے صبح نو بجے تک تم اپنی سوشل لائف انجوائے کر سکتے ہو، لیکن احتیاط

شرط ہے۔“

”شکر ہے سہرا،“ افضل خان نے انکساری سے جواب دیا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”ایک بات معلوم کرنے کی جرات کر سکتا ہوں؟“

”کیا۔۔۔؟“

”کہیں آپ سیٹھ عثمان کی بیرونی سرگرمیوں کا توڑ کرنے کے ارادے تو۔۔۔؟“

”شٹ اپ۔۔۔“ شیخ حامد نے اسے جھٹکی نظر سے دیکھا۔ ”دوبارہ بھی اس قسم کے ذاتی سوالات کی حماقت نہ کرنا۔“ ڈائیکٹ لاسٹ۔۔۔

”سوری سر۔۔۔“ افضل خان کی پالتو کتے کی طرح دم دبا تا پلٹ کر باہر گیا۔

اس وقت اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے بعد بھی اس کے کانوں میں جگ باس کا ایک خاص جملہ صدمہ اسے بازگشت بن کر گونج رہا تھا۔ ”واپسی میں مجھے سب کی تفصیلی رپورٹیں اپنے ایک کارندے سے ملتی رہتی ہیں۔“ وہ اہم کارندہ کون تھا جو ابھی تک افضل خان کی نظروں میں نہیں آسکا تھا؟

خاصی دیر تک وہ جگ باس کے چیلے کی بازگشت سناتا رہا پھر اس نے سر جھٹک کر اس مسئلے کو پس پشت ڈال دیا۔ شیخ حامد نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ اپنی سوشل لائف انجوائے کر سکتا ہے۔

نہا دھو کر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اس نے ٹی وی آن کر دیا پھر شراب اور اس کے ساتھ دیگر لوازمات نکال کر میز پر رکھے اور پیتے میں مشغول ہو گیا۔ یہ بات اس نے بہر حال طے کر لی تھی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس ”تغییر آدمی“ کا کھوج بھی ضرور لگائے گا جو اس کے لیے کبھی اندر جیسے میں سائنسز لگے پتھول کی وہ گولی تابت ہو سکتا تھا جس پر۔۔۔ تڑپ تڑپ کر مرنے کا حکم ہوتا تھا۔ تین پیک حلق سے نیچے اتارنے کے بعد افضل خان اپنی سوشل لائف کو انجوائے کرنے کی خاطر ان موڈرن اور آزاد خیال لڑکیوں اور خواتین کے ناموں پر غور کرنے کا جو اس کے اشارے پر بھی ”نہ“ نہیں کہتی تھیں۔ اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر تھیں جس پر فیشن کے مخصوص چینل سے کسی غیر ملکی فیشن شو کی جھلکیاں بڑی تفصیل سے دکھائی جا رہی تھیں۔

سازمے سات چبچب چک چار پانچ پیک پینے کے بعد وہ پوری طرح ترنگ میں تھا، فیشن شو کی ماڈل گرلز جس انداز

میں جدید اور مختصر لباس کے ساتھ ساتھ اپنے جسم کی فحاش کر رہی تھیں وہ افضل خان کی اشتہا کو اور بھڑکا رہی تھیں اس کے ذہن میں کئی استہلال شدہ چہروں کے نام کے بعد دیگرے ابھر رہے تھے۔ شیخ حامد کی تین چار دنوں کی غیر موجودگی میں وہ اپنی تمام راتیں رنگین بنا چاہتا تھا۔ اچانک ایک گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد اس کے ذہن میں ایک نیا نام نکلی بن کر کوندا۔ اس نے دبی گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس وقت سوا آٹھ بج رہے تھے۔ اس نے گلاس میز پر رکھ کر کارڈ فیس فون اٹھایا۔ ریجنو کلب کے نمبر گھمانے لگا۔ اس کے ذہن میں میڈم روہی کا حسین اور گداز جسم کھلانے لگا۔ میڈم روہی بیوہ ہونے کے باوجود نکلتے ہوئے قد اور ایسے خوبصورت جسم کی مالک تھی جس کے اندر جنس مخالف کے لیے بے پناہ مقناطیسی قوتوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ استہلال شدہ جسموں کے مقابلے میں وہ اب بھی بالکل تر و تازہ لگتی تھی۔

شوہر کی موت سے قبل اس کو کبھی کسی پبلک میڈرنگ میں شاذ و نہ روہی دیکھا جاتا تھا لیکن شوہر کے انتقال کے بعد اس نے جس انداز میں ہونٹوں، ٹھکیوں اور تفرنگی مقامات پر جانا شروع کر دیا تھا، وہ سب کے لیے حیرت انگیز بات تھی۔ وہ ہر کس و نامکس سے بے تکلف ہونے کی عادی نہیں تھی لیکن اس کا کوچ دار اور گداز جسم ہر محفل میں مرکز نگاہ بن جاتا تھا، خاص طور پر ان بڑے لوگوں کے لیے جو دن میں بہت لمبے دیے رہتے تھے لیکن رات میں اپنی خواب گاہوں کو ہمیشہ نئے نئے جسموں سے گل و گلزار بنانے کے عادی تھے۔

سال سوا سال قبل روہی کے کروڑ پتی شوہر خالد ریاض کا انتقال ہانگ کانگ میں بزنس کا فزٹنس انٹینڈ کرنے کے بعد ہوئی جاتے ہوئے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہوا تھا۔ میڈم روہی کو شوہر کی موت کی اطلاع دی گئی تو وہ پہلی فلاحیت سے شوہر کی لاش وطن واپس لانے کے لیے ہانگ کانگ پہنچی گئی۔ غیر ملکی اور ملکی ایکسپنسیوں نے بھی میڈم روہی کو احتیاطاً پوسٹ مارٹم کرانے کا مشورہ دیا تھا لیکن اس نے کسی مشورے پر عمل نہیں کیا۔ لاش کو چار ٹریڈ جین سے واپس لانے کے بعد اس نے رسم و رواج کے مطابق سپرد خاک کر دیا تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد چار ماہ تک وہ گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ پھر اس نے شاید اپنے غم کو بھلانے کی خاطر سوشل زندگی اختیار کر لی تھی۔ ریجنو کلب پر چھوٹے شہر کا سب سے مشہور اور مہنگا کلب تھا اس لیے اس نے وہاں کی رکنیت بھی اختیار کر لی جہاں ممبروں کے سوا کسی اور کو رکنیت دینے سے آگے جانے کی

اجازت نہیں تھی۔

”ہیلو۔۔۔“ تین بار نمبر لڑائی کرنے کے بعد ریجنو کلب کی خوبصورت اور نوخیز ریسیپٹنٹ نے کال ریسیو کی۔ ”ماریا فرام ریجنو کلب انٹینڈنٹ پھر۔۔۔“

”کیسی ہو ماریا۔۔۔“ افضل خان نے بے تکلفی سے پوچھا، ماریا کو بھی وہ پہلے استہلال کر چکا تھا۔

”اوہ، افضل خان۔۔۔“ ماریا نے دم آواز میں پوچھا۔ ”آج تم کلب نہیں آئے، کہیں اور مصروف ہو؟“

”اوہ۔۔۔ نو۔۔۔“ افضل خان نے اسے جانے کی خاطر کہا۔ ”اس وقت بھی ایک آفیشل ڈیوٹی تیار رہا ہوں، شیخ سے بات کرنی تھی۔“

”بیک لک۔۔۔“ ماریا نے شوٹی سے جواب دیا۔ ”شیخ اس وقت کسی کام سے باہر گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں دوبارہ کال کر لوں گا۔“ افضل خان نے تنبیہ کے ساتھ جواب دیا۔ وہ ماریا سے میڈم روہی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھنا چاہتا تھا، شیخ سے اس کی موجودگی یا غیر موجودگی کے بارے میں دریافت کرنا زیادہ مناسب تھا، پھر اس سے خوش کر وہ کارڈ فیس آف کرتا۔ ماریا کی سرسراہٹ ہوئی آواز سنائی دی۔

”تم جو آفیشل کام کر رہے ہو اس میں اور کون تمہارے ساتھ ہے؟“

”کیا مطلب۔۔۔؟“

”مطلب یہ کہ آج میڈم روہی بھی ابھی تک کلب نہیں آئی۔“ ماریا نے بے تکلفی سے کہا۔ ”سب ہی کا یہ خیال ہے کہ وہ مالدیو خاتون تمہارے اندر دھکی لے رہی ہے۔“

”تمہارا وہم ہے، ورنہ آج تک اس کا کوئی نہ کوئی ایکسیڈنٹ ضرور مشہور ہو چکا ہوتا۔“

”مجھے سے کچھ چھپانے کی تو۔۔۔“

”ڈونٹ بی کلی ماریا۔۔۔“ افضل خان نے اس بار قدرے بے زاری کا اظہار کیا پھر سلسلہ بھی منقطع کر دیا۔

ماریا نے جس شے کا اظہار کیا تھا وہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ خود افضل خان نے بھی ایک دو موقعوں پر محسوس کیا تھا کہ میڈم روہی اس کے ساتھ مل بیٹھنے کی خواہش مند ہے لیکن ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔ یہ بات بھی درست تھی کہ اس وقت بھی اپنے خلوت کدے کو جانے کی خاطر افضل خان کے ذہن میں اسی خوبصورت بیوہ کا خیال ابھرا جس کے قرب کے لیے وہ لگی چل رہا تھا۔

ماریا سے رابطہ ختم ہونے کے بعد افضل خان نے گلاس



MEDICAM SHAMPOO



بالوں کو سنواریں اب نئے انداز سے

وہی 3 کی خوبیوں کے ساتھ

NEW International
Packaging

بالوں کی بہتر نشوونما کو یقینی بنائے بال لمبے، گھنے، چمکدار نظر آئیں۔۔۔

اپنے عہد کی تحریری عاقبت بھی رکھوانے کو تیار ہوں۔ اس سے مل گئی کو اپنے جسم سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتی اس لیے کہ یہ بدترین گناہ ہے۔

”تم اس کا نام بتاؤ۔“ افضل خان کو اپنا مستقبل روشن اور تابناک نظر آیا تو اس نے بڑی اہمیت سے روٹی کا ہاتھ تھام لیا۔

”ایک ضروری بات اور قبل از وقت ذہن نشین کر لو۔ کام ہونے کے بعد، میں غوری طور پر تم سے نکاح کر کے اس ملک کو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر چھوڑ دوں گی، بیرون ملک بھی کر ہم اپنے ذاتی مکان میں ہی زندگی کا آغاز کریں گے۔“

”اس سے زیادہ کسی کی زندگی کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے۔“ افضل خان لالچ میں جذباتی ہونے لگا۔ ”تم مجھے صرف اس کا نام اور پتا دو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے اس طرح دوسری دنیا کا سفر کراؤں گا کہ اس کی روح بھی ششدر رہ جائے گی۔“

”پھر غور کرو افضل، کہنا آسان ہوتا ہے لیکن کرنا بے حد دشوار ہوتا ہے۔“ روٹی نے کسم کسم کر کہا۔ ”تم انکار کر دو گے تو بات سبک ہو جائے گی۔ میں کوئی دوسرا کام کا آدمی تلاش کر لوں گی۔ عورت ایک بار جو بات دل میں ٹھان لے پھر اس سے پیچھے ہٹنا اپنی سب سے بڑی توجہ بنتی ہے۔“

افضل خان کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”روٹی ڈیڑھ اب تم نے میرا انتخاب کیا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔ یہاں تک آنے سے پہلے میرے بارے میں کچھ حقیقتات بھی ضرور کر چکی ہوگی؟“

”ہاں۔۔۔ میں انکار نہیں کر دوں گی۔ میں مکمل یقین کرنے کے بعد یہاں آئی ہوں اب اگر تم بھی ایک بار دل میں پختہ ارادہ کر لو تو وہ کام تم ہی سب سے زیادہ آسانی سے کر سکتے ہو۔“

افضل خان اس وقت نشے میں تھا اس لیے بات کی گہرائی نہ بھانپ سکا لیکن جب اس کے دوبارہ اصرار پر میڈم روٹی کے ہونٹوں پر سچا حامد کا نام آیا تو ہلک جھپٹے میں اس کا سارا فہم ہرن ہو گیا۔ روٹی کا ہاتھ اس نے بولکلاہٹ میں ایسے چھوڑ دیا جیسے اب تک کسی نامن کا چہن تھا سے بیٹھا ہو۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے اللہ کر کے کے دبیر قاتلین پر ادھر ادھر تیز قدم اٹھانے لگا۔ میڈم روٹی نہایت اطمینان سے بھی اس کی کیفیت کا اندازہ لگا رہی تھی۔

”جہیں حاصل کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ وہ گلاس خالی کرتے ہوئے بولا۔ اس کی بھوکی نظریں اس وقت بھی روٹی کے جسمانی گداز اور نشیب و فراز پر کسی بھوکے گدھ کی طرح منڈلا رہی تھیں۔

”میرے شوہر کا انتقال کسی اتفاقیہ حادثے کا نتیجہ نہیں تھا۔“ میڈم روٹی نے گلاس میں پچی شراب کا گھونٹ لیے ہوئے کہا۔ ”باقاعدہ ایک پلاننگ کے تحت کچھ لوگوں نے، انہیں اپنے راستے سے ہٹا دیا تھا۔“

”تمہارے شوہر کا کاروبار کیا تھا؟“ افضل خان نے بے دلی سے دریافت کیا۔

”نام نہیں پوچھو گے؟ ان کا نام خالد ریاض تھا۔“ روٹی نے خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ حقیقی پتھروں کی بیرونی منڈی کے بے تاج بادشاہ تسلیم کیے جاتے تھے۔ کسی غیر ملکی بینکوں میں اس کے کروڑوں ڈالرز اب بھی موجود ہیں جو، اب میرے نام ہو چکے ہیں لیکن۔۔۔ مجھے دولت نہیں، اس دشمن کا سراپا ہے جس نے میری زندگی برباد کی۔۔۔“

”تجلی پرانی بات ہے۔۔۔“

”ایک سال سے کچھ اوپر ہو چکا ہے۔“ روٹی نے سر ڈاؤں بھری۔

”اور تم اب تک خاموش رہیں، کیا اس کی بھی کوئی خاص وجہ تھی؟“

”ہاں۔۔۔ میں چاہتی تھی کہ دشمنوں کو اس بات کا یقین آجائے کہ میں ان کے ہاپاک منصوبوں سے واقف نہیں ہوں۔“ روٹی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”کسی آستین کے سانپ کا سر کھینچنے میں اس وقت زیادہ مزہ آتا ہے جب اس کو بے خبری میں ہلاک کیا جائے۔ اب وہ وقت آ گیا ہے اور تم۔۔۔ تم یہ کام کر سکتے ہو۔“

”کیا نام ہے اس کا۔۔۔؟“

”نام بتانے سے پہلے میں کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہوں۔“ روٹی نے اس بار گلاس کی پچی شراب ایک سی گھونٹ میں ملنے سے بچھڑا کر بڑے سنجھے ہوئے انداز میں بولی۔ ”میں نے ماؤرن بننے کا یہ طوق اسی لیے اپنے گلے میں ڈالا ہے کہ اپنے مرحوم شوہر کا انتقام لے سکوں۔ میں تمہیں اس کام کے لیے پچاس لاکھ آنکھ بند کر کے دے سکتی ہوں اور۔۔۔ تمہاری کامیابی کی صورت میں تم سے شادی کرنے کے بعد اپنے نام کی آدمی جائیداد جس کی مالیت کروڑوں میں بنتی ہے تمہارے نام کر دوں گی۔ تم کو یقین نہ ہو تو میں کسی حقدار پارتی کے پاس، جو ہم دونوں سے واقف ہو

دوسری طرف افضل خان مجیب شش و پنج میں پڑ گیا تھا، وہ جانتا تھا کہ وہ شاید صبح جلد کو اس کے قریب ہونے کے سبب بہت آسانی سے جہنم رسید کر سکتا تھا۔ اس کام کے عوض جو آخری کی جی وہ بھی اس قدر پر کشش تھی کہ وہ فوری طور پر اس سے دست بردار ہونے کو بھی تیار نہیں تھا۔

”میں اب چلتی ہوں افضل!“ میڈم روہی نے نہایت اطمینان سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے علم تھا کہ تم میرے دشمن کا نام سن کر بھرا جاؤ گے لیکن ابھی بات صرف میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ اگر تم چاہو تو سوچتے دیکھتے کے بعد انکار بھی کر سکتے ہو لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔ اس وقت تمہارے اپارٹمنٹ میں میرے اور تمہارے درمیان جو بھی گفتگو ہوگی اسے اپنے ذہن سے بھی کھرچ کر نکال بیٹھنا ورنہ شام میں صبح حادہ کے لیے پچاس لاکھ نہیں ایڈوائس دے سکتی ہوں تو تمہارے لیے کسی اور کو بھی دو چار لاکھ میں آمادہ کر سکتی ہوں، یہ کام زیادہ آسان بھی ہوگا۔ تمہارا منی کیار ہا ہے، اس کا اعزازہ تم خود بھی خطے دل سے لگا لیتا۔ اوکے۔ بالی۔“

میڈم روہی تیزی سے دروازہ کھول کر نکل گئی تو افضل خان نے اسے فوری بند کیا پھر اپنے لیے نیا گلاس تیار کرنے لگا۔ وہ صبح ہونے سے خوش کوئی آخری فیصلہ کر لیتا جانتا تھا جو اس کے لیے نہایت دشوار تھا۔ ایک طرف اگر زندگی تھی تو دوسری طرف موت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک مشکل اور بھی درپیش تھی۔ اگر صبح جلد ہی روہی کے شوہر کا قاتل تھا تو روہی کے اس کے اپارٹمنٹ تک آنے کی خبر سننے کے بعد وہ اس ملاقات کی گہرائی تک کھوج لگانے کی کوشش ضرور کرے گا، اس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

لیاقت حسین کے کہنے کے بموجب، گل خان نے بھی زریں کو تاکید کر دی کہ وہ دوپہر کا کھانا تیار کرنے کے بعد فرمین کے پاس رہے۔ لیاقت حسین ڈیوٹی کے بعد آٹھ ساڑھے آٹھ بیچے تک آجاتا تھا اس کے بعد زریں چلی جاتی تھی۔

فرمین کو دو روز تک سکون ملنے کے بعد اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ پر تاب گوش یا وہ جو بھی گندی بلا بھی اب کم از کم اس کے مکان میں چڑھ کے گئے پانی کی وجہ سے نہیں آسکتی۔ لیاقت حسین کے علاوہ خود زریں نے بھی یہی کہا تھا کہ اس قسم کی بدرومیں انسان کو ڈرا تو سکتی ہیں لیکن اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔ اس وقت بھی وہ فرمین کو یہی سمجھا رہی تھی۔

”تم نے جو کچھ نئی آنکھوں سے دیکھ لیا، وہی تمہیں خواب میں بھی نظر آ رہا تھا، بھوت پریت اور گندی بلا بھی انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ جو خدا کو منظور ہو وہی سچ ہے، ہمارا تمہارا ایمان بھی یہی ہے کہ اس پاک ذات پر یقین کرو جو دونوں جہانوں کا مالک ہے، اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”اور تم نے جو عائدہ اور اس کے شوہر والی خون کی موت کی بات کی تھی، کیا وہ غلط تھی؟“ فرمین نے زریں کو یاد دلایا تو وہ ایک لمبے خاموش ہوئی، اس نے جو کچھ اپنی کلی آنکھوں سے دیکھا تھا وہی واقعہ اس نے فرمین کو سنا دیا تھا، اب اس کی تردیدیں کر سکتی تھی۔

”وہ۔۔۔ وہ بات بھی غلط نہیں ہے۔“ اس نے فرمین کو تسلی دینے کی خاطر کہا۔ ”چار ذات کا پلید لوگ جو گندامل کرتے ہیں وہ بھی کبھی کبھی انسان کا جان لے لیتا ہے مگر اس میں بھی اوپر والے کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عائدہ اور اس کے خاوند کو شہید کر دیا گیا ہو، مگر اوپر والے کی مرضی ہے۔ انسان کو ہر حال میں اپنا فرض پورا کرتے رہنا چاہیے۔ کل کیا ہوگا؟ کیا ہونے والا ہے؟ یہ بھی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“

”زریں، ایک بات پوچھوں تم برا تو نہیں مانو گی؟“ فرمین نے ذرا دیر سے موضوع کو بدلنے کی کوشش کی۔

”میں تمہاری کسی بات کا برا کیوں متاؤں گی۔ پوچھو تم کیا پوچھنا چاہتی ہو۔“ زریں نے محبت سے فرمین کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”تمہاری شادی کو کتنا سال ہو گیا۔۔۔؟“

”اوہ۔۔۔“ زریں نے فرمین کی بات کا مفہوم جان کر کہا۔ ”ابھی کل چار سال ہوا ہے لیکن گل خان کی ابھی مرضی نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ فرمین نے حیرت کا اظہار کیا۔

”مطلب یہ ہے کہ وہ بولتا ہے کہ عورت ماں بننے کے بعد بچے کا زیادہ خیال رکھتا ہے، اس لیے وہ ابھی ایک سال اور انتظار کرے گا۔“

”اور تم۔۔۔“

”میں گل خان سے الگ نہیں ہوں فرمین۔“ زریں نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ ”دنیا کی ہر عورت شادی کے بعد ماں بننا چاہتی ہے، میں بھی چاہتی ہوں کہ میرے گھر میں بھی بچے کے معصوم قہقہے گونجیں لیکن جب شوہر نہ چاہے تو۔۔۔“

”اور تو کوئی بات نہیں ہے؟“ فرمین کے اندر جھسک کھلانے لگا۔

”نہیں۔۔۔ گل خان ہم کو دل و جان سے چاہتا ہے، مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔“ زریں نے تنبیہ کی سے کہا۔

”دینے بھی یہ سب اللہ کی مرضی پر ہے، جب مقدر میں لکھ دے گا تو ہر گل خان بھی مجبور ہو جائے گا۔“

فرمین نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”کیا لیاقت بھائی کو بھی جلدی نہیں ہے؟“ زریں نے فرمین کو مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

”نہیں، ایسا بات نہیں ہے لیکن تم ٹھیک بولا۔“ فرمین نے شینا کر کہا۔ ”جب تک اوپر والے کو منظور نہ ہو ہم کیا کر سکتے ہیں۔“

باتوں باتوں میں آٹھ بج گئے تو فرمین کو لیاقت کی فکر ہوئی، کچھ دیر پہلے گل خان آ گیا تھا۔ اس نے باہر سے آواز دے کر زریں سے فرمین کی خبر پوچھی، یہ بھی کہا کہ لیاقت کے آنے تک وہ فرمین ہی کے پاس رہے۔

”تم پریشان مت ہو۔“ زریں نے بھی فرمین کو یہی چہن دیکھ کر کہا۔ ”لیاقت بھائی خوش قسمت ہے جو ادھر آتے ہی قدرت نے اسے نیکیوں کے سبب اتنی جلدی نواز دیا ورنہ گل خان کو پورے دو سال تک ادھر ادھر دھکے کھانے پڑے ہتھے۔“

”لیاقت ابھی دس پندرہ منٹ میں آجائے گا۔“ فرمین نے گل خان کے خیال سے کہا۔ ”تم جانا چاہو تو جاؤ، اب تو دو روز سے سکون ہی ہے۔“

”صاحب لوگوں کے باہر جانے کی وجہ سے لیاقت بھائی کی ذمہ داری بڑھ گئی ہے۔“ زریں بولی۔ ”مجھے بھی گل خان کو بھی کام زیادہ ہو تو دس ساڑھے دس بھی بج جاتے تھیں۔“

”تم کو نہیں ملتا؟“

”صرف خدا سے ڈرنا چاہیے میری بہن۔“ زریں نے بڑی عقیدت سے کہا۔ ”وہ راضی رہے تو سب راضی، ورنہ انسان کو مجبور بنائیں بھی اس کے گناہوں اور خدا سے بے خبری کی سزا تو ضرور ملتی ہے۔“

آدھا گھنٹا اور گزر گیا تو فرمین نے گل خان کے خیال سے کہا۔ ”تم اب جاؤ زریں، دو گھر کا فاصلہ تو ہے، لیاقت آگے تو ٹھیک ورنہ اگر مجھے ڈر لگا تو تم کو باہر آ کر آواز دے لوں گی۔“

”کچھ دعوہ۔“ زریں نے اٹھتے ہوئے سوال کیا تو

فرمین نے شوخی سے کہا۔

”مجھے خبر تھا، گل خان بھائی کا آواز سن لینے کے بعد تمہارا دل بھی جالے کو بے چین تھا۔“

زریں نے جواب میں فرمین کو نگلے لگالیا، وہ اس کے گچ کو گل بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد فرمین نے دروازے کو اندر سے بند کیا پھر لائین کی روشنی اور تیز کر کے اپنے کمرے میں آگئی۔ دو روز سے سکون کے باوجود، وہ قبرستان کی سمت چلنے والی کھڑکی لیاقت حسین کے آنے کے بعد ہی کھلتی تھی۔ آج بھی اس نے نہیں کھولی، چنگ پر لٹ کر لیاقت حسین کے در سے آنے کے بارے میں سوچنے لگی، وہ روز سے وہ جلدی آ رہا تھا۔ آج دیر تک رکنا پڑا تو اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ قدرت نے اس کے ساتھ جو جہر بانی کی گئی وہ اس پر بھی عکس گزرا تھی۔ اس نے لیاقت کے ڈرامہ ہونے کے بعد اچھے خاصے پیسے بچانے شروع کر دیے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی اگلی تنخواہ تک اس کے پاس کچھ پیسے اور بیع ہو جائیں تو وہ لیاقت سے اسرار کر کے ایک معقول رقم اس کی ماں کو بھی بھیجے گی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کو پیسے کی ضرورت نہیں ہوگی، سرخرازا خان کی حویلی میں اس کے پاس دنیا کا کیا بہت کچھ تھا۔ دولت کے گھنٹہ اور چھوٹے بڑے کے فرق کی وجہ سے ہی تو اس نے فرمین کو بھی بحیثیت بہو قبول کرنے سے منہ پھیر لیا تھا۔ لیاقت سے بھی منہ کھول کر کہہ دیا تھا کہ اگر وہ اس کی پسند قبول نہیں کر سکتا تو پھر باپ بننے کے راستے بھی جدا ہو جائیں گے۔ لیاقت فرمین کو نہیں چھوڑ سکتا تھا اس لیے اس نے اس کی خاطر باپ کو چھوڑ دیا لیکن اس ماں کی دعا میں اس کے ساتھ تھیں۔ اسے فرمین پسند نہ ہوتی تو وہ چوری جیسے اس کی شادی میں بھی شریک نہ ہوتی۔ بعد میں لیاقت نے بھی یہی کہا تھا کہ اس کی ماں کو شوہر کی پسند کے مقابلے میں فرمین زیادہ عزیز تھی۔ اسی کی دعاؤں کی وجہ سے لیاقت کا نصیب جاگ رہا تھا، اسے لیاقت کے پیسوں کی ضرورت بھی نہیں تھی لیکن دنیا کی ہر ماں کی طرح اس کا بھی لیاقت کی کمائی پر کچھ حق جاتا تھا۔ اولاد کی کمائی کے دس روپے بھی ماں کو بے حد عزیز ہوتے ہیں۔ لیاقت نے اس بارے میں نہیں سوچا تھا لیکن وہ اس ذمہ داری کو اپنا فرض سمجھ کر پورا کرنا چاہتی تھی، اپنی طرف سے اس ماں کو سکون پہنچاتا جا رہی تھی جس نے فرمین ہی کی خاطر اپنے بیٹے کی جدائی کا غم بھی برداشت کر لیا تھا۔ پھر وہ اسے فراموش کس طرح کر سکتی تھی؟

ان ہی خیالوں میں گم، نہ جانے کس وقت اسے نیند آگئی پھر اس نے جو کچھ دیکھا وہ بے حد حسین اور دل پسند

تمہارے گھر کے قریب چھوڑ دوں گا۔ کیا خیال ہے؟“
سراج کا انداز دوستانہ تھا اس لیے لیاقت نے انکار بھی نہیں کیا۔ اس کے علاوہ ایک پولیس آفیسر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر کسی کی گمرانی کے شوق نے بھی اسے اکسایا۔ سراج کی پیشکش بھی اس کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھی۔
دس منٹ بعد سراج نے شہر کے پورے علاقے میں پھیل کر اپنی گاڑی ایک ایسی جگہ پارک کی جہاں سے وہ دروازہ تک دیکھ سکتا تھا۔ لیاقت نے گاڑی سے اترنے کی خاطر دروازہ کھولا چاہا تو سراج نے اسے روک دیا، پھر سامنے ایک چار منٹر لگھوری اپارٹمنٹ کی سمت اشارہ کر کے بولا۔ ”ہمیں یہیں بیٹھ کر سامنے کے اس اپارٹمنٹ کی گمرانی کرنی ہے جہاں باہر مدھم دھم کی گلیاں بلب روشن نظر آ رہی ہیں۔“
”مگر۔۔۔ یہاں سے تو آپ اس کے اندر جھانک کر کچھ بھی تو نہیں دیکھ سکتے۔“ لیاقت نے مصیبت سے کہا تو سراج ہنس کر بولا۔ ”ہمیں اس کے اندر جھانک کر دیکھنا ہی نہیں ہے لیکن ایک خاتون پر نظر رکھنی ہے جو شاید کچھ دیر بعد اپنی گاڑی میں بیٹھ کر یہاں آئے گی، وہ اس بلڈنگ میں کس وقت داخل ہوتی ہے اور کب وہاں آتی ہے، کس اپارٹمنٹ میں جاتی ہے، یہ سب کچھ اچھا گاڑی میں ہی بیٹھے بیٹھے دیکھنا ہے۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھا صاحب۔“ لیاقت کے اندر جیسے ابھرنے لگا۔ ”وہ کس وقت آتی ہے؟ کس وقت جاتی ہے؟ وہ تو آپ اچھے بیٹھے دیکھ سکتے ہیں لیکن وہ کس منزل پر کس کے مکان پر جائے گی، یہ بات آپ کو کیسے معلوم ہوگی؟“

”جس آدمی نے مجھے اطلاع دی ہے، وہ سادہ لباس میں بلڈنگ کے آس پاس نہیں موجود ہے، عورت بلڈنگ میں کہاں جاتی ہے یہ دیکھنا اس کی ذہنی ہے جس کی اطلاع وہ مجھے موبائل پر دے گا۔“

لیاقت کے ذہن میں اس عورت اور نیلے بلب والی عمارت کے سلسلے میں بھی بہت سے سوالات ابھر رہے تھے لیکن اس نے خود پر کنٹرول رکھا ایک ہی دن میں وہ ان معاملات کی تک پہنچنے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔ شاید سراج بھی اس کی کرپے نہ والی باتیں پسند نہ کرتا۔ اس لیے لیاقت نے بھی اپنی توجہ اسی عمارت کے صدر دروازے کی طرف منتقل کر لی۔

سات آٹھ منٹ بعد ایک چمپانی قیمتی گاڑی اسی عمارت کے قریب آ کر رکنے لگی گاڑی کی روشنیاں بند کرنے

کے بعد ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلا، جو عورت اس میں سے باہر آئی وہ حسین کھلانے کی سستی تھی، اس کے جسم پر چمکی لباس موجود تھا۔ تیز خیر قدم اٹھاتے وہ عمارت کے اندر داخل ہوئی تو سراج نے کہا۔
”یہی وہ خاتون ہے جس کی گمرانی کرنی ہے لیکن تم میری ایک بات کا خیال رکھنا، جب تک میں نہ کہوں تم گاڑی سے باہر نکلنے کی غلطی نہیں کرو گے۔“
”ٹھیک ہے صاحب۔“ لیاقت نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

جس سڑک پر وہ اپارٹمنٹ واقع تھا اس پر جراتے نام ٹریفک نظر آرہی تھی، دروازہ تک کوئی دکان نہیں تھی اس لیے کوئی راہ گیر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف ایک عجیب سا ویران سا چمپا ہوا تھا۔ گاڑیوں کے آنے جانے کا سلسلہ بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ لیاقت خاموش بیٹھا اس گاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا جس سے ایک خوبصورت خاتون اتر کر عمارت میں داخل ہوئی تھی۔ دس منٹ اور گزر گئے لیکن اس کی کچھ میں یہ بات نہ آ سکی کہ سراج کس وجہ سے اس عورت کی گمرانی کر رہا تھا؟ دس منٹ بعد لیاقت نے ایک دیکھ کر گاڑی کو اس عمارت اور اس کے بعد دوسری عمارت کی درمیانی پتلی سڑک پر آ کر رکنے دیکھا، دیکھ کر لائش بھاری ٹھیک لیکن کوئی اس میں سے اتر نہیں۔ اس دیکھ کر بڑی سڑک سے تقریباً دس منٹ دور یہی روک گیا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ اب یہاں کوئی نہ کوئی بیگہ رہی ہو سکتا ہے؟“ سراج کی بات سن کر لیاقت چونکا۔

”کیسا بگڑا صاحب۔؟“ اس نے مدھم آواز میں سراج سے پوچھا۔

”دیکھن کی لائش بند ہونے کے بعد کوئی اس سے باہر نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی جو خاتون اندر گئی ہے یہ دیکھن اسی کے تعاقب میں آئی ہے۔ لیکن بے ہماری طرح وہ بھی اس کی گمرانی کر رہے ہوں۔۔۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے خاتون کی وہاں سے بعد اسے اتوا کرنے کی کوشش بھی کی جائے۔“

”اغوا۔۔۔ وہ کیوں۔۔۔؟“ لیاقت نے حیرت سے پوچھا۔

”اس کی وجہ بعد میں معلوم ہوگی، فی الحال تم میری ہدایت پر عمل کرنا۔ گاڑی سے نیچے نہ اترنا۔“ سراج نے اسے دوبارہ تاکید کی۔

لیاقت سنبھل کر بیٹھ گیا، سراج کی بات سن کر اسے

عجب سانسوں اور ہاتھ۔ ایک منٹ بعد ہی سراج کے موبائل پر سنبھل موصول ہوا۔
”ٹھیک ہے۔۔۔ میں نے بھی اسے دیکھ لیا ہے۔۔۔ نہیں، کسی اور کوئی احوال بلانے کی ضرورت نہیں۔ میں دیکھ لوں گا۔ چاہتا ہوں بھی دور دورہ کر تعاقب کرنا لیکن میری اجازت کے بغیر کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔“ پانی۔۔۔ سراج نے بات ختم کر کے احتیاطاً اپنا سروس آٹو بیک ہسپتال نکال کر گود میں رکھ لیا۔

دونوں کی نگاہیں، مطلوبہ عمارت کے صدر دروازے پر مرکوز تھیں۔ وقت سست رفتاری سے گزرتا رہا پھر کوئی تقریباً چالیس منٹ کے بعد وہی خوبصورت خاتون عمارت کے صدر دروازے سے باہر آئی، گاڑی کے قریب جا کر وہ دروازہ کھولنا چاہتی تھی لیکن اس کا گاڑی کے عقب میں جیسے دوپٹے کے تعاقب پولیس برقی رفتاری سے نکل کر خاتون کی طرف لپکے، ایک نے اسے پشت سے دبوچ لیا، دوسرا ہاتھ میں ہسپتال لیے دایم بائیں کی گمرانی کر رہا تھا۔ سراج اپنی گاڑی میں بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہا لیکن لیاقت حسین برقی رفتاری سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ سراج ایک لمبے کو گھبرا گیا پھر موسیقی کی نزاکت محسوس کر کے وہ بھی اپنے سروس آٹو بیک ہسپتال کے دستے پر گرفت مضبوط کرنا لپک کر باہر نکل گیا۔ اتنی دیر میں لیاقت حسین دوڑتے ہوئے اس آدمی کے سر پر پھینک گیا جو خاتون کو دبوچے بندوں کی طرف لے جا رہا تھا، ہسپتال والے نے اسے لٹاکر دور رہنے کی دھمکی دی تھی لیکن لیاقت حسین کا ہاتھ فضا میں بلند ہو کر دوسرے آدمی کی پٹینی پر اس شدت سے پڑا کہ وہ عورت کو چھوڑ کر سڑک پر زخمی ہو گیا۔ دوسرے شخص نے لیاقت حسین پر یکے بعد دو فائر کیے۔ ایک گولی نشانہ چوک کر خاتون کے جسم پر کہیں لگی تو وہ لہو لہو کر گاڑی کے قریب ہی گر پڑی۔ لیاقت نے جنونی کیفیت میں دوڑ کر ہسپتال والے کو چڑا چاہا تو اس نے دو فائر مزید کر دیے۔ ہسپتال میں سائنفرز ہونے کی وجہ سے صرف بچ۔۔۔ بچ کی آواز ہی ابھری تھی جسے سراج نے سن لیا تھا۔ وہ ایسی پوزیشن میں نہیں تھا کہ جوابی فائر کرنا اس لیے کہ سامنے لیاقت حسین تھا، پھر بھی بلند آواز میں ہسپتال والے کو لٹاکر۔

”لگا۔۔۔ کیا ہوا صاحب؟“ اس نے ہائل انداز میں سراج سے سوال کیا۔ ”کیا وہ لوگ خاتون کو اغوا کر کے لے گئے؟“

سراج کو اس کا جواب سن کر حیرت ہوئی۔ اس نے فوری طور پر لیاقت کی قمیض پر نظر ڈالی وہاں اسے خون کا کوئی قطرہ بھی نظر نہیں آیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی نظر ہسپتال سے چلائی جانے والی گولیوں کے خالی غول پر پڑی جو لیاقت کے قدموں کے قریب ہی پڑے تھے۔ سراج چمکا کر رہ گیا۔ اس نے لیاقت کی قمیض اوپنی کر کے اپنا تجسس دور کرنے کی کوشش کی تو اس کے ذہن کو ایک اور جھٹکا لگا۔ لیاقت حسین کے پیٹ پر دو ایسے واضح نشان موجود تھے جو گولی لگنے کے بعد مؤثر علاج کے بعد بھر تو جاتے ہیں لیکن اپنا نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ سراج نے قمیض چھوڑ کر لیاقت کو تیز نظروں سے گھورا۔

”میں نے تمہیں گاڑی سے اترنے سے منع کیا تھا۔۔۔ یاد ہے تمہیں؟“

”یاد ہے صاحب لیکن میں۔۔۔ میں شاید آپ کو دشمن کے قریب دیکھ کر آپ کی خاطر باہر آ گیا تھا۔“ لیاقت نے ہلکی جھپکاتے ہوئے جواب دیا۔

سراج نے اسے دوبارہ گاڑی میں جا کر بیٹھنے کا حکم دیا تو لیاقت خاموشی سے قدم اٹھاتے وہاں جا کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سراج نے فوری طور پر قرعہ میاں کرنے کا حاسطے کی اطلاع دی تو دس منٹ کے اندر تھانے کی پولیس بھی، ایوبلیس کے ساتھ آگئی۔ سراج کی ہدایت پر دونوں آدمیوں کو جو بے

اس وقت اس کی نگاہیں حیرت سے پھیلی کی پھلی رہ گئیں جب لیاقت کے بجائے ہسپتال والا دردناک آواز غلطی سے خارج کرتے ہوئے زمین پر گرنا۔ لیاقت حسین بدستور اپنی جگہ کھڑا رہا۔

”خاتون بری طرح زخمی ہے صاحب۔“ سادہ لباس والے نے سراج کو انعام کیا۔

”تم اسے اسی کی گاڑی میں لے کر اسپتال پہنچو، میں آتا ہوں۔“ سراج نے اسے حکم دینے کے بعد لیاقت حسین کی طرف دیکھا جس کی آنکھ سے ایسا ناٹھرا بھر رہا تھا، جیسے وہ خواب کی حالت سے دوچار ہو، وہ خود سے بھی انجان نظر آ رہا تھا۔

”لیاقت حسین، تم ٹھیک تو ہو؟“ سراج نے قریب جا کر اسے چھوڑا تو وہ اس طرح چونکا جیسے کوئی خواب ٹوٹ گیا ہو۔

”لگا۔۔۔ کیا ہوا صاحب؟“ اس نے ہائل انداز میں سراج سے سوال کیا۔ ”کیا وہ لوگ خاتون کو اغوا کر کے لے گئے؟“

سراج کو اس کا جواب سن کر حیرت ہوئی۔ اس نے فوری طور پر لیاقت کی قمیض پر نظر ڈالی وہاں اسے خون کا کوئی قطرہ بھی نظر نہیں آیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی نظر ہسپتال سے چلائی جانے والی گولیوں کے خالی غول پر پڑی جو لیاقت کے قدموں کے قریب ہی پڑے تھے۔ سراج چمکا کر رہ گیا۔ اس نے لیاقت کی قمیض اوپنی کر کے اپنا تجسس دور کرنے کی کوشش کی تو اس کے ذہن کو ایک اور جھٹکا لگا۔ لیاقت حسین کے پیٹ پر دو ایسے واضح نشان موجود تھے جو گولی لگنے کے بعد مؤثر علاج کے بعد بھر تو جاتے ہیں لیکن اپنا نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ سراج نے قمیض چھوڑ کر لیاقت کو تیز نظروں سے گھورا۔

”میں نے تمہیں گاڑی سے اترنے سے منع کیا تھا۔۔۔ یاد ہے تمہیں؟“

”یاد ہے صاحب لیکن میں۔۔۔ میں شاید آپ کو دشمن کے قریب دیکھ کر آپ کی خاطر باہر آ گیا تھا۔“ لیاقت نے ہلکی جھپکاتے ہوئے جواب دیا۔

سراج نے اسے دوبارہ گاڑی میں جا کر بیٹھنے کا حکم دیا تو لیاقت خاموشی سے قدم اٹھاتے وہاں جا کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سراج نے فوری طور پر قرعہ میاں کرنے کا حاسطے کی اطلاع دی تو دس منٹ کے اندر تھانے کی پولیس بھی، ایوبلیس کے ساتھ آگئی۔ سراج کی ہدایت پر دونوں آدمیوں کو جو بے

ہوشی کی حالت سے دو چار تھے، دونوں کو ایسے بلیں میں ڈال دیا گیا، بندوبست کو ایک پولیس والا اسٹارٹ کر کے تھانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

”آپ تو خیریت سے ہیں سر۔“ تھانے سے آنے والے سب انسپکٹر نے دریافت کیا۔

”ہاں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں، تم جا کر ان دونوں کو لالک اپ کر دو لیکن میرا نام درمیان میں نہ آنے پائے۔ تم نے خود گشت کے دوران میں ان دو افراد کو ایک خانوں کو گواہ کرتے دیکھا تھا۔ دہلی خانوں کو بھی تم نے اپنے کسی آدمی کے ذریعے اس کی کار میں قریبی اسپتال روانہ کروا دیا ہے۔ اس کی خبر گیری بھی تمہارے ذمے ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس ساری کارکردگی کا پورا کر بیٹ نہیں ملے۔“

”شکر ہے سر۔“ سب انسپکٹر نے بڑی سعادت مندی سے سر اٹھا کر یہ ادا کیا۔ سرانے اسے جانوں کا نام بھی بتا دیا۔ یہ بھی کہا کہ اسے بھی نہیں معلوم کہ دہلی خانوں کس عمارت سے باہر آئی تھی اور اسے کیوں اغوا کیا جا رہا تھا؟ ہو سکتا ہے کہ اغوا برائے تاجران کا معاملہ ہو اس لیے کہ جس خانوں کا اغوا کرنے کی کوشش کی گئی وہ بے حد مالدار عورت ہے۔ اسی کی عزت پر اسے دہلی لایا گیا تھا۔“

سب انسپکٹر کے جانے کے بعد سراج کے ذہن میں پھر لیاقت حسین کا تصور ابھرا۔ اس نے جہ چوہا اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا وہ کسی سائنس فکشن فلم کا ایک حصہ تو قرار دیا جاسکتا تھا لیکن عملی زندگی میں اس قدر عجیب فیز۔ ناقابل یقین اور حیرت انگیز صورت حال کم از کم سراج کی آٹھ سالہ پولیس سروس میں پہلے بھی پیش نہیں آئی تھی۔ وہ اسے صرف حیرت انگیز واقعہ ہی قرار دے سکتا تھا۔

سراج گاڑی میں آکر بیٹھا تو لیاقت حسین نے بڑی مصیبت سے سوال کیا۔

”صاحب۔۔۔ آپ جس خانوں کے لیے آئے تھے وہ کدھر گئی؟“

”لیاقت حسین۔۔۔ میری ایک بات غور سے سنو۔“ سراج اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ”تم میرے ساتھ ضرور آئے تھے لیکن اب تم کسی خانوں کے بارے میں کسی کے سامنے زبان نہیں کھولو گے، اس بارے میں ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لاؤ گے۔ یہ میرا حکم ہے۔“

”ٹھیک ہے صاحب۔۔۔ میں اپنی زبان بند رکھوں گا۔“ لیاقت حسین نے سادگی سے جواب دیا۔

اس وقت اپنے گھر میں بھی وہ انہی خیالوں میں گم تھا جب پیٹ کھلانے کی خاطر اس کا سیدھا ماتھہ نہیں کے اندر چلا گیا۔ دو مقام پر اسے اپنے پیٹ کی جلد پر ایسے دھم دھم ہونے جو بھر پور تھے، لیاقت حسین کو خود بھی تعجب ہوا۔ اپنے خیال کی تصدیق کی خاطر اس نے سوتی ہوئی فرمیں کے سر کے نیچے سے ہاتھ نکالا پھر لائٹیں لے کر باہر گئی میں آیا اور تیز روشنی میں جا کر دایا خود بھی حیرت کا شکار ہو گیا۔ ٹھوڑے ٹھوڑے فاصلے سے وہ دو مندر گہرے زخموں کے ایسے نشان بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا جو اس سے بچتر اسے یہ بھی نظر آئے تھے، وہ بڑی دیر تک ذہنی نگاہ میں جھل رہا۔ ذہن کو گڑبڑ رہا۔ حیرت کے عالم میں ان مندر زخموں کے بارے میں سوچتا رہا لیکن ایسا کوئی حادثہ اسے یاد نہیں آیا جس کی روشنی میں وہ ان زخموں کے بارے میں اپنے آپ کو مطمئن کر سکتا۔

بہرینہ چون کرنے کے لیے وہ دوبارہ فرمیں کے قریب آکر لیٹ گیا، کچھ دیر اس کا ذہن بھٹکتا رہا پھر وہ گہری نیند سو گیا۔ دوسرے دن لیاقت کے ذہن کو وہ حیرت انگیز جھٹکے اور برداشت کرنے پڑے۔ صبح جب وہ ڈیوٹی پر جانے سے قبل تھانے گیا تو اس نے نفسیاتی طور پر پھر پیٹ کے زخموں کو دیکھنا چاہا لیکن اس کا ذہن ایک بل کوئن ہو گیا۔ کل جن زخموں کو اس نے روشنی میں پورے ہوش و حواس کے عالم میں دیکھا تھا اس وقت ان کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا اس نے لیاقت حسین کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔ وہ حسب معمول تیار ہو کر ڈیوٹی پر چلا گیا، دن بھر اپنے کاموں میں مشغول رہا۔ اسے سراج کا انتظار تھا، وہ آتا تو اس خانوں کے بارے میں پھر اس کو کیدنے کی کوشش ضرور کرتا لیکن اس دن سراج نہیں آیا۔

ٹھیک پونے آٹھ بجے وہ کاموں سے فارغ ہو کر گھر آیا تو راستے میں گل خان اپنے مکان کے سامنے پتھر کی چوکی پر بیٹھا شاید اسی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد گل خان نے اسے ایک اور حیرت انگیز اطلاع دی۔

”آج ہم پھر تمہارے لیے نبرہ لینے ادھر مختصر ہو گیا تھا لیکن۔۔۔ وہاں تو میدان بالکل صاف تھا، نہ کوئی چھوڑا دی تھی نہ ہی لوگوں کا ہجوم۔ میں نے ایک دو آدمیوں سے معلومات کیا تو پتا چلا کہ وہ بزرگ چار چور دو پہلے ایسا گیا کہ پھر واپس پلٹ کر نہیں آیا۔ ادھر ہی ایک بوڑھے تاجران سے بھی ملاقات ہوئی، وہ عجیب بات کہہ رہا تھا۔“

لیاقت تاجران بوڑھے سے حوالے پر چلا۔ ”کیا کہہ رہا تھا وہ؟“

تجاوہ۔۔۔“

”وہ کہہ رہا تھا کہ دیوانہ جس کام سے وہاں کسی پروانے کا انتظار کر رہا تھا، اسے نواز کر چلا گیا۔ اب بھی وہاں نہیں آئے گا۔“

لیاقت حسین کے ذہن میں وہ منظر گھوم گیا جب ایک تاجران بوڑھے ہی نے اسے دیوانے کے پاس لے ملنے کی درخواست کی تھی۔ اس وقت بھی اس نے یہی کہا تھا کہ نہ جانے وہ دیوانہ کس ارادے سے اور کس کے انتظار میں ادھر دھوئی رہا ہے بیٹھا تھا۔ لیاقت کا خیال تھا کہ اسے اور تاجران کو بھی بغیر نبرہ کے اندر نہیں جانے دیا جائے گا مگر کسی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اندر جا کر تاجران سستانے کے بہانے چھوٹی چھوڑا دی کے باہر کر گیا تھا، لیاقت کو اندر بچ دیا جہاں دیوانے کے ہاتھوں کو شاید پہلی بار حرکت میں دیکھا گیا، اس نے آنکھیں کھولے بغیر اگلے ماتھ سے خاک کی چٹکی اٹھا کر لیاقت کے منہ میں ڈال دی پھر کچھ پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ واپسی پر لیاقت حسین نے بوڑھے تاجران سے اندر جانے کو کہا تو وہ اسے ٹال گیا البتہ واپسی میں بھی اس نے یہی کہا تھا کہ ”کسی سے کچھ سوال جواب نہ کرو، سیدھے قدم اٹھاتے ہوئے نکل جاؤ۔۔۔ اور۔۔۔ سامنے گزر جائیں تو پھر پلٹ کر واپس نہیں آئیں۔ تم میری بات پر عمل کرنا، ایک بات اور غور سے سن لو۔۔۔ اندر جو کچھ ہو رہا، تم اس کا ذکر بھی کسی کے سامنے زبان تک نہ لاؤ۔ دیوانوں کی طرف سے بھی کچھ مطمئن، بظاہر اللہ ہوتی ہیں۔ اللہ بھی ان کی مدد فرماتا ہے جو فطرتی خدا کی بھلائی کے لیے کام کرتے ہیں۔“

لیاقت کے ذہن میں بوڑھے تاجران کے منہ کو گرج رہے تھے۔ ایسے یاد تھا کہ واپسی میں کسی نے ان دونوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اس وقت گل خان نے بھی کسی تاجران بوڑھے کا ذکر کیا۔ یہ بھی بتایا کہ تاجران نے گل خان سے بھی اشاروں کنایوں میں یہی کہا تھا۔ ”دیوانہ جس کام سے وہاں کسی پروانے کا انتظار کر رہا تھا، اسے نواز کر چلا گیا، اب بھی واپس نہیں آئے گا۔“

”تم کیا سوچ رہے ہو لیاقت؟“ گل خان نے لیاقت کو مخاطب کیا۔ ”سب مقدری کی بات ہے، جانے وہ کون خوش نصیب تھا دیوانہ جسے نواز کر چلا گیا؟ تم پریشان مت ہو، اوپر والا سب کا نگہبان ہے۔“

”تم نے ٹھیک کہا۔“ لیاقت نے مختصر جواب دیا پھر اس نے گھر کے دروازے پر جا کر فرمیں کو آواز دی اور خود دوسری طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا، جب فرمیں نے اسے بتایا کہ زرخیز باتیں ہے تو وہ پلٹ کر اندر آ گیا۔ اس کے ذہن میں جو کچھ کل شام سے ابھر رہی تھی وہ جیسے اچانک ہی

سلیجھ گئی تھی اس کے ذہن میں ایک جملہ گنبد کی صدا بن کر پھرانے لگا۔

”وہ خوش نصیب تم ہی ہو لیاقت حسین! دیوانہ تمہارا ہی مختصر تھا۔ وہ تمہیں نواز کر اب کسی اور طرف نکل گیا۔“

☆ ☆ ☆ زیادہ بی لینے کے سبب افضل خان کی آنکھیں جڑا دیر سے کھلی لیکن وہ پریشان نہیں ہوا۔ اس لیے کہ کچھ عرصہ پہلے ملک گئے ابھی صرف ایک دن ہی گزرا تھا، اس کے علاوہ باہر کے کام کی دیکھ بھال بھی افضل خان کے ذمے تھی، اس سے سوائے بک پاس کے اور کوئی باز پرس نہیں کر سکتا تھا۔ سب سے پہلے اٹھ کر نیم گرم شاور لیا تو اس کے ذہن پر طاری بھاری پن چھٹنے لگا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد اس کے ذہن میں سب سے پہلے میڈم روٹی کا خیال آیا، اس نے ایک بار پھر روٹی کی پرسیشن آفریئر نوڈ کیا پھر سوائس اٹھا کر اس کا نمبر ملائے گا۔ اس کی آنکھیں کئی گھنٹہ کی طرف روشن نظر آ رہی تھیں۔

”میل۔۔۔ دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز ابھری تو وہ سنبھل کر بولا۔

”مجھے میڈم روٹی سے بات کرنی ہے۔“

”سواری۔۔۔ وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر نے بھی سختی سے ہدایت کر رہی ہے کہ میڈم کو ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

”آپ۔۔۔ افضل خان نے مختصر لہجہ میں اپنا مقصد واضح کرنے کی کوشش کی۔

”میں ریڈ کر اس اسپتال کی میڈنز بول رہی ہوں۔“ سنجیدگی سے جواب دیا گیا۔

”ڈاکٹر کا کیا خیال ہے؟ میڈم کو کب تک ہوش آجائے گا؟“ افضل خان اور محتاط ہو گیا۔ روٹی کے ہوش میں نہ آنے والی بات نے اسے چونکا دیا تھا۔

”یقیناً سب کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

”کیا وزیر کو میڈم سے ملنے کی اجازت ہے؟“

”اس کا جواب ڈاکٹر ہی دے سکتے ہیں۔“ دوسری جانب سے رابطہ ختم کر دیا گیا۔

افضل خان موہاں رکھ کر سوچنے لگا۔ کل رات کے وقت واپسی میں شاید میڈم روٹی کی حادثے سے دو چار ہو کر اسپتال پہنچ گئی ہو، ممکن ہے ایک بیگ کا نشی اس عاجزے کا سبب ہو لیکن اسپتال کی میڈنز کے لب و لہجے کی سنجیدگی نے افضل خان کو بھی ڈسٹرب کر دیا تھا۔ رات وہ اسی کے

اپارمنٹ سے گئی تھی، ہو سکتا ہے اس نے یہ بات ڈاکٹر کو بتا دی ہو کہ وہ کہاں سے آ رہی تھی؟ کس سے ملنے گئی تھی؟ اس کے علاوہ بھی بہت سارے امکانات تھے، سب سے بڑی پریشانی کا سبب خود میڈم روہی کی زبان سے نکل ہوئی وہ اہم بات تھی جسے کنرا فضل خان بھی بوجھلا گیا تھا۔

بگ باس کو واپسی کے بعد اگر میڈم روہی کے کسی حادثے کی اطلاع ملتی تو یہ بات اتنی اہم نہ ہوتی لیکن اسے یہ کھوج ضرور ہوتی کہ وہ افضل خان کے اپارمنٹ تک کیوں گئی تھی؟ ان دونوں کے درمیان کس قسم کی کشمکش ہوئی تھی؟ افضل خان کے لیے اب ضروری ہو گیا تھا کہ میڈم روہی کے بارے میں مزید تفصیلات جانے کی کوشش کرے لیکن اس طرح کہ کسی کو اس کی پریشانی کا علم نہ ہو۔ کسی فوری خیال کے تحت اس نے اپارمنٹ سے باہر نکل کر صبح کا وہ تازہ انگریزی اخبار اٹھا لیا جو روزی جگہ ڈالا جاتا تھا۔ اندر آ کر اس نے جلدی جلدی اخبار کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ تیسرے صفے پر اسے وہ خبر ملی جس کی اسے تلاش تھی۔ میڈم روہی کی ایک تصویر بھی ساتھ تھی جو ملی تھی۔ اسٹاف رپورٹر کے حوالے سے لکھا گیا تھا کہ..... "گزشتہ رات ڈیفنس کے ایک پوش علاقے میں سب انسپکٹر پولیس والوں کے ساتھ معمول کے گشت پر تھا جب اس نے دو مشکوک آدمی دیکھے جو کسی عورت کو سہارا دے کر اپنی وین کی طرف لے جا رہے تھے۔ سب انسپکٹر کو انوکھا کا شہ ہوا تو اس نے دور سے ان افراد کو لکھارا جنہوں نے کوئی جواب دینے کے بجائے پولیس کی جیب پر فائرنگ شروع کر دی۔ پولیس نے چوٹی فائرنگ کی تو دونوں مشکوک افراد نے ہتھیار ڈال دیے لیکن اس عرصے میں انوکھا کنگدگان کی جانب سے چلائی جانے والی ایک گولی میڈم روہی کے بائیں بازو پر لگی اور اس دوران میں خود کو چھڑا کر اپنی قریب کھڑی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ مذکورہ سب انسپکٹر نے زخمی خاتون کو بے ہوشی کی حالت میں اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اس کی گاڑی میں فوری طور پر ریڈ کر اس اسپتال روانہ کیا اور دونوں مجرموں کو جو پولیس کے مطابق پہلے بھی انوکھا رائے تاوان کی کئی وارداتوں میں ملوث رہ چکے ہیں، الاک اپ کر دیا۔ اسپتال ذرائع کے مطابق اگرچہ میڈم روہی کے زخم بہت زیادہ خطرناک نہیں ہیں لیکن اگر انہیں چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہوش نہ آیا تو کبھی کوئی خطرناک رن بھی اختیار کر سکتا ہے۔ اسپتال کے دی آئی پی روم نمبر بی۔ ون کے باہر پولیس کا پتھر لگا دیا گیا ہے۔ میڈم روہی کے ہوش میں آنے کے بعد سسٹنی خیر انکشافات کی توقع

کی جاری ہے۔"

اگرچہ افضل خان کے اپارمنٹ کا نام نہیں آیا تھا لیکن اخباری رپورٹ پڑھ لینے کے بعد اس کی پریشانی ضرور بڑھ گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ دونوں زیر حراست مجرم میڈم روہی کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں تک پہنچے ہوں گے۔ واپسی پر انہوں نے روہی کو انوکھا کرنے کی کوشش کی ہوگی لیکن پولیس نے بروقت ان کا پلان چھوٹ کر دیا۔ بہر حال میڈم روہی کے ہوش میں آ جانے کے بعد یا پھر عدالت میں دوران پیش اس کے اپارمنٹ کا نام بھی ضرور آئے گا۔ یہ بات افضل خان کے لیے کسی طور پر مناسب نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ روہی کے ہوش میں آنے کے بعد پولیس افسران اس سے گفتگو کریں، کسی نہ کسی طرح افضل خان کا اس سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔

افضل خان ابھی کوئی راستہ نکالنے کے بارے میں غوری کر رہا تھا کہ اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کچھ تامل کے بعد ریسپونڈ کیا۔ "افضل خان....." اس نے اطمینان سے کہا۔ "میں شہم بھل رہی ہوں۔" دوسری جانب سے افضل خان کے دفتر میں کام کرنے والی ملی فون آپریٹر کی آواز ابھری۔ "تم نے آج کا اخبار دیکھا؟"

"کوئی خاص خبر....."

"ہاں..... مشہور کروڑ پتی خالد ریاض کی بیوہ کو کل رات کچھ لوگوں نے انوکھا کرنے کی کوشش کی لیکن اسی دوران میں پولیس کے راولڈ پر آ جاتے ہیں وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بہر حال پولیس اور مجرموں کے درمیان ہونے والی فائرنگ کے دوران میں میڈم روہی بھی زخمی ہوئی اور اس وقت وہ ریڈ کر اس اسپتال میں گزشتہ بارہ چودہ گھنٹوں سے بے ہوش پڑی ہے۔"

"تمہیں اس خبر سے کیا دلچسپی ہے؟" افضل نے بظاہر بے پروائی سے دریافت کیا۔ "اُسے جس علاقے سے زخمی حالت میں پایا گیا ہے اسی ایریا میں تمہارا اپارمنٹ بھی ہے۔"

"کیا کہنا چاہ رہی ہو؟" افضل خان نے تیز لہجے میں سوال کیا۔ "کچھ دنوں سے یہ خبر گھٹ کر رہی ہے کہ میڈم روہی کسی وجہ سے تمہاری غصیت میں دلچسپی لے رہی تھی۔ شاید تم بھی....." "نان سنس۔" افضل خان بھلا گیا۔ "میں اس قسم کی بے ہودگی پسند نہیں کرتا، آنکھ خیال رکھنا۔"

"تمہاری جگہ اگر میں ہوتی تو شاید میں بھی اچے

جاتی۔" شہمن نے الفاظ چپاتے ہوئے کہا۔ "بگ باس کے آنے میں شاید دو دن اور باقی رہے تھیں۔"

"بگ باس کا ان باتوں سے کیا تعلق؟" افضل خان نے ہونٹ چپاتے ہوئے سوال کیا۔ "ان باتوں سے نہ کسی لیکن تم سے تو ہے۔" شہمن کا لہجہ اس بار بھی سنی خیر تھا۔

"میں آدھے گھنٹے میں دفتر پہنچ رہا ہوں۔" افضل خان نے تھملا کر کہا پھر فون بند کر دیا۔ اس کے اندر ایک نیا فطرہ سر اٹھانے لگا۔ بات اگر صرف روہی تک ہوتی تو کھوکھلی تھیں لیکن شہمن نے خاص طور پر بگ باس کا نام کیوں لیا تھا؟ کیا اپارمنٹ کے حوالے سے وہ اسے ڈرا نا چاہتی تھی یا کسی طرح وہ بھی اس راز سے واقف تھی جس کا انکشاف گزشتہ رات روہی نے کیا تھا؟ شہمن روہی کو کس طرح اور کس حیثیت سے جانتی تھی؟ دونوں کے درمیان اگر کوئی تعلق تھا تو اس کی نوعیت کیا تھی؟ اگر تعلق نہیں تھا تو پھر شہمن کو روہی کے زخمی ہونے یا نہ ہونے سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اور بھی کئی سوالات تھے جو اس کے ذہن میں گڑبگڑ رہے تھے؟ اسے یہ بھی علم تھا کہ خود شہمن بھی ملازمت کے اوقات قہقہے ہونے کے بعد کس قسم کی زندگی گزار رہی تھی؟ اس کی ذاتی تفریحات کس نوعیت کی تھیں؟

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد افضل خان نے دفتر پہنچ کر سب سے پہلے اسے ہی اپنے آفس میں طلب کیا۔ شہمن سوچ بچار دوسری آپریٹر کے حوالے کر کے افضل خان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس وقت بھی وہ ڈر اور بے خوف ہی نظر آ رہی تھی۔ اس کا لباس بھی حسب سائینت نہایت موڈرن تھا۔

"کوئی خاص حکم؟" اس نے خالی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے افضل خان سے مدح میں دریا پت کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے پوچھی۔ "اگر میں تمہارے کسی کام آسکوں تو اسے بھی اپنی خوش قسمتی میں سمجھوں گی۔"

"تم نے فون پر بگ باس کا حوالہ کیوں دیا تھا؟" "میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر یہ بات بگ باس کے کانوں تک نہ پہنچے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ کروڑ پتی بیوہ کو اس وقت انوکھا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ تمہارے اپارمنٹ کی بلڈنگ سے نکل کر واپسی کے ارادے سے اپنی گاڑی میں بیٹھنے جا رہی تھی۔"

"آئی سی۔" افضل نے مسکرا کر دوسرا راستہ اختیار کرنے کی گمان لی۔ "گو اب تم میری ذاتی مصروفیات کا بھی کھوج لگانے کا کام انجام دے رہی ہو؟"

"تم جانتے ہو کہ میرا نام شہمن ہے، جو خوبصورت

پھولوں پر....."

"ون منٹ....." افضل خان اس کی بات کا ٹکڑا کر ایک لخت سنجیدہ ہو گیا۔ "میں دفتر میں اس قسم کی باتیں پسند نہیں کرتا۔ بگ باس کا بھی یہی حکم ہے کہ کسی بھی اسٹاف نمبر کی سوشل لائف کا کوئی تعلق اس دفتر سے نہیں ہونا چاہیے۔"

"ریڈ کر اس اسپتال کے ایک دوکانوں کو میں بہت قریب سے جانتی ہوں۔" شہمن نے افضل خان کی بات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بڑی رازداری سے کہا۔ "میں کوشش کر رہی ہوں کہ کسی طرح پولیس کی تفتیش شروع ہونے سے پیشتر روہی تک پہنچ کر اس سے بات کر لوں۔"

"کس قسم کی بات.....؟" افضل خان نے اس بار قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔ شہمن کی زبانی ریڈ کر اس اسپتال کے دو تین دکانوں سے واقفیت والی بات اس کے بھی کام آ سکتی تھی۔

"جی کہ وہ تمہاری بلڈنگ میں سرے سے گئی ہی نہیں تھی۔" شہمن نے عجیب انداز میں کہا۔ "وہ وہاں گاڑی سے اتری ضرور تھی جیسا کہ پولیس کے ریکارڈ پر بھی درج ہو سکتا ہے لیکن کیا ضروری ہے کہ اسے تمہارے ہی اپارمنٹ میں جانا مقصود ہو؟ برابر کی کسی عمارت میں وہ اپنی کسی واقف کار سے بھی ملنے جاسکتی ہے۔"

"تم ایسا کیوں جانتی ہو؟" افضل نے کسمپاس سوال کیا۔ "میری بلڈنگ میں صرف میرا ہی اپارمنٹ نہیں ہے اور بہت سارے لوگوں کی رہائش بھی مختلف اپارمنٹ میں ہے۔" "اوکے....." اگرچہ شہمن بھی اس بات کا خوف نہیں ہے تو میں بلاوجہ ہی پریشان ہوئی۔ "وہ اپنا جملہ کھل کر کے اٹھنے کے لیے ہر توتلے لگی تو افضل خان نے اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ شہمن کی ذاتی واقفیت سے اسے جو سہولت مل رہی تھی وہ اسے کھونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کچھ وقت کے بعد اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ مفاہمت کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم میڈم کو بہت قریب سے جانتی ہو؟"

"ہاں۔ میں اس بات سے انکار نہیں کروں گی۔" اس بار شہمن نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

"کیا وہ تمہاری پرانی واقف کار ہے؟"

"سوری..... میں اس سوال کا جواب فی الحال نہیں دے سکوں گی۔"

"اس کے شوہر کی حادثاتی موت کے سلسلے میں تم گیا

”میں نہیں سمجھ سکتی کہ تم اس قسم کے سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟“ شبنم نے بڑی خوبصورتی سے بات سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت اہم مسئلہ یہ ہے کہ میڈم کے مسئلے میں تمہارا نام کی طرح درمیان میں نہیں آنا چاہیے۔“

”اور اگر تمہاری کوشش کے باوجود اس نے ہو نہ سکا تو؟“
 ”تو..... ممکن ہے کہ جب پاس کے اور چہارے راستے
 جدا ہو جائیں اور تم جانے ہو کہ جب پاس کی ناراضگی مول لینا
 کتنا مہنگا بچے گا۔“ شبنم نے ایک لخت جذباتی انداز میں
 جواب دیا۔ ”میں فی الحال تجھیں جب پاس کے قریب اور تردد
 دیکھنا چاہتی ہوں۔ اسی میں ہم دونوں کا مفاد ملے گا۔“

”ٹھیک ہے“؛ افضل خان نے اپنی ہلکت تسلیم کر لی۔
”اگر تم میڈم سے مل کر میم سے اپارٹمنٹ کا ذکر درمیان سے
ختم کر سکتی ہو تو میں تمہارا شکریہ ادا کر دوں گا۔“
”اور اس محنت کا انعام کیا دوں گا۔۔۔؟“ شبنم شوخ
ہونے لگی۔

”جو تم مانگو۔“ افضل خان ترمک میں آکر بیٹا۔
 ”کو تو ایک دودن میں ایڈوائس ادا کی بھی کر دوں۔“
 ”اتنی جلدی بھی نہیں ہے۔“ شبنم نے اٹھے ہوئے
 کہا۔ ”تم دوسری آپریٹر کو بلا کر میرا کام سنبھالنے کی تاکید
 کر دو۔ میں فوری طور پر اسپتال جانا پسند کروں گی۔ ہو سکتا
 ہے کہ ہمارے مقدور سے کام بن جائے۔“

شبنم کے جانے کے بعد افضل خان نے سکون کا سانس لیا۔ دوسری آپریٹنگ کوالا کر اسے شبنم کی ڈیوٹی انجام دینے کی ہدایت کی پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس وقت بھی اس کے ذہن میں ایک ہی سوال رہ رہ کر کھلبلا رہا تھا۔ شبنم اور میڈم رولہ کی درمیان کیا تعلق ہے؟ اس کا ذاتی خیال تھا کہ وہ میڈم کے شوگر کی حادثاتی موت کے سلسلے میں بھی بہت کچھ جانتی ہوگی..... لیکن یہ صرف قیاس تھا.....

☆☆☆
 ایس بی آغا مخدوم اپنے دفتر میں بیٹھا بار بار وائٹ پیس
 رہا تھا اور چیخ و پند اور اخباریں شائع ہونے والی میٹروپولی کی
 خبر پر نظر ڈال رہا تھا جب سراج نے داخل ہو کر اسے سلام کیا
 اور نہایت مصحوبیت سے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ایس بی
 نے اسے فون پر طلب کیا تھا۔

”تم نے آج کا اخبار دیکھا؟“ آقا منظور نے اپنا اشتعال شدید کرتے ہوئے سراج کی طرف دیکھا۔
”جی ہاں۔ میڈم روہی کے بارے میں پڑھ کر مجھے بھی حیرت ہوئی۔“

سجود پھر شام میں دن مسلسل استنوال سے کیل، والے، چھائیائیں فطم اور رنگ کورا ہو چکا ہے۔ چہرہ معصوم بھلکتے اور شاداب نظر آتا ہے

ایک ہاتھ پر ”ہارمونا تک کریم“ اور دوسرے پر کوئی بھی مہنگی سے مہنگی کریم لگا کر دیکھیں
 ”ہارمونا تک کریم“ والا ہاتھ واضح طور پر نرم و ملائم اور گورا ہوگا

تنگ :
 فرائی طرح جو آب و ہوا یا ماحول کے جوہر اترتے ہوئے جاتے ہیں اسے اترتے کے لفظ
 سے تپ کے لفظ کا گھوم اور چھو کے لفظ سے تپنے کے لفظ سے تپا جاتا ہے۔ اس طرح تپا سے
 تپا ہونے کے لفظ بھی گھومے جاتے ہیں گھرا کر تپا جاتے ہیں اسے خون میں Red Blood
 Corpus Cells کی کہانی کی جیسے کہ آتی ہے۔ تپا کرنا کہ اس کے جوہر سے کہہ کر تپا ہونے پر
 اس سے تپا ہونے پر پتہ چلتا ہے کہ اس کی تپا ہونے کا تپا ہونا اس کی تپا ہونے کے
 تپا ہونے پر پتہ چلتا ہے کہ اس کی تپا ہونے کا تپا ہونا اس کی تپا ہونے کے تپا ہونے کے
 تپا ہونے کے تپا ہونے کے تپا ہونے کے تپا ہونے کے تپا ہونے کے تپا ہونے کے تپا ہونے کے

[illegible]

کل بھاپ سے ایک ہی دن میں گھڑتا
 ہم کر رہی ہے ہر روز رنگ ہونے پر ہر ایک کر کے ایک ایک گھڑ ہوا ہے ہر ایک کر رہی
 ہے کہ ہر ایک کر کے ایک ایک گھڑ ہے ہر ایک کر کے ایک ایک گھڑ ہے ہر ایک کر کے ایک ایک گھڑ ہے
 گھڑ ہونے پر ہر ایک کر کے ایک ایک گھڑ ہے ہر ایک کر کے ایک ایک گھڑ ہے ہر ایک کر کے ایک ایک گھڑ ہے
 چھاپاں چھاپاں کر رہی ہے ہر ایک کر کے ایک ایک گھڑ ہے ہر ایک کر کے ایک ایک گھڑ ہے ہر ایک کر کے ایک ایک گھڑ ہے
 کر رہی ہے ہر ایک کر کے ایک ایک گھڑ ہے ہر ایک کر کے ایک ایک گھڑ ہے ہر ایک کر کے ایک ایک گھڑ ہے

[illegible]

0300-9486848 (سوات) 6- سکو پانڈ، مینٹورہ

”جن حرا اودوں کو آپ نے قبول میں لیا ہے ان کا کیا بیان ہے؟“ ایس بی نے تیرے لیے سب انکپٹر سے سوال کیا۔ انداز جارحانہ ہی تھا۔
”انہوں نے تسلیم کر لیا ہے سر کہ وہ میڈم کو اغوا کر کے۔۔۔“

”وہ کیوں کر رہے ہیں۔۔۔“ ایس بی نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پیشتر ہی میز پر ہاتھ مارتے ہوئے غصے سے کہا۔ ”آپ ان کے ملق میں ڈنڈا اڑال کر اسلیٹ اگوانے کی کوشش کریں۔“

”ٹھیک ہے سر۔۔۔“ سب انکپٹر نے بے چارگی سے کہا۔ اس کے سوا وہ غریب کچھ بھی کیا سکتا تھا۔

”تم۔۔۔ میں خوش ہوں کہ آپ نے میڈم کو ان خطرناک لوگوں سے بروقت بچالیا۔“ ایس بی نے اس بار قدرے سناٹا انداز اختیار کیا، پھر تیزی پر تلی ڈال کر بولا۔ ”لیکن میں سمجھتا ہوں وہ اسلیٹ کو زبان تک لانے سے آخری وقت تک گریز کریں گے۔ آپ ان دونوں کو اسے۔۔۔ ون قسم کا ڈرائنگ روم فرینٹ دیں۔ میں نے آپ کے ایس بی سے بھی بات کر لی ہے۔“

”جی بہتر ہے سر۔۔۔“

”میڈم کا کیا بیان ہے؟“
”میں اس وقت انہی کی طرف جارہا تھا سر۔۔۔“ سب انکپٹر نے وضاحت کی۔ ”کچھ دیر پیشتر ہی جس سپاہی کو میڈم کے کمرے پر تعینات کیا گیا تھا اس نے اطلاع دی تھی کہ میڈم کو ہوش آ گیا ہے، میں نے ڈاکٹر سے بھی اس بات کی تصدیق کر لی تھی۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ آپ جا میں لیکن مجھے اس بیان کی رپورٹ دینا نہیں بھولے گا۔“

”رائٹ سر۔۔۔“ سب انکپٹر نے اٹھ کر پھر زوردار سلیٹ کیا اور ایڑیوں کے مل گھوم کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

”آپ کا شبہ کس پر ہے؟۔۔۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آخر وہ کون کون ہے جو میڈم کو زندہ نہیں دیکھ سکتا؟“ سراج نے سب انکپٹر کے جانے کے بعد آغا منصور کو کریدنے کی کوشش کی۔ ”کوئی نہ کوئی خاص وجہ تو ہوگی۔“

”سوری۔۔۔“ ایس بی نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ”میں اس وقت زبان کھولنے سے قاصر ہوں لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس نے میڈم کے سلسلے میں ہاتھ پانگ کر کے بعد ہی یہ قدم اٹھایا ہوگا۔“

”میرے لیے کیا حکم ہے۔۔۔؟“

”کسی وقت موقع نکال کر اگر آپ بھی ان دونوں گرفتار خزانہ کو نفسیاتی طور پر نپٹالیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی کارآمد بات ان کے منہ سے نکل جائے جو میرے لیے بے قدر ہو کر سکے۔“ ایس بی نے ان دونوں کی شان میں پولیس لائن میں مروج کالیوں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے کہا۔

”رائٹ سر۔۔۔“ سراج نے اٹھے ہوئے کہا پھر وہ ایس بی کے کمرے سے نکل کر سیدھا اپنے آفس پہنچا۔ آغا منصور کی باتیں اس کے ذہن میں بدستور گردش کر رہی تھیں، اگر اس کا خیال تھا کہ کوئی میڈم روپی کو اغوا کر کے ہلاک کرنا چاہتا تھا تو ایس بی یقیناً اس کا نام بھی جانتا ہوگا لیکن اگر مجرم صرف روپی کی موت کا خواہاں تھا تو اسے اغوا کرنے کا ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ دین میں بیٹھے بیٹھے بھی روپی کے جسم کو خود کا آگنی رائفل کے ذریعے چھنی کرایا جاسکتا تھا۔ مجرم بھی آسانی سے فرار ہو جاتے اور کسی پر بے کی محتاش بھی نہ ہوتی لیکن۔۔۔ اگر آغا منصور کے ذہن میں کوئی خاص نام محفوظ تھا تو وہ بعد میں بھی زبان کھول سکتا تھا۔

سراج خاصی دیر تک اس جھال سے الجھتا رہا پھر فون پر ہونے والی گفتنی نے اس کی توجہ منتشر کر دی۔

”ہیلو۔۔۔ ڈی ایس بی سراج۔۔۔“ اس نے حسب عادت ریسیور اٹھا کر مارتھ جیس میں بڑے سنجے ہوئے اور مہذب انداز میں کہا۔

”میں آپ کو پھر دھنٹ پہلے بھی کال کر چکی ہوں لیکن آپ شاید بیٹ پر نہیں تھے۔“

”کون بول رہا ہے؟“ سراج نے سنبھل کر سوال کیا۔ وہ آواز اس نے پہلی بار سنی تھی، یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ بولنے والی اپنا لب و لہجہ بدل کر گفتگو کر رہی ہے۔

”میں کوئی فرضی نام بھی لے سکتی ہوں مگر اس سے کیا فائدہ ہوگا۔“ اس بار صاف کوئی سے جواب دیا گیا۔ ”دوسری بات یہ بھی بتا دوں کہ میں ایک پبلک کانسٹبل ہوں۔“

”بات کر رہی ہوں اس لیے میرا نمبر نہیں کرانے کی کوشش میں اپنا حقیقی وقت ضائع نہ کیجیے گا۔“

”کیا بات کہی ہے؟“ سراج نے خشک انداز اختیار کیا۔
”میں میڈم روپی کے سلسلے میں آپ سے ایک خاص بات عرض کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ سننا پسند کریں گے؟“ روپی کے نام پر سراج چونکا۔ اس نے اپنا لہجہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ ”اگرچہ اس کیس سے میرا

دراست کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اگر آپ کوئی مفید اطلاع دینا چاہیں تو اسے یقیناً توجہ سے سنوں گا۔“

”صرف اتنا عرض کروں گی کہ میڈم کو اغوا کرنے والی کارروائی محض دکھاوا تھی۔“

”کیا مطلب۔۔۔“ سراج چونکا۔ ”آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟“

”کچھ لوگ میڈم کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتے۔“

”وہ کون لوگ ہیں، کیا آپ ان کا نام۔۔۔“

”ابھی نہیں۔۔۔“ دوسری جانب سے سراج کی بات کاٹ کر غیبی سے کہا گیا۔ ”اس وقت میں آپ کو جو کچھ دے رہی ہوں اس کو ذہن میں محفوظ رکھیں تاکہ بوقت ضرورت آپ کے لیے کارآمد ہو۔ دوسری بات یہ عرض کر دوں کہ آپ چونکہ سیٹھ عثمان کے دوست، ہمدرد اور کھاس فیلو بھی ہیں اس لیے میں نے بھی آپ کو دوست ہی سمجھ کر فون کیا ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو کم از کم کوئی ایسا اشارہ ہی دے دیں جو میرے لیے کارآمد ہو۔“

”سوری۔۔۔“ دوسری جانب سے مختصر جواب کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

سراج اس کال سے الجھ کر رہ گیا، جو بات کچھ دیر پہلے آغا منصور نے اپنے دفتر میں بیٹھ کر کئی کئی ایسی سے ملتی جلتی خبر کی تھی کہ معلوم خاتون نے اسے فون پر بھیج دی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ خاتون نے سیٹھ عثمان کا محض تعریفی حوالہ دیا تھا لیکن ایس بی نے آغا منصور نے کسی مصلحت کی بنا پر کسی کے نام کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ بہر حال دونوں کی باتوں کا لب لباب ایک ہی تھا۔ کوئی شخصیت میڈم روپی کو نہایت جالاک کی سے موت کے گھاٹ اتارنے کی خواہاں تھی۔ وہ شخصیت کون تھی؟ روپی کے مرجانے کی خواہش اس کے دل میں کیوں چل رہی تھی؟ دونوں ہی سوال اہم تھے لیکن ان کا جواب کم از کم سراج کی پہنچ سے ابھی بہت دور تھا۔

☆☆☆

لیاقت حسین نے صبح ڈیوٹی پر پہنچ کر سب سے پہلے اندر کام کرنے والی پرانی ملازمہ سے رات بھر کی خبریت دریافت کی پھر کوئی ایک پچھلے کر پوچھے غفور کے کمرے میں اس کی خبریت دریافت کرنے چلا گیا۔ غفور گزشتہ دو روز سے مری کی تکلیف اور بخار میں مبتلا تھا۔

”اب آپ کیسے ہو بابا۔۔۔“

شفقت بھری نظروں سے دیکھا۔ ”طبیعت کا کیا بتاؤں، سب سے بڑی بیماری تو انسان کا بڑھاپا ہے، اس عمر میں طبیعت نرم و گرم تو ہوگی۔ معمولی بخار ہے ایک دو روز میں لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

”غفور بابا اتم جانتے ہو کہ بیگم صاحبہ نے جاتے وقت مجھے اس کوٹھی کے تمام سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا تھا۔“

”جانتا ہوں پتر اور خوش بھی ہوں۔۔۔ تم نے بروقت دشمنوں کی چال کی خبر نہ دی ہوتی تو۔۔۔“ غفور جملہ پورا کرتے کرتے رک گیا۔ ”ٹیک آڈی کو اس کی وقاداری، نیکی اور ایماندارگی کا کچل بھی ضرور ملتا ہے۔“

”میں یہاں صاحب کی غیر موجودگی میں کچھ ضروری کام بھی کرنا چاہتا ہوں، مجھے یقین ہے کہ بیگم صاحبہ کو بھی آنے کے بعد کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

”ضرور کر دو پتر۔ غفور کی دعائیں بھی تمہارے ساتھ چلیں۔“

”اور اگر بعد میں تم نے میری تہہ پٹی پسند نہ کی۔ کوئی اعتراض کیا تو پھر۔۔۔؟“

”تو نے یہ کیسے سوچ لیا پتر کہ میں تیری کسی بات کے خلاف آواز نکالوں گا۔“

”کیا بات۔۔۔“

”سولہ آنے چکی۔“ غفور نے کھانٹے ہوئے جواب دیا تو لیاقت ایک لذت بخیز جگہ سے بولا۔

”پھر میں تم ہی سے شروع کرتا ہوں۔“ لیاقت نے بڑی اہانت سے حکم چلایا۔ ”دو روز سے تم نا مل کر رہے ہو لیکن آج تم نے زبان باز دی ہے تو جلدی سے منہ پر ہلکا سا پانی کا چھپکا مار کر تیار ہو جاؤ، آئی دیر میں، میں گاڑی ادھر لاتا ہوں، تمہیں اسی وقت میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چل کر دوا لانا ہوگی۔“

”رہنے دے لیاقت پتر، میں نے ایک دیکھی علاج۔۔۔“

”تم نے ابھی زبان دی تھی غفور بابا۔ اور ابھی تول بھی ہار رہے ہو۔“ لیاقت تیار ہو جاؤ۔ ”لیاقت اپنا جملہ مکمل کرتے ہوئے گاڑی لینے چلا گیا تو غفور اسے دل سے دعائیں دیتے ہوئے، جاہ پانی سے اٹھ کر جانے کو آمادہ ہو گیا۔

ڈاکٹر سیٹھ عثمان کا واقف کار تھا، اس نے غفور کا تھیلی معائنہ کرنے کے بعد اسپتال ہی سے ضروری دوا بھیجی۔ مفت دوا دیں اور ایک ہفتہ عمل آرام کا مشورہ دیا۔ واپسی کے راستے میں لیاقت نے غفور سے کہا۔

”من لیا اپنے کان سے پاؤں ڈاکٹر نے ایک ہفتہ جہیں
کھل آدھام کرنے کا شور مچا رہا ہے۔“
”وہ تو ٹھیک ہے، پھر لیکن پودوں میں بھی انسان کی طرح
زندگی ہوتی ہے، وقت پر انہیں کھانا اور پانی ملنے تو وہ۔“
”اس کی گھومت کرو۔“ ایک دور دراز میں تمہاری ڈی جی کر
لوں گا پھر کسی نو جوان مانی کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ تم ٹھیک
ہو جاؤ تو پھر دیکھ بھال کرنا تمہاری ہی ذمہ داری ہوگی۔“
ظہور کی دعا لے کر وہ اپنے روزمرہ کے کاموں میں
اشغول ہو گیا۔ اس شام اس کی ملاقات سراج سے بھی ہوئی۔
لیاقت نے باہر لان میں چائے پانی کا بندوبست کیا پھر سراج
کے اشارے پر اس کے قریب ہی لان پر بیٹھ گیا۔
”میں تم سے ایک ضروری بات معلوم کرنا چاہتا ہوں
لیکن یہ بات صرف ہمارے درمیان ہوگی۔“ سراج نے
اپنے الفاظ پر زور دے کر کہا۔ ”تم اس کا ذکر کسی اور سے نہیں
کرو گے۔“
لیاقت حسین نے ہامی بھری اور سنبل کر بیٹھ گیا۔
”ابھی طرح غور کر کے بتاؤ کہ کیا کرنا چاہیے آنے سے
قبل تمہارا کسی سے ایسا جھگڑا یا ٹکراؤ ہوا تھا جس میں تم دشمنی
ہو گئے ہو؟“
”میں آپ کا مقصد سمجھ رہا ہوں صاحب لیکن میرا بھی
کسی کے ساتھ ایسا کوئی جھگڑا نہیں ہوا جس میں مجھے کوئی گئی
ہو۔“ لیاقت نے نظریں جھکا کر جواب دیا پھر بولا۔ ”اس
رات میں نے گھر جا کر تیز روشنی میں بھی وہ دو نشان بڑی
حیرت سے دیکھے تھے، ایسا ہی لگتا تھا جیسے کوئی خطرناک دشمن
بھرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے اپنا نشان چھوڑ گیا ہو لیکن۔“
”لیکن کیا۔۔۔؟“ سراج نے اسے تیز نظروں سے
دیکھا۔ ”تم کچھ کہتے کہتے خاموش کیوں ہو گئے؟“
”کیا کہوں صاحب۔“ لیاقت حسین نے نہایت
سادگی اور معصومیت سے جواب دیا۔ ”مجھے خود بھی حیرت ہے
کہ جو نشان میں نے رات کو دیکھے تھے وہ صبح نہاتے وقت
کہیں بھی نظر نہیں آئے۔ میں کئی بار اپنی تسلی کر چکا ہوں۔“
”کیا تم کو اس کی کوئی وجہ بھی نہیں معلوم؟“ سراج نے
اسے تیز نظروں سے دیکھا۔
”معلوم ہوتی تو آپ سے بھی نہ چھپا ہوتا۔“ لیاقت نے
دل پر جگر کے جھوٹ بولا۔ وہ اس بزرگ اور بوڑھے ناچا
کی بلی ہوئی بات زبان تک نہیں لاسکتا تھا۔
”کیا تمہیں یاد ہے کہ میں نے تمہیں اس روز گاڑی
سے باہر نہ نکلنے کی تاکید کی تھی؟“

”یاد ہے صاحب۔“
”پھر۔۔۔ تم اچانک گاڑی سے نکل کر باہر کیوں
گئے؟“ سراج نے قدرے افسرانہ انداز اختیار کیا۔
”میں۔۔۔ میں تو گاڑی سے نہیں اترتا تھا۔“ لیاقت
نے اس بار بڑے جھین سے کہا۔ ”بھلا آپ کا حکم کس طرح
بال سکتا تھا؟“
”یہ تو یاد ہوگا کہ تم میرے دوبارہ کہنے پر گاڑی میں
جا کر بیٹھے تھے؟“
”میں جوت نہیں پولوں کا صاحب۔“ لیاقت نے عجیب
انداز میں ذہن پر زور ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں، مجھے یاد
ہے صاحب لیکن گاڑی سے اترنا مجھے یاد نہیں۔“
”گاڑی سے اترنے کے بعد تم نے کیا کیا تھا؟“
سراج کی نظریں لیاقت حسین کے چہرے پر مرکوز تھیں۔
”کیا، کیا تھا صاحب۔؟ مجھے کچھ یاد نہیں۔“ لیاقت
نے گھبرا کر ہاتھ جوڑ لیے۔ ”صاحب، مجھے کچھ بھی یاد نہیں بلکہ
میں نے آپ سے پوچھا بھی تھا کس خاتون کا کیا بنا؟“
سراج نے غوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا، وہ تجربے
کا آفسر تھا، اس کی نگاہیں اور دل گواہی دے رہے تھے کہ
لیاقت حسین نے اس وقت بھی جو جواب دیے وہ غلط نہیں
تھے۔ ایک سیدھا سادا شخص اس انداز میں دروغ گوئی بھی
نہیں کر سکتا۔ بڑے بڑے گھماک جرم بھی پولیس کے سامنے
زبان کھولنے پر مجبور ہو جاتے تھے لیکن لیاقت حسین نے جو
کہانی پیٹ کے رقصوں کے بارے میں بتائی تھی وہ پراسرار
بھی تھی اور حیرت انگیز بھی۔۔۔ ان رقصوں کی تصدیق کے لیے
وہ اس وقت بھی لیاقت حسین کو اندر گہرائی میں لے گیا۔ اس
نے لیاقت کی قمیض اٹھا کر بڑی توجہ اور تفصیل سے اس کے
پیٹ کو جھرت بھری نظروں سے دیکھا۔ لیاقت نے لہلہاتیں کہا
تھا، جو نشان سراج نے اپنی نظروں سے دیکھے تھے، خود
لیاقت حسین نے بھی ان کی تصدیق کی تھی لیکن اب وہ حیرت
انگیز طور پر غائب تھے۔ یہ سب ناقابل یقین تھا۔ کیراج سے
نکل کر دونوں دوبارہ لان میں آ گئے۔ سراج نے کرسی پر بیٹھے
ہوئے لیاقت حسین کو بحث سے مخاطب کیا۔
”لیاقت حسین، تم نے ان نشانات کے بارے میں کسی
اور سے تو کچھ نہیں کہا؟“

اس پراسرار اور تعجب آمیز سلسلے کے مزید
واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

موبائل اور انٹرنیٹ جیسی ایجادات نے جہاں انسان کو یہ شمار
سمولٹوں سے نوازا۔۔۔ وہیں انسانیت کی تذلیل میں بھی کوئی کسر انہا
نہیں رکھی۔ وہ جو سایہ بن کر رہتے تھے، کب دشمن نے نقب لگائی انہیں
خبر ہی نہ ہو سکی اور جب انہیں علم ہوا تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔

ہوں پرتی کی شکار ایک دوشیزہ کا پرنگر ہاجرہ

نئی نسل

کاشف زبیر

جولی جیسے لکھنؤ اور یہ بات اس کے شوہر
مارک جیسے دفتر سے آتے ہی محسوس کرتی تھی لیکن اس
بارے میں اس وقت پوچھا جب وہ بچوں کو گڈ نائٹ کہہ کر
اپنے کمرے میں آئے تھے۔ مارک نے نرم لہجے میں کہا۔
”کوئی مسئلہ ہے کیا؟“

جولی، جو لباس تبدیل کرنے کے بعد ڈریسنگ کے
سامنے بیٹھی بالوں میں برش پھیر رہی تھی، چونک گئی۔ ”نہیں
ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”تب تم پریشان کیوں ہو؟“

جولی اسٹول سے اٹھ کر بستر پر آ گئی۔ ”بات معمولی سی
ہے حالانکہ اس میں پریشانی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔“

مارک نے اس کے گرد بازو حائل کر کے اسے خود سے
قریب کر لیا اور بولا۔ ”کیا بات ہے؟“

جولی ہچکچاتی لیکن پھر اس نے کہہ ہی دیا۔ ”این جیوان
ہو گئی ہے۔“

این جیوان ان کی سب سے بڑی اولاد تھی اور گزشتہ
دونوں انہوں نے اس کی چودھویں سالگرہ منائی تھی۔ مارک
نے اسے ایٹل کی جدید ترین ٹیوٹ بک تجھے میں دی تھی اور



جولی نے اسے اہل کا ہی آئی فون گفٹ کیا تھا۔ این سے چھوٹے ریٹ نے اسے ایک خوب صورت لباس دیا تھا اور سب سے چھوٹی سات سالہ ماریا نے اسے لیدر شوز دیے تھے۔ یہ جوتے اس نے اپنے جیب خرچ سے خریدے تھے۔ این بہت خوب صورت اور معصوم نظر آنے والی نوجوان لڑکی تھی۔ وہ اچھی صحت کی وجہ سے اپنی عمر سے کسی قدر بڑی لگتی تھی۔ اس میں کوئی شبہ کی بات نہیں تھی کہ اس میں جوانی کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

مارک مسکرایا۔ "اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو اچھی بات ہے۔"

"ہاں۔" جولی نے بے دلی سے کہا۔ "لیکن تم جانتے ہو مجھے خوف آتا ہے۔"

مارک سنجیدہ ہو گیا۔ وہ جولی کی بات کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ اس نے نرمی سے اس کا شانہ سہلایا۔ "تمہارا خوف ٹھیک نہیں ہے ضروری نہیں جو تمہارے ساتھ ہوا ہو وہ ہر لڑکی کے ساتھ ہوا اور پھر ہم این کے ماں باپ موجود ہیں، ہم اس کی دیکھ بھال کریں گے۔"

"میں جانتی ہوں اس کے باوجود میں اندر سے خوف نکال نہیں سکتی ہوں۔" جولی محوم کر مارک کے سینے سے لگ گئی۔ "شاید وقت کے ساتھ یہ خوف ختم ہو جائے۔"

"ایسا ہی ہو گا۔" مارک نے یقین سے کہا اور ہاتھ بڑھا کر لائٹ بند کر دی۔ "اب سو جاؤ۔"

مارک فوراً سو گیا تھا لیکن جولی کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ وہ این کے بارے میں سوچتی رہی۔ این آج کل کی لڑکیوں کے مقابلے میں معصوم اور سیدھی تھی۔ اسے نہ تو لڑکوں سے کوئی دھمکی تھی اور نہ وہ ڈانس پارٹیوں میں جانے کی شوقین تھی۔ جولی اچھی طرح جانتی تھی کہ نوجوان سسل کونشیاٹ اور جنس سے حصار کرانے میں ان ڈانس پارٹیوں کا سب سے بڑا ہاتھ تھا۔ ماں باپ اپنے بچوں کو ان پارٹیوں سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے لیکن جوان ہوتے بچے کسی نہ کسی طرح راست نکال ہی لیتے تھے۔ جولی کو احساس تھا کہ جلد این بھی ان پارٹیوں میں شامل ہو جائے گی اور اس کے بعد اس کی زندگی گیارہ اختیار کرے۔ اس کے بارے میں ابھی سے کچھ کہنا مشکل تھا۔ یہ لڑکوں اور لڑکیوں کی زندگی کا حساس ترین دور ہوتا ہے، اس میں وہ اپنی زندگی بناتے بھی ہیں اور بگاڑتے بھی ہیں۔ ایک زمانے میں ماں باپ اپنے بچوں کو روک لیتے تھے لیکن اب وہ اس معاملے میں بے بس ہوتے جا رہے تھے۔

لیکن جولی کا خوف اس سے کہیں بڑھ کر تھا۔ وہ سوچ رہی اور پھر سوچتی۔ صبح وہ حسب معمول وقت پر ابھی مارک جاب پر جانے کے لیے نکل اڑتے وقت لکھا تھا کہ کنگ اس کا کارڈ اٹھا نکاشی سے کوئی جیس میل دھرتا اور اسے دفتر تک ایک کنگ کی ڈرائیو کرنا پڑتی تھی اس لیے وہ صبح بچوں کو اسکول نہیں لے سکتا تھا۔ یہ فریضہ جولی انجام دیتی تھی۔ وہ دونوں ایک اسکول میں پڑھتے تھے جبکہ این الگ اسکول میں پڑھتی تھی وہ دسویں درجے میں تھی۔ اس کی کلاس کی ساری لڑکیاں اس میں اس سے بڑی تھیں اور زندگی کے دوسرے معاملات میں کہیں زیادہ تجربے کا بھی۔ جولی ان کی طرف سے بھی فخر محسوس کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کئی جوان ہونے والی لڑکیوں کو ان کی سامی لڑکیاں ہی گائڈ کرتی ہیں اور انہیں جنس اور کنشیاٹ کی طرف لے جانے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ لڑکی کے گروپ میں جو سب سے زیادہ تجربے کا رہتی تھی وہی لڑکی ہوتی اور سب لڑکیاں اس کی بات مانتی تھیں یا اس کے زیر اثر ہوتی تھیں۔ جولی نے این کو اس بارے میں سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن این نے کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے این کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ بچوں کو انکلاؤ کی زحمت سے بچانے کے لیے جولی انہیں اسکول چھوڑنے اور لینے جاتی تھی۔ جب وہ این چھوڑنے اور لینے جاتی تو وہ بھی کئی کئی کن لڑکیوں سے مل رہی ہے اور اندازہ لگانے کی کوشش کرتی کہ ان میں کون سی لڑکی این کے لیے مناسب نہیں لیکن ابھی تک اسے کوئی ایسی لڑکی نظر نہیں آئی تھی جس سے دوستی این کے لیے مناسب ہوگی۔ اسکول سے بہت کچھ ہی این سے ان کی دوستی تھی اور وہ ان کے گھر آتی تھیں۔ اس روز وہ این کو چھوڑے سے ہوشیار نظر آنے والی لڑکی کی طرف بڑھی۔

"ہائے ماری۔"

"ہائے این۔" ماری نے گرم جوشی سے کہا۔

تمہاری ماما تھیں؟

ماری نے این کی دوستی حال ہی میں ہوئی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ اس کی ماں ماری کو دیکھے۔ اسے احساس تھا کہ اس کی ماں ماری کو پسند نہیں کرے گی اور شاید اسے سے ٹھٹھنے لگنے سے منع کر دیا جائے۔ این ماں باپ کا حکم کی عادی تھی اس لیے وہ کسی ایسی صورت حال سے بچتا تھا۔ ماری نے اس کی طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔

پارٹی ہے، کیا خیال ہے؟

اس نے معنی خیر انداز میں

طرف دیکھا۔ "اب تو تم جوان ہو گئی ہو۔"

این کا رنگ گھاپی ہو گیا تھا، اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ماما اور ڈیڈ کی طرف سے اجازت نہیں ملے گی۔"

"بہت بے وقوف۔۔۔۔۔ ان سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

این نے حیرت سے ماری کی طرف دیکھا۔ "جب میں کیسے جانتی ہوں؟"

"تم کوئی بھانڈا نہ کر دینا۔ کسی اور دوست کے گھر جانے کا کہہ کر آ جانا۔" ماری نے اسے ترکیب سمجھائی۔ "میں تمہیں گلی کے کونے سے پک کر لوں گی۔"

این ہچکچاتی، پھر اس نے کہا۔ "میں تمہیں سوچ کر بتاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے لیکن وہاں مزہ بہت آتا ہے۔" ماری نے اصرار کیا۔ "تم ایک باجل کر تو دیکھو۔"

اسکول میں این اس بارے میں سوچتی رہی اسے معلوم تھا اگر اس نے ماما اور ڈیڈ کو بچ بتا دیا تو اسے جانے کی اجازت نہیں ملے گی چونکہ وہ ابھی صرف چودہ سال کی تھی اس لیے اپنی مرضی بھی نہیں چلا سکتی تھی۔ اٹھارہ سال کی ہونے کے بعد وہ اپنے معاملات میں خود مختار ہوتی۔ مگر فی الحال اس کا دل چاہ رہا تھا۔ لہذا چھٹی کے وقت کلاس سے باہر آنے کے بعد اس نے راہ اوری میں ماری کو روک لیا۔ ماری خوش ہو گئی۔ "تم چل رہی ہو؟"

"میں نے ابھی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ میں تمہیں شام تک بتاؤں گی۔"

"تم مجھے سات بجے تک بتا دینا، پارٹی آٹھ بجے شروع ہوگی۔"

"اور کب تک جاری رہے گی؟"

"صبح تک۔" ماری بولی۔

این گھبرا گئی۔ "میں اتنی دیر نہیں رکھ سکتی۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے، جب تمہارا دل چاہے گا ہم واپس آ جاؤں گے۔"

"وعدہ؟"

"ہاں بیکار وعدہ۔" ماری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

این ماری سے الگ ہو کر باہر نکل جہاں جولی گاڑی میں اس کی منتظر تھی۔ وہ اندر آئی تو جولی نے فوراً اسے دیکھا۔ "کیا بات ہے تم کسی بات پر ایسا لڑھکے ہو؟"

این چونک گئی۔ "نونا۔"

جولی نے گاڑی آگے بڑھائی کیونکہ پیچھے گاڑیوں کی

ایک لمبی قطار موجود تھی۔ اسکول سے نکل کر جولی نے پوچھا۔ "کیا تمہاری کوئی نئی دوست بنی ہے؟"

"نونا۔" اس بار این نے نظریں چرا کر کہا۔

جولی فکرمند ہو گئی، اسے واضح طور پر محسوس ہوا کہ این نے اس سے جھوٹ بولا ہے اور بچے ماں باپ سے اسی وقت جھوٹ بولتے ہیں جب وہ کوئی ایسا کام کرنے جا رہے ہوں جس کے بارے میں انہیں یقین ہو کہ ان کے ماں باپ کے علم میں آ گیا تو وہ انہیں منع کر دیں گے۔ مگر اس نے این سے اس موضوع پر پھر کوئی بات نہیں کی۔ البتہ جب وہ گھر پہنچے تو کھانے کی میز پر این نے کہا۔ "ماما میں شام کو انش روز کے پاس جاؤں گی۔"

انش روز، این کی ایک دوست تھی اور اس کا گھر چند گلی چھوڑ کر اسی علاقے میں تھا۔ شام کے بعد این کو صرف اسی کے گھر جانے کی اجازت تھی۔ جولی نے اسے فوراً سے دیکھا۔ "کوئی خاص بات ہے؟"

"نہیں ماما میں ایسے ہی۔" این نے پھر اس انداز میں کہا کہ اس کا جھوٹ جولی نے واضح محسوس کر لیا۔

"ٹھیک ہے تم چل جانا لیکن جلدی واپس آنا۔"

"اوکے ماما۔" این خوش ہو گئی۔ اس نے اپنے کمرے میں جاتے ہی ایسی ایم ایس کر کے پہلے ماری کو اطلاع دی اور پھر انش روز کو بتایا۔ اگر ماما یا ڈیڈ جہیں کال کر کے پوچھیں تو ہم یہی کہیں کہیں تمہارے گھر میں ہوں۔

"مگر کیوں؟" اینش روز حیران ہوئی تھی۔

"میں ڈانس پارٹی میں جا رہی ہوں۔" این نے ایس

ایم ایس کیا۔

"واہ۔" انش روز بھی پر جوش ہو گئی تھی۔ "کیا میں بھی چل سکتی ہوں؟"

"نہیں۔۔۔۔۔ اس صورت میں ماما اور ڈیڈ کو بتا چل جائے گا۔" این نے انکار کیا۔ وہ شام کے وقت تیار ہوئی اور ساڑھے سات بجے گھر سے نکلی۔ ماری گلی کے کونے پر اس کی منتظر تھی۔ پارٹی ایک الگ تھلک اور بڑے سے مکان میں جاری تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی این کی آنکھیں حیرت سے کھلیں گئیں کیونکہ وہاں وہ سب کچھ ہو رہا تھا جس کے بارے میں اس نے صرف سنا تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں جاسے سے باہر، نشے میں بدست ہو کر شیطان کو گھسیٹ رہے تھے۔ این گھبرا گئی۔ اس نے پہلے بھی ایسی کسی پارٹی میں شرکت نہیں کی تھی۔ ماری اسے ایک کمرے میں لے گئی جہاں کوئی نصف درجن لڑکیاں ناگفتہ بہ طبعے میں جلد آواز سے بات کر رہی تھیں۔

ان کی گفتگو فطرت کوئی کے زمرے میں آتی تھی اور یہ وہ بھی۔ ماری نے ان کا تعارف کرایا تو ایک مرد مارٹن کی لڑکی نے مردوں کے بارے میں تجربات کے متعلق اس سے کچھ ایسے سوالات کیے کہ فاسے سرد موسم میں بھی ان کو پہینا آگیا تھا لڑکی نے اس سے بڑے اشتیاق سے کہا۔

”تم کچھ نہ جانتا تھی؟“
”واش روم کس طرف ہے؟“

لیکن وہ واش روم جانے کے بجائے مکان سے باہر نکل آئی۔ ماری اس کے پیچھے پیچھے آئی تھی۔ ”این کیا ہوا تم باہر کیوں آگئیں؟“

”میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“ این نے جواب دیا۔ ”میں گھر جا رہی ہوں۔“

”تم آن! ابھی تو پارتی کا آغاز ہے۔“ ماری نے اسے راضی کرنے کے لیے کہا۔ ”ابھی تمہیں بہت کچھ دیکھنے اور سیکھنے کو ملے گا۔“

این کے خیال میں اس نے جتنا دیکھ لیا تھا اتنا ہی کافی تھا۔ اگر اس کے ماما اور ڈی کو بتا چل جاتا کہ وہ کہاں گئی تھی تو یقیناً شام کے بعد اس کے گھر سے نکلنے پر پابندی عائد کر دی جاتی۔ اس کے اصرار پر ماری اسے گھر کے پاس چھوڑ گئی لیکن اس کا سوڈ آف ہو گیا تھا۔ این کو گھر کی کچلیں وہ اس سے مستقل ناراض نہ ہو جائے لیکن اگلے روز اسکول میں اس کا موزا چھڑا تھا اور اس نے این سے کہا۔ ”ابھی تم معاملات میں رہی ہو۔ جب تک تم کوئی عملی تجربہ نہیں کر لو گی، تمہیں ایسے معاملات میں مزہ نہیں آئے گا۔“

”عملی تجربہ؟“
”ہاں تم کسی لڑکے سے دوستی کرو۔“
”دوستی کیسے کروں؟“ این نے سادگی سے پوچھا۔
”تمہارے پاس پرل کبھیو ہے؟“
”ہاں ہے۔“

”بس تو اس پر تلاش کرو، جہیں کوئی نہ کوئی مل جائے گا۔“

این نے اسی رات نوٹ بک پر ایک ایسی سائٹ کا رخ کیا جس پر لڑکے اور لڑکیاں آپس میں رابطہ کر سکتے تھے۔ اس نے کئی لڑکیوں کی پروفائل دیکھی اور اسے مورن نامی ایک لڑکا اچھا لگا۔ اس نے اپنی پروفائل میں اپنی تصاویر، ایک چٹ آئی ڈی اور سب سے زیادہ ڈال دیا۔ این نے پہلے اس کی چٹ آئی ڈی ٹرائی کی لیکن وہ لاگ آف تھا۔ تب اس نے اسے ایس ایم ایس کیا۔ ”ہائی۔“

اس کا فوری جواب آیا۔ ”ہائی۔“
”کیا تم مجھ سے چٹ کرنا چاہتے ہو؟“
”تم لڑکی ہو؟“

”ہاں۔“
”عمر کتنی ہے؟“

”اگلے مہینے ستر سال کی ہو جاؤ گی۔“ این نے لہلہ جواب دیا۔

”میں نیٹ پر آ رہا ہوں۔“

این نے بھی نوٹ بک کھول لی۔ اس میں وائرلیس انٹر نیٹ کنکشن پہلے سے موجود تھا اور وہ اسے نہیں سے بھی استعمال کر سکتی تھی۔ چٹ روم میں آتے ہی اسے مورن کا پیغام دکھائی دیا۔ لیکن اس پر کوئی تصویر نہیں تھی بس آڈی کا خاکہ بنا ہوا آ رہا تھا جبکہ این نے اپنی تصویر دی تھی یعنی وہ چٹ روم میں کچھ لکھتی تو وہ اس کی تصویر کے ساتھ جاتا۔ مورن نے پہلی بار اس کی تصویر دیکھی۔

”واہ اتم تو بہت خوب صورت ہو۔“

”شکریہ۔۔۔۔۔ تم نے اپنی تصویر کیوں نہیں دی؟“
”تم نے میری تصویر پر وہ قتل میں دیکھ لی ہو گی۔“ مورن نے کہا۔

اس رات این دیر تک اس سے بات کرتی رہی۔ مورن بہت اچھے چٹے لکھتا تھا اور اس سے بات کرتے ہوئے این کو ذرا بھی پر محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس کا انداز شہتہ اور جیلے بناوٹ سے پاک تھے۔ اس نے این کی تعریف کی لیکن ایک حد میں رہ کر۔ دوسرے دن پھر وہ رات گئے تک آپس میں بات کرتے رہے اور اس کے بعد تو یہ معمول بن گیا۔ مارک کو محسوس نہیں کر سکا تھا لیکن جولی نے محسوس کر لیا اور ایک رات اس نے سونے سے پہلے مارک سے اس کا ذکر کیا۔

”جولی روز ہی رات کو ذرا تک نوٹ بک کھولے بیٹھی رہتی ہے۔“

”تو نوٹ بک کس لیے ہوتی ہے۔ دیکھو جولی، اب وہ جوان ہو رہی ہے اور اسے سوشل رابطوں کی ضرورت ہے اسی لیے اسے نوٹ بک اور سوشل ڈیا ہے۔“

”ہاں لیکن مجھے غصہ ہے وہ تمہیں کسی لحاظ سے نہ مل بیٹھے۔“

”میرا خیال ہے کہ این اتنی احمق نہیں ہے۔“ مارک نے کسی قدر ناگوارگی سے کہا۔ ”ہم نے اس کی بہترین تربیت کی ہے۔ اسے اچھے برے کی تمیز سکھائی ہے اور سب سے بڑھ کر اسے ہمارا احترام حاصل ہے۔ وہ ہم سے جرات کر سکتی ہے۔“

جولی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”آج کی نسل کے لیے یہ سب چیزیں نا کافی ہیں۔ وہ ذہنی لحاظ سے پرانی نسل سے بھی کم ہے۔ بس اسے رابطے کے ذرائع جدید مل گئے ہیں۔“

مارک اپنی بیوی سے متعلق نہیں تھا لیکن اس نے بحث سے گریز کیا۔ ”نی الحال اسے پچھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

جس وقت مارک اور جولی آپس میں بات کر رہے تھے عین اسی وقت این، مورن سے ملاقات کا پروگرام بنا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ آنے والے اتوار کو ماما اور ڈی

بچوں کو تفریح کرانے لے جائیں گے۔ وہ کسی بہانے سے رک جائے گی اور گھر والوں کے جاتے ہی وہ نکل کر مورن سے ملنے چلی جائے گی۔ مورن نے اسے ایک معروف

شاپنگ سینٹر کے باہر ملنے کو کہا تھا۔ این اس ملاقات کے لیے بہت بد جوش ہو رہی تھی۔ وہ اپنے طور پر مورن سے محبت کر

تی تھی اور دن رات اس کے خیالوں میں کھولی رہتی تھی۔ آنے والے اتوار کو جب سب جانے کے لیے تیار ہو

رہے تھے۔ اس نے عین موقع پر اٹھ کر دیا۔

”ماما میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“
جولی فکر مند ہوئی۔ ”کیا ہوا ڈی؟“

”بس ماما طبیعت سست ہے، میں نہیں جا رہی۔“

پروگرام ملے تھا اس لیے جولی اور مارک کو جانا تھا۔ جولی جاتے ہوئے اسے بہت ساری ہدایات دے کر گئی تھی۔ انکس بچوں کو لے کر شہر سے باہر ایک ایسوزنٹ مارک

جانا تھا اور ان کی وہی شام تک ہوتی۔ گھر والوں کے نکلنے

کا این نے ساگرہ پر بریٹ کا دیا ہوا لباس نکالا اور اسے پہن کر تیار ہو گئی۔ وہ بس کے ذریعے شاپنگ سینٹر تک آئی

اور ایک مخصوص سٹج پر بیٹھ کر مورن کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے مورن کی تصویر اپنی بار بھیجی تھی کہ وہ اس کے ذہن میں

نقش ہو گئی تھی۔ وہ ہر چھبیس سال کے آس پاس کی عمر کے لڑکے کو فور سے دیکھتی تھی کیونکہ مورن نے اسے اپنی عمر میں

بتائی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جب مورن کو یہ سچے گاس نے اپنی غلط بتائی ہے تو اس کا کیا عمل ہوگا۔ ممکن ہے وہ اسے اچھا نہ سمجھے اور اس سے ناراض ہو جائے۔

”ہے این! اچانک ایک ایسوزنٹ عمر آدی نے اس کے پاس آکر کہا۔ وہ اسے بہت پر شوق نظروں سے دیکھ رہا

تھا۔ ”تم تو بہت خوبصورت ہو! اپنی تصویر سے بھی زیادہ۔“

”تم کون ہو؟“ این نے پوچھا۔
”میں مورن ہوں۔“ وہ اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔
این حیران رہ گئی۔ وہ شخص کی صورت پیشینہ سے کم

نہیں تھا۔ اس کے سر کی بال سلیقے سے بٹے ہوئے تھے۔ لیکن اس کے خدو خال میں مورن کی جھلک تھی۔ این کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

”تم نے جھوٹ بولا تھا۔ تم پچھبیس سال کے نہیں ہو۔“

”ہی! اس نے نہایت پیار سے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں پچھبیس سال کا نہیں ہوں لیکن اس سے میری محبت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نیٹ اور فون پر جو باتیں ہوئیں وہ ہمارے ہی درمیان میں۔“

”تم نے مجھے دھوکا دیا۔“ این کی آواز بھرا گئی تھی۔

مورن نے گہری سانس لی۔ ”ڈی! میں نے خوف سے جھوٹ بولا تھا مجھے ڈر تھا اگر تم جان جاؤ گی کہ میں اتنا جوان نہیں ہوں تو تم مجھ سے تعلق تو ڈلو گی۔ میں تم سے دور نہیں

ہونا چاہتا تھا۔ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔“

این کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے لیکن رفتہ رفتہ مورن کی باتوں نے اس کا دل کم کر دیا تھا۔ پھر مورن

نے اسے سچ کی تجویز پیش کی۔ ”وہ کسی قدر چٹا ہٹ کے بعد مان گئی۔ مورن اسے نزدیک واقع ایک فرسٹ کلاس

ریستوران میں لے گیا۔ اس نے این کی پسند کی بھڑین چیزوں کا آرڈر دیا۔ اس دوران میں این کا دل قدرے کم ہو

گیا تھا اور وہ جیسے منکرا لگی تھی۔ مورن اب اسے اتنا برا نہیں لگ رہا تھا۔ سچ کے بعد اس نے این سے کہا۔

”میرے ساتھ چلو، میں تمہیں کچھ دیکھانا چاہتا ہوں۔“

”تمہارے گھر؟“

”نہیں میرا گھر تو دور ہے میں صرف تم سے ملنے کی خاطر اتنی دور آیا ہوں۔ این تم میرے لیے بہت خاص ہو،

بہت ہی خاص۔“ مورن نے پراثر انداز میں کہا۔ یقیناً اسے اس لمحے کی خاصی پریشانی تھی۔

”پھر کہاں؟“

”میں نے موٹل میں کمر لیا ہے۔“

کچھ دیر بعد این اس کے ساتھ موٹل کی طرف جا رہی تھی۔ موٹل میں یہ کمر الگ جھلک تھا۔ مورن نے کمرے میں

آنے کے بعد بیڈ کے سامنے موجود الماری سے ایک چھوٹا سا گفٹ بیگ نکال کر اسے دکھایا۔ گفٹ بیگ نکالنے سے اس نے الماری کا دروازہ پھرا نہیں کھولا تھا۔ این نے کھول کر اندر

دیکھا اور جب ہند کر دیا۔ مورن اسے پر امید نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔
”کیا تمہیں پسند نہیں آیا؟“
”نہیں، ٹھیک ہے۔“ اس نے بے دلی سے کہا۔

”تو مجھے پہن کر دکھاؤ۔“

بادل نا خواستہ این اٹھی اور ہنگ لے کر وہاں روم کی طرف بڑھ گئی۔ یہ ایک چھوٹی سی اور سنسنی خیز قسم کی ٹائی تھی۔ اس نے ٹائی پہن کر خود کو آئینے میں دیکھا تو اسے اپنا آپ بہت اچھا لگا تھا وہ شرماتے ہوئے واش روم سے باہر آئی تو اسے دیکھ کر مورن کی آنکھوں میں بھی ہلکے آنکھیں تھیں۔

☆☆☆

جولی اور مارک بچوں کے ساتھ امیڈنٹ پارک میں تھے۔ ماریا میری گوراؤنڈ میں چمچی چمچی اور بریٹ آنکسریم لینے گیا تھا۔ مارک کے سیل فون کی بیل بجی۔ اس نے فون نکال کر دیکھا۔ کال ایجنٹی نمبر سے تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ”نیں مارک جیس۔“

”مسٹر مارک جیس۔“ دوسری طرف سے ایک مرد نے کہا۔ ”میرا نام آفیسر جون فشر ہے۔ میرا تعلق اٹلانٹا پولیس ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔“

”مسٹر کیا ہے آفیسر؟“

”این جیس تمہاری بیٹی ہے؟ عمر تقریباً پندرہ سال، گولڈن براؤن بال اور گردن پر دائیں طرف براؤن تھل ہے۔“

”ہاں وہ میری بیٹی ہے۔“ مارک نے تیز لہجہ میں کہا۔ ”وہ شیک تو ہے۔“

جولی، جو مارک کی باتوں سے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی، اس کے قریب آ گئی۔ پولیس آفیسر کہہ رہا تھا۔ ”وہ شیک ہے اس کی جان کو خطرہ نہیں ہے لیکن مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ کسی نے اسے بھرانہ محلے کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ اس وقت اسپتال میں ہے۔“

مارک کو لگا جیسے اس کا دماغ ٹھوم گیا ہو۔ ”کیا... کیا کہہ رہے ہو؟“

”مجھے افسوس ہے لیکن یہ خبر درست ہے۔“

مارک نے خود پر قابو پایا۔ ”میرے خدا... اس اسپتال میں ہے؟ ہم ابھی آ رہے ہیں۔“

جولی، این اور اسپتال کا سن کر بے قرار ہو گئی تھی۔ جیسے ہی مارک نے فون بند کیا اس نے پوچھا۔ ”کیا ہوا این، کیا اس کی طبیعت خراب ہو گئی ہے؟“

”ہاں۔“ مارک نے اصل بات بتانے سے گریز کیا۔ ”وہ اسپتال میں ہے لیکن اس کی جان کو خطرہ نہیں ہے۔ ہم فوراً وہاں پہنچتے ہیں۔“

انہوں نے بچوں کو واپس بلا لیا اور وہ اسپتال کی طرف

روانہ ہو گئے۔ ایک گھنٹے کی طویل ڈیمانڈ کے بعد وہ اسپتال پہنچے۔ ماریا اور بریٹ کو انہوں نے کار میں چھوڑ دیا تھا۔ جولی اور مارک اندر آئے۔ استقبالیہ سے این کے بارے میں معلوم کیا اور جب وہ اس کے کمرے کی طرف آئے تو وہاں آفیسر جون فشر پہلے سے موجود تھا۔ مارک نے اپنا تعارف کرایا۔ ”این جیس ہے؟“

”یہ ظاہر تو شیک ہے لیکن اصل سیکشن ڈاکٹر زیادہ بہتر بتا سکے گا۔“

مارک جون فشر کو ایک طرف لے آیا۔ ”آفیسر ہوا کیا ہے؟“

”ایک جوڑے کو این جیس ہائی وے کے پاس اس حالت میں ملی کہ اسے اپنا ہوش نہیں تھا اور وہ ڈولتے قدموں سے جا رہی تھی۔ اس کے لباس کا مچکا حصہ خون آلود ہو رہا تھا۔“

اس جوڑے نے این کو اسپتال پہنچایا اور پولیس کو اطلاع دی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ کسی آدمی نے اس کے ساتھ وحشیانہ زیادتی کی ہے جس سے این کو جسمانی طور پر بھی نقصان ہوا ہے۔ وہ شاک کی کیفیت میں تھی اس لیے ڈاکٹر نے اسے ڈنگولائزر سے کر سلا دیا ہے۔ جسمانی طور پر ٹریٹمنٹ کے بعد وہ بہتر ہے اور اس کی جان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔“

جولی نے بھی یہ سب سنا لیا تھا اور اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی بیٹی کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ اس کے کمرے میں جانا چاہتی تھی لیکن ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔

چند منٹ بعد ایک ڈاکٹر آیا۔ این کو اسی نے ملٹی امدادی تھی۔ اس نے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے لیکن اب لڑکی کی حالت بہتر ہے۔ جسمانی طور پر وہ شیک ہے۔ وہ دس دن میں رلی کور کر لے گی۔“

”اور ذہنی طور پر؟“ مارک نے پوچھا۔

”اس بارے میں ہم کچھ کہہ نہیں سکتے ہیں لیکن اکثر کیسز میں لڑکیوں کا رد عمل شدید مایوسی اور توہمیت پسند ہو جاتا ہے۔“

”دنیائے کثرت جانہ معمولات ترک کر دینا اور خود کو کسی کوشش عام بات ہے۔ آپ کو اسے کسی ماہر نفسیات کو بھی دکھانا ہوگا۔“

”کیا ہم اسے دیکھ سکتے ہیں؟“ جولی نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”بالکل لیکن ابھی اسے چھوٹے یا جگانے کی کوشش مت کیجیے گا، وہ جتنی دیر آرام کرے گی اس کے لیے اتنی ہی بہتر ہوگا۔“

جولی اور مارک کمرے میں آئے جہاں این بستر پر

ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ صرف اس کا سینہ آہستہ آہستہ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسے نشانات تھے جیسے اسے مارا گیا ہو۔ جولی اسے دیکھ کر سسک اٹھی۔ اس نے مارک سے کہا۔ ”میں اسی بات سے ڈرتی تھی۔ ہم نے اپنی بیٹی کی اتنی دیکھ بھال نہیں کی جتنی کرنی چاہیے تھی۔“

”ایسا نہیں ہے۔“ مارک نے آہستہ سے کہا۔ ”ہم نے اس کی ہر ممکن دیکھ بھال کی ہے۔“

”پھر اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟“

”خود کو سنہالو۔“ مارک نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”این کا دکھ ہم سے زیادہ ہے۔ یہ براہ راست نشانہ دہی ہے، اسے پھر سے سنہالنا ہوگا۔“

مارک باہر آیا جہاں آفیسر جون فشر ڈاکٹر سے رپورٹ لے رہا تھا۔ مارک نے اس سے پوچھا۔ ”پولیس نے اس درندے کو گرفتار کرنے کے لیے کیا کیا؟“

جون نے شانے اٹکائے۔ ”فی الحال کچھ بھی نہیں کیونکہ ہمیں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ وہ کل تک بیان دینے کے قابل ہوگی۔ اس کے بیان سے ہی مجرم کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔“

جون فشر نے مارک سے اس بارے میں پوچھا، اس نے جواب دیا۔ ”ہم کچھ نہیں جانتے۔ آج میں بچوں کو لے کر تفریح کے لیے جانا تھا لیکن این نے طبیعت خرابی کی وجہ سے جانے سے انکار کر دیا۔“

ایک نرس نے پلاٹیک شاپر میں لپٹا ہوا این کا لباس لا کر جون فشر کو دیا۔ یہ خون آلود ہو رہا تھا۔ جون نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے اس نے تم لوگوں سے چھپایا ہے۔ وہ کہنے کیلئے تھی اور وہی این کی اس حالت کا ذمہ دار ہے۔“

”میری بیٹی معصوم ہے۔ اس کی عمر ابھی صرف چودہ سال اور دس مہینے ہے۔“ مارک نے تیز لہجہ میں کہا۔

”وہ کم عمر ہے لیکن جوان ہے۔“ جون متاثر ہوئے بغیر بولا۔ ”اسے معلوم تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہی ہے۔“

”یعنی اس کے ساتھ زیادتی کرنے والا مجرم نہیں ہے؟“

”وہ بالکل مجرم ہے۔“ جون نے کہا۔ ”اگر یہ کام لڑکی کی رضامندی سے ہوا ہے تب بھی وہ مجرم ہے اور جرم ثابت ہونے پر عدالت اسے سات سال کے لیے جیل بھیج سکتی ہے۔“

”ایک لڑکی کو تھام کر اسے صرف سات سال قید؟“

مارک نے سختی سے کہا۔

جون فشر نے پھر شانے اٹکائے۔ ”کانون ریاست کی اسمبلی بتاتی ہے ہمارے تمام لوگ ووٹ دے کر منتخب کرتے ہیں۔“ جولی باہر نکل آئی تھی۔ ”مارک! آفیسر شیک کہہ رہا ہے، یہ کانون کے مطابق کارروائی کا عجز ہے۔“

”تمہارے پاس بتانے کے لیے کچھ ہے جس سے مجرم پر دہشت پڑ سکے۔“ آخر لڑکی کا کسی طرح اس سے رابطہ ہو گا۔“

جولی کے ذہن میں پہلا خیال این کے سیل فون اور نوٹ بک کا آیا تھا۔ این کا پرس اسپتال انتظامیہ کے پاس تھا اور اس کا سیل فون ایسی میں تھا، وہ انتظامیہ نے مارک کے حوالے کر دیا۔ مارک نے جولی سے کہا۔ ”میں بچوں کو گھر چھوڑ کر آتا ہوں تم نہیں رہو۔“

جولی نے سر ہلایا اور این کے کمرے میں آ گئی۔ این کو ڈرپ لگی ہوئی تھی جس کے ذریعے اسے طاقتور ادویات دی جا رہی تھیں تاکہ وہ جسمانی طور پر جلد بہتر ہو جائے۔ جولی نے جھک کر اسے دیکھا اور نرسی سے پکارا، پھر وہ سسک اٹھی۔ ”میری جان اچھے اسی بات کا خوف تھا۔“

☆☆☆

جولی ایک نوٹے ہوئے گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا باپ ویت نام کی جنگ کا بھگوتا تھا اور پولیس اسے تلاش کرتی آن کے گھر تک آئی تھی۔ جولی کی ماں اپنے شوہر سے ویسے ہی خوش نہیں تھی۔ کارل کے فوج سے بھاگ جانے کے بعد اس کی تنخواہ بھی بند ہو گئی تھی اور نورمانے عدالت سے طلاق لے لی۔ وہ مسکایں کے ایک پسماندہ علاقے میں رہتے تھے۔ اگرچہ یہاں زمینیں بہت زرخیز تھیں لیکن یہ ساری زمینیں چند لوگوں کے پاس تھیں اور وہی اپنی دولت کے ثل بیوتے پر علاقے میں روزگار کے تمام ذرائع پر قابض تھے۔ عام لوگوں کے لیے زندگی آسان نہیں تھی۔ نورما ایک ریسٹوران میں ویٹر میں کام کرتی تھی۔ سارا دن لوگوں کو سرد کرتے، ان کے گندے مذاق برداشت کرتے اور گندے برتن سینے سینے دھک کرنا تھا جو بھائی تھی کہ جب رات کو گھر آتی تو اس کے پاس اپنی اٹھوٹی بیٹی کے لیے دو منٹ بھی نہیں ہوتے تھے۔

جولی میچ اسکول جاتی تھی اور وہاں سے واپسی پر وہ اس وقت تک گھر میں اکیلی رہتی تھی جب تک نورما واپس نہیں آ جاتی تھی۔ ماں کے آنے کے بعد بھی اس کی تنہائی پر قرار رہتی تھی بس خوف ختم ہو جاتا تھا۔ جب نورما نے کارل سے طلاق لی تو اس وقت جولی دس سال کی تھی۔ تین سال بعد وہ جوانی کی حدوں پر چڑھی اور اس وقت بھی اسے ماں کی طرف

سے کوئی رہنمائی نہیں ملتی تھی۔ نور ما کو جونی کی لکڑی نہیں تھی۔ اس کے خیال میں ہر انسان اپنی حفاظت کا خود سے دار ہوتا ہے، اس کا کام جونی کو رہا نہیں، خود راگ اور لباس مہیا کرنا تھا اور وہ یہ کام کر رہی تھی۔

جونی اسکول پیدل آتی جاتی تھی اور اس سفر میں وہ ایک چھوٹے سے جنگل سے بھی گزرتی تھی۔ ایک دن وہ اس جنگل سے آ رہی تھی کہ غور کرکھا کر گزری اور اس کا ٹھکانا پتھر سے ٹکرا کر ڈھکی ہو گیا۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن تکلیف کی وجہ سے کھڑی نہیں ہو سکی تھی۔ اس کے رونے کی آواز سن کر ایک شخص وہاں آ گیا۔ پچاسیس یا پچاس سال کا اور چہرے سے خراب نظر آنے والا شخص تھا۔ اس نے جونی سے پوچھا کہ اسے کیا ہوا ہے؟ جونی اسے دیکھ کر ڈر گئی تھی لیکن اس نے اسے اپنا زخم دکھایا۔ ”میں گر گئی ہوں، مجھے چوتھی گلی ہے۔“

”اوہ ڈیڑھ۔“ اس نے ہمدردی سے کہا۔ ”میرے ساتھ چلو میں تمہارے زخم کی صفائی کرتا ہوں۔“

جونی اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی لیکن اس نے جونی کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور اپنے ساتھ لے جانے لگا۔ وہ تو منہ آدمی تھا اور اس کے انداز میں ایک غیر محسوس سختی تھی جیسے جونی کو دبی کرنا تھا جو وہ کہہ رہا ہے۔ وہ جونی کو جنگل میں واقع ایک چھوٹے سے ٹوٹے پھوٹے گھونٹن میں لایا۔ لیکن میں معمولی سا سامان تھا۔ یہاں بجلی بھی نہیں تھی۔ آدمی نے جونی کو لکڑی کی میز پر بٹھایا اور پھر اسے لیٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس طرح اسے اس کا زخم صاف کرنے میں آسانی رہے گی لیکن اس کی حریف نظریں جونی پر گڑی جارہی تھیں۔

اس روز نور ما جب ریتووران سے گھر پہنچی تو جونی تیار حال اور تقریباً بے ہوش پڑی تھی۔ اس کا پھٹا ہوا لباس، خراش خراش جسم اور چہرہ بتا رہا تھا کہ اس پر کیا گزر چکی ہے۔ نور ما نے جلدی سے اس کا لباس تبدیل کیا اور اس کا جسم صاف کیا پھر اسے گلوکوٹ ملا کر دم دھو دھو سے پلایا تو جونی کو ہوش آیا۔ ماں کو سامنے دیکھ کر وہ سبک اٹھی اور اس نے خود پر پیتے والی قیامت ماں کو سنائی۔ جونی کا خیال تھا کہ اس کی ماں فوراً پوچھیں کو کال کرے گی لیکن اس نے جونی سے کہا۔ ”تم چپ رہو گی اور اس بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہو گی۔“

”لیکن کیوں مام؟“ جونی چلا اٹھی۔ ”اسے سزا ملنی چاہیے۔“

”خاموش رہو۔“ نور مانے درشت لہجے میں کہا۔ ”اے سزا نہیں ملے گی لیکن سب میں تمہاری اور میری بدنامی ہو جائے

گی۔ اس لیے جو ہو چکا اسے خاموشی سے لی جاؤ۔“

ماں کے مجبور کرنے پر جونی خاموش ہوئی ورنہ اس کا دل چاہو رہا تھا کہ خود پوچھنے کے پاس چلے جائے اور اس شخص کے خلاف رپورٹ کرے۔ اسے خود سے من آنے لگی تھی۔ اسے لگتا جیسے وہ ناپاک ہو گئی ہے۔ اس احساس سے جان چھڑانے کے لیے وہ گھنٹوں شاور کے نیچے کھڑی رہتی تھی لیکن ناپاکی کا احساس برقرار رہتا تھا۔ یہ احساس اصل میں اس کے ذہن میں تھا۔ اسے اپنی زندگی بیکار گئے تھی اور وہ بھی سوجھی کہ اسے مر جانا چاہیے۔ اسی خیال کے زیر اثر ایک دن اس نے خواب آور گولیاں کھالیں۔ اس کی قسمت کہ اس روز اتفاق سے نور ما جلدی گھر آ گئی اور وہ جونی کو فوراً اسپتال لے گئی۔ جونی کی جان بچ گئی تھی۔ پھر ایک مہینہ کا راسٹا کھانسی سے اس کا علاج کیا اور وہ اپنی مخصوص ذہنی کیفیت سے نکل آئی۔

جونی نے اسکول کی تعلیم مکمل کی اور ایک مقامی کالج میں داخلہ لے لیا اور اس کے ساتھ ہی آئس سکرینی کا کورس کرنے لگی۔ گر جوشن کے بعد وہ انٹرنیشنل پی ای آئی اور سیمیں اس نے ملازمت کر لی۔ پھر اس کی ملاقات مارک سے ہوئی اور انہوں نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا۔ اب ان کی شادی کو سولہ سال گزر چکے تھے۔ نور ما ساٹھ سال کی عمر میں کام چھوڑ کر ایک اولڈ ہاؤس میں منتقل ہو گئی اور دو سال پہلے ایک نرسنگ ہوم میں انتقال کر گئی تھی۔

☆☆☆

جونی نے اپنی بیٹی کو دیکھا، اسے لگا جیسے تاریخ خود کو دہرا رہی تھی۔ جو اس نے دیکھا اور سہا تھا وہی اس کی بیٹی کو دیکھنا اور سہنا پڑا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جونی کو سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا اور اس کا ذہنی کرب اس منزل تک پہنچ گیا کہ اس نے خود کشی کی کوشش کر ڈالی۔ اس نے اپن کو دیکھا اور دل ہی دل میں عزم کیا کہ وہ اسے اس حال کو نہیں چھینے دے گی کہ وہ زندگی سے نا تا توڑنے کا سوچے۔ وہ اور مارک اس کا پوری طرح ساتھ دیں گے۔ مارک ایک گھٹے بعد واپس آ گیا تھا۔ جونی اسے لے کر کمرے سے باہر آئی اور بولی۔

”مارک ہمیں اپنی بیٹی کا پورا ساتھ دینا ہو گا تاکہ وہ جلد از جلد اس سانحے کے اثرات سے نکل جائے۔“

مارک نے سر ہلایا۔ ”میں اس کتے کے بچے کو چھوڑوں گا نہیں۔“

”میں اس کی نہیں امین کی بات کر رہی ہوں۔“ جونی نے کہا۔ ”اس کا معاملہ پوچھنے کے ہاتھ میں جا چکا ہے۔ لیکن امین کا معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہے اور ہم ہی اسے دوبارہ

ہومیو اور دیسی جڑی بوٹیوں کے حیرت انگیز نسخہ جات

موٹاپے

ایک ماہ 30 پائونڈوز کم اور 6 کلو گرام

طبعی طور پر کم کرنے کے لیے یہ نسخہ بالکل لائق اور صحت مند ہے۔ اسے روزانہ استعمال کریں۔



ایٹڈیل سلیمنگ کورس

طبیعی طور پر

بغیر میڈیکل



بالوں کی طرح۔ آر کورس

بریسٹ آپ

ایٹڈیل بیوٹی کورس

ایٹڈیل ہانڈ گرو



HR اور موشن کے لیے یہ نسخہ بالکل لائق اور صحت مند ہے۔ اسے روزانہ استعمال کریں۔



مشہور کے لیے فون یا جوائی لٹاف

پاکستان ہومیو پیتھ کلینک

استقبال کیا۔ بریٹ اس کے لیے پھول لایا تھا اور ماریا نے اس کے لیے کاڈز بنایا تھا۔ این خوش نظر آئے تھی۔ جولی اور مارک نے مل کر لایا تھا کہ اس سامنے پر اس سے کوئی بات نہیں کرنی ہے۔ خوش قسمتی سے یہ بات صرف ان تک محدود تھی اور انہوں نے بریٹ اور ماریا کو بھی نہیں بتایا تھا۔ انہیں صرف اتنا معلوم تھا کہ این کی طبیعت خراب ہوگئی تھی اس لیے اسے اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ انہوں نے بچوں کو سمجھادیا تھا کہ این سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنی ہے۔ جولی رات کو این کے کمرے میں اسے گفٹس تک سمجھاتے آئے تو وہ سمجھ میں سل فون لیے لیٹی تھی۔ جولی کو دیکھ کر اس نے سل فون میز پر رکھ دیا۔ جولی نے اسے بتا دیا۔ ”اب کیسا محسوس ہو رہا ہے؟“

وہاں سے جاتے نہیں دیکھا ہے۔ گویا نہ کوئی ثبوت ہے اور نہ کوئی گواہ ہے۔“

جولی نے اسے یاد دلایا۔ ”لیکن امین کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔“

یہ تو ہے مگر عدالت میں ثبوت اور گواہ پیش کرنے
ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس شہودی این اسے کا ثبوت ہے اور
یہی اس واردات کا کوئی گواہ ہے۔ اب سارا انحصار این پر
ہے اگر وہ عدالت میں اس شخص کو شناخت کر لیتی ہے تو
عدالت اسے سزا دے سکتی ہے۔ لیکن اس کے لیے این کو
عدالت اور وکیل صفائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔“
”ٹھیک ہے تم اسے گرفتار کرنے کی کوشش کرو پھر یہ
معاملات بھی دیکھتے ہیں۔“

”آج شام میں تمہارے گھر آؤں گا۔ اس کی سختی
شہادت کے لیے مجھے ایم کیو کی ضرورت ہے۔“
”ٹھیک ہے۔“ جولی نے بے دلی سے کہا۔ ”لیکن کیا

”بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر ہم کس کی مزید تفتیش نہیں کر سکتے۔“ جون ہشر نے زور دے کر کہا۔
جولی نے فون بند کیا تو اس نے این کو بچن کے دروازے پر کھڑے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، اس نے جولی سے کہا۔ ”میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔“
آپ نے۔“ آخری چلہ اس نے چلا کر کہا اور پلٹ کے بیڑیوں کی طرف چلی گئی۔ جولی اس کے پیچھے بھی لگی۔ این نے اسے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ بڑی مشکل سے اور جولی کے مسلسل دروازہ بھانے پر اس نے دروازہ کھولا اور جولی کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ جولی اسے تسلی دیتی رہی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ماریا اور بریٹ اسکول گئے ہوئے تھے۔ اس نے این سے کہا۔

”میرا دوستی ہے۔ اگر تم کو پولیس سے تعاون نہیں کرو گی تو وہ اس شخص کو کسی طرح گرفتار کرے گی۔“
”مجھے اس شخص کی گرفتاری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“
”ٹھیک ہے میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں لیکن فیئر، پولیس یہ بات نہیں سمجھ سکتی اسے ہر صورت اپنا کام کرنا ہوتا ہے۔ اگر تم یہاں اس سے تعاون سے انکار کرو گی تو ہمیں اور ہمیں پولیس ہیڈ کوارٹر بلا لیا جائے گا اور ہمیں وہاں جانا پڑے گا۔ ہم تو پولیس سے تعاون سے انکار نہیں کر سکتے۔ میری بات سمجھ رہی ہوں؟“

ایں سفر ہلایا۔ "ٹھیک ہے لیکن پلیز! اس سے کہہ

"میں نے سوچا کہ میں ہے ماما۔" "ابن کا لہجہ بھرا گیا۔
 میرے ذہن میں خود آتی ہے۔ میں ہر باتیں پانچویں ماما۔"
 جولی نے اسے بازوؤں میں گھس لی۔ "ابن تمہارے
 ساتھ ہم سب ہیں۔ ہم تمہیں سنبھال لیں گے۔ تمہیں مرنے
 نہیں دینگے۔"
 "آغا! ابن نے مصیبت سے پرہیز کیا۔"

”ہاں میری جان بالکل سچ۔“ جولی نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ ”اب تم سو جاؤ۔“

ابن سعادت مندی سے آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ سو گئی تھی۔ جولی نے ایک بار پھر اس کے ہاتھ پر یاد کیا اور اس کے کمرے سے نکل گئی۔ ماں کے جاتے ہی ابن نے آنکھیں کھولیں اور ریل فون اٹھالیا۔ اگلے دن وہ اسکول نہیں گئی تھی۔ جولی نے اس کی دودن کی بیماری کی چھٹی کی درخواست اسکول بھیج دی تھی۔ دوپہر کے وقت آفیسر جون فشر کی کال آئی۔ مارک دفتر میں تھا۔ کال جولی نے ریسیو کی۔ جون نے اسے بتایا۔

”ہم نے اس شخص کا پتا چلا لیا ہے۔ وہ اٹلانٹا میں رہتا ہے۔ اس نے موٹی کے کمرے کی ادائیگی کر بیٹ کا راز سے کھلی اور پولیس کے پاس اس کا کمرشل ریکارڈ بھی ہے۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہے۔“ مٹول کے کمرے سے ہمیں کسی قسم کا کوئی سراغ نہیں ملا ہے۔ بینڈی چادر دھوئی جا چکی ہے اور کسی نے اس شخص کو این کے ساتھ وہاں آتے یا این کے

ایک سے ایک روک کر لے کر جانے لگا۔ چاروں کو شہر سے کہ یہ شخص پہلے بھی ایسے جرائم میں ملوث رہا ہے۔ اس نے کئی معصوم اور کمسن لڑکیوں کو دھوکا دیا ہے۔“
ایک چمک گئی اور اس نے بے ساختہ کہا۔ ”یہ غلط ہے، اس نے کہا تھا کہ میں اس کے لیے خاص ہوں۔“
جون فشر نے نرمی سے کہا۔ ”بے لیا اس نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔ وہ مجھ پر آدمی ہے۔“

ایں خاموش ہو گئی جیسے اس سے متعلق نہ ہو۔ جون ہابر آتا تو مارک اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ ”میں چاہتا ہوں اس شخص کو جلد از جلد گرفتار کیا جائے۔“

”ہماری بھی کیا کوشش ہے لیکن اس کے لیے تمہیں ذرا صبر سے کام لینا ہوگا۔ ہم اسے مکمل ثبوت کے ساتھ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ دانتے کا پتا چلنے میں دیر لگی ہے اس لیے ڈی این اے کے لیے مواد نہیں مل سکا۔“

ان کو دو پہر تک جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ اسپتال سے جانے سے پہلے ایک ماہر نفسیات نے اس سے کچھ دیر گفتگو کی تھی اور اس کے خیال میں ان مضبوط اعصاب والی لڑکی تھی جس نے اس سامنے کارناؤڈا شروع نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔۔ اس نے جولی سے کہا: ”مجھے یقین ہے کہ یہ بہت جلد داخل ہو جائے گی بشرطیکہ ماحول میں کوئی ایسا دماغی نہ آئے۔“

”ہمارے سبھی جیسا ریت کریں گے۔“

”ہاں کھل..... ساتھ ہی ذرا زیادہ توجہ ہو لیکن اسے محسوس نہ ہو کہ اسے خاص طور سے توجہ دی جا رہی ہے۔“

اور این کی طرف بڑھا دی۔ فاکس مارک نے تمام لی۔ جون نے کہا۔ "اس میں اس شخص کی مختلف تصاویر ہیں، تم انہیں دیکھ کر شامت کرنے کی کوشش کرو کہ کیا یہ وہی آدمی ہے۔"

مارک نے فاکس این کے سامنے کر دی اور آہستہ سے کہا۔ "دیکھو دیکھا اسے پہچانو۔"

این نے فاکس میں موجود شخص کی تصویر میں دیکھی۔ یہ کل چار تصاویر تھیں اور چاروں بالکل مختلف چہرے میں تھیں لیکن یہ سب ایک ہی آدمی کی تصاویر تھیں۔ این بکھیر دیکھتی رہی پھر اس نے فاکس بند کر کے جون کی طرف بڑھا دی۔ جون نے بو پچھا۔ "کیا یہ وہی شخص ہے؟"

این نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔"

"لیکن اسی شخص نے اس موٹی کے کمرے کا کرایہ کرینٹ کارڈ سے ادا کیا جہاں۔۔۔۔۔"

"میں تم سے کہہ چکی ہوں۔ یہ وہ نہیں ہے۔" این نے برہمی سے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ "پلیز اب دوبارہ مجھ سے ملنے کے لیے یہاں مت آنا۔ میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔"

این دوڑتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ جون پریشان ہو کر آواز دی۔ "جی اس کے پیچھے لگا۔ جون فشر نے گہری سانس لی۔ "سسر جنس، غوی بالکل بھی تعاون نہیں کر رہی ہے۔ اس نے آدمی کو پہچاننے سے انکار کیا ہے۔"

"ممکن ہے یہ وہ آدمی نہ ہو۔"

"پولیس کو سو فیصد یقین ہے یہ وہی شخص ہے۔" جون نے جواب دیا۔ "اگر این نے تعاون نہیں کیا تو امکان ہے اسے سزا نہیں ہوگی بلکہ ہم اسے گرفتار بھی نہیں کر سکیں گے۔"

"ہم این کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے۔" مارک نے شرمندگی سے کہا۔

جون فشر کھڑا ہو گیا۔ "میرا خیال ہے آپ لوگ اب بھی وہی غلطی کر رہے ہیں جو پہلے کی تھی۔ آپ لڑکی پر نظر نہیں رکھ رہے ہیں اور مجھے یقین ہے وہ اس سے رابطے میں ہے۔"

مارک، جون فشر کو باہر چھوڑ کر آیا تو فشر منہ تھا۔ وہ اوپر این کے کمرے میں آیا جو ستر پر اوڑھنے میں لیٹے ہوئے رو رہی تھی اور جولی اس کی پشت سہلا رہی تھی۔ مارک نے کہا۔ "این! تم نے اس شخص کو کیوں شناخت نہیں کیا؟"

یہ سن کر این کے رونے دھونے میں شدت آگئی تھی اس نے چلا کر کہا۔ "پلیز! مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

"مارک پلیز! جولی نے بھی انتہائی۔"

"اس نے اس درندے کو شناخت کیوں نہیں کیا؟" مارک نے برہمی سے کہا۔ "کیا اس کا اس سے اب بھی رابطہ ہے؟"

این تڑپ کر اٹھی اور چیخ کر بولی۔ "میرے کمرے سے چلے جاؤ۔ ابھی اور اسی وقت۔۔۔۔۔"

جولی نے جلدی سے اٹھ کر مارک کا بازو تھام لیا۔ "مارک چلو یہاں سے۔"

این دوبارہ اوڑھنے میں گر کر رونے لگی تھی۔ مارک اور جولی اس کے کمرے سے نکل آئے۔ جولی نے کہا۔ "تمہیں اس سے ابی طرح بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ وہ ابھی اس سامنے سے سبیل نہیں ہے۔"

"اگر یہ واقعہ اس کے لیے سانحہ ہے تو اس نے اس شخص کو شناخت کیوں نہیں کیا ہے؟"

"مارک، بہت ساری وجوہات ہو سکتی ہیں۔ دیکھو این ابھی ذہنی طور پر ڈسٹرب ہے۔ وہ بیمار ہے اور بیمار آدمی سے ہم تامل رو بہ کی توقع نہیں کر سکتے۔"

"مجھے وہ بیمار یا ذہنی ڈسٹرب نہیں لگ رہی ہے۔" مارک نے تیز لہجہ میں کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اپنے کمرے میں بیٹھی این اب آنسو بہانے کے ساتھ تیزی سے اپنے سل فون کی کچا اسکرین پر اٹھایاں بھی چلا رہی تھی۔ بکھیر دیکھ جولی نے آکر خاموشی سے اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو این تیزی سے سل فون میز پر رکھ کر سناکت ہو گئی جیسے سوری ہو لیکن جولی نے اس کے موبائل اسکرین کی روشنی دیکھ لی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

ابھی صبح سب معمول کے مطابق بیدار ہوئے تھے سوائے این کے، وہ دوپہر سوتا رہنے میں تھی۔ مارک نے آج تو اس نے ناشتا تیار کرنے میں مصروف جولی سے این کے بارے میں پوچھا۔ "اس کے کمرے کا دروازہ ابھی تک بند ہے۔"

جولی پریشان ہوئی تھی وہ لیپٹن اتار لی اور پر کی طرف گئی۔ اس نے این کے کمرے کا دروازہ کھولا چاہا تو وہ لاک لگا۔ اس نے چلا کر مارک کو آواز دی۔ "مارک! اوپر آؤ۔"

جولی کے لہجے نے بتا دیا تھا کہ کوئی مسئلہ ہے۔ مارک اوپر پہنچا تو جولی دروازے کو کھاتے ہوئے این کو آواز دے رہی تھی اور دروازہ کھولنے کو کہہ رہی تھی۔ مارک نے اسے پیچھے کرتے ہوئے دروازے کو زور سے بھایا اور چلا یا۔

"این! اس دروازے کو فوراً کھول دو۔"

گھر اندر سے کوئی جواب نہیں ملا تو مارک نے پیچھے ہٹ کر دروازے کو زور سے لات ماری، دوسری ضرب میں دروازہ کھل گیا تھا۔ وہ دونوں بے تابی سے اندر داخل ہوئے۔ این ستر پر سناکت بیٹھی تھی۔ جولی اسے بھونکنے اور

آواز دینے لگی۔ مارک کی نظر سائڈ دروازے پر رکھی خالی خالی گئی۔ یہ خراب آور گولیوں کی خبیثی تھی جو خالی تھی اس میں میں سے زیادہ گولیاں ہوتی ہیں اور نوٹی ہو سکتی ہیں جی کہ این نے میں گولیاں کھالی ہیں جو کسی حکومت کی نیندر سلائے کے لیے کافی سے زیادہ ہیں۔

"جولی، ایبولینس کے لیے کال کرو۔"

جلدی۔ "مارک نے این کی گردن پر نبض تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ نبض اسے مل گئی لیکن یہ بہت ست تھی۔" جلدی کرو، یہ زغذغ ہے۔"

جولی پیچھے کی طرف ہٹ کر اور گرتے پڑتے اس نے نیچے آکر امیر جی کو کال کر کے ایبولینس طلب کی۔ چند منٹ بعد ایبولینس ڈاکٹر سمیت آگئی تھی۔ اس نے این کا معائنہ کیا اور تشویش سے کہا۔ "اسے فوری طور پر اسپتال لے جانا پڑے گا۔ اس کی حالت خراب ہے۔"

این کو فوری طور پر ایبولینس میں منتقل کر کے اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ جولی اور مارک بھی ایبولینس میں اس کے ساتھ تھے۔ ڈاکٹر نے راستے میں اسے اسٹین لگا دی تھی۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسپتال پہنچتے ہی این کو آئی سی یو میں منتقل کر دیا۔ جہاں ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی کوشش میں لگ گئے تھے۔ انہوں نے این کا معدہ صاف کیا اور خواب آور دوا کے اثرات زائل کرنے کے لیے دوا دیں دینے لگے۔ کئی گھنٹے کی کوشش کے بعد وہ اس کی جان بچانے میں کامیاب رہے تھے۔ مارک اور جولی آئی سی یو کے باہر بیٹھے ہر آتے جاتے ڈاکٹر اور نرس سے این کے بارے میں پوچھتے تھے لیکن کوئی انہیں سلی بخش جواب نہیں دے رہا تھا۔ بالآخر این کی جان بچانے والی ٹیم کا سربراہ ڈاکٹر باہر آیا اور اس نے جولی اور مارک کو خوشخبری سنائی۔

"مبارک ہو، اب تمہاری بیٹی کی حالت خطرے سے باہر ہے۔"

جولی کی سسل برسنے والی آنکھوں میں اب تشکر کے آنسو آگئے تھے۔ مارک نے بے تابی سے کہا۔ "کیا ہم اسے دیکھ سکتے ہیں؟"

"ابھی نہیں، کچھ ٹریٹ منٹ جاری ہے۔ آدھے گھنٹے بعد اسے کمرے میں شفٹ کر دیا جائے گا تب تم اسے دیکھ سکو گے۔"

آدھے گھنٹے بعد این کو کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس کی حالت خطرے سے باہر آگئی تھی لیکن وہ بدستور ہے ہوش میں۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ اسے ہوش میں آنے میں کم سے کم چھ گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ مارک کو بریٹ اور ماریا کا خیال آیا۔

"وہ گھر میں پریشان اور اکیسے ہوں گے، میں انہیں دیکھ کر آتا ہوں۔"

"نہیں۔" جولی نے اپنا چہرہ صاف کیا۔ "تم یہیں رکو میں دیکھ کر آتی ہوں۔ بچوں کو کولی بھی دے لوں گی۔ گاڑی بھی لے آؤں گی۔"

مارک جانتا تھا یہ کام وہ زیادہ اچھے طریقے سے کرتی تھی اس لیے اس نے امتیاز نہیں کیا۔ جولی نے باہر آکر ٹیکسی لی اور گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ بریٹ اور ماریا حیران پریشان تھے۔ وہ بکھیر رہے تھے کہ این کی طبیعت پھر خراب ہو گئی تھی۔ جولی نے ان سے یہی کہا۔ اسکول کا وقت گزر چکا تھا۔ اس نے دونوں کو ہاتھ دیا اور خود اوپر آئی۔ این کے کمرے کا دروازہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ اندر آئی اور این کا سل فون تلاش کیا وہ اسے گھٹے کے نیچے سے مل گیا۔ اس نے تیزی سے اس کا انکس کھولا لیکن اس میں کوئی خاص ایس ایم ایس نہیں تھی۔ البتہ سونہ نامی شخص کے پرانے ایس ایم ایس تھے۔ ان میں اس نے این کو اس کے والے بیٹے استعمال کیے تھے۔ پھر جولی نے سیٹر بکس کھولا تو اس میں این کی جانب سے سونہ کو درجوں کے حساب سے ایس ایم ایس کے گئے تھے۔ جولی ان کو کھول کھول کر پڑھتی رہی اور جیسے جیسے وہ ایس ایم ایس پڑھ رہی تھی اس کی آنکھوں سے پردہ ہٹا جا رہا تھا۔ یہ ایس ایم ایس کچھ اس طرح کے تھے۔

"سونہ! پلیز مجھ سے رابطہ کرو۔"

"سونہ! مجھ سے بات کرو، پلیز۔"

"صرف ایک ایس ایم ایس کرو۔"

"تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا لیکن تم مجھے برے نہیں لگتے۔"

"تم نے مجھ سے جھوٹ بولا پھر بھی تم مجھے اچھے لگتے ہو۔"

آخری تین ایس ایم ایس اہم تھے۔ این نے لکھا تھا۔ "سونہ! تم نے مجھ سے ایک جھوٹ اور بولا۔ تم نے کہا میں تمہارے لیے خاص ہوں لیکن تم دوسری لڑکیوں کو بھی یہی دھوکا دیتے رہے ہو۔"

"تمہارا جھوٹ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔"

"میں خود بخود کر رہی ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

جولی نے سر تھام لیا۔ "تو یہ وجہ ہے اس کی خودکشی کی کوشش کی۔ میں سمجھ رہی تھی اسے بے پروا ہو کر بھوکھ رہنا گوارا نہیں ہے۔ یہ فرق ہے پرانی لڑ اور آج کی نئی لڑکی۔"

شنا سا چہرہ

سرزاد امجد بیگ

کائنات کی ابتدا سے آج تک زن، زرا اور زمین کی بدولت بڑے بڑے فسادات... جنم لیتے آئے ہیں... لہو پانی کے مانند بہتا آرہا ہے... کسی کی بگڑی اچھلتی ہے تو کسی کے خواب ٹوٹتے ہیں اور کوئی زندگی کی جنگ ہی ہار جاتا ہے... شکست و ریخت کا یہ سلسلہ تو جانے کب تک جاری رہے گا، بہر حال عدالت کے کمرے میں مرزا امجد اپنا کردار بخوبی دیکھائے آرہے ہیں۔ اگرچہ ایسے وکلا کی وجہ سے کسی کی زندگی تو واپس نہیں مل سکتی مگر... حصول انصاف میں آسانی ضرور ممکن ہو جاتی ہے۔

دکھائی دے رہی تھی جو اس نے ٹھکنوں تک اُڑس رکھی تھی اور اس واحد پہناوے کو بھی میل کی تہوں نے اپنے اندر چھپا رکھا تھا۔ میلی کے سر اور ڈاڑھی کے بال بے ترتیب بڑھے ہوئے تھے۔ وہ ہاتھ پاؤں سے بھی نکلتا تھا۔ بالوں اور جسم کی حالت سے یہی پتا چلتا تھا کہ اسے کسٹل خانے کا مت دیکھے ٹھکنوں گزر چکے ہیں۔ اس کی بگڑی کیفیت ہوش و خرد سے بے گناہ ایک دیوانے ایسی تھی۔ آپ نے بھی اس جسم کا ایک آدھ کردار شہر کے کسی حصے میں گھومتا پھرتا ضرور دیکھا ہوگا۔

میں نے سٹی کو بچانے کے لیے یک دم بریک لگا دیے تھے لہذا وہ گاڑی کے یونٹ سے آگاہ تھا، تاہم اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی کیونکہ گاڑی کی اسپینڈر ہونے کے برابر تھی۔ میں یک ٹک اسے دیکھتے ہوئے انتظار کرنے لگا کہ وہ گاڑی کے سامنے سے بنے اور میں آگے بڑھوں۔

ممکن تھا کہ یہ انتظار طوالت پکڑ لیتا لیکن میلی کو شاید میری حالت پر ترس آگیا۔ وہ گاڑی کے سامنے سے ہٹ کر پہلو سے ہوتے ہوئے ڈرائیونگ سائڈ کی جانب بڑھنے لگا یعنی وہ سیدھا میری طرف آ رہا تھا۔

پہلے تو میں یہی سمجھا کہ اس نے بھی مجھے پہچان لیا ہے لیکن اس کے چہرے پر آنکھوں میں مجھے شناسائی کا شائبہ

بعض چہرے ایسے ہوتے ہیں کہ جن پر نگاہ پڑے ہی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے انہیں پہلے بھی کیوں دیکھا ہے۔ کہاں اور کب...؟ یہ فوری طور پر یاد نہیں آتا اور ہمارا ذہن انہیں کا شکار ہو جاتا ہے۔

وہ بھی ایک ایسی شنا سا چہرہ تھا! میں اسے ایک طویل عرصے کے بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت بہت خستہ اور قلیلِ رحم حالت میں تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے اسے پہچان لیا اور اگلے ہی لمحے میری حیرت میں تعجب بھی شامل ہو گیا کہ کتنی... اور اس کیفیت میں! میں بے یقینی سے آنکھیں میاڑے اسے دیکھتا چلا گیا۔ واقعی، میرا ذہن اس صورت حال کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

کفایت اللہ عرف میلی اچانک ہی اندھیرے سے نکل کر میری گاڑی کے سامنے آگیا تھا۔ میں اس وقت اپنے ایک عزیز کی تدفین کے سلسلے میں مئی سن قبرستان آیا ہوا تھا۔ جب میری واپسی ہوئی تو چاروں طرف اندھیرا چھل چکا تھا۔ میں جیسے ہی اپنی گاڑی کو قبرستان سے نکال کر روڈ پر لایا، وہ ڈٹ کر گاڑی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

میلی کے بدن پر لباس کے نام پر صرف ایک شلوار

تک دکھائی نہ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے نزدیک پہنچتا، میں نے اپنی سائیکل کا شیشہ گرا دیا۔

اپنا نام اور میرا حیرت بھرا سوال سن کر بھی اس کے چہرے پر شامانی کا کوئی تاثر نہیں اُبھرا۔ وہ صحیح معنوں میں خود فراموشی کی منزل سے گزر رہا تھا۔ میں ابھی سوچ ہی کر رہا تھا کہ اب اسے کس ابعاد میں مخاطب کروں کہ اس نے کیا کیا ایک ایسی حرکت کی جس سے میرا دماغ محکوم کر رہ گیا۔ شاید وہ خیرات میں تاخیر کے باعث جلال میں آ گیا تھا۔

میں چند لمحات تک اسٹیرنگ تھا، سڑک کے عالم میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیمار باپ کا ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کئی گھنٹے گاڑی میں اچھا خاصا کام نکال دیا تھا۔ ایک بات تو طے تھی کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں تھا اور نہ ہی اس نے مجھے پہچانا تھا۔ اس کئی کو دیکھ کر مجھے وہ کئی یاد آگیا، برسوں پہلے جس نے میرے ایک کس میں اساتذہ کے گواہ کا کردار ادا کیا تھا۔ اور.....؟

ابتدائی پیشیوں میں تمام تر محنتیں اور دبا لیے گئے تھے اور اب باقاعدہ سماعت کا نمبر تھا۔ جج کریسی انصاف پر براہمان ہوا تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی، میجر سے موکل اور اس کیس کے طرم نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کا

سلسلہ شروع ہوا۔

مزمع کی ماں عالیہ کی عمر پچیس چھپن رہی ہوگی۔ شوہر کے انتقال کو طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ عالیہ اپنی اور اپنے بیٹے کی زراذقات کے لیے ایک چھوٹی سی دکان کرتی تھی جو بیٹے ایک گلی میں واقع تھی۔ ان دکان میں کئے آلہ، کئے پتے، فریج، فرائزر اور چھوٹے دیکر چھوٹے موٹے آئینہ فروخت ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں عالیہ نے اسٹینٹ کے کاروبار میں بھی تانک بھنسا کر تھی۔ وہ جنس دونوں پارمیں کو آپس میں ملا کر اپنا کمیشن کھرا کرتی تھی۔ اس سے زیادہ وہ کسی کھراگ میں نہیں پڑتی تھی۔ مجھ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اس نے کھارادر کے ایک معروف اسٹینٹ ایجنٹ کا وسیلہ اختیار کیا تھا جس کا شمار میرے تعلق داروں میں ہوتا تھا لہذا میں نے فیس کے سلسلے میں ٹھوڑی بہت رعایت بھی کر دی تھی۔

جلاک اسے کے کلیٹ نمبر گیارہ میں رہتا تھا اور اس کا نام اشتیاق تھا۔ اشتیاق کی عمر یہ وقت موت تک پچیس سال تھی۔ وہ اپنے بڑے بھائی اشتیاق، بھائی صدف اور ان کے دو بچوں فائز اور واحد کے ساتھ کلیٹ نمبر اسے گیارہ میں رہا کرتا تھا۔ اشتیاق آنو اسپتھر پارکس کی ایک بڑی شاپ پر بہت پرانا ملازم تھا۔ یہ دکان جہت سینٹر کے قریب واقع تھی۔ اشتیاق میٹرک سے آگے نہیں پڑھ کا تھا لہذا اشتیاق نے اسے جلازہ پر واقع خانروں کی ایک دکان پر ملازم رکھوایا

تھا۔ وہ کافی عرصے سے اسی دکان پر کام کر رہا تھا۔

استقامت کی جانب سے پہلا گواہ کثیر سے میں آیا۔ یہ
بلڈنگ کا چوکیدار دلاور خان تھا۔ دلاور کی عمر پچیس اور
چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد اور مضبوط
کاش کا مالک تھا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنا
مختصر سا بیان دیکارڈ کروایا۔ اس کے بعد وکیل استقامت اس
کے پاس پہنچ گیا۔

”جی ہاں..... جانتا ہوں۔“
 ”یہ کیا آدمی ہے؟“ وکیل استفسار نے پوچھا۔
 ”بہت ہی فحش والا اور جھگڑالو.....“
 ”میری معلومات کے مطابق، وقوعہ سے چند روز پہلے
 مقتول اور گڑم میں اچھا خاصا جھگڑا بھی ہوا تھا.....!“ وکیل
 استفسار جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”کیا وہ
 جھگڑا تمہارے سامنے ہی ہوا تھا؟“

”مستقم گھماتے اور ایک دوسرے پر لات مکا چلا رہے تھے۔“ وکیل استغاثہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے التعمد دیا۔

سپنر فالجنت

اشہات میں گردن ہلائی۔

”آپ بائبل ٹیک کر رہے ہیں وکیل صاحب!“ وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ”مزم کے ہونٹوں اور چہرے کے دوسرے حصوں سے خون نکل آیا تھا اور اس کی شرٹ کا کمر بیان بھی پھٹ گیا تھا۔ اشتیاق نے اسے بے دروغی مارا تھا۔“

”مقتول سے پٹنے کے بعد مزم کے کیا تاثرات تھے؟“

”اور اس نے اشتیاق کو بڑی خطرناک دھمکی دی تھی۔“ گواہ نے بتایا۔
”کیسی دھمکی؟“

اپنی باری پر میں بیچ کی حازت حاصل کر کے گواہوں
والے کھڑے کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے استغاثہ کے گواہ
چوکیدار دلاور خان کی آنکھوں میں دیکھا اور جرح کا سلسلہ
آغاز کرتے ہوئے سوال کیا۔
”دلاور خان! انھیں نور اپارٹمنٹس میں کام کرتے
ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”جی ہاں۔۔۔“

”جب تم نے اس بلنگ میں ملازمت شروع کی تو۔۔۔“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”تو ظلم اور قتل پہلے سے نور اپارٹمنٹس میں رہ رہے تھے یا تمہارے بعد آئے تھے؟“

سپتمبر 2011ء

"دلاور خان!" میں نے اپنے سوالات میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں تم نے بڑے وثوق سے بتایا ہے کہ ملزم نہایت ہی فضیلا اور جھگڑا آوری ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔؟"

"نہیں جناب!" اس نے جلدی سے نفی میں گردن ہلائی۔ "میں نے بالکل سچی کہا تھا۔"

"پچھلے دس سال میں ملزم نے تم سے کتنی بار جھگڑا کیا؟"

"میرے ساتھ تو۔۔۔ وہ گزرائے ہوئے انداز میں بولا۔ "اس کا بھی جھگڑا نہیں ہوا۔"

"تم معزز عدالت کو صرف دس ایسے افراد کے نام بتاؤ، پچھلے دس سال میں میرے موکل نے جن سے لڑائی جھگڑا کیا ہو؟" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اب۔۔۔ میں نے۔۔۔ سب کے نام۔۔۔ لکھ کر تو نہیں رکھے ہوئے۔" وہ بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ "کیا اتنا بتا دینا کافی نہیں کہ ملزم ایک پھندے باز آدمی ہے۔"

"عدالت میں صرف بتا دینا کافی نہیں ہوتا خان صاحب!" میں نے غصے سے کہنے لگے۔ "عدالت سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتی بلکہ ہر بات کے لیے غصوں ثبوت مانگتی ہے۔"

وہ امداد طلب نظروں سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"چلو۔۔۔ میں تمہاری مشکل آسان کر دیتا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "تم صرف اتنا بتا دو کہ دو کدو اس سال میں ملزم نے کتنے پھندے کیے ہیں؟"

"جی۔۔۔ مجھے ابھی طرح یاد نہیں!"

"اشتقاق کا نقل آٹھ اکتوبر کی رات کو ہوا تھا۔" میں نے استغاثہ کے گواہ کو گویا ٹیکوں کی دی سے باہر سے ہونے کہا۔ "کیا تم معزز عدالت کو بتاؤ گے کہ اکتوبر کے آٹھ دنوں میں ملزم نے کتنے جھگڑے کیے تھے؟"

وہ بری طرح پھنس کر رہ گیا تھا، جان پھرانے والے انداز میں بولا۔ "جناب! اکتوبر میں تو صرف اشتقاق ہی سے اس کا پھندا ہوا تھا۔"

"جناب عالی!" میں نے روئے سخن بیچ کی جانب موڑتے ہوئے خاصے دنگ لہجے میں کہا۔ "استغاثہ کا گواہ اور نو پار پرنسٹن کا چوکیدار دلاور خان اپنے دعوے کو مکمل

ثبات کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اس نے بڑے اعتماد سے ملزم کو غصے والا اور جھگڑا لورڈا دیا تھا لیکن پچھلے دس سال کا کوئی ایک بھی ایسا واقعہ گواہ کو یاد نہیں جب میرے موکل نے کسی رہائشی سے جھگڑا کیا ہو۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ۔۔۔ میں سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"جھگڑے اور غصے کے حوالے سے میرے موکل پر سراسر الزام لگایا جا رہا ہے۔ میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ استغاثہ کو اس بات کا پابند بنائے کہ وہ آئندہ پیشی پر نو پار پرنسٹن کے پانچ ایسے رہائشیوں کو عدالت میں پیش کرے جو اس بات کی گواہی دیں کہ ملزم ایک جھگڑا لورڈا، غصہ اور پھندے باز آدمی ہے، یہ صورت دیگر۔۔۔ استغاثہ کے اس اقدام کو بدعتی اور بہتان طرازی کے باب میں رقم کیا جائے گا۔"

بیچنے والے وکیل استغاثہ کو میری فرمائش کے حوالے سے چند ہدایات دیں پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"بیک صاحب! پلیز پروسیو۔۔۔"

"دلاور خان!" میں گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ "تم وقوع کے روز ملزم اور مقتول کے بیچ ہونے والے جھگڑے کے بھی چشم دید گواہ ہو۔ تم نے وکیل استغاثہ کو بتایا ہے کہ جب ان دونوں کے درمیان جھگڑا شروع ہوا تو تم ان کے پاس نہیں تھے۔ شوری آواز سن کر تم اوپر پچھلے اور تم نے انہیں پھنسا دیا۔ میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ۔۔۔ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے حاضرین عدالت کی طرف دیکھا پھر گواہ سے پوچھا۔

"جب تم نے ان کے جھگڑے کا شور سنا تو اس وقت تم کہاں تھے اور یہ کہ۔۔۔ ان دونوں کا جھگڑا اوپر کہاں ہو رہا تھا۔ کیا جھگڑا پر۔۔۔؟"

"جناب! میں نے جب ان کے جھگڑے کی آواز سنی تو اس وقت میں پانی والی موڑ کے پاس کھڑا تھا۔" اس نے تھوک نکل کر بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "یہ دونوں جھگڑا پر نہیں بلکہ چوتھے مالے (فلور) پر ایک دوسرے سے قسم کھاتے تھے۔"

"چوتھے مالے پر!" میں نے زیر لب دہرایا پھر پوچھا۔ "چوتھا مالہ۔۔۔ ہلاک اسے یا ہلاک بی؟"

"ہلاک بی۔۔۔"

"ملزم کی رہائش بھی تو اسی مالے پر ہے۔" میں نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ اپنی والدہ کے ساتھ قلیت نہر

لی۔۔۔ میں میں رہتا ہے۔"

"جی ہاں۔۔۔ ان دونوں کا جھگڑا قلیت نہر لی۔۔۔ میں کے سامنے ہی ہوا تھا۔" گواہ نے غصوں لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن مقتول تو ہلاک۔۔۔ اسے کاروائی تھا!" میں نے معنوی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "دو وہاں ملزم کے گھر کے سامنے کیا کرتا پھر رہا تھا؟"

"وہ چھت پر جانے کے لیے ادھر گیا تھا۔"

"کیا چھت پر جانے والا دروازہ ہلاک۔۔۔ لی میں ہے؟"

"دونوں ہلاک کے آخری یعنی چوتھے مالے پر ایک ایک دروازہ چھت پر جانے کے لیے موجود ہے۔" گواہ نے جواب دیا۔ "لیکن ہلاک۔۔۔ اسے والے دروازے کو مستحکم کر دیا گیا ہے۔ اب اس مقدمہ کے لیے صرف ہلاک۔۔۔ لی والا دروازہ استعمال کیا جاتا ہے۔"

"ہلاک۔۔۔ اسے والے دروازے کو مستحکم بند کرنے کا سبب کیا ہے؟"

"وہ دروازہ صدر صاحب کے حکم پر بند کیا گیا ہے۔" گواہ نے جواب دیا۔ "سب آپ انہی سے پوچھیں تو اچھا ہے۔"

"ٹھیک ہے!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میرا جب بھی صدر صاحب سے واسطہ پڑا، میں یہ سوال ضرور ان سے پوچھوں گا۔ تم معزز عدالت کو صرف اتنا بتاؤ کہ۔۔۔ میں نے تھوڑا تو وقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"مقتول جھگڑے والے دن، چھت پر کیا کرنے جا رہا تھا؟"

"وہ چھت پر چنگ اڑانے کا ارادہ رکھتا تھا۔"

"کیا مقتول اس روز ڈیوٹی پر نہیں گیا تھا؟"

"وہ چھت کا دن تھا جناب۔۔۔"

"اوکے!" میں نے سر کو اٹھائی جیش دینے کے بعد پوچھا۔ "کیا اس روز ملزم نے مقتول کو چھت پر جانے سے روک دیا تھا جو ان کے بیچ پھندا ہو گیا۔ کیا چھت کے دروازے کی چابی ملزم کے پاس ہوتی ہے؟"

"چابی تو میرے پاس ہوتی ہے جناب!" اس نے جواب دیا۔ "میں دونوں نام پانی کے والوں کو ملنے اور بند کرنے چھت پر جاتا ہوں تو تھوڑی دیر کے لیے وہ دروازہ کھلا رہتا ہے۔ بس، اسی موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے مقتول چنگ اڑا اور کے ساتھ ادھر پہنچ گیا تھا اور پھر اس کا

ملزم سے جھگڑا ہو گیا۔"

"جھگڑا ہو گیا۔۔۔" میں نے اسی کے الفاظ کو دہراتے ہوئے کہا۔ "لیکن ابھی تک تم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ جھگڑا ہوا کس بات پر تھا؟"

"مقتول نے ملزم کو ایک غلیظ گالی دی تھی۔" گواہ نے بتایا۔ "گالی سن کر ملزم غصے میں آ گیا اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے پر پل پڑے تھے۔"

"مقتول نے کس بات پر ملزم کو گالی دی تھی؟" میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔

"وہ بات دراصل یہ ہے جناب کہ۔۔۔" وہ ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا، ملزم کی ماں ایک چھوٹی سی دکان چلاتی ہے جہاں زیادہ تر بچوں کے آٹمز فروخت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھانے آلو، کھنے چنے اور فرنیچر وغیرہ بھی اس دکان کی اہم چیزیں ہیں جو بچوں اور بڑوں میں یکساں پسند کی جاتی ہیں۔ ملزم کی والدہ عالیہ یہ اشیا اپنے قلیت کے دروازے کے سامنے ہی تیار کر کے دکان پر لے جاتی ہے۔ لہذا اس کا سامان چھت والے دروازے کے آس پاس ادھر ادھر بکھرا رہتا ہے۔ جس سے چھت کی طرف جانے میں خاصی پریشانی ہوتی ہے۔ میں نے عالیہ کو کئی مرتبہ جھانے کی کوشش کی ہے مگر وہ فوراً لڑائی جھگڑے پر آتی ہے۔ صدر صاحب نے بھی ان لوگوں کو سدھانے کی کافی کوشش کی ہے لیکن کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ان کے گھر میں کوئی مرد تو ہے نہیں کہ جسے نیچے ہلا کر کوئی بات کی جائے۔ عالیہ بھی اپنے بیٹے کی طرح غصے کی بہت تیز ہے۔ فوراً لڑائی جھگڑے پر آتی ہے اس لیے زیادہ تر لوگ اس کے منہ گنا پسند نہیں کرتے اور۔۔۔"

"یہ سب ٹھیک ہے دلاور خان!" میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے حریہ دہانے سے روک دیا اور کہا۔ "تم مجھے بتا رہے تھے کہ مقتول نے ملزم کو گالی کیوں دی کی۔؟"

"جی، میں اسی طرف آرہا تھا کہ آپ نے روک دیا۔" وہ براہ سادہ بتاتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے، اب نہیں روکو گے۔" میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "تم بولتے چلے جاؤ۔"

"جب اس روز مقتول کا پاؤں، چھت والے دروازے کے نزدیک رکھے سامان سے الجھا تو اس نے شبثا کر بے ساختہ گالی دی۔" استغاثہ کے گواہ دلاور خان کے بتایا۔ "اس وقت ملزم اپنے دروازے ہی میں کھڑا تھا۔ وہ

ایک کرمتول پر حملہ آور ہوا تو دونوں میں باقاعدہ لڑائی اور مارنے کی شروع ہوئی۔ یہ ہے سارا قصہ جناب.....!"

"مگر تم ان کے شور کی آواز سن کر چوتھے ماٹے پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ آپس میں قائم تھا تھے اور.... ایک دوسرے پر لاتیں اور کتے بھی برسار رہے تھے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تم نے کوشش کر کے انہیں پھرا دیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ ہاں نا؟"

"جی ہاں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ تانیہ کی انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا یہ بھی درست ہے کہ اس پھلے سے میں مبتلا ہو جاؤں؟“
 اچھی خاصی مار کھائی تھی۔ اس کا ہیوٹ چھٹ گیا تھا اور چہرے کی کھال بھی کئی جگہ سے ادھر کی تھی جہاں سے باقاعدہ خون بھی جاری ہو گیا تھا۔ اگر اس سونے پر تم اور دیگر لوگ بیچاؤ نہ کرتے تو ممکن ہے، میں مبتلا ہو جاؤں۔ اس سے بھی زیادہ عقین نقصان پہنچا سکتا تھا؟“
 ”جی..... حالات دو اتھتات سے تو یہی نظر آ رہا تھا۔“
 وہ بڑی سادگی سے ہوا۔

”تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں
تایا ہے کہ..... اس موقع پر ملزم نے مقتول سے بے دریغ
چپنے کے بعد اسے کوئی خطرناک دھمکی بھی دی تھی؟“ میں نے
رجحہ کو سمجھتے ہوئے کہا۔
”پہلے بے تحاشا گالیاں دیں اور اس کے بعد دھمکی
دی تھی.....؟“
”اور تمہارے خیال میں وہ جبری خطرناک دھمکی
تھی؟“

”کیسی۔۔۔“ وہ ایک چھر بھری لپٹے ہوئے بولا۔ ”اس نے بہت
 کچھ الفاظ میں ستول سے کہا تھا۔ اشتیاق! میں تمہیں
 روزوں کا نہیں۔۔۔ بہت جلد تمہیں ہماری نقصان اٹھانا
 سے گا۔“

”او تم سمجھتے ہو، چند روز بعد ظرم نے اس خطرناک
 کی پر عمل کر ڈالا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے
 سے کہا۔ ”تیس۔۔۔؟“

”یہاں۔۔۔ میں یہی سمجھتا ہوں۔“ وہ بہت رसान
 بولا۔

”یہ بات تمہیں وکیل استغاثہ نے سمجھائی ہے یا.....؟
نے اپنی آنکھوں سے کل کی یہ واردات ہوتے دیکھی

مطابق مقتول کی لاش کو سب سے پہلے تم نے دیکھا تھا۔ کیا پولیس کا یہ خیال درست ہے؟

”جی ہاں۔ بالکل درست ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”جب صبح آٹھ بجے میں پانی کھولنے چلتا تھا تو میں نے ٹینکی کے قریب بھیجی پرانی چار پائی پر اشتیاق کی لاش دیکھی تو میں نے شور مچا دیا کہ کسی نے اشتیاق کو قتل کر دیا ہے۔“

”کیا تمہیں دوری سے دیکھ کر یقین ہو گیا تھا کہ وہ اشتیاق ہے؟“ میں نے ٹولنے والی نظر سے گواہ کو دیکھا۔ ”اور یہ کہ۔۔۔ وہ مر چکا ہے۔“

”دور سے تو مجھے یہی نظر آیا تھا کہ کوئی چار پائی پر بڑا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس وقت میں ٹینکی کے والوز کھول چکا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی کہ چار پائی پر کون سو رہا ہے؟ مجھ سے بھیچے چار پائی کے قریب لے گیا اور جیسی مجھے پتا چلا کہ وہ اشتیاق ہے۔ اس کا سر پاش پاش تھا اور سارا لباس خون خون ہو رہا تھا۔“ اس نے ایک جھرجھری لی اور خاموش ہو گیا۔

”جب تم حسب معمول صبح آٹھ بجے پانی کھولنے چلتے ہو تو کیا چھت والا دروازہ لاک تھا؟“ میں نے گواہ سے ایک اہم سوال کیا۔

”جی ہاں! اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔“ میں نے خود تالا کھولا تھا۔

”بلڈنگ کی چھت پر جانے کے لیے صرف بلاک۔ لی والا دروازہ ہی استعمال ہو رہا ہے؟“

”جی ہاں۔“

”بلاک۔ اے والے دروازے کو تو مستقل بند کر دیا گیا ہے؟“

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ ”بلاک۔ اے والے چھت کے دروازے کو کس طرف سے لاک کیا گیا ہے۔ میرا مطلب ہے، دروازے پر تالا لگنے کی طرف لگا گیا ہے یا چھت کی جانب؟“

”چھت کی جانب۔“ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے، اگر بلاک۔ اے کی طرف سے زبردستی کوئی چھت پر جانا چاہے تو اسے تالا نہیں بلکہ دروازہ توڑنا ہوگا۔“

”جی۔۔۔ جی بالکل!“

”کیا قودہ کے روز بلاک۔ اے والے چھت کے دروازے کے ساتھ کسی کوئی کارروائی کی گئی تھی؟“

”نہیں جناب۔“ اس نے ٹیٹی میں جواب دیا۔ ”وہ دروازہ اپنی نیک سلامت تھا بلکہ چھت کی طرف سے اس پر تالا بھی لگا ہوا تھا۔“

”بلاک۔ اے والا چھت کا دروازہ، چھت کی جانب سے لاک تھا!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بلاک۔ لی والے دروازے کا لاک تم نے کھولا تھا یعنی تمہارے چھت پر جانے سے پہلے وہ دروازہ زینے کی طرف سے لاک تھا۔ میں شیک کبہ رہا ہوں؟“

”جی ہاں۔۔۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ اس نے بڑی رمان سے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”قودہ کی صبح سے پہلے آخری بار تم چھت پر کب گئے تھے؟“

”شام میں پانی کھولنے میں چھت پر گیا تھا۔“

”شام میں۔۔۔ مطلب، پانچ بجے؟“

”جی ہاں۔“

”اور تم صرف ایک گھنٹے کے لیے پانی چلاتے ہو۔“ میں نے تصدیقی طلب انداز میں کہا۔ ”ٹھیک چہ بچے تم دوبارہ چھت پر گئے، پانی کے والوز بند کیے، دروازے کو تالا لگا دیا اور نیچے آ گئے، ہیں نا؟“

”جی ہاں۔۔۔ میں نے یہی کیا تھا۔“

”کیا شام کے چہ بچے سے لے کر اگلی صبح کے آٹھ بجے تک جہیں چھت پر جانے کی ضرورت پیش آئی تھی؟“

”جی نہیں۔ میں شام کے بعد پھر صبح ہی چھت پر گیا تھا۔“

”بلڈنگ کے کمینڈ میں سے کسی نے چھت پر جانے کی خواہش ظاہر کی ہو؟“

اس نے ایک مرتبہ پھر ٹیٹی میں جواب دیا۔ ”یعنی کسی نے بھی تم سے چھت کی چابی نہیں مانگی؟“

”کسی نے بھی نہیں!“

”کیا زینے والے دونوں دروازوں (بلاک۔ اے + بلاک۔ بی) کے علاوہ بھی چھت پر جانے کا کوئی راستہ ہے؟“ میں نے جیسے جیسے میں دریافت کیا۔ ”میرا مطلب ہے، آس پاس کی کسی بلڈنگ سے کوئی؟“

”جی نہیں۔“ اس نے دونوں انداز میں جواب دیا۔ ”اس علاقے میں ہماری بلڈنگ سب سے اونچی ہے۔ آس پاس دو اور تین منزلہ عمارتیں ہیں۔“

”سلسلہ بھی میں نے سنے نہیں کیا!“ میں نے سرسری

بلڈنگ کی چھت پر آنا ممکن نہیں۔“

”آس پاس سے کوئی چھت پر پہنچنا ممکن نہیں۔“ میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ”اور چھت تک رسائی حاصل کرنے والے بلڈنگ کے دونوں دروازے بھی لاک تھے پھر۔۔۔“ میں نے گواہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ”پھر قاتل اور مقتول رات کو دو اور تین بجے کے درمیان چھت پر کیسے پہنچے؟“

”م۔۔۔ مجھے کچھ پتا نہیں!“ وہ خوف زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”تم یہ تو مانتے ہو۔ قاتل اور مقتول چھت پر گئے تھے؟“ میں نے استفسار کیا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ ”مجھے اور کچھ نہیں پتا چلتا جناب عالی!“ میں نے یہ کہتے ہوئے جرح ختم کر دی۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے میں روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت پر رخصت کر دی۔

آئندہ پیشی سے قبل میں نے اپنے موکل کی والدہ عالیہ سے ایک بھر پور ملاقات کی اور اس کے ذمے چند اہم اور ضروری کام لگا دیے۔ وہ پبلک ڈیپنگ کی عورت تھی۔ اپنے لوگوں کی معلومات اور معلومات حاصل کرنے کے ذرائع بڑے زبردست ہوتے ہیں۔ میں اسٹاف کے گواہوں کی فہرست کا تفصیلی جائزہ لے چکا تھا لہذا اس فہرست میں شامل چند کرداروں کے بارے میں بعض خاص قسم کی معلومات حاصل کرنے کے لیے میں نے عالیہ کی ڈیوٹی لگا دی۔

اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، وکیل صاحب! یہ کام میرے لیے مشکل نہیں۔ میں آپ کی مطلوبہ معلومات اکٹھی کر کے آپ تک پہنچا دوں گی۔“

”لیکن اگلی پیشی سے پہلے۔۔۔!“

”جی۔۔۔ میں سمجھ رہی ہوں۔“

”اور میں آپ کو بھی گواہی کے لیے عدالت میں بلا سکتا ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کے لیے ذہنی طور پر تیار رہے گا۔“

”آپ مجھے ہر وقت تیار پائیں گے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”لیکن یہ تو بتادیں کہ وہ گواہی کس سلسلے میں ہوگی؟“

”سلسلہ بھی میں نے سنے نہیں کیا!“ میں نے سرسری

انداز میں کہا۔ ”لیکن عدالت میں پیش کرنے سے پہلے میں اس گواہی کے سلسلے میں آپ کو بریف کر دوں گا اور ایک حوالے سے آپ اطمینان رکھیں کہ میں کسی بھی مرحلے پر آپ کو غلط بیانی کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔“

”اس بات کا مجھے اچھی طرح اندازہ ہے۔“ وہ بڑے فخر سے بولی۔ ”میں آپ پر بھروسہ کرتی ہوں بیگ صاحب! دن بھر درجنوں لوگوں سے میرا واسطہ پڑتا ہے۔ انسان کی اتنی بیچان ہے مجھے۔؟“ وہ سانس بھرا کرتے کے لیے متوقف ہوئی پھر لی آئیز لہجے میں کہا۔

”آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔“

اس نے کہا اور۔۔۔ میں بے فکر ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

آئندہ پیشی پر عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو میں نے بڑے ٹھنڈے انداز میں جج سے درخواست کی۔

”جناب عالی! اس سے پہلے کہ اسٹاف کا گواہ پیش ہو، میں اس کیس کے تقاضی انصر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔“

جیسا کہ آپ جانتے ہیں، کسی بھی کیس کا انکوائری آفیسر (آئی۔ او) اسٹاف کے ایک گواہ کی حیثیت کا حامل ہوتا ہے اور یہ اس کی ڈیوٹی کا حصہ ہوتا ہے کہ وہ ہر پیشی پر عدالت کے کمرے میں موجود رہے۔ جج نے میری معصومی فرمائش پوری کرنے میں کسی پس و پیش سے کام نہیں لیا۔

اگلے ہی لمحے آئی او راؤ اجازت پیش پاس میں کھڑا تھا۔ میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد گواہوں والے کنبہ کے پاس پہنچا پھر انکوائری آفیسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

”راؤ صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟“

”پولیس روزنامے کے مطابق، اس واقعے کی اطلاع آٹھ اکتوبر کی صبح نو بجے بذریعہ فون دی گئی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور یوں بلڈنگ کے صدر صاحب نے کیا تھا۔“

”آپ جانے قودہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟“

”ٹھیک ساڑھے نو بجے۔“

”جب آپ قودہ پر پہنچے تو وہاں کون کون موجود تھا؟“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میرا مطلب ہے، بلڈنگ کی چھت پر۔؟“

”بلڈنگ کی چھت والا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔“ آئی

اوسے بتایا "اس لیے وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔"
 "چھت کا دروازہ کیوں اور کس نے بند کر دیا تھا؟"
 "صدر صاحب نے۔" اس نے جواب دیا۔
 "اس کی کوئی خاص وجہ؟"

"صدر صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ مقتول اشتیاق کی لاش بلڈنگ کے چوکیدار دلاور خان نے دریافت کی تھی۔" میرے سوال کے جواب میں گفتیشی افسر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "وہ لاش کو دیکھ کر سیدھا صدر صاحب کے فلیٹ پر پہنچا اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ صدر صاحب کا فلیٹ بلاک۔ بی کے حجرہ فلوپر واقع ہے۔ بی۔ سولہ طرزم کے فلیٹ کے بالکل نیچے۔" وہ لمبے بھر کو سانس لینے کے لیے تھما پھر اپنی وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"صدر صاحب کو سوتے میں سے جگایا گیا تھا۔ وہ آنکھیں ملے ہوئے چوکیدار کے ساتھ چھت پر پہنچے اور اپنی آنکھوں سے اشتیاق کی لاش کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد ہی انہوں نے اپنے گھر کے فون سے کال کر کے قحانے میں اس واقعے کی اطلاع دی تھی اور چھت کا دروازہ انہوں نے اس لیے بند کر دیا تھا کہ واقعی شہادتیں اور دوسرے ثبوت جوں کے توں رہیں تاکہ پولیس کو اپنے کام میں کسی دشواری کا سامنا نہ ہو۔"

"نور اپارٹمنٹس کے صدر صاحب تو خاصے کچھ دار معقول ہوتے ہیں۔" میں نے غمگینہ سے لہجے میں کہا۔ "اس صورت حال میں چھت کا دروازہ بند کر دینا ایک محض مندانہ فیصلہ تھا کیونکہ ایسے مواقع پر لوگ جاتے وادوات کی طرف دوڑ لگا دیتے ہیں اور بہت سے اہم سرائفوں کا خانہ خراب ہو کر رہ جاتا ہے۔"

"جی ہاں۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔
 "میں نے پوچھا۔" راؤ صاحب! آپ نے جانے تو وہ پر پتھ کر مقتول کی لاش کا جائزہ لیا تو آپ کے ذہن میں کیا تاثر قائم ہوا تھا۔" میرا مطلب ہے، پہلا تاثر؟"
 میں رفتہ رفتہ بڑے غیر محسوس انداز میں آئی او صاحب کو اپنے دام میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے میرے سوال کا جواب کچھ اس طرح دیا۔

"پہلا تاثر تو یہی قائم ہوا تھا کہ وہ اب زندہ لوگوں میں شامل نہیں۔ اس کی موت واضح ہو چکی ہے۔ بعد ازاں پتا چلا کہ وزنی ہتھوڑے کی ایک کاری ضرب نے اس کی کھوپڑی کا کھومر ٹالنے کے بعد اسے موت کی نیند سلا دیا ہے۔"

"بعد ازاں؟" میں نے سوالیہ لہجے سے اس کی

طرف دیکھا۔ "کب؟"

"آلے قتل کی دریافت کے بعد۔" اس نے جواب دیا۔ "ہتھوڑے پر گئے ہوئے خون سے یہ بات مکمل کی کہ قاتل نے اسی کی مدد سے مقتول کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔"

"کیا آلے قتل یعنی وہ وزنی ہتھوڑا آپ کو بلڈنگ کی چھت پر سے مل گیا تھا؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "آلے قتل کی تلاش کے لیے میں بہت سے پاز پینٹے پڑے تھے۔"

"آلے قتل آپ کو کہاں سے ملا تھا؟" میں نے گہری تنقید کی سے پوچھا۔

"ڈکٹ میں سے۔" اس نے جواب دیا۔

دونوں بلاکس کے درمیان، ہوا کی آزادانہ آمد و رفت کے لیے ایک ڈکٹ چھوڑ دیا گیا تھا جس کے ساتھ، وہاں کے چند کمین بہت غیر انسانی سلوک کرتے تھے۔ اس سے تازہ ہوا تو لے لیتے تھے اور اس کے بدلے میں گھر کا کچرا وہاں پھینک دیا کرتے تھے۔

میں نے آئی او سے پوچھا۔ "آپ نے میرے سوال کو کس بنا پر کرتی رہی تھا؟"

"موقع پر موجود گواہوں کے بیانات اس کے خلاف جاتے تھے۔" اس نے جواب دیا۔ "وقوع سے چند روز پہلے مقتول اور طرزم میں شہید نویت کا بھگڑا ہوا تھا۔ اس واقعے کی گواہی چوکیدار اور صدر سمیت بلڈنگ کے اور بھی کئی رہائشیوں نے دی ہے۔ اس پتھڑے میں طرزم نے مقتول سے بٹنے کے بعد بڑے واضح الفاظ میں اسے خطرناک مارتی کی دھمکی دی تھی۔ طرزم نے بڑے کھلے ڈالے الفاظ میں کہا تھا کہ وہ مقتول کو چھوڑے گا نہیں۔" لگائی توقف کے بعد اس نے اپنی بات کی مضبوطی کے لیے اس طرح اضافہ کیا۔

"مقتول کے ایک قریبی دوست جمشید نے پولیس کو بیان دیا ہے کہ مقتول اپنی موت سے پہلے بہت خوف زدہ تھا اور اس نے جمشید کو بتایا تھا کہ وہ طرزم کی طرف سے پریشان ہے۔ اسے ایسا لگتا ہے کہ طرزم کسی بھی وقت اس پر کوئی اور چھوڑ کر دے گا۔ اور پھر مقتول کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔"

"ہوں۔" اس نے پرمختی انداز میں گردن ہلائی اور آئی او سے سوال کیا "کیا مقتول کے اس دوست جمشید کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل ہے؟"

"جی ہاں۔" شامل ہے۔" اس نے اثبات میں

جواب دیا۔

"راؤ صاحب! میں نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔" آلے قتل دریافت ہو جانے کے بعد آپ نے ایف بی میچنگ تو یقیناً کی ہوگی۔" میرا مطلب ہے، فکر پرش۔

"میں ایف بی میچنگ کا مطلب اچھی طرح سمجھتا ہوں وکیل صاحب! وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

"بہت خوش کی بات ہے! میں نے سرسری انداز میں کہا، پھر پوچھا۔ "آلے قتل کے دستے پر آپ کو طرزم کے فکر پرش قبول کئے ہوں گے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟" میں نے چیختے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"وہ بات دراصل یہ ہے جناب کہ۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے وہ ہتھوڑا ڈکٹ کے اندر سے ڈھونڈ کر نکالا ہے۔ اس کے ایک ایک حصے پر پتھر اور دوسری آلات گئی ہوئی تھیں۔ یوں سمجھیں کہ وہ غارت میں تھخڑا ہوا تھا لہذا اس کے کوسے یا دستے پر سے فکر پرش اٹھانا ناممکنات میں سے تھا، ایف بی میچنگ تو اس کے بعد کا مرحلہ ہے۔"

"اوکے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "آئی او صاحب! آپ میری ایک بات سے تو یقیناً اتفاق کریں گے؟"

"کون سی بات جناب؟" اس نے سوالیہ لہجے سے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔ "جس وقت وقوع پیش آیا، قاتل اور مقتول دونوں بلڈنگ کی چھت پر موجود تھے؟"

"جی ہاں، اس میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔" وہ بڑے وثوق سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "جی تو وہ واقعہ پیش آیا تھا۔"

"آپ کو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے اس حصے پر کوئی اعتراض تو نہیں کہ وقوع کی رات مقتول اشتیاق کی موت دواور تنہا بچے کے درمیان واقع ہوئی تھی؟"

"بالکل، کوئی اعتراض نہیں جناب!"

"کیا آپ مجھے اور معزز عدالت کو سمجھائیں گے کہ رات کے دو تین بجے مقتول بلڈنگ کی چھت پر کیا کر رہا تھا؟"

"وہ کسی بھی کام کے لیے چھت پر جا سکتا ہے۔" وہ گڑبڑاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "مثلاً چھل قدمی

کے لیے۔" ہوا خوری کے لیے۔"

"اور طرزم۔"

"طرزم یقیناً مقتول کی تاک میں ہوگا۔" وہ احتیالی ہ معقول وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اسے اپنا کام کرنے کے لیے یہ موقع مناسب لگا اور وہ بھی چپکے سے چھت پر پہنچ گیا اور پھر اس نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

"بہت خوب آئی او صاحب! میں نے استہزاانہ انداز میں کہا۔ "آپ نے تو چنگی بجاتے میں کیس مل کر دیا۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ ابھمن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اپنے مطلب کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے، آپ نے چوکیدار اور صدر صاحب کا بیان دھیان سے نہیں لیا۔ بلڈنگ کی چھت پر پہنچنے کے لیے بلاک بی کے زینے والے دروازے سے گزرنا ضروری ہے جو کہ بند رہتا ہے۔ بند کا مطلب یہ ہے کہ اس پر تالا لگا رہتا ہے جس کی ایک چابی چوکیدار کے پاس اور دوسری صدر صاحب کے پاس ہوتی ہے۔ چوکیدار جوشام ایک ایک گھنٹے کے لیے دروازہ کھولتا ہے اور وہ بھی پانی چلانے کے لیے۔ اس کے علاوہ وہ دروازہ مستقل لاک رہتا ہے۔" میں نے لگائی توقف کے بعد ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

"چوکیدار دلاور خان نے معزز عدالت کے روبرو بتایا ہے کہ وقوع سے پہلے والی شام اس نے ٹھیک چھ بجے وہ دروازہ لاک کر دیا تھا، پھر اگلی صبح آٹھ بجے اسی نے دروازہ کھولا اور چھت پر گیا۔ اسی موقع پر مقتول کی لاش دریافت ہوئی تھی۔ جب پوری رات وہ دروازہ بند رہا تو پھر قاتل اور مقتول کیسے چھت پر پہنچ گئے جبکہ چھت تک رسائی کا واحد ذریعہ یہی دروازہ ہے؟"

"ایسا نہیں ہے وکیل صاحب کہ میں نے چوکیدار یا صدر صاحب کا بیان دھیان سے نہ لیا ہو۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور ڈال کر بولا۔ "چوکیدار کی وضاحت تو عدالت کے سامنے آئی چکی ہے۔ جب صدر صاحب بیان دینے آئیں گے تو وہی کسی وضاحت وہ بھی کری دیں گے۔ میں آپ کی تسلی اور معلومات کے لیے یہاں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ صدر صاحب کے مطابق یہ بین ممکن ہے کہ طرزم نے چھت والے تالے کی ایک چابی بنوائی ہو۔ اکثر چوکیدار جب پانی کھولنے چھت پر جاتا ہے تو کھلے ہوئے تالے کو دروازے کی کٹڑی ہی میں لگا چھوڑ دیتا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طرزم نے تالے کی ایک چابی بنوائی ہوگی۔"

”میں آپ کی بات کو درست تسلیم کر لیتا ہوں کہ بالکل ویسا ہی ہوا ہوگا جیسا آپ نے ابھی بیان کیا ہے۔“ میں نے غصہ سے ہونے لگے میں کہا۔ ”اب آپ بھی میری ایک بات مانیں تو بڑی نوازش ہوگی۔“

”کون سی بات؟“ اس نے استفسار کیا۔

میں نے بہت ٹھنڈے انداز میں اس کے استفسار کی بھدراڑا تے ہوئے کہا۔ ”ڈپٹی کیٹ چاہی ہاتھ میں آتے ہی ملزم خوشی سے پاگل ہو گیا ہوگا۔ اس نے ہلڈنگ کے اندر اور چھت پر جا کر خوب بھگڑے ڈالے ہوں گے۔ اس کے بعد وہ محتول کو دعوت نامہ دینے گیا ہوگا، اس بات کا کہ وہ آٹھ اکتوبر کی رات دو اور تین بجے کے درمیان چپ چاپ چھت پر آجائے۔ اس نے اس کی دردناک موت کا بڑا پکا بندہ درست کیا ہے۔ اس دعوت نامے پر محتول بلا چوں و چرا کشان کشان چھت پر پہنچ گیا اور اپنے میزبان کی بولت کا احساس کرتے ہوئے وہ اس کی جانب سے پیٹھ پھیر کر بیٹھ گیا تاکہ اسے سمجھوڑے گاوار کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہو اور۔۔۔۔۔“

”آج بلیکس یو آر آ“ وکیل استفسار کے ممبر کا چہانہ چمک اٹھا۔ ”میرے فاضل دوست یہ کس قسم کی فضول باتیں کر رہے ہیں۔ کبھی کوئی قتل کی واردات اس طرح بھی ہوا کرتی ہے۔“

”بہت بہت شکر یہ میرے دوست!“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ کم از کم آپ نے عدالت کے کمرے میں اپنی موجودگی کا احساس تو دلایا ورنہ میں تو بھگہ رہا تھا کہ شاید آپ میڈیکل یو آر پر ہیں۔“

”میڈیکل یو“ کے الفاظ نے رشتوں پر نمک اور ملتی پر تیل کا کام دکھایا تھا۔ وہ مجھے ناپسندیدہ نظر سے دیکھنے کے بعد جج سے منس ہوا۔

”جناب عالی! اچھے پھر وہ جیسی منٹ سے وکیل صفائی بڑی بے دردی سے معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ ایک ہی جیسے سوالات کو تھما پھرا کر پوچھنے کا فائدہ کیا ہے اور آخر میں تو انہوں نے کسی جاسوسی ناول کا اقتباس پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ میری معزز عدالت سے بس اتنی سی درخواست ہے کہ وکیل موصوف کو اس قسم کے اھنڈوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔“

جج نے وکیل استفسار کے خاموش ہوتے ہی سارا المبا میرے کندھوں پر ڈال دیا۔ مطلب یہ کہ وکیل استفسار کے اعتراضات کے جوابات مجھ ہی کو دینا ہوں گے۔ اس نے ٹینگ کے اوپر سے مجھے دیکھا اور غصہ سے ہونے انداز میں

مختصر ہوا۔

”ایک صاحب! آپ کیا کہیں گے؟“

میں نے ٹھکانہ کر گھا صاف کیا اور وکیل استفسار کی آنکھوں میں نظر گاڑ کر کہا شروع کیا۔ ”میرے فاضل دوست! پہلی بات تو یہ کہ میں نے آئی او کو جوابات ماننے کے لیے کہا ہے وہ فضول بکواس ہے اور نہ ہی معزز عدالت کے قیمتی وقت کا زیاں ہو رہا ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں نے ایک ہی نوعیت کے سوالات کو۔۔۔ گھما پھرا کر پوچھا ہے اور نہ ہی کسی جاسوسی ناول کا اقتباس پڑھ کر سنایا ہے۔ یہ دراصل وہ نتائج ہیں جو میں نے آئی او کے متعدد جوابات سے افذ کیے ہیں۔ کوئی بھی ہوش مند آدمی اگر آئی او کی توجہات کا لحاظ سے دماغ سے چاکرہ لے گا تو وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا جہاں میں پہنچا ہوں لیکن میرے فاضل دوست۔۔۔ میں نے بڑے ڈرامائی انداز میں رک کر حاضرین عدالت پر ایک سنجیدہ نگاہ ڈالی پھر دوبارہ وکیل استفسار کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

”میرے فاضل دوست! آپ کو میرے کسی بھی تجربے پر اعتراض کا حق حاصل ہے لیکن اس صورت میں آپ پر لازم ہوگا کہ میرے ایک سادہ سے سوال کا سادہ سا جواب دیں۔“

وہ ابھن بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”مثلاً کون سا سوال؟“

”محتول وقوعہ کی رات چھت پر کیا لینے گیا تھا؟“

”مم۔۔۔۔۔ مجھے کیا پتا۔۔۔؟“ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

”کیا پتا کر کے بتا سکتے ہیں؟“

”کس سے؟“

”کسی سے بھی۔۔۔۔۔ آپ تو ماشاء اللہ! وکیل استفسار ہیں!“

”اگر محتول اس وقت زندہ ہوتا تو میں ضرور اس سے پوچھتا۔۔۔!“

”کوئی اور ذریعہ۔۔۔؟“

”مجھے رجوں سے رابطے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔“ وہ براساتہ بناتے ہوئے بولا۔

”خوشبو کے ذریعے۔۔۔؟“ میں نے مخصوص پر اسرار جرج چاری رہی۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ کس کی خوشبو؟“

”بیادری خوشبو“ میں نے بھیر انداز میں انکشاف کیا۔

وہ بیادری سے بولا۔ ”پتا نہیں، آپ کہاں کہاں کی

اڑا رہے ہیں۔“

میں نے وکیل استفسار کو نظر انداز کرتے ہوئے انگوٹری افسر کی جانب دیکھا اور خامسے تو اتانے کے میں سوال کیا۔

”راؤ صاحب! آپ کا دھیان ابھی اس خوشبو کی طرف نہیں تھا۔۔۔۔۔ آپ نے ایک لمبے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا کہ یہ خوشبو کون کی چکر بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً محتول کسی لڑکی سے ملے، کسی بھی طرح چھت پر پہنچ گیا ہو اور قاتل نے اس سونے کا قندہ اٹھاتے ہوئے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ واقعی! ایسا ہو تو سکتا ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن پھر وہی سوال کہ چھت کی طرف جانے والا دروازہ تو لاک۔۔۔۔۔“

”تو کوئی اور ذریعہ فرض کر لیتے ہیں۔“ میں نے آئی او کی بات مکمل نہیں ہونے دی اور حسرتانہ انداز میں کہا۔ ”محبت میں تو بہت طاقت ہوتی ہے۔ ہم محتول اشتیاق اور اس کی محبوبہ کو ہوا میں پرواز کراتے ہوئے چھت پر پہنچا دیتے ہیں۔“

”مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!“ میرے انداز پر وکیل استفسار بری طرح ہلکا اٹھا۔ ”وکیل صفائی نے ایک مرتبہ پھر معزز عدالت کے قیمتی وقت کے ساتھ مذاق شروع کر دیا ہے۔“

اس مرتبہ جج نے وکیل استفسار کے اعتراض کو ذرا بھی اہمیت نہ دی۔ اس سے، میری باتوں میں جج کی دلچسپی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اس نے وکیل استفسار کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

”ایک صاحب! آپ نے بیادری والے جوابات دیا تھا ہے، اس کا پس منظر کیا ہے؟“

”جناب عالی!“ میں نے غصہ سے ہونے لگے میں بتانا شروع کیا۔ ”میری اب تک کی تحقیق کے مطابق، محتول خاسا عاشقانہ مزاج واقع ہوا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی محبوبہ سے ملنے وقوعہ کی رات ہلڈنگ کی چھت پر پہنچا تھا کہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔“

”جب چھت والا دروازہ شام چھ بجے سے اگلی صبح آٹھ بجے تک لاک رہا تھا تو پھر محتول اور اس کی محبوبہ رات کو دو اور تین بجے کے درمیان چھت پر کیسے پہنچ سکتے ہیں؟“ وکیل استفسار نے اپنی شینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

میں اس وقت براہ راست جج سے مخاطب تھا لہذا وکیل استفسار کا استفسار مجھے سخت ناگوار گزرا۔ میں نے خامسے درشت لہجے میں اسے جواب دیا۔

”میرے فاضل دوست! آپ تو یہ سوال پوچھنے کا حق

کیا آپ

لیوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لیوب مقوی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لیوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لیوب مقوی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی وی پی منگوا لیں فون نمبر 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دار الحکمت (رجسٹری)
(دیکھی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لیوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

اس کے بعد عدالت کا خصوصی وقت ختم ہو گیا۔
جج نے آئندہ پیشگی تاریخ دے کر عدالت برخواست
کرنے کا اعلان کر دیا۔

”دی کورٹ آف ایڈجسٹمنٹ“

میں نے مقول کے حقیقی معاملات کی جو بات پھیری
تھی، وہ ہوا میں قلعہ تعمیر کرنے کا قصہ نہیں تھا بلکہ میں اس
حوالے سے مکمل حقیقت کو چکا تھا۔ ابتدائی معلومات مجھے علوم کی
ماں عالیہ نے فراہم کی تھیں۔ اس کے بعد میں نے دوسرے
دعوت کر کے اپنے مطلب کا مواد جمع کر لیا تھا جو عدالت کے
کمرے میں، میں اپنے سوئچ کی حمایت میں استعمال کرتے
جارہا تھا۔ ان سستی خیز اعترافات کے لیے آپ کو بھی جج کی
طرح تھوڑا صبر کرنا ہوگا۔ ویسے ایک بات کا میں تدبیر سے
اعتراف کرتا ہوں کہ اگر عالیہ مجھ سے تعاون نہ کرتی تو
میرے لیے اچھی خاصی مشکلات کمزری ہو سکتی تھیں۔

☆☆☆

عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ استغاثہ کی
جانب سے اس پیشی پر مقول کے بڑے بھائی اشفاق کو کوٹوالی
کے لیے پیش کیا گیا۔ اشفاق کی عمر پینتیس برس رہی ہوگی۔ وہ
عام سی شکل و صورت کا بالکل ایک معمول انسان تھا۔ اس
وقت وہ سیاح چلون اور دھاری دار شہر میں ٹھہرا تھا۔
اشفاق نے جج بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنا مختصر سا
بیان ریکارڈ کر دیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لیے
دش بائس کے قریب چلا گیا۔ اس جرح میں کوئی اہم بات
زیر بحث آئی اور نہ ہی کوئی چٹکا دینے والا پوائنٹ ابھر کر
سامنے آیا۔

میں نے اپنی باری پر، ذرا مختلف انداز میں جرح کا
آغاز کیا۔ میرا اسٹائل اور سوالات کا زاویہ کچھ اس قسم کا تھا
کہ گواہ کو محسوس ہی نہ ہو کہ وہ کسی ٹرائل سے گزر رہا ہے۔
انتہائی دوستانہ انداز میں، میں نے اس سے کہا۔

”اشفاق صاحب! مجھے آپ کے بھائی کی ناکہانی
موت کا سخت افسوس ہے اور اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی
دکھ ہے کہ آپ کو میرے سوالات کا سامنا کرنے کے لیے
کنہرے میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ بہر حال، یہ ایک جمہوری
ہے کہ آپ کو اس مرحلے سے تو گزرنا ہی ہوگا۔“

”کوئی بات نہیں وکیل صاحب!“ وہ سرسری سے لہجے
میں بولا۔ ”جب اوٹھلی میں سروے دیا ہے تو پھر محسوسوں سے
کیا ڈراما میں ٹرائل کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا ہوں۔“

”نگ۔ کیا مطلب؟“ میری بات مکمل
ہونے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ سوال تو میں
نے اس کیس کے انکوائری آفیسر سے پوچھا تھا اور اس نے
جواب میں بتایا تھا کہ میں ممکن ہے، ظلم نے جیت والی جالی
کی لپٹی کیٹ بنال ہو۔ یہی خیالات آئی او کے مقول کے
بارے میں بھی تھے۔ بات یہ ہوا کہ استغاثہ، مقول اور قاتل
کی جیت تک رسائی کے حوالے سے ٹھیکر ہے۔“

وکیل استغاثہ الجھ کر وہ گیا کہ میری وضاحت کے
جواب میں وہ کون سا نیا اعتراض اٹھائے؟ میں نے اس کے
تکذیب سے قانع نہ اٹھاتے ہوئے روئے سخن جج کی جانب
موز اور گہری سنجیدگی سے کہا۔

”پورا آڑا آئی ایم شیور۔ وقوعہ کی رات دو اور تین
بچے کے درمیان قاتل اور مقول جانے وقوعہ یعنی پلٹنگ کی
جیت پر موجود تھے جیسا یہ سائبر رونا ہوا البتہ۔“ میں نے
لحائی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا بات یہ ہے کہ وہ جیت پر کس طرح پہنچے؟
اور مجھے یقین ہے کہ میں آنے والی ایک دو تہائیوں کے
درمیان یہ معاملہ طے کر کے محسوس ثبوت اور دلائل کے ساتھ
عدالت کے سامنے پیش کروں گا۔“

”اس کا مطلب ہے بیک صاحب!“ جج نے خصوصی
دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ”آپ کو معلوم
ہے کہ مقول کا مشاعرہ کس کے ساتھ چل رہا تھا۔“
”وینٹیلیٹیو ر آؤ“ میں نے پراگماتہ انداز میں
جواب دیا۔

”کیا آپ مقول کی محبوبہ کا نام معزز عدالت کے
سامنے لائیں گے؟“

”ابھی نہیں، جناب عالی!“ میں نے معذرت خواہانہ
انداز میں کہا۔

جج نے پوچھا۔ ”پھر کب؟“
”استغاثہ کے گواہوں کے بیانات مکمل ہو جائیں۔“
پھر۔

”اس تاخیر کا کوئی خاص سبب ہے؟“

”جی سرائے!“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا
”مقول کی محبوبہ کا نام مکمل جانے سے استغاثہ کے گواہوں کی
شہادتیں متاثر ہو سکتی ہیں۔“

”اُس اوکے۔“ جج نے مطمئن انداز میں سر ہلا

آپ بلڈ نہیں کہہ رہے۔“

میں نے اس کے مزید قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں
ایک عام سا انسان یعنی خطا کا پتلا ہوں لہذا مجھ سے غلطی ہو سکتی
ہے چنانچہ آپ پر ایک فرض عائد ہوتا ہے۔“

”کیسا فرض؟“ اس نے حیرت بھرے لہجے میں
پوچھا۔

”یہ فرض کہ۔“ میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے
ہوئے کہا۔ ”میں جیسے ہی کوئی لفظ بات کہوں، آپ مجھے فوراً
ٹوک دیجیے گا۔ اوکے؟“

اس نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی اور کہا
”اوکے!“

میں تھوڑی سی محنت کے بعد استغاثہ کے گواہ یعنی
مقول کے بڑے بھائی کو ایسے ٹرائل میں لے آیا تھا کہ وہ
مجھے وکیل ستانی نہیں بلکہ کوئی کنسلٹنٹ، کوئی اسپرٹیکل ایٹر
(Spiritual Healer) سمجھنے لگا تھا۔ یہ صورت حال
وکیل استغاثہ کے لیے گہرے گمراہ تھی۔ اس سے قبل کہ وہ کسی
قسم کی مداخلت کا پروگرام بناتا، میں نے دش بائس میں
کنہرے استغاثہ کے گواہ کو حلف کیا۔

”اشفاق صاحب! میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنا تو
بہت دور کی بات ہے، جب آپ کے مقول بھائی نے یہ
مشکل میزک کرنے کے بعد ہاتھ کھڑے کر دیے تو آپ کو
ذہنی مدد سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ پڑا تھا یا نہیں؟“

”جی ہاں۔“ اشفاق کے، پڑ جانے چھوڑنے کا مجھے
دل دکھ ہوا تھا۔

”آپ نے اس کی حوصلہ افزائی کی بہت کوشش کی۔“
میں نے اس کے سے ہوئے زخموں کو کھولنا شروع کیا۔ ”لیکن
وہ کسی بھی مرحلے پر آپ کی دل جوئی کو تیار نہ ہوا اور واضح
الفاظ میں یہ اعلان کر دیا کہ وہ اب آگے نہیں پڑے گا۔“
”جی ہاں۔“ وہ نیچے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اشفاق
کے اس فیصلے سے مجھے بہت مایوسی ہوئی تھی۔“

”پھر یہ مایوسی رفتہ رفتہ اذیت میں بدلنے لگی۔“ میں
نے اس کے کٹے ہوئے زخموں کو آئینی سپیکٹک لوشن سے صاف
کرنا شروع کیا۔ ”مقول نے تعلیم کو تو خیر یاد کر ہی دیا تھا۔
اس کے ساتھ ہی وہ آوارہ گردی میں بھی پڑ گیا۔ جی ہاں؟“

حاضرین عدالت سمیت وکیل استغاثہ، انکوائری
آفیسر اور جج بھی بڑی توجہ اور دلچسپی سے اس عجیب و غریب
عدالتی کارروائی کو دیکھ اور سن رہے تھے۔ میں نے عالیہ کی
فراہم کردہ اور اپنی جمع شدہ معلومات کو یکجا کر کے استغاثہ

کے گواہ اشتقاق پر آزمانے کا "مئل" جاری رکھا۔

"ہاں.....!" گواہ نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ "وہ چھوٹی موٹی نوکریاں بھی کرتا رہا اور اس کے ساتھ ہی آوارہ گردی بھی جاری رکھی۔"

"نوکری کا عرصہ انتہائی قلیل ہوتا تھا۔" میں نے لقمہ دینے والے انداز میں کہا۔ "جبکہ آوارہ گردی کا مشن طوالت پکڑ لیتا تھا۔ مقتول کے انہی رویوں نے آپ کی اذیت کو ذہنی عذاب میں بدل دیا تھا۔؟"

اس نے ایک مرجہ پھر سر کو اثباتی جنبش دی۔

میں نے کبھی جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بالآخر آپ نے اسے نازوں کی ایک دکان پر ملازم رکھا دیا۔ اپنی موت کے وقت تک وہ ملازوالی اسی دکان پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔ ایک بہت ہی اہم واقعہ مذکورہ نازوں کی اس دکان پر مقتول کی ملازمت کا سبب بن گیا تھا اور وہ آسانی سے آوارہ گردی کو خیر باد کہنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔"

میں نے بھائی کو وقف کر کے سوالیہ نظر سے گواہ کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ تاہم اس نے زبان کو زحمت دینے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے ہی بہت دکھائی اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"آپ کے بھائی نے حرکت ہی ایسی کر دی تھی کہ آپ کو اپنی بلڈنگ کے کمینوں کے سامنے خاصی شرمندگی اٹھانا پڑی تھی۔ خصوصاً رفیق بھائی کے سامنے۔ اس انہوں تک واقف کے بعد ہی مقتول اس بات کے لیے راضی ہوا تھا کہ اب وہ تک کر کام کرے گا۔!"

"جی....." وہ تھوک لگتے ہوئے بولا۔ "جی ہاں!"

"کیا میں رفیق بھائی والے معاملے کی تفصیل میں جاسکتا ہوں؟"

"ہاں..... آں....." وہ چٹکچٹا ہتھ بھرے انداز میں بولا۔ "جی ہاں....."

وکیل صفائی، استفسار کے کسی گواہ کا نازل کرنے کے لیے اس سے اجازت طلب کرنے کا حق نہیں ہوتا لیکن میرا یہ رویہ ایک خاص مقصد کے حصول کے لیے تھا جو کہ اب سامنے آنے ہی والا تھا۔

"آپ نے مجھے رفیق بھائی کے معاملے میں بولنے کا اختیار تو دے دیا ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن وہ باتیں اچھی طرح اپنے ذہن میں بخالیں۔"

"تک..... کون سی دو باتیں.....؟" وہ حذبذب

انداز میں مستغرق ہوا۔

میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "نمبر ایک..... آپ سچ بولنے کا حلف اٹھا چکے ہیں لہذا کوئی بھی غلط بیانی آپ کو کسی مصیبت میں ڈال سکتی ہے جبکہ آپ پہلے ہی کچھ کم عذاب میں مبتلا نہیں ہیں۔" میں نے ڈرامائی انداز میں بھائی کو وقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"نمبر دو..... میری گفتگو آگنی سے تفصیلی بات ہو چکی ہے جو کہ آپ ہی کے ہلاک میں، قلیت نمبر اسے۔ فور میں رہتی ہیں۔ اگر اس سلسلے میں مجھے محسوس ہوا کہ آپ کسی نوعیت کی دروغ گوئی سے کام لے رہے ہیں تو میں صفائی کے گواہ کے طور پر گفتگو آگنی کو آپ کے کسی بھی جواب کی تصدیق یا تردید کے لیے عدالت میں پیش کروں گا۔"

وہ بے حد مشکل اور الجھن میں نظر آ رہا تھا تاہم جی کڑا کر کے اس نے کہہ ہی دیا۔ "جی ہاں..... کیوں نہیں..... مجھے مشکور ہے..... آپ سوال کریں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا یہ درست ہے کہ آپ کے قلیت کے سینہ نیچے قلیت نمبر اسے۔ سیون پڑتا ہے؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "ہم اسے ایون میں رہتے ہیں اور ہمارے نیچے والے قلیت کا نمبر اسے۔ سیون ہے۔"

"اور کیا یہ بھی سچ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک قلیت نمبر اسے۔ سیون میں رفیق بھائی اپنی کھلی کے ساتھ رہا کرتے تھے۔" میں نے گواہ کے گرد پھیلانے ہوئے جال کو رفتہ رفتہ سینٹا شروع کیا۔ "اور رفیق بھائی کی ایک بیٹی کا نام نازیہ تھا۔؟"

"جی..... جی ہاں.....!" اس نے یہ وقت تمام جواب دیا۔

مجھے یہ تمام تر معلومات اپنے سوئچ کی والدہ عالیہ سے حاصل ہوئی تھیں۔ میں نے عالیہ کو اس بات کے لیے ذہنی طور پر تیار بھی کر رکھا تھا کہ کویت ضرورت میں اسے گواہی کے لیے عدالت بھی لاسکتا ہوں لیکن میری جی الامکان کوشش یہی تھی کہ عالیہ کو "ملوث" کیے بغیر یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ جائے جس میں نے گفتگو آگنی والا کارڈ کھلیا تھا حالانکہ میں اسے جانتا تھا اور نہ ہی کبھی اس سے واسطہ پڑا تھا۔ گفتگو آگنی دراصل رفیق بھائی کی بہن اور نازیہ کی چھوٹی تھی جو ہلاک۔ اسے میں گراؤنڈ فور کے قلیت نمبر چار میں رہائش پزیر تھی۔ میں نے جو کارڈ کھلیا تھا وہ تپ کا ایک ثابت ہوا تھا۔ گفتگو آگنی کے ذکر کے بعد استفسار کے گواہ کے چہرے کا

رنگ بدل گیا تھا۔

"رفیق بھائی نور اپارٹمنٹس چھوڑ کر کیم آباد کے کسی پراجیکٹ میں آباد ہو گئے تھے۔" میں نے سلسلہ جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اور انہیں یہ جہرت آپ کے بھائی متقول اشتقاق کے قتل کرنے پڑی تھی۔؟"

اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے قدرے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ "آپ اس بات سے تو انکار نہیں کریں گے کہ آپ کے متقول بھائی اشتقاق کا، رفیق بھائی کی بیٹی نازیہ سے پیار محبت کا..... سلسلہ چل نکلا تھا اور وہ دونوں رات کی تاریکی میں بلڈنگ کی چھت پر جا کر خفیہ ملاقاتیں کیا کرتے تھے؟"

"جی..... حقیقت یہی ہے۔ میں اس سے انکار نہیں کروں گا۔" گواہ نے صدق دل سے اعتراف حقیقت کرتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!" میں نے سچ کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

جج سمیت وہاں موجود کوئی بھی سامع اس بات کی توقع نہیں کر رہا تھا کہ میں اپنی جرح کو بریک لگا دوں گا۔ ابھی تو محفل گرم ہوئی تھی، ماحول پر ایک رنگ آنے لگا تھا اور میں نے یہ کہہ کر سامعین، بشمول منصف کا مزہ کرنا کر دیا تھا کہ..... مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی! یہ تو سامعین پر ایک کھلی گرا دینے کے مترادف تھا۔

افسانے..... عمدہ افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ دھیرے دھیرے بلندی کی جانب بڑھتا ہے۔ جب وہ نقطہ مردچ پر پہنچتا ہے اور پڑھنے والے کا ذہن وہ دل اس کے فرانس میں اچکا ہوتا ہے تو مصنف ایک کاری ضرب لگا کر قاری کے دل و دماغ کو سمجھوڑ ڈالتا ہے۔ تب بتا چلتا ہے کہ افسانہ ختم ہو گیا..... میں نے بھی کچھ ایسا ہی کیا تھا۔

جب محفل شباب پر ہوتا اٹھنے کا جو لطف ہے وہ اس کے اترنے کے بعد کہاں!

استفسار کی جانب سے اگلی گواہی جمشید کی تھی۔ جمشید، متقول اشتقاق کا بہت قریبی دوست تھا اور انگریزی آفیسر راؤ امتیاز نے اپنے بیان میں اس کا بہت بڑھ چڑھ کر ذکر کیا تھا۔ اشتقاق اپنی گواہی کے اختتام پر عدالت کے کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔

جمشید مضبوط کاٹھی کا مالگ، ایک پست قامت نوجوان

شاہی کروفر

ایک صفائی قید خانے میں نیولین ہوتا پارٹ سے ملے گیا، چوتھائی دنیا کا مالگ اس وقت ایک سینل زدہ کوٹھڑی میں مقید تھا۔ صفائی نے پوچھا۔ "آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟"

نیولین نے مسکرا کر چھت کی طرف اشارہ کیا۔ صفائی نے اوپر دیکھا چھت سے جانے لگ رہے تھے۔ شکست خوردہ بادشاہ نے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ صفائی نے دیواروں پر نظر ڈالی۔ ان کا پلستر اکھر چکا تھا۔ انہیں نمی سے بھر بھری مٹی بن چکی تھیں۔ نیولین نے آخر میں فرش کی طرف اشارہ کیا۔ صفائی نے نیچے دیکھا، ہائیکس غائب تھیں، فرش ہمارا تھا، چنگ کے پائے آدھے آدھے فٹ تک زمین میں دھنس چکے تھے۔ وہ کوٹھڑی کے مشاہدے سے فارغ ہو چکا تو..... نیولین نے گفتگو لہجے میں کہا۔ "خود بتاؤ کیا یہ جگہ بادشاہوں کی رہائش کے قابل ہے؟" صفائی نے تا مساف سے گردن ہلا کر جواب دیا۔

"نہیں! ایک ایسی ہی ہرگز نہیں لیکن آپ اس سلوک پر احتجاج کیوں نہیں کرتے؟" نیولین نے قہقہہ لگا دیا اور نوجوان صفائی کا بازو جھپٹا کر کہا۔ "بادشاہ ہم دیا کرتے ہیں۔ ہم ندے سکھیں تو خاسوس رہا کرتے ہیں۔ احتجاج نہیں کیا کرتے۔"

مرسلہ: مون مہاس باہر..... ادا کا ڈھ

تھا۔ عمر میں وہ اشتقاق کے لگ بھگ ہی تھا۔ میں نے اشتقاق کو تو نہیں دیکھا تھا تاہم تیس فاکس کے مطابق اس کی عمر چوبیس بجیں سال تھی۔ جمشید کی رنگت سانولی تھی اور وہ لڑائی بھڑائی کا بھی ماہر نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں جھنجھو یا نہ تاثرات پائے جاتے تھے۔ اپنے گھونگر پالے بالوں اور مخصوص تہذیبی حال کے باعث پہلی نظر میں کچھ کوئی نیکر دکھائی دیتا تھا۔

جمشید نے حلیہ بیان ریکارڈ کر دیا تو وکیل استفسار مختلف انداز سے اس کی زبانی عدالت کو یہ باور کرانے کی

کوشش کرتا رہا کہ مقتول اشتیاق، ملزم کی دھمکی سے اس قدر خوف زدہ تھا کہ اس کی راتوں کی نیند اور دل کا سکون چھن گیا تھا۔ اسے ہر لمحے یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ ملزم اپنی دھمکی پر عمل کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دے گا اور بالآخر ایک روز ایسا ہو کر رہا، وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اپنی باری پر جج سے جرح کی اجازت لی اور وٹس باکس کے قریب پہنچ گیا پھر میں نے سر تا پا گواہ کا جائزہ لیتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

”جشید! کیا تم کوئی ورزش وغیرہ بھی کرتے ہو؟“ وہ سمجھا کہ میں اس کی مضبوط کالجی اور ورزشی بدن سے متاثر ہو گیا ہوں۔ جلدی سے بولا۔ ”جی ہاں۔ میں باڈی بلڈنگ کرتا ہوں۔“

”صرف باڈی بلڈنگ یا۔۔۔؟“

”باڈی بلڈنگ کے علاوہ مجھے مارشل آرٹس کا بھی شوق ہے۔“

”کیا تم نے کوئی مارشل آرٹس کلب جوائن بھی کر رکھا ہے؟“

”جی نہیں۔۔۔۔۔ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن معتز یہ ایسا کرنے کا میرا ارادہ ہے۔“

”کوئی قاعدہ نہیں ہے جشید!۔۔۔ میں نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”جی، کیا مطلب؟“ وہ ہکا بکا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے بدستور تنبیہ کی۔ ”جشید! تم باڈی بلڈنگ، مارشل آرٹس، باکسنگ یا جو کچھ بھی سیکو لیکن اس سے تمہارا کوئی بھلا نہیں ہونے والا کیونکہ تم۔۔۔؟“

میں نے دانستہ سستی خیر انداز میں جملہ امور اچھوڑا تو وہ اضطرابی لہجے میں مستصر ہوا۔ ”کیونکہ کیا وکیل صاحب؟“

”کیونکہ۔۔۔!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم ایک بزدل انسان ہو۔ ایک لمبی کاچے بھی تم سے زیادہ بہادر ہوتا ہے۔“

”آپ کیا کہہ رہے ہیں۔۔۔؟“ اس کا منہ جھرت سے کھل گیا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں جشید۔“ میں نے قصور انداز میں جواب دیا۔ ”اگر انسان اندر سے ڈر چوک ہو تو دنیا جہان کا اسلوٹ لے کر بھی وہ ایک چٹنی کو نہیں مار سکتا۔ تمہاری مثال بھی کچھ ایسی قسم کی ہے۔“

”آپ۔۔۔ آپ بہت زیادتی کر رہے ہیں۔“ وہ برہمی سے بولا۔ ”میں کمزور اور بزدل نہیں ہوں۔ میں دس

ہندوں کا اکیلے مقابلہ کر سکتا ہوں۔“

”سب کہنے کی باتیں ہیں جشید۔“ میں نے اس کے والے انداز میں کہا۔ ”میں تمہاری ان شیڈیں سے متاثر ہونے والا نہیں ہوں۔۔۔۔۔ جو گر جتے ہیں وہ برے نہیں۔“

”میں گر جتا نہیں بلکہ میری گر بھی دکھا سکتا ہوں۔“ وہ جارحانہ لہجے میں بولا، پھر پوچھا ”آپ نے کس بات سے اندازہ لگایا ہے کہ میں ڈر چوک ہوں؟“

”تمہاری بے وفائی سے۔۔۔!“

”بے وفائی؟“ وہ متحیر بنا کر بولا۔ ”میں نے کس سے بے وفائی کی ہے؟“

”اپنے مگر دوست اشتیاق سے!“

”یہ تو آپ اپنی بات کر رہے ہیں۔۔۔!“ وہ پھر سے ہوئے لہجے میں بولا۔

”تمہاری بات کا مطلب ہے، مقتول نے تم سے بے وفائی کی ہے؟“

”جی ہاں۔ بالکل!“ وہ جوش جذبات میں بول گیا۔

میں نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“

”وہ اس طرح کہ۔۔۔“ اچانک اس کی آواز بھرا گئی۔ ”وہ۔۔۔ مجھے چھوڑ کر چلا گیا، میرا دوست مجھ سے بچھڑ گیا۔۔۔ میں تمہارہ گیا ہوں۔“

”میں اپنی بات پر قائم ہوں جشید!“ میں نے کبیر انداز میں کہا۔ ”اگر تم نے پیٹھ نہ دکھائی ہوتی تو شاید اشتیاق آج زندہ ہوتا۔!“

”تم۔۔۔ مگر میں نے۔۔۔“ وہ بے حد الجھن زدہ نظر سے مجھ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کہاں پیٹھ دکھائی ہے؟“

میں اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی ہی دھن میں بوٹا چلا گیا۔ ”تم تو اتنے بہادر اور جی دار ہو کہ اکیلے دس ہندوں کا مقابلہ ڈٹ کر کر سکتے ہو۔ اور تمہارا وہ دوست اس بے چارے سے تو جوان سے سہم سہم کر زندگی گزارتا رہا۔“

”میں نے کھائی تو قوت کر کے اکیڑ ڈبا کس میں کھڑے اپنے موکل اور اس کیس کے ملزم عمران کی جانب اشارہ کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تم نے پہلے نہیں کو اور بعد ازاں عدالت میں حلفیہ بیان دیا ہے کہ مقتول، ملزم کی دھمکی کی وجہ سے بہت خوف زدہ تھا۔ کیا تم اپنے دوست کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے؟ تمہارا یہ سیٹھ والا بدن کیا اپنا ڈالنے کے کام آئے گا۔ تم دس ہندوں کا بہت دلیبری سے مقابلہ کرنے کے دعویدار ہو

اور تمہارا عزیز از جان دوست ڈر ڈر کر سانس لیتا رہا۔ یہ تمہارے لیے ذوب کرنے کا مقام نہیں ہے۔؟“

میں نے ان متعدد سوالات نے اسے پکرا کر رکھ دیا تھا اور یہی میرا رخ نظر تھا۔ ابھی تک میں نے جو جرح کی تھی اس کا صرف اتنا سا مقصد تھا کہ استغاثہ کا گواہ پوکھلا کر رہ جائے تاکہ میں اس کی زبان سے جو کچھ اگلیا جانتا ہوں، اس میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہ ہو اور۔۔۔ الحمد للہ! میں اپنی کوشش میں کامیاب رہا تھا۔

وہ ششائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں نے اشتیاق کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی۔۔۔ بہت حوصلہ دیا تھا اسے۔۔۔۔۔“

”مجھے یقین آ گیا جشید!“ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ ”تم مقتول کے سچے دوست تھے۔ تم نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس کی بدقسمتی کہ زندگی نے وفائے کی اور وہ تمہیں چھوڑ کر چلا گیا۔“

وہ حیران و پریشان نظر سے میرے بدلے ہوئے جو رو کر دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کا دوست ہوں یا دشمن۔۔۔۔۔ وہ میری بات پر یقین کرے یا میری نیت پر شک؟ وہ ”ہاں“ اور ”نہ“ کی درمیانی پوزیشن میں لٹکا حیرت اور استغاب کی کئی جلی کیفیت میں مجھے تنگے جا رہا تھا۔ اس کی اس ذہنی حالت کے پیش نظر میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ استغاثہ کا گواہ جشید اس وقت مکمل طور پر میرے فرانس میں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پھر میری لے کر میری گرفت سے نکل جاتا، میں نے اپنی ”محنت“ وصول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”جشید!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”اس بات میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ تم مقتول کے سچے اور مخلص دوست تھے، اس کے حقیقی خیر خواہ تھے؟“

”جی ہاں۔ بے شک۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

”اور وہ بھی تمہارا بے لوث دوست تھا؟“

”بالکل جناب!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی

”میں اسے کبھی نہیں بھول پاؤں گا۔“

”بھولنا بھی نہیں چاہیے!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”جشید! دنیا بھر میں اس اصول کو تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ سچے اور حقیقی دوست ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپاتے۔ وہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی شیئر کرتے ہیں۔ کیا تم بھی مقتول کے ساتھ اسی قسم۔۔۔ کی دوستی

تمہارے تھے؟“

”جی ہاں!“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ”میں تو اسے یہ بھی بتا دیا کرتا تھا کہ آج میں نے کیا کھایا ہے، کیا پیا ہے اور کس سے کون سی بات کی ہے۔۔۔۔۔“

”اور وہ؟“

”وہ بھی اپنے دل کا احوال مجھے بتا دیا کرتا تھا۔“

”کیا یہ درست ہے کہ کچھ عرصہ پہلے نازیہ نامی ایک لڑکی سے مقتول کا پھر چلا تھا؟“ میں نے قدرے تیز آواز میں پوچھا۔ ”نازیہ پہلے تو پارٹنرشپ میں رہتی تھی۔ مقتول اور نازیہ بلڈنگ کی چھت پر ملا کرتے تھے۔ اب وہ لوگ کریم آباد کے علاقے میں شفٹ ہو چکے ہیں۔“ میں نے کھائی توقف کیا پھر اس کی آنکھوں میں چھانکتے ہوئے تنہی انداز میں اضافہ کیا۔

”اس سوال کا جواب دیتے ہوئے جنہیں ایک حقیقت کو ذہن میں رکھنا ہوگا اور وہ یہ کہ تم سے پہلے والی گواہی میں معزز عدالت کے روبرو مقتول کا بڑا بھائی اشتیاق اور نازیہ کے پکڑ کے حوالے سے حقائق کا اعتراف کر چکا ہے۔ اگر تم نے غلط بیانی سے کام لینے کی کوشش کی تو تمہارا بیان، اشتیاق کے بیان سے لگا نہیں کھائے گا اور مجبوراً مجھے اشتیاق کو دوبارہ عدالت میں بلانا پڑے گا تاکہ وہ دوبارہ گواہی دے اور پانی کا پانی الگ ہو سکے اور یہ حقیقت منظر عام پر آجائے کہ تم دونوں میں سے کون سا ہے اور کون مجھ کو لٹھا۔ جو بھی بولنا، بہت سوچ سمجھ کر بولنا۔!“

”اگر اشتیاق بھائی حقیقت کا اعتراف نہ بھی کر چکے ہوتے تو بھی مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔“ وہ کبریٰ سنجیدگی سے بولا۔ ”میں نہیں جانتا کہ تھوڑی دیر پہلے اشتیاق بھائی نے کیا بیان دیا ہے۔ بہر حال، میں چونکہ معزز عدالت کے روبرو جج بولنے کا حلف اٹھا چکا ہوں اس لیے دروغ کوئی سے کام نہیں لوں گا اور سچ یہ ہے کہ۔۔۔“ اس نے مختصر سا توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اکتفا لہجے میں کہا۔

”مقتول اور نازیہ میں واقعی پیار و محبت کا معاملہ چل رہا تھا۔“

”جب یہ معاملہ سامنے آیا تو اس پر بہت لے دے ہوئی تھی۔“ میں نے اپنی جرح کو اپنے پوائنٹ کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ ”جس کے نتیجے میں نازیہ کے والدین بھائی وہ بلڈنگ چھوڑ کر کریم آباد شفٹ ہو گئے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں جناب۔۔۔۔۔ آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔“ وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ”ایسا ہی ہوا تھا۔“

”تم اس بات سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ انسان کے اندر سے پیار و محبت کے جراثیم آسانی سے کیا... مشکل سے بھی ختم نہیں کیے جاسکتے۔“

”جی ہاں... یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔“

”وہ بھی اپنے اندر موجود پیار و محبت کے جراثیم کو کچل نہیں سکتا تھا؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا چاہا۔“

”چونکہ سوال پیدا نہیں ہوتا اس لیے مقتول نے جواب پیدا کر لیا تھا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اس نے پیار و محبت کے جراثیم کے کان و لفظ کے لیے ایک اور آسان تلاش کر لیا تھا۔“

”جی۔۔۔۔۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”اور یہ آسان بھی نور اپارٹمنٹس ہی میں واقع تھا۔۔۔۔۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”مقتول کو اپنی بلڈنگ کی ایک اور ٹراکی سے محبت ہو گئی تھی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“

”اس کا مطلب ہے، میں شیک کبہ رہا ہوں؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔“

”اور ان دونوں کی ملاقاتیں بھی اکثر رات کی تاریکی میں بلڈنگ کی چھت پر ہی ہوا کرتی تھیں؟“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

استفسار کے نوجوان گواہ ہشید نے مقتول کے سنے معاشقہ کا اقرار کر کے جو چارہ لگا تھا، اس کے ساتھ ہی میرا لگایا ہوا ایک نوک دار کاٹا بھی تھا جو اب اس کے حلق میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ اسی کاٹنے میں لگے ہوئے چارے کو وہ اکل سکتا تھا اور نہ ہی نگل سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں مختلف جیسے سوالات کی شکل میں کاٹنے کی ڈور کو جو جکے جکے جھٹکے دے رہا تھا، اس عمل نے گواہ کو ایک نایاب ذہنیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس کی حالت ”نہ پاسے رفتن، نہ جائے آمدن“ کا منہ بول نہ ہوتا تھا۔

”جی ہاں۔۔۔۔۔ بالکل ایسا ہی تھا۔۔۔۔۔“ اس نے نکتہ زدہ انداز میں میرے استفسار کی تصدیق کی۔

”اور مقتول کی محبت کا یہ عمل اس کی موت تک جاری و ساری تھا؟“

گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”مقتول کی آخری محبوبہ کا تعلق بلاک اے سے تھا یا بلاک بی سے؟“

”بلاک بی سے۔۔۔۔۔“ اس نے بے دھوک جواب دیا۔

”مقتول کی آخری محبوبہ کا نام؟“

”سونیا۔۔۔۔۔!“

”کون سونیا؟“

”کنفی صاحب کی بیٹی۔۔۔۔۔!“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

مظفر اسی عدالت کا تھا اور وٹنس باکس میں استفسار کا ایک اور اہم اور مستہر گواہ اور بلڈنگ کنفی کا صدر کھڑا تھا۔ وہ سواری رنگ کے شلوار سوٹ میں لمبوس تھا۔ صدر کی عمر لگ بھگ پچاس سال رہی ہوگی۔ وہ بھاری بیٹے کا مالک ایک تو عیلا شخص تھا۔ رنگت گندمی اور چہرے کے تاثرات میں ایک خاص قسم کی کرختگی پائی جاتی تھی۔

حلقہ بیان دینے کے بعد صدر صاحب جرح کے نام پر وکیل استفسار کو اور خصوصاً معزز عدالت کو یہ یاد کرانے کی کوشش میں مصروف دکھائی دیے کہ اس کیس کا طرم یعنی میرا موکل عمران ایک جھگڑالو اور خستہ دروڑن جوان تھا اور یہ بھی کہ طرم کی ماں عالیہ بھی ایک خستہ دروڑ اور پھتہ سے باز عورت تھی۔ ہر کوئی اس کے منہ لگتے ہوئے ڈرتا تھا وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔!

میں اپنی باری پر سوال و جواب کے لیے وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے وائٹن ان الٹوڈ کو سرسری اعزاز میں لیا جن پر وکیل استفسار نے سیر حاصل جرح کر کے طرم کو مجرم ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی طرح میں نے ان امور پر بڑی تفصیلی بات کی جنہیں وکیل مخالف نے چھوئے کی رحمت بھی گوارا نہیں کی تھی اور یہی میری کامیابی کا سبب بھی بنا۔

میں نے کھاراکا کھا صاف کیا اور گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز پکھاس طرح کیا۔ ”صدر صاحب! استفسار کی جانب سے اب تک مختلف مراحل پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ طرم ایک خستہ دروڑ، جھگڑالو اور شر پسند نوجوان ہے۔ اس ذیل میں اس کے جھگڑوں اور پھتوں کو مثالیں بنا کر بھی پیش کیا گیا۔ آپ اپنی ذاتی حیثیت سے بتائیں کہ آج تک آپ کے ساتھ طرم کی کنفی مرتبہ لڑائی ہو چکی ہے؟“

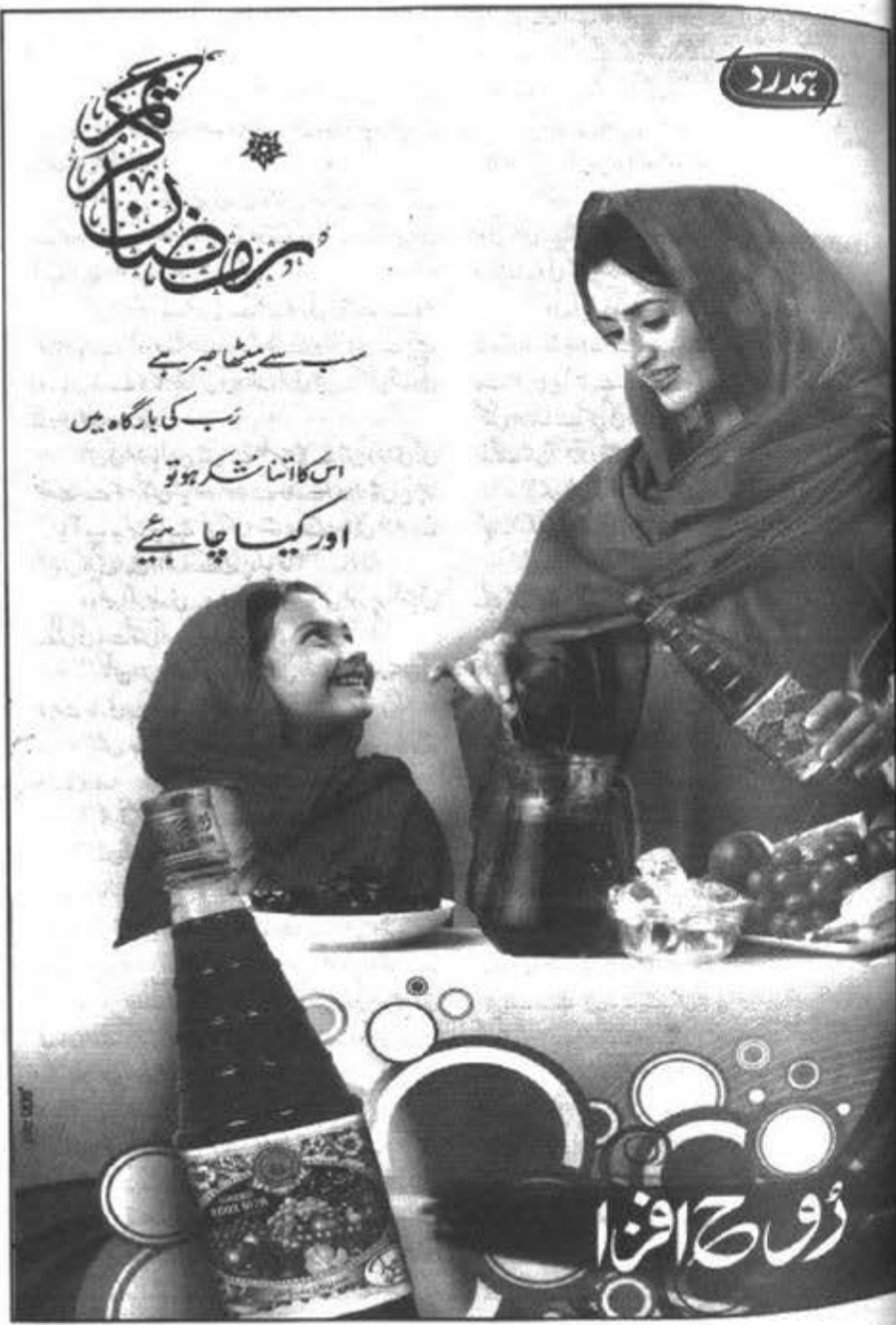
”مجھ سے تو کبھی اس کی منہ ماری نہیں ہوئی۔“ وہ اکیوڑ باکس میں کھڑے طرم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”اس کے باوجود بھی آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے اس بے چارے کو مطعون کرنے کی کوشش کی ہے۔“ میں نے شاکی نظر سے استفسار کے گواہ صدر صاحب کی طرف

ہمدرد

درمیان

سب سے میٹھا صبر ہے
زب کی بارگاہ میں
اس کا تنا شکرت ہو تو
اور کیا چاہیے



روح افزا

دیکھا۔ "وکیل استاذ کی جرح کے جواب میں آپ نے میرے موکل کو دنیا کا برترین انسان ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی؟"

"شاید آپ نے میری گفتگو کے زاویے پر غور نہیں کیا۔" وہ سنبھلا بیٹھے ہوئے بولا۔ "اسی لیے آپ مقصد کی تک نہیں پہنچ سکے۔"

"اس میں یقیناً میری کسی کوتاہی کو دخل ہوگا۔" میں نے عمدہ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "برائے مہربانی آپ اپنے زاویے کو اجاگر فرمائیں۔"

"یہ طرم تو ایک طرح سے آواز کار کی حیثیت سے کام کرتا رہا ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس کے پیچھے ڈوریاں ہلانے کا کام تو اس کی والدہ کرتی ہیں۔ اصل قسادی بڑی عورت ہے۔"

اس کی لور ہال پر میں نے مسکرا دنگے میں ذرا سی بھی فطرت سے کام نہیں لیا اور سہلانے والے انداز میں پوچھا۔ "کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ استاذ کے مطابق طرم نے اشتیاق کا کل اپنی والدہ کے ایما پر کیا تھا؟"

وہ گہرا کمر جلدی سے بولا۔ "میں خاص طور پر اشتیاق کے کل کی بات نہیں کر رہا ہوں۔"

"لیکن اس وقت تو عدالت میں اشتیاق مرڈر کیس کی سماعت جاری ہے؟"

"میں جانتا ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"پھر؟" میں نے زنج کرنے والا انداز جاری رکھا۔

"میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ اصل قتلے کی جڑ طرم کی ماں عالیہ ہے۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "عالیہ کے لاڈ بیٹا اور بے جا حمایت نے اس لوٹے کا دماغ خراب کر دیا ہے اور یہ بڑا بدتمیز اور جھگڑالو ہو گیا ہے۔ مجھ سے پہلے کرنے کی تو کبھی اس کی بہت نہیں ہوئی البتہ، اس کی ماں سے اکثر ویسٹ گرما گرمی ہو جاتی ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی سلگانے والی بات کر دیتی ہے اور انسان لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ جب اس مزاج کی ماں اپنے بیٹے کی تربیت کرے گی تو پھر وہ جو بھی طوفان کھڑا کر دے کم ہے۔" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے لمبے لمبے بھر کو متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"ان حالات کی روشنی میں اس بات کے امکانات بہت واضح ہو جاتے ہیں کہ اس خود مر اور بدتمیز نے اشتیاق کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔"

"اوکے صدر صاحب! طرم کے مجرم ہونے کے حوالے سے آپ کا نظریہ بالکل واضح ہو گیا۔" میں نے غصے سے بولے لہجے میں کہا۔ "اب ذرا آپ مجھے اس کی والدہ کے بارے میں بتائیں۔"

"مثلاً کیا بتاؤں؟" انہاں نے مجھ ہی سے سوال ڈالا۔

"مثلاً۔۔۔ کس کس بات پر آپ کی اس سے بدحوشی ہوتی رہتی ہے؟" میں نے گہری تجسس کی سے کہا۔ "اندازاً یہی تھا جیسے یہ کوئی عجیب معاملہ ہو۔"

"کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں نا۔۔۔" وہ برا سادہ بتاتے ہوئے بولا۔ "مجھے سب سے زیادہ غصہ تو اس عورت کی بہت دھڑی پر آتا ہے۔ اسے دوسروں کی تکلیف کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ بے حس کی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ آپ کبھی ہمارے بلڈنگ میں آکر تو دیکھیں۔"

"میں ضرور آؤں گا۔" میں نے بدستور بنجید لہجے میں کہا۔ "کیا کوئی خاص بات ہے؟"

"جب آکر دیکھیں گے تو پتا چلے گا۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "میں آپ کو بی بلاک گسے کا پلڈر پرے جاؤں گا، طرم کے گھر کے دروازے کے سامنے۔ آپ دیکھ سکیں گے کہ ان لوگوں نے اپنے دروازے سے لے کر چھت والے دروازے تک کیا کیا کادھ کھاڑ بیچ کر رکھا ہے۔ اسے جانے والوں کا راستہ بالکل بند ہو کر رہ گیا ہے۔ اس عورت نے گویا اپنے گھر کے اندر اور باہر ایک چھوٹا سا کارخانہ قائم کر رکھا ہے جہاں کھنے آلو کھنے چنے، وہیں اور جانے کون کون سے آٹکھ تیار ہوتے رہتے ہیں۔ میں ان کے قہقہے کے سننے سے بے رحم رہتا ہوں۔ رات گئے تک اوپر ایسی ایسی آوازیں پیدا ہوتی رہتی ہیں کہ انسان ایک لمحے کے لیے بھی سکھ سے سونہ سکے۔ پتا نہیں یہ ماں چار رات گئے کن کارروائیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ دیکھنے میں تو یہ دو افراد ہیں لیکن ہوں محسوس ہوتا ہے، میرے سر کے اوپر ایک پورا اسٹیل آباد ہے۔"

"واقعی۔۔۔ تو بہت ہی غلط بات ہے۔" میں نے بعد وادہ انداز میں کہا۔ "انسان کو اپنے پڑوسیوں کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔"

"کوئی انسان ہوتا نا؟" وہ زہر لیے لہجے میں بولا۔ "میں تو سوچ رہا ہوں، اس عورت کے خلاف اوپری سبب شکایت کر دوں کہ اس نے ایک پرائمری اسکول کی ٹیچر کی محول رکھی ہے تاکہ اس سے باڑ پر س کی جائے۔ یا پھر کوٹھری طرح استعمال کرے اور یا پھر اپنا ٹین ڈبائے۔"

"میں نے سنا ہے کہ آپ نے ایک بار ایک شخص کو مارا تھا۔" میں نے جوش دلانے والے انداز میں کہا۔ "آپ تو بلڈنگ کمپنی کے صدر ہیں جناب۔"

"ہماری بلڈنگ کے دونوں بلاکوں میں کل ملا کر چالیس فلیٹس ہیں۔" وہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ "ابنہ! ان میں ایک کو چھوڑ کر باقی سب مجھے صدر تسلیم کرتے ہیں۔ صرف ایک ایک عورت مجھے کچھ نہیں سمجھتی حتیٰ کہ یہ تو اپنی بد سچائی سے ماہانہ کمپنی نہیں بھی دیتی۔"

"یہ کیا قصہ ہے صدر صاحب؟" میں نے چونکنے کے انداز میں پوچھا۔

اس تیس میں، میں وکیل صفائی کا کردار ادا کر رہا تھا لیکن استاذ کے گواہ کے ساتھ میری اس گفتگو کو سن کر کوئی نہیں کہہ سکا تھا کہ میں گواہ کا ٹرائل کر رہا ہوں۔ یوں ہی محسوس ہوتا تھا جیسے دویم خیال دوست آپس میں باہمی امور پر بات چیت کر رہے ہوں لیکن یہ حقیقت نہیں بلکہ میری ایک چال تھی۔ میں صدر صاحب جیسے کائنات آدی کو اپنے دام میں لانے کے لیے یہ جذباتی اور غیر خواہانہ اداکاری کر رہا تھا۔ بس، کوئی کچھ جانتا تھا کہ میں صدر صاحب کو اپنی غیر محسوس گرفت میں جکڑنے ہی والا تھا۔

"قصہ کچھ اس طرح ہے جناب۔" وہ میرے استہزاء کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "جب یہ بلڈنگ تکمیل تک نہیں تھی تو شروع میں یہاں آکر آباد ہونے والوں میں ایک عورت ہے۔ یہ بھی گھری اور ان دنوں یہ بچی کی بیوہ ہوئی تھی لہذا اس وقت کی بلڈنگ کمپنی نے ترس کھاتے ہوئے اس کی کمپنی نہیں صاف کر دی تھی۔ تب میں اور اب میں زمین آسمان کا فرق آچکا ہے۔ آج کل ماشاء اللہ! یہ عورت اٹھارہ گریڈ کے آفیسر سے بھی زیادہ کمزوری ہے۔ اس کی دکان چھڑا چھڑ رہی ہے۔ علاوہ ازیں پر اپنی ایک بیوہ کی طرح بھی اچھا خاصا کمزوری ہے۔ میں نے دو تین بار نیوں کو بھی آپس میں ملا دے تو اس کا کمیشن کھرا ہے۔ اس کے گھر میں ٹی وی، فریج، ٹیپ ریکارڈر، وی سی آر، ٹیگز اور ضروریات کی ساری اہم چیزیں موجود ہیں لیکن جب کمپنی نہیں دینے کی باری آتی ہے تو یہ فوراً نہ ہن جاتی ہے۔" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے غصہ بھرنا لہجے سے لہجہ میں بولا۔

"بہت ہی شوہروں والیاں بڑے رشک کی نگاہ سے اس بیوہ کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے جذبات چمک رہے ہوتے ہیں کہ۔۔۔ اگر یہ کیا ہے یہ جڑ ہے۔"

میں نے جوش دلانے والے انداز میں کہا۔ "آپ تو بلڈنگ کمپنی کے صدر ہیں جناب۔"

"ہماری بلڈنگ کے دونوں بلاکوں میں کل ملا کر چالیس فلیٹس ہیں۔" وہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ "ابنہ! ان میں ایک کو چھوڑ کر باقی سب مجھے صدر تسلیم کرتے ہیں۔ صرف ایک ایک عورت مجھے کچھ نہیں سمجھتی حتیٰ کہ یہ تو اپنی بد سچائی سے ماہانہ کمپنی نہیں بھی دیتی۔"

"یہ کیا قصہ ہے صدر صاحب؟" میں نے چونکنے کے انداز میں پوچھا۔

اس تیس میں، میں وکیل صفائی کا کردار ادا کر رہا تھا لیکن استاذ کے گواہ کے ساتھ میری اس گفتگو کو سن کر کوئی نہیں کہہ سکا تھا کہ میں گواہ کا ٹرائل کر رہا ہوں۔ یوں ہی محسوس ہوتا تھا جیسے دویم خیال دوست آپس میں باہمی امور پر بات چیت کر رہے ہوں لیکن یہ حقیقت نہیں بلکہ میری ایک چال تھی۔ میں صدر صاحب جیسے کائنات آدی کو اپنے دام میں لانے کے لیے یہ جذباتی اور غیر خواہانہ اداکاری کر رہا تھا۔ بس، کوئی کچھ جانتا تھا کہ میں صدر صاحب کو اپنی غیر محسوس گرفت میں جکڑنے ہی والا تھا۔

"قصہ کچھ اس طرح ہے جناب۔" وہ میرے استہزاء کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "جب یہ بلڈنگ تکمیل تک نہیں تھی تو شروع میں یہاں آکر آباد ہونے والوں میں ایک عورت ہے۔ یہ بھی گھری اور ان دنوں یہ بچی کی بیوہ ہوئی تھی لہذا اس وقت کی بلڈنگ کمپنی نے ترس کھاتے ہوئے اس کی کمپنی نہیں صاف کر دی تھی۔ تب میں اور اب میں زمین آسمان کا فرق آچکا ہے۔ آج کل ماشاء اللہ! یہ عورت اٹھارہ گریڈ کے آفیسر سے بھی زیادہ کمزوری ہے۔ اس کی دکان چھڑا چھڑ رہی ہے۔ علاوہ ازیں پر اپنی ایک بیوہ کی طرح بھی اچھا خاصا کمزوری ہے۔ میں نے دو تین بار نیوں کو بھی آپس میں ملا دے تو اس کا کمیشن کھرا ہے۔ اس کے گھر میں ٹی وی، فریج، ٹیپ ریکارڈر، وی سی آر، ٹیگز اور ضروریات کی ساری اہم چیزیں موجود ہیں لیکن جب کمپنی نہیں دینے کی باری آتی ہے تو یہ فوراً نہ ہن جاتی ہے۔" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے غصہ بھرنا لہجے سے لہجہ میں بولا۔

"بہت ہی شوہروں والیاں بڑے رشک کی نگاہ سے اس بیوہ کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے جذبات چمک رہے ہوتے ہیں کہ۔۔۔ اگر یہ کیا ہے یہ جڑ ہے۔"

"بہت ہی شوہروں والیاں بڑے رشک کی نگاہ سے اس بیوہ کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے جذبات چمک رہے ہوتے ہیں کہ۔۔۔ اگر یہ کیا ہے یہ جڑ ہے۔"

"بہت ہی شوہروں والیاں بڑے رشک کی نگاہ سے اس بیوہ کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے جذبات چمک رہے ہوتے ہیں کہ۔۔۔ اگر یہ کیا ہے یہ جڑ ہے۔"

"بہت ہی شوہروں والیاں بڑے رشک کی نگاہ سے اس بیوہ کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے جذبات چمک رہے ہوتے ہیں کہ۔۔۔ اگر یہ کیا ہے یہ جڑ ہے۔"

"بہت ہی شوہروں والیاں بڑے رشک کی نگاہ سے اس بیوہ کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے جذبات چمک رہے ہوتے ہیں کہ۔۔۔ اگر یہ کیا ہے یہ جڑ ہے۔"

"بہت ہی شوہروں والیاں بڑے رشک کی نگاہ سے اس بیوہ کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے جذبات چمک رہے ہوتے ہیں کہ۔۔۔ اگر یہ کیا ہے یہ جڑ ہے۔"

"بہت ہی شوہروں والیاں بڑے رشک کی نگاہ سے اس بیوہ کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے جذبات چمک رہے ہوتے ہیں کہ۔۔۔ اگر یہ کیا ہے یہ جڑ ہے۔"

"بہت ہی شوہروں والیاں بڑے رشک کی نگاہ سے اس بیوہ کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے جذبات چمک رہے ہوتے ہیں کہ۔۔۔ اگر یہ کیا ہے یہ جڑ ہے۔"

"بہت ہی شوہروں والیاں بڑے رشک کی نگاہ سے اس بیوہ کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے جذبات چمک رہے ہوتے ہیں کہ۔۔۔ اگر یہ کیا ہے یہ جڑ ہے۔"

میں نے جوش دلانے والے انداز میں کہا۔ "آپ تو بلڈنگ کمپنی کے صدر ہیں جناب۔"

"ہماری بلڈنگ کے دونوں بلاکوں میں کل ملا کر چالیس فلیٹس ہیں۔" وہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ "ابنہ! ان میں ایک کو چھوڑ کر باقی سب مجھے صدر تسلیم کرتے ہیں۔ صرف ایک ایک عورت مجھے کچھ نہیں سمجھتی حتیٰ کہ یہ تو اپنی بد سچائی سے ماہانہ کمپنی نہیں بھی دیتی۔"

"یہ کیا قصہ ہے صدر صاحب؟" میں نے چونکنے کے انداز میں پوچھا۔

اس تیس میں، میں وکیل صفائی کا کردار ادا کر رہا تھا لیکن استاذ کے گواہ کے ساتھ میری اس گفتگو کو سن کر کوئی نہیں کہہ سکا تھا کہ میں گواہ کا ٹرائل کر رہا ہوں۔ یوں ہی محسوس ہوتا تھا جیسے دویم خیال دوست آپس میں باہمی امور پر بات چیت کر رہے ہوں لیکن یہ حقیقت نہیں بلکہ میری ایک چال تھی۔ میں صدر صاحب جیسے کائنات آدی کو اپنے دام میں لانے کے لیے یہ جذباتی اور غیر خواہانہ اداکاری کر رہا تھا۔ بس، کوئی کچھ جانتا تھا کہ میں صدر صاحب کو اپنی غیر محسوس گرفت میں جکڑنے ہی والا تھا۔

"قصہ کچھ اس طرح ہے جناب۔" وہ میرے استہزاء کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "جب یہ بلڈنگ تکمیل تک نہیں تھی تو شروع میں یہاں آکر آباد ہونے والوں میں ایک عورت ہے۔ یہ بھی گھری اور ان دنوں یہ بچی کی بیوہ ہوئی تھی لہذا اس وقت کی بلڈنگ کمپنی نے ترس کھاتے ہوئے اس کی کمپنی نہیں صاف کر دی تھی۔ تب میں اور اب میں زمین آسمان کا فرق آچکا ہے۔ آج کل ماشاء اللہ! یہ عورت اٹھارہ گریڈ کے آفیسر سے بھی زیادہ کمزوری ہے۔ اس کی دکان چھڑا چھڑ رہی ہے۔ علاوہ ازیں پر اپنی ایک بیوہ کی طرح بھی اچھا خاصا کمزوری ہے۔ میں نے دو تین بار نیوں کو بھی آپس میں ملا دے تو اس کا کمیشن کھرا ہے۔ اس کے گھر میں ٹی وی، فریج، ٹیپ ریکارڈر، وی سی آر، ٹیگز اور ضروریات کی ساری اہم چیزیں موجود ہیں لیکن جب کمپنی نہیں دینے کی باری آتی ہے تو یہ فوراً نہ ہن جاتی ہے۔" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے غصہ بھرنا لہجے سے لہجہ میں بولا۔

"بہت ہی شوہروں والیاں بڑے رشک کی نگاہ سے اس بیوہ کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے جذبات چمک رہے ہوتے ہیں کہ۔۔۔ اگر یہ کیا ہے یہ جڑ ہے۔"

"بہت ہی شوہروں والیاں بڑے رشک کی نگاہ سے اس بیوہ کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے جذبات چمک رہے ہوتے ہیں کہ۔۔۔ اگر یہ کیا ہے یہ جڑ ہے۔"

"بہت ہی شوہروں والیاں بڑے رشک کی نگاہ سے اس بیوہ کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے جذبات چمک رہے ہوتے ہیں کہ۔۔۔ اگر یہ کیا ہے یہ جڑ ہے۔"

"بہت ہی شوہروں والیاں بڑے رشک کی نگاہ سے اس بیوہ کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے جذبات چمک رہے ہوتے ہیں کہ۔۔۔ اگر یہ کیا ہے یہ جڑ ہے۔"

"بہت ہی شوہروں والیاں بڑے رشک کی نگاہ سے اس بیوہ کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے جذبات چمک رہے ہوتے ہیں کہ۔۔۔ اگر یہ کیا ہے یہ جڑ ہے۔"

"بہت ہی شوہروں والیاں بڑے رشک کی نگاہ سے اس بیوہ کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے جذبات چمک رہے ہوتے ہیں کہ۔۔۔ اگر یہ کیا ہے یہ جڑ ہے۔"

"بہت ہی شوہروں والیاں بڑے رشک کی نگاہ سے اس بیوہ کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے جذبات چمک رہے ہوتے ہیں کہ۔۔۔ اگر یہ کیا ہے یہ جڑ ہے۔"

"بہت ہی شوہروں والیاں بڑے رشک کی نگاہ سے اس بیوہ کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے جذبات چمک رہے ہوتے ہیں کہ۔۔۔ اگر یہ کیا ہے یہ جڑ ہے۔"

"بہت ہی شوہروں والیاں بڑے رشک کی نگاہ سے اس بیوہ کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے جذبات چمک رہے ہوتے ہیں کہ۔۔۔ اگر یہ کیا ہے یہ جڑ ہے۔"

کیا۔

”مقتول اور اس کی محبوبہ تازیہ سے؟“

اس نے ایک بار ہلکا سا اشارہ کیا۔

”صدر صاحب! میں نے ظہیر سے ہونے لکھے ہیں کہ۔“ مقتول اور تازیہ کی محبت کا معاملہ جب مکمل کر سب کے سامنے آ گیا تو رفیق بھائی کو بڑی شرمندگی اٹھانا پڑی تھی اور پھر جلد ہی وہ نور پارٹمنٹس کو خیر باد کہہ کر کریم آباد وینڈنٹ ہو گئے تھے۔ اگر میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں تو برائے مہربانی آپ مجھے نوک دیجیے گا۔“

”نہیں جناب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ واقعہ یہاں ایسے ہی پیش آیا تھا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”رفیق بھائی بہت ہی شریف انسان ہیں۔ ان کے لیے معاملہ بہت نازک تھا۔ وہ اسی عداوت اور نفرت میں ہماری بلڈنگ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔“

”آپ بالکل درست فرما رہے ہیں صدر صاحب۔“ میں نے سرسراہٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ٹیپوں کے معاملات واقعی بہت نازک اور حساس ہوتے ہیں۔ انسان غیرت میں کچھ بھی کر بیٹھتا ہے۔ لیکن۔۔۔۔۔۔“

میں نے دائیں بات ادھوری چھوڑی تو وہ اضطرابی لہجے میں پوچھ بیٹھا۔ ”لیکن کیا وہ مکمل صاحب؟“

”لیکن یہ کہ۔۔۔۔۔۔“ میں نے سانس بڑھ کر اور رکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے خیال میں رفیق بھائی بہت ہی بزدل آدمی تھا جیسا کہ عموماً ہر شریف انسان ہوتا ہے۔ اسے فراہم راہ اختیار کرنے کے بجائے بہادری اور جرأت کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔“

”مثلاً۔۔۔۔۔۔ وہ کیا کرتا؟“ وہ پوچھ بیٹھا۔

”وہ مقتول کو ایسا سبق سکھاتا جیسا کہ۔۔۔۔۔۔ میں نے ڈرامائی انداز میں لکھتیت کا مظاہرہ کیا پھر سرسری انداز میں کہا۔“ خیر چھوڑیں صدر صاحب! اس بحث میں بڑ کریم اصل موضوع سے دور ہو جائیں گے۔“ وہ ایک ننگا فاش نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”صدر صاحب!“ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”جب رفیق بھائی کریم آباد وینڈنٹ ہوئے تو پھر آپ کو چھت والا دوسرا دروازہ بھی کھول دینا چاہیے تھا کیونکہ چھت کے علاوہ استعمال کا خطرہ تو کئی گیا تھا؟“

”یہ خطرہ ہی تو گیا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ جذبہ بزدلی انداز میں بولا۔“ لیکن میں نے اس خیال سے وہ دروازہ مستحکم لاک کر دیا کہ اس مثال سے حوصلہ بڑھ کر کوئی اور نوجوان جوڑا

مقتول اور تازیہ کی تاریخ کو دہرائے کی کوشش نہ کرے۔“ لہائی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”دودھ کا جلا، چھاپہ بھی پھونک پھونک کر بیٹھا ہے جناب۔۔۔۔۔۔“

”میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں صدر صاحب! لیکن کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کی اس پیش بندی کے بعد یہ معاملہ ہمیشہ کے لیے رک گیا تھا؟“

”جی ہاں، مجھے یقین ہے۔“

”نہ تو کسی اور نوجوان جوڑے کی ایسی ہمت ہوئی تھی اور نہ ہی مقتول نے کوئی نیا کھانا کھولا تھا؟“

”اگر ایسا کوئی کام ہوا ہوگا تو میرے علم میں نہیں اور نہ ہی ایسے معاملات کی خبر رکھتا میرے فرائض کا حصہ ہے۔“ وہ قدرے اکھڑ لہجے میں بولا۔ ”ہاں، اس بات کی میں گارنٹی لے سکتا ہوں کہ اس کے بعد سے بلڈنگ اس قسم کی ملاقاتوں کے لیے استعمال نہیں ہوئی۔“

”یعنی جب سے آپ نے بلاک اسے اسے دروازے کو کھلا کر دیا تھا؟“

”جی ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔“

”صدر صاحب! آپ بہت بڑا دعویٰ کر رہے ہیں۔“

”یہ ایک حقیقت ہے جناب۔“

”صدر صاحب! میری فحش معلومات کے مطابق مقتول نے تازیہ والے معاملے کے بعد ہمت نہیں ہاری تھی۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”بلکہ بلاک بی کے ایک بینک میں نیا کھانا کھول لیا تھا۔“

”آپ اتنی بڑی بات۔۔۔۔۔۔ کس بنا پر کہہ رہے ہیں۔۔۔۔۔۔“ وہ ہل کر رہ گیا۔ ”اس سلسلے میں آپ کے پاس کوئی فحش ثبوت بھی ہے؟“

”صدر صاحب! اول تو یہ بات میں نہیں کہہ رہا بلکہ پچھلی ایک پیشی پر استغاثہ کے ایک گواہ اور مقتول کے بھائی دوست جشیہ نے معزز عدالت کے روبرو یہ سنسنی خیز اکتشاف کیا تھا۔“

”میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔“ اور جہاں تک فحش ثبوت مہیا کرنے کی بات ہے تو میں آئندہ پیشی پر دونوں گواہات میں طلب کرنے کے احکامات صادر کر دیتا ہوں۔“

”دونوں کو۔۔۔۔۔۔ کیا مطلب؟“ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

”جشیہ کو اور بی بلاک کی اس لڑکی کو جس سے ملاقات کے لیے مقتول اپنی موت تک راتوں کو چھپ چھپ کر بلڈنگ

کی چھت پر جایا کرتا تھا۔۔۔۔۔۔“

”یہ آپ بڑی عجیب بات بتا رہے ہیں۔“ وہ معنوی الجھن کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”جب چھت کی چابی میرے اور چوکیدار کے سوا اور کسی کے پاس نہیں تو پھر کوئی چھت پر کیسے جا سکتا ہے۔“

”مقتول اشتیاقی بلڈنگ کی چھت پر بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔“ میں نے قدرے چارہ انداز میں کہا۔ ”جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دودھ کی رات چھت پر گیا تھا۔ بند دروازوں والی چھت پر کیسے گیا تھا۔“

اس معاملے کو بعد میں بھی لے لیا جا سکتا ہے۔ کیا تھا تو یقیناً وہ اپنی محبوبہ سے ملاقات کے لیے وہاں پہنچا ہوگا لیکن ممکن ہے، محبوبہ سے پہلے اس کا باپ وہاں پہنچ گیا ہو۔ یا عین ممکن ہے کہ محبوبہ کا باپ پہلے سے وہاں، کسی تاریک کونے میں گھات لگا بیٹھا ہو۔ اسے پیچھے ہی موقع ملا، اس نے مقتول کی بے خبری میں وزنی ہتھوڑے کا وارڈ کر کے اس کی زندگی کا چراغ بجھ کر دیا۔“ میں ٹانگیں نہیں اٹھا۔

”کہانی اچھی ہے۔“ وہ جھوک جھٹکے ہوئے بولا۔ ”لیکن وکیل صاحب! یہ سب کچھ جو آپ نے بیان کیا ہے، ممکن نہیں۔“

”صدر صاحب! اکمال کر رہے ہیں آپ!“ میں نے مزید پیش کرنے والے انداز میں کہا۔ ”ایسا غضب نہ کریں، یہ سب تو عملاً پیش آچکا۔ لیکن مجھے ایک بات پر سخت حیرت ہے صدر صاحب۔۔۔۔۔۔“

”کس بات پر؟“

”اس بات پر کہ آپ نے ابھی تک اس لڑکی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا جس سے ملاقات کی خواہش میں بے چارہ مقتول اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”کیوں صدر صاحب۔۔۔۔۔۔ ایسا کیوں؟“

”اگر۔۔۔۔۔۔ میں نے نہیں۔۔۔۔۔۔ پوچھا تو آپ ہی بتا دیں۔“ وہ گریزاں کر بولا۔

”آپ کو بار بار۔“ صدر صاحب“ کہتے ہوئے مجھے بڑا عجیب سا لگ رہا ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں صدر پاکستان سے مخاطب ہوں۔“

”تو میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ وہ خاصی رکھائی سے بولا۔

”نہیں، آپ مجھے اس بات کی اجازت دے دیں کہ میں۔۔۔۔۔۔ صدر صاحب“ کے بجائے آپ کو آپ کے اصل نام

سے مخاطب کر سکوں۔“ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔ ”آپ کی اس اجازت سے میرا مسئلہ۔۔۔۔۔۔ بلکہ اس عدالت کے بہت سارے مسائل حل ہو جائیں گے حالانکہ عدالت پہلے سے آپ کا نام جانتی ہے۔ یہ تو میری ہی کوتاہی ہے کہ میں اب تک۔“ صدر صاحب، صدر صاحب“ کی رٹ لگائے ہوئے ہوں، ایک مرتبہ بھی میں نے آپ کو آپ کے نام سے نہیں پکارا۔“

”تو یہ شوق اب پورا کر لیں۔“ بادل ناخواستہ اس کی زبان سے نکلا۔

”کفایت اللہ عرف کنفی صاحب!“ میں نے ایک ایک لفظ پر سنسنی خیز دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ آپ کو اس بات کا کب احساس ہوا کہ مقتول نے آپ کی صاحبزادی سونیا کو اپنی محبت کے سہرے جال میں پھنسا لیا تھا۔۔۔۔۔۔؟“

میرے اس اکتشاف انگیز استفسار سے عدالت کے اندر کچھ سناٹا غاری ہو گیا۔ فحش کی نظر دیکھنا ہاں میں کھڑے کنفی المعروف پ۔ف۔ صدر صاحب“ کے ہونٹوں پر لگی ہوئی تھی کہ وہ کبھی وہاں سے کیا جواب آتا ہے۔

چند لمحات تک کنفی سکتے کی کیفیت میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پھر اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں میں کسی خوف ناک ڈالنے کے آثار نمودار ہوئے، پھر اس کے لب تر تھرا اٹھے اور ان کے کپکپاتے ہوئے لبوں سے کچھ سے مشابہ آواز خارج ہوئی۔

وہ میری جانب انگلی اٹھاتے ہوئے دھمکی آیز لہجے میں بولا۔ ”وکیل کے بیٹے۔۔۔۔۔۔ میں تمہاری۔۔۔۔۔۔ زبان کو گوندی سے۔۔۔۔۔۔ کچھ نکالوں گا۔ تم جانتے نہیں ہو کہ میں۔۔۔۔۔۔ ک میں۔۔۔۔۔۔!“

کف اڑانے والے انداز میں اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑی اور بے ساختہ وینس ہاؤس سے باہر نکل آیا۔ اس کے دھمکی دار خطرناک الفاظ کی روشنی میں مجھ سمیت، عدالت کے کمرے میں موجود ہر شخص یہی سمجھا کہ وہ مجھ پر حملہ آور ہونے آ رہا ہے۔ میں ذہنی طور پر ہر ایمر جنسی کے لیے تیار ہونے کے ساتھ ہی احتیاطاً ایک محفوظ گوشے کی جانب سرک گیا لیکن ایسا کچھ بھی پیش نہ آیا جس کی ہم سب لوگ توقع کر رہے تھے۔

استغاثہ کا گواہ کفایت اللہ عرف کنفی یعنی بلڈنگ کا صدر وینس ہاؤس سے باہر آنے کے بعد عدالت میں عدالت کے دروازے کی سمت ٹپک گیا۔ یہ فراہم ایک حکم کھانا کوشش



پھوپسی زاد سال

منظر امام

کچھ رشتے جی جان سے پیار ہوتے ہیں مگر... کچھ جی کا جنجال بن جاتے ہیں۔ یہ رشتہ بھی اس کے گلے کی پڈی بن گیا تھا۔ جسے اگلنے کی اس کو اجازت نہ تھی اور نگلنے کے لیے اس کا ضمیر تیار نہ تھا۔ ایسے میں اگر کوئی پاگل پن کی انتہا کو چھو لے تو عجب نہیں۔

ذرا سی جان پہچان..... بن گئی وہاں جان

ایک بار میں چلتے چلتے گر پڑا جس طرح بہت لوگ گر جاتے ہیں، غور کرنا کہ یا کسی چیز سے الجھ کر۔ اسی طرح میں بھی گر گیا تھا اور یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں سنبھل کر اٹھ بیٹھا اور ابھی اپنے گرد آلود کپڑوں کو ہٹا رہی رہا تھا کہ ایک صاحب میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرے پر ہلکی مگر مندی تھی۔ ”کیا ہوا“

جناب! خیریت تو ہے؟۔ چوت تو نہیں آئی؟“

”نہیں جناب، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے اظہار کیا تھا۔

”دیکھیں چوت گئی ہے تو تکلف نہ کریں، بتا دیں۔“

چوت کو چھپا ہوا کوئی شخص ہی نہیں ہے۔ آگے جا کر پرالیم ہو جاتی ہے۔“

وزنی ہتھوڑے کی ضرب لگا کر اس کا کام تمام کر دیا۔ یہ مقدمہ ایک آدھ ہفتی تک مزید چلا۔ پھر جلی عدالت کے منتظرانہ فیصلے کے بعد، ایک ہی سزا پا کر قید چلا گیا۔ اس روز جب وہ مجھے جی جن کے قبرستان کے باہر نظر آیا اور وہ بھی مست است حالت میں تو میں اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

میں اپنے جیس کی تسکین کے لیے اگلے روز فوراً اپارٹمنٹس بھی گیا تاکہ یہ جان سکوں کہ کتنی جلی سے کب باہر آیا اور اس کی ایسی حالت کا سبب کیا ہے؟ لیکن مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ نور اپارٹمنٹس سے مجھے جو معلومات ملیں، ان کے مطابق کتنی کے قیدیل چلے جانے کے بعد سونیا کی خالہ اسے اپنے ساتھ حیدر آباد لے گئی تھی۔ نور اپارٹمنٹس والے قلیت کو فروخت کر دیا تھا اور سونیا نے اپنی خالہ صنفیہ کے ساتھ حیدر آباد میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ اس واقعے سے کافی عرصہ پہلے سونیا کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ باپ کے قتل چلے جانے کے بعد وہ اپنی تودہ نہیں سکتی تھی لہذا اس کی خالہ کا فیصلہ درست تھا۔ پھر بھی وہ نور اپارٹمنٹس کی طرف نہیں آئی اور نہ ہی وہ لوگ اس کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔ میں مایوس ہو کر وہاں سے واپس لوٹ آیا تھا۔

میں اگر یہ ضائع ہی لیتا کہ مجھے کتنی کی حیدر آباد والی سالی کا اپنے ریس ڈھونڈ کر ہی دم لیتا ہے تو یہ کوئی ایسا ممکن کام بھی نہیں تھا لیکن کمزوریاں زمانہ نے مجھے اس تکبیر سے میں پڑنے کی اجازت نہیں دی اور میں خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ میں تو خاموش ہو کر بیٹھ گیا ہوں لیکن آپ... خصوصاً کراچی والے قارئین اپنی آنکھیں کھلی رکھیں گے۔ کتنی میری گاڑی پر دو ہتھ اور ہتھار سید کرنے کے بعد تو ایک طرف بڑھ گیا تھا۔ میرے سوال کا جواب دینے کی اس نے ضرورت محسوس نہیں کی تھی مگر ہو سکتا ہے، آپ اس سے کچھ اگلوانے میں کامیاب ہو جائیں۔ اگر وہ ناگفتار فیض آپ کو کراچی کی کسی سڑک پر دکھائی دے تو آپ اسے روک کر یہ سوال ضرور کیجیے گا۔

اس طرح ممکن ہے، آپ اس کہانی کا آخری باب پڑھنے میں کامیاب ہو جائیں جو ہو سکتا ہے، پوری کہانی سے زیادہ دلچسپ اور سسٹمی فیئر ہو..... اور یہ بھی میں ممکن ہے کہ آپ کے کسی سوال کے جواب میں کتنی بھڑک کر وہ خطرناک تجربہ براہ راست آپ ہی پر کر ڈالے جو اس نے میری گاڑی پر کیا تھا۔

آپ کو جو بھی کرتا ہے، اپنے رسک اور صوابدید پر کرتا ہے.....!

(تحریر: شام بٹ)

تھی۔ اگلے ہی لمحے مخصوص عدالتی عملہ فوراً حرکت میں آ گیا۔ اس سے پہلے کہ کتنی عدالت کے کمرے سے باہر نکلے میں کامیاب ہو پاؤں، حذر کرنا بلا حملے نے فوری ہنگامی کارروائی کر کے اسے دیوچ لیا، پھر عدالت کے حکم پر اسے باقاعدہ گرفتار کر لیا گیا۔

☆☆☆

آجہ ہفتی پر عدالت نے میرے موہل کو باعزت بری کر دیا۔

جب اصل مجرم پولیس کی کسٹڈی میں پہنچ جاتا ہے تو اس سے اقبال جرم کرانے میں جنگ اور پھگری کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ کتنی نے جس اعزاز میں عدالت سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی وہ اعزاز اس کے مجرم ہونے کی روشن دلیل تھا۔ میں نے غیر محسوس طریقے سے جرح کی پھگری کی مدد سے اسے جس صفائی سے طلال کیا تھا اس پر وہ شہنا کر رہ گیا تھا اور اس کے اسی جتنی رد عمل نے جج کو بھی اس کی گرفتاری پر اکسایا تھا۔ جب کتنی نے پولیس کی مہمان داری کے دوران میں اشتیاق کے قتل کا اقرار کر لیا تو پھر میرے موہل کی قید کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی بے گناہی ثابت ہوتے ہی عدالت نے اسے رہائی کی نوید سنائی۔

کتنی نے اپنی گرفتاری کے بعد، اقبال جرم کرتے ہوئے پولیس کو جو بیان دیا اس کے مطابق وہ اشتیاق اور اپنی بیٹی کے معاملے سے واقف ہو گیا تھا لیکن اس نے اشتیاق یا سونیا کو سمجھانے کا تکلف نہیں کیا۔ وہ اشتیاق کی سابقہ سہری سے واقف تھا لہذا بدنامی کی کوئی صورت حال پیدا ہونے سے پہلے ہی اس نے اشتیاق کا کاغذ صاف کرنے کا پروگرام طے کر لیا۔

وہ یہ تحقیق کر چکا تھا کہ سونیا نے اس کی چھت والی چابی چرا کر اشتیاق کی مدد سے اس کی ڈھنگی چابی بنوائی تھی جو کہ اشتیاق کے پاس رہتی تھی۔ انہیں جب بھی ملنا ہوتا تھا، رات کی تاریکی میں اشتیاق چپکے سے چھت پر پہنچ جاتا تھا، تھوڑی دیر کے بعد سونیا بھی اس کے پاس ہوتی۔

کتنی نے ان کے معمولات کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور قوت عدالت کو اپنے فیصلے پر عمل کے لیے چن لیا۔ اس کی تحقیق کے مطابق، اس رات اشتیاق اور کتنی کی بیٹی سونیا کو چھت پر ملاقات کرنا تھی۔ وہ ان کے کمن کے وقت سے پہلے ہی چھت پر پہنچ گیا اور وزنی ہتھوڑے سمیت ایک تاریک اور محفوظ گوشے میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر جیسے ہی اشتیاق وہاں پہنچی کہ پرانی چار پائی پر بیٹھا، کتنی نے اس کے سر پر

”ارے نہیں جناب۔“ میں نے ان کی ہمدردی سے متاثر ہو کر کہا۔

”جناب عالی! آپ کے چہرے کے تاثرات بتا رہے ہیں کہ آپ کو اندرونی طور پر تکلیف ہو رہی ہے۔ اچھا یہ بتائیں، آپ کو سرگی کا عارضہ تو نہیں ہے؟“

”کبھی باتیں کر رہے ہیں؟ مجھے کوئی سرگی ورنہ نہیں ہے۔“ میں نے تیرے لیے میں کہا۔

”یہ قصداً اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا بلڈ پریشر پانی رہتا ہے اس لیے آپ پکرا کر گر پڑے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ مجھے ایسی کوئی پرابلم نہیں ہے۔“ میں بھلا کر بولا۔

”مجھے تو مصیبت سے کہ بعض بیماریوں کا پتا بھی نہیں چلتا۔ خاموشی کا طبع کی طرح ہوتی ہیں، اچانک ہی بندے کو کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ آپ کی آنکھیں بتا رہی ہیں کہ آپ بیمار رہتے ہیں۔“

”خدا کے بندے! اب میں کیسے یقین دلاؤں؟“

”مجھے یقین دلانے کے لیے آپ کو میرے ساتھ کسی کلینک چل کر ٹیسٹ کروانے ہوں گے۔“ اس نے کہا۔

”آپ یقین کریں یہ میری فطرت ہے کہ میں کسی مظلوم کو یوں تکلیف میں نہیں چھوڑ سکتا۔“

”او بھائی، میں کوئی مظلوم و ظالم نہیں ہوں۔“ مجھے اب غصہ آ رہا تھا۔

”جو آدمی اندر سے بیمار ہو، میں اسے مظلوم ہی سمجھتا ہوں۔“ اس نے مستقل ذہنی کامیابی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”خدا کے لیے میری جان چھوڑ دیں۔“ میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن آپ کی باتوں سے بیمار ہو جاؤں گا۔“

”ہاں بھئی۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ وہ اچانک بہت اداس ہو گیا تھا۔ ”نیک کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔ ایک میں ہی پاگل ہوں جو خود بخود ہر ایک سے ہمدردی کرتا پھرتا ہوں۔ ارے میرا کیا ہے۔ دنیا چاہے جائے مجاز میں۔“ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ”اچھا جناب، اگر میری باتوں سے تکلیف پہنچی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔“

اس وقت مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ کتنا بھلا انسان تھا۔ آج کے دور میں ایسے انسان کہاں ہوتے ہیں۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”معاف کرنا بھائی۔ میری باتوں سے آپ ہرث ہوئے۔“

”تو پھر آپ میری بات مانیں گے نا۔“ وہ ایک دم سے خوش ہو گیا تھا۔

”کون سی بات؟“

”مجھے چیک اپ کروانے کی۔ میرے ساتھ چل کر بلڈ پریشر وغیرہ چیک کروالیں۔ یقین کریں میری تسلی ہو جائے گی۔ میں سکون سے گھر چاکوں گا۔“

”ٹھیک ہے بھائی۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔

”چلو، چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔“

اتفاق سے کلینک بھی سامنے ہی تھا۔ اس نے زبردستی میرا بلڈ پریشر چیک کروایا جو نارمل سے کچھ زیادہ تھا۔

”دیکھا میں نے بتایا تھا نا کہ آپ کے ساتھ بلڈ پریشر کی پرابلم ہے۔“

”نہیں یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”پریشر اپنا ڈاؤن ہوتا رہتا ہے۔“

”ڈاکٹر صاحب! آپ ان کا بلڈ بھی ٹیسٹ کر لیں۔“ اس نے کہا۔ ”کم از کم یہ پتا تو چلے کہ ان کا بلڈ گروپ کیا ہے؟“

”بھئی اب اس کی کیا ضرورت ہے؟“ میں جھلا کر بولا۔ ”ویسے میں جانتا ہوں کہ میرا بلڈ گروپ او یا بیو ہے۔“

”ڈاکٹر صاحب دوسری چیزیں بھی چیک کریں۔“ شوکر کو لیسٹر دل وغیرہ۔“

”دیکھیں، یہ چیزیں اس طرح اچانک چیک نہیں ہو سکتیں۔“ ڈاکٹر نے سمجھایا۔ ”کولیسٹرول کے لیے بارہ مہینوں کا فائدہ ہوتا ہے۔ شوکر بھی فائدے کے بعد چیک کی جاتی ہے۔“

”ارے بھائی۔ یہ بتاؤ کہ تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟“ میں نے کہا۔ ”تمہارے کہنے پر میں نے بلڈ پریشر چیک کروالیا۔ اب اور کیا چاہتے ہو؟“

”ٹھیک ہے بھائی صاحب۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”اب یہ بتائیں کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں اپنے دفتر جا رہا تھا، تمہاری وجہ سے خود بخود اتنا لیٹ ہو گیا ہوں۔“

”چلیں۔“ میں آپ کو دفتر تک پہنچا دیتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”خدا کے بندے! میرا دفتر سامنے ہی ہے۔ میں تمہاری مدد کے بغیر بھی جاسکتا ہوں۔“

”سوال یہ نہیں پیدا ہوتا کہ میں آپ کو اس طرح جانے دوں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ چاہے تو مجھے گالیاں دیں۔ میرے غلوں کا مذاق اڑائیں۔ کچھ بھی کریں۔ میں

آپ کو دفتر پہنچا کر ہی رہوں گا۔“

”بھئی آدمی تھا۔ کم بخت نے میرا دماغ خراب کر کے رکھ دیا تھا۔ اس سے جان چھڑانے کی کوئی ترکیب مجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اسی لیے مجبوراً اپنے دفتر لانا ہی پڑا جو وہاں سے قریب ہی تھا۔“

”اب تو میں دفتر پہنچ چکا ہوں، اب تم جاؤ۔“ میں نے کہا۔

”چلا جاؤں گا لیکن پہلے دفتر والوں کو تو بتا دوں کہ آپ کے ساتھ کیا پرابلم ہے؟“

”کیا پرابلم ہے میرے ساتھ۔ کیوں میرا دماغ خراب کر رکھا ہے تو نے؟“ اب تو واقعی مجھے بے تحاشا غصہ آنے لگا تھا۔ ”پاگل بنا کر رکھ دیا ہے۔“

”دیکھا، میں نے کہا تھا نا کہ آپ کے اندر کوئی خرابی ہے۔ یہ غصہ اسی بات کی علامت ہے۔ کسی خفیہ بیماری کے اثرات آپ کے دماغ پر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو کسی نئی انسٹیکر کرانا ہوگا۔“

”اے دنغ ہو جا سر درد!“

میری چیخ پکار سن کر دفتر والے ہمارے آس پاس جمع ہو گئے تھے اور اس سے پہلے کہ میں کچھ بتاؤں اس کم بخت نے بولنا شروع کر دیا۔ ”جناب، یہ راستہ چلتے ہوئے گر پڑے تھے۔ میں انہیں کلینک لے گیا تھا۔ وہاں ڈاکٹر نے ان کا چیک اپ کیا۔۔۔ فی الحال تو کوئی ایسا مرض نہیں بتایا لیکن دماغ پر گہری کے اثرات ہیں۔ ذرا سی دیر میں ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں۔“

”اے جاگم بخت درد نہ جان سے مار دوں گا۔“ میں نے پک کر اس کا کریاں پھرایا۔

”دیکھا، آپ لوگ خود دیکھ لیں، ان کی کیا حالت ہے؟“ اس نے فریاد کی۔

لوگوں نے مجھے گھمٹ کر ایک طرف کر دیا۔ دل چاہا رہا تھا کہ کم بخت کا سر پھاڑ دوں۔ وہ اس وقت بھی میرے دفتر والوں کو میری نہ جانے کون کون سی بیماریوں کے بارے میں بتاتے جا رہا تھا۔

”دفتر کا باس بھی یہ شور سن کر چلا آیا تھا۔ اس نے صورت حال معلوم کرنے کے بعد مجھ سے کہا۔ ”دیکھیں دیکھ صاحب۔ اگر آپ بھتر نہیں محسوس کر رہے تو کچھ دنوں کے لیے پھنسیاں لیں۔“

”ارے نہیں سر، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ کم بخت، نا محمول انسان نہ جانے کیوں میرے

پیچھے پڑ گیا ہے؟“

”اب آپ لوگ خود دیکھ لیں۔“ وہ بلند آواز میں بولا۔ ”کیا کوئی صحت مند انسان کسی شریف آدمی کو ایسے گالیاں دے سکتا ہے لیکن اس میں ان کا قصور نہیں ہے۔ یہ گیس ہے جو ان کے دل سے ہوتی ہوئی دماغ تک آگئی ہے۔ اگر ان کی یہی حالت رہی تو ان کا زور بڑیک ڈاؤن بھی ہو سکتا ہے۔“

”لعنت ہے اس آدمی پر سر۔“ میں زور سے چیلا۔

”اس کم بخت نے۔“

”بس بس۔“ باس نے مجھے بولنے سے روک دیا۔

”ظاہر ہو گیا کہ تم واقعی بیمار ہو۔“

مجھے اس دوران میں موقع مل گیا تھا۔ میں نے ایک کرسی اٹھا کر اس مردود پر دے ماری۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ دوسری طرف دفتر والوں نے مجھے قابو کر لیا۔ باس نے فون کر کے ایمبولینس منگوا لی تھی۔ اس کے لیے نہیں بلکہ میرے لیے۔ اس کم بخت کی تو وہی وقت مرہم پٹی کر دی گئی تھی جبکہ پورا دفتر مجھے لے کر ذہنی امراض کے اسپتال پہنچ گیا۔

دفتر والوں کے ساتھ ساتھ وہ بھی چلا آیا تھا اور بار بار بولے جا رہا تھا۔ ”آپ لوگ یقین کریں کہ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے کیونکہ ان کی ذہنی حالت ہی اس قابل نہیں ہے۔“

ڈاکٹر کے کمرے میں بھی مجھے اس پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا تھا لیکن میں اسے صرف ایک ہی ہاتھ مار سکا تھا کہ لوگوں نے مجھے پھر قابو میں کر لیا۔ ڈاکٹر نے مجھے بے ہوشی کا انجکشن لگا دیا تھا۔

پھر مجھے ہوش نہیں کی میرے ساتھ کیا ہوا ہوگا؟

جب ہوش آیا تو ایک آدمی مجھ سے کہہ رہا تھا۔ ”سنو تم اکبر اعظم کے پھوپھی زاد سالے ہو نا۔“

”نہیں تو۔“ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پتا نہیں کون سی جگہ تھی؟ ہر طرف عجیب جسم کے لوگ تھے، آڑے ترچھے، کوئی ہنس رہا تھا، کوئی رورہا تھا، کوئی گارہا تھا۔

”میرے خدا! ذرا سی دیر میں سب کچھ مجھ میں آ گیا۔ مجھے پاگل خانے پہنچا دیا گیا تھا۔“

جس آدمی نے مجھے اکبر اعظم کا پھوپھی زاد سالا قرار دیا تھا۔ وہ زور زور سے تالیاں بجاتا تھا۔ ”جاگ گیا، جاگ گیا۔ اکبر اعظم کا سالا جاگ گیا۔“

وہ ایک عجیب دشت ناک جگہ تھی۔ لوہے کی سلاخوں

والے کمرے، جیسے قیدیوں کے لیے ہوتے ہیں۔ میرے دفتر والے مجھے یہاں پہنچا گئے تھے اور یہ سب اسی مردودی وجہ سے ہوا تھا۔ میرا تصور کیا تھا، صرف بیکی تاکہ میں چلتے چلتے گر گیا تھا لیکن اس کم بخت نے تو بات کا جھوٹا کر مجھے پاگل خانے میں بھرتی کر دیا تھا۔ ایسا آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔

میرے سامنے سے ایک ڈاکٹر گزر رہا تھا۔ یعنی سلاخوں کی دوسری طرف سے سفید کوٹ پہنے ہوئے۔ ”جناب! میری بات سنیں، پلیز!“ میں نے لکھا جت سے اسے مخاطب کیا۔

ڈاکٹر نے کہا تو کچھ نہیں لیکن دور کر دیا تھا۔

”جناب! آپ یقین کریں کہ میں پاگل نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں نے یقین کر لیا کہ تم پاگل نہیں ہو۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”آپ مجھے کی کوشش کریں۔ مجھے کسی غلطی میں یہاں لے آئے ہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”ورنہ میں اتنا ہی سچ الدماغ ہوں جتنے آپ ہو سکتے ہیں۔“

”یہاں سب یہی کہتے ہیں۔ کوئی پاگل اپنے آپ کو پاگل نہیں کہے گا۔“

”آپ پلیز۔ میری پوری کہانی تو سن لیں۔“

”ہمارے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ تمہاری کہانی سن رہے ہیں۔“

اس دوران میں وہ پاگل بھی ہمارے قریب آ گیا جس نے مجھے اکبر اعظم کا پھولی زاد سال بتایا تھا۔ وہ ڈاکٹر سے کہہ رہا تھا۔ ”اس کی باتوں میں مت آنا۔ یہ اکبر اعظم کا پھولی زاد سال ہے۔ میں نے خود اسے اکبر اعظم کے ساتھ مونک چلیاں کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔“

”جھوٹ بولتا ہے یہ۔ میں مونک چلیاں نہیں کھاتا۔“ میں نے غصے اور جھونک میں آ کر یہ بول گیا تھا۔

ڈاکٹر مسکراتے ہوئے بڑھ گیا۔ میں جھلا کر اس پاگل سے بھڑ گیا۔ ”اب تو کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے؟ ایک تو وہ مردود ہے؟ جس نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا ہے اور ایک تو ہے جو مجھے اکبر اعظم کا سال بتا رہا ہے۔ خدا کے لیے میری جان چھوڑ دے بھائی ورنہ میں واقعی پاگل ہو جاؤں گا۔“

”ارے سنو، سنو۔“ اس نے دوسروں کو بتانا شروع کر دیا۔ ”یہ اکبر اعظم کا پھولی زاد سال ہے۔“

میں اسے بکواس کرتے ہوئے چھوڑ کر ایک طرف

آ کر بیٹھ گیا۔ میں پوری صورت حال کا تجزیہ کرنا چاہ رہا تھا۔ کد آ کر میرے ساتھ یہ کیا تھا ہوا ہے؟

اس آدمی کا ملنا، اس کا بھردی جتنا، ڈاکٹر کے پاس لے جانا، پھر دفتر میں اس کا دوا دیا کرنا۔ آخر کیا تھا یہ سب۔ کیا میرے خلاف کوئی سازش تھی؟

لیکن کیوں، میرے خلاف کون سازش کرنے لگا؟ میرے پاس تھا ہی کیا؟ کم بخت دفتر والوں نے بھی کوئی مروت نہیں برتی اور مجھے پاگل خانے بھیجا دیا۔

میرے گھر والوں کو شاید خبر نہ ہو۔ مجھے سب سے زیادہ وہ باب کی فکر تھی۔ اتنی مشکلوں سے تو ایک لڑکی سے محبت کرنے کا موقع ملتا تھا اور اب اس پاگل پن کے پھر میں وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔

اب میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ اس پاگل خانے سے نکلنے کا تھا۔

لیکن کیسے نکلا جائے؟

میں نے یہ سن کر کھانسا کہ پاگل خانہ دراصل دلدل کی طرح ہوتا ہے۔ دلدل سے نکلنے کے لیے جتنے ہاتھ پاؤں چلائیں گے۔ اتنے ہی اس میں دھستے چلے جائیں گے۔

بہتر یہی تھا کہ میں بالکل خاموشی اختیار کر لوں۔ اپنے آپ کو متعدد دست ظاہری نہ کروں۔ پھر موقع پا کر یہاں سے بھاگ نکلوں۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے اپنے بڑے بھائی اور ان کی بیوی یعنی اپنی بھائی کو ڈاکٹر کے ساتھ آتے ہوئے دیکھا۔ یعنی دفتر والوں نے یہ خبر گھرمک پہنچا دی تھی۔ اسی لیے وہ مجھ سے ملنے آئے تھے۔

انہیں دیکھتے ہی میں جلدی سے سلاخوں کے پاس آ گیا۔ ”ارے ندیم بھائی۔ اچھا ہوا آپ آ گئے۔ میں تو عجیب مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ دفتر والوں نے میرے ساتھ یہ عجیب حرکت کی ہے۔ پلیز! اب مجھے نکالیں یہاں سے۔“

”یہ باتیں تو بالکل سچ کر رہا ہے۔“ ندیم بھائی نے ڈاکٹر سے کہا۔

”اس قسم کے ذہنی مریض کبھی بھی بالکل صحیح باتیں کرنے لگتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔ ”لیکن جب ان کی ذہنی روایتی ہے تو پھر بہت خطرناک ہو جاتے ہیں۔“

”ندیم بھائی۔ یہ ڈاکٹر تو جاہل معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ اس کی باتوں میں نہ آئیں۔“

”دیکھا آپ نے؟“ میری بھائی نے اپنے شوہر یعنی ندیم بھائی کو مخاطب کیا۔ ”اب یہی دیکھ لیں کہ بے چارے

ڈاکٹر صاحب کو جاہل کہہ رہا ہے جیسے یہ خود کوئی بہت بڑا قابل ہے۔“

میں تھلا کر رہ گیا۔ ”بھائی تم تو یہی چاہتی ہو کہ کسی طرح میرا پتا صاف ہو جائے اور تم پورے گھر پر قبضہ کر کے بیٹھ جاؤ۔“ میں نے کہا۔

”وسیم!“ ندیم بھائی غصے سے بولے۔ ”شرم نہیں آتی، اپنی بھائی کے لیے کیا بول رہے ہو؟“

”ارے کیا ہوا ہے آپ کو؟“ بھائی نے ندیم بھائی کا بازو تھام لیا۔ ”ایکس بے چارے پاگل کی بات کا برا مان رہے ہیں۔ مجھے تو اسے دیکھ دیکھ کر افسوس ہو رہا ہے۔ دل خون کے آنسو رو رہے ہیں۔“

”پلیز بھائی۔ اپنی مکاری اپنے پاس ہی رہے دو۔“ میں نے بلبل کر کہا۔

”پلیس آپ لوگ۔“ ڈاکٹر نے ان دونوں سے کہا۔

”اب یہ Rash ہوتا جا رہا ہے، ایسا نہ ہو کہ آپ دونوں کو یا اپنے آپ کو نقصان پہنچا لے۔“

پھر وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ میں انہیں آواز میں ہی دیتا رہ گیا۔ اس وقت اپنی حالت پر پہلی بار رونا آ رہا تھا۔

ایک بے بسی میں نے پہلے ہی محسوس نہیں کی ہوگی۔

اچانک کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا، یہ وہی پاگل تھا جس نے مجھے اکبر اعظم کا پھولی زاد سال بتا دیا تھا۔ ”کیا بات ہے۔ کیوں رو رہے ہو؟“ اس وقت اس کا بوجھ یک دم سنجیدہ تھا۔ معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ پاگل بھی ہو سکتا ہے۔

”ابے جی یار میرا دماغ مت خراب کر۔“ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”ماراض مت ہو۔ میں اب تمہیں اکبر اعظم کا پھولی زاد سال انہیں کہوں گا۔ آؤ میرے ساتھ۔“ وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے ایک طرف لے آیا۔ ”بیٹھے جاؤ۔“ اس نے کہا۔

میں اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے بیٹھ گیا۔ وہ اس وقت پاگل تو معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ”دیکھو میں ایک بات تمہارا ہوں۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اپنے آپ کو عقل مند اور سچ ثابت نہ کرو۔ ورنہ یہاں سے بھی نہیں نکل سکو گے۔ تمہاری ہر کوشش بے کار جائے گی۔“

”پہلے بتاؤ۔ کیا تم پاگل نہیں ہو؟“

”نہیں، میں نارمل ہوں۔ بالکل تمہاری طرح۔“ اس نے کہا۔ ”بس حادثاتی طور پر یہاں آ کر پھنس گیا ہوں اور اب یہاں سے نکلنے کی چلائنگ کر رہا ہوں اور دیکھ لیتا۔“

بہت جلد میں یہاں سے نکل جاؤں گا لیکن تم کس طرح یہاں پھنس گئے؟“

میں نے اسے اس آدمی کے بارے میں بتا دیا کہ اس کم بخت کی وجہ سے میں اس حال کو پہنچا ہوں۔ میری بات سن کر وہ دیر تک ہنسا رہا۔ ”بس! تم اب بے فکر ہو جاؤ۔ میں اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی یہاں سے نکال لوں گا۔“

”تمہاری بہت مہربانی ہوگی بھائی؟ لیکن یہ کام کیسے ہوگا؟“

”تم اس کی فکر مت کرو۔“ اس نے کہا، پھر اچانک کہنے لگا۔ ”دیکھو ڈاکٹر اور دوسرے لوگ اس طرف آ رہے ہیں! تم بھی میری طرح شروع ہو جاؤ۔“

”چلو خدیک ہے۔“ میں نے بھی اسٹاف کو آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

”تم کون ہو، بتاؤ کون ہو تم؟“

”اکبر اعظم کا پھولی زاد سال ہوں۔ میری اماں کا نام سکندر اعظم تھا۔ میرے خالو کی دو بیٹیاں تھیں۔ جن سے وہ دیکھا کرتے تھے۔ میرے بچپن کی اماں بچوں کی پیداوار سے پہلے مر گئی تھی۔“

”اور میں تارزن ہوں۔ تارزن میرے باپ کا نام بھی یہی تھا۔ میرا پورا خاندان تارزن ہے۔ میں قلم کمال فروش کا ہیرو بھی ہوں۔“

”اچھا دیر میں اسٹاف کے لوگ ہم دونوں کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔“

”بس بھائی، یہ پریکٹس جاری رکھو۔“ اس نے کہا۔ ”اور میرے ساتھ ساتھ رہنا میں تمہیں دوسرے پاگلوں سے بچاتا رہوں گا ورنہ سب تمہاری زندگی عذاب کر دیں گے۔“

”ایک بات بتاؤ۔ یہاں کھانے پینے کا کیا بندوبست ہوتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سب ہو جاتا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”مقررہ وقت پر سب کچھ مل جاتا ہے۔“

اچانک کسی کے رونے کی آواز نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک بوڑھا شخصوں میں سر دیے بری طرح رو رہا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اس بوڑھے کے پاس پہنچ گئے۔ وہ ہمیں دیکھ کر بھڑکنے لگا تھا۔ ”نہیں، وہو میرے پاس سے۔ میں پاگل نہیں ہوں، ہو۔“

”بڑے میاں! تم پریشان مت ہو۔ ہم تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”ہم بھی تمہاری

طرح ہیں۔

”مجھے میرے بچوں نے یہاں داخل کر دیا ہے۔“ اس کی آواز میں بے پناہ کرب تھا۔ ”کیونکہ میں شاید ان پر بوجھ بن گیا تھا۔ اب انہوں نے بوجھ سے چھٹکارا پالیا ہے۔ وہ بہت خوش ہوں گے، بہت خوش۔“

میں کانپ کر رہ گیا۔ خدا یا! یہ کیسا ظلم تھا؟ ایک باپ اپنی اولاد پر بوجھ خیال کیا جا رہا تھا۔ اولاد اسے پاگل خانے پہنچا چکی تھی۔ اس کی یہ عمر ایسی تھی کہ وہ آرام سے گھر میں بیٹھا اور سب اس کی خدمت کرتے لیکن یہاں اس کا یہ حال ہو رہا تھا۔

”اس پاگل خانے میں ایسی بے شمار کہانیاں ہیں۔“ اس آدمی نے کہا جو میرے ساتھ تھا۔ ”ہم ایک انتہائی خود غرض اور بے حس معاشرے میں زندہ ہیں۔ یہاں مرفیوں بھی لڑکھو جاتی ہیں۔ گلاب کا پھول لپک لپک کر گرنے لگا تا ہے۔“

وہ اچانک ہی پٹری سے اتر کر اول قول بولنے لگا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسٹاف کے کچھ اور لوگ بھی دکھائی دے گئے تھے اس لیے اس نے بکواس شروع کر دی تھی۔

”یاد تم کو سردا دو گے۔“ اس نے کہا۔ ”میرے ساتھ ساتھ تم بھی شروع ہو جایا کرو ورنہ یہاں سے لٹکانا مشکل ہو جائے گا۔“

”بھائی! مجھے ابھی پاگل بننے کی پریکٹس نہیں ہوئی ہے۔“ میں نے بتایا۔

”کچھ نہیں تو کم از کم جتنے ہی رہا کرو۔“ اس نے بتایا۔

”کچھ تو چاہیے تم پاگل ہو۔“ ہم اس بوڑھے کو چھوڑ کر ایک طرف بڑھ گئے۔ اس کی وجہ سے مجھے بہت آسانی ہوئی تھی۔ اسی کی وجہ سے کھانا وغیرہ بھی مل گیا تھا۔ دو ماہ بھی وہی گئی تھیں۔

پھر وہ کمر دکھایا گیا جس میں میرا بستر تھا۔ اس کمرے میں اور بھی کئی بستر تھے۔ معلوم ہوا کہ یہاں ایسے پاگلوں کو رکھا جاتا ہے جو خطرناک نہیں ہیں۔ مار دھاڑ والے پاگل کہیں اور رکھے جاتے تھے۔

دو دن اسی طرح گزر گئے۔ مجھے ایسا لگنے لگا جیسے میں نے برسوں گزار دیے ہوں۔ وہاں کا ایک ایک لمحہ میرے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ پوری دنیا پر غصہ آ رہا تھا۔ اپنے آپ پر، اس کم بخت پر، دفتر والوں پر، اپنے گھروالوں پر جن کا یہ حال تھا کہ مجھے پاگل سمجھ کر بھول ہی گئے تھے۔

تیسری صبح کو ایک ڈاکٹر میرے پاس آیا۔ ”کیا نام

ہے تمہارا؟“ اس نے پوچھا۔

”اود بلاؤ۔“ میں نے جواب دیا۔

”اود۔“ اس کے چہرے پر مایوسی غاری ہو گئی۔ اس نے اپنے برابر کھڑی ہوئی نرس سے کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی ذہنی پوزیشن ٹھیک نہیں ہے۔ جاؤ اس کے وزیٹر کو واپس کر دو۔“

”ارے نہیں ڈاکٹر صاحب۔ ایسا نہ کریں۔“ میں بوکھلا کر جلدی جلدی بولنے لگا۔ ”میرا نام وکسم ہے۔ میں نے اپنا نام اود بلاؤ بس مذاق میں بتایا تھا۔ کون مجھ سے ملنے آیا ہے؟ پیلیز، میری اس سے ملاقات کروادیں۔“

”کوئی ایسی سیدھی حرکت تو نہیں کرو گے؟“ ”نہیں صاحب۔ اب میں ایسا بھی پاگل نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے کیا حرکت کرنی ہے۔“ ”تو پھر آؤ میرے ساتھ۔“

ڈاکٹر مجھے اپنے کمرے میں لے آیا۔ اور یہاں وہی کم بخت موجود تھا۔ جی ہاں وہی، جس کی وجہ سے میں اس حال کو پہنچا تھا۔

وہ کم بخت پاگل خانے میں مجھ سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی میرا دماغ گھوم گیا۔ یہ ہوش ہی نہیں رہا کہ مجھے خود کو قابو میں رکھنا ہے ورنہ مجھے بہت نقصان ہو سکتا ہے۔

میں نے جھپٹ کر اس کا گریبان تھام لیا۔ ”مرد وہ۔ ذلیل انسان، کیوں آیا ہے تو۔“ میرا منشا دیکھنے؟ اب اور کتنا تباہ کرے گا مجھے بتاؤ؟

”ارے ارے یہ کیا۔ تم کیا کر رہے ہو؟“ وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹنے کی کوشش کرنے لگا۔

”میں تجھے جان سے مار دوں گا۔“ میں نے اسے ایک گھونسا رسید کر دیا۔

بس یہی میری غلطی تھی۔ ڈاکٹر اور اس کے محلے نے مجھے پکڑ لیا اور زبردستی ایک انکشن لگا کر بے ہوش کر دیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں ایک چھوٹی سی کونٹری میں پاگل اکیلا تھا۔

اس کمرے میں لوہے کی سلاخیں تھیں جس کے باہر ایک ڈاکٹر دوسرے بڑے ڈاکٹر کو میرے بارے میں رپورٹ دے رہا تھا۔

”مٹی سر۔ یہ مریض روز بروز خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑنے مرنے پر آمادہ ہے اس لیے اس کو دوسروں سے الگ رکھا گیا ہے۔“

خوبصورتی خوبصورت جلد سے جبکہ خوبصورت جلد سکن ٹونر سے وہ بھی چند سیکنڈز میں

جلد کی خوبصورتی کیلئے سب سے بہتر سکن ٹونر آج آزمائیں فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس

ہیں تو اپنے آپ کو خوبصورت بنانے کیلئے انسان صدیوں سے مختلف جتن کرتا چلا آ رہا ہے۔ خاص طور پر چہرہ تو ہر کوئی خوبصورت چاہتا ہے اس سلسلے میں بعض چہرے کی کچھ خصوصیات ورژنیں کر کے چہرے کے عضلات کو مضبوط بناتے ہیں تاکہ وہ چاک چوند اور جوان نظر آئیں۔ خاص طور پر مرد۔ جبکہ بعض چہرے پر کچھ لگا کر جلد کو نرم، ملائم اور چمکدار بناتے ہیں کہ وہ خوبصورت نظر آئیں خاص طور پر خواتین۔ ہم نے بھی اپنی تحقیقات کو اس مقصد کے حصول پر مرکوز کیا۔ یعنی جلد کی خوبصورتی کیلئے کہ جلد کو نرم ملائم اور چمکدار ہو۔ طویل تحقیق کے بعد ہم ان نتائج کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جو کہ گتے ہی دو چار سیکنڈز میں اپنا اثر دکھاتا ہے۔ یعنی جلد نرم ملائم گوری اور چمکدار ہو جاتی ہے۔ دانے اور خارش ختم ہو جاتی ہے۔ ایسا ہماری دن رات تمکا دینے والی طویل تحقیق اور محنت سے ہی ممکن ہو سکا۔ رنگ گورا کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ کسی بھی پینچ کریم سے آسانی سے رنگ گورا ہو جاتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ رنگ بھی گورا ہو۔ اور معر اثرات بھی نہ ہو۔ اگر استعمال چھوڑ دیا جائے تو چہرہ بھی خراب نہ ہو اور ابھی دیر پا ہو اس وقت مارکیٹ میں مختلف ناموں سے ملتی سستی کریمیں دستیاب ہیں جن کے اثرات سے آپ بخوبی واقف ہیں کہ استعمال کرتے رہیں تو لہجہ چھوڑ دیں تو چہرہ ایک دم خراب لہذا ہم نے اپنی تحقیق میں سب سے زیادہ توجہ اس پر دی کہ روزانہ کا استعمال بھی نہ ہو استعمال چھوڑ دیں تو چہرہ خراب بھی نہ ہو اور دیر تک رہے سو ہم اس میں کامیاب ہوئے سکن ٹونر استعمال کرنے سے جلد 5 سیکنڈز میں ہی نرم ملائم گوری اور چمکدار ایک دفعہ استعمال کا اثر میٹھوں تک اپنی ہی جلد پر ہاتھ

ہیں تو اپنے آپ کو خوبصورت بنانے کیلئے انسان صدیوں سے مختلف جتن کرتا چلا آ رہا ہے۔ خاص طور پر چہرہ تو ہر کوئی خوبصورت چاہتا ہے اس سلسلے میں بعض چہرے کی کچھ خصوصیات ورژنیں کر کے چہرے کے عضلات کو مضبوط بناتے ہیں تاکہ وہ چاک چوند اور جوان نظر آئیں۔ خاص طور پر مرد۔ جبکہ بعض چہرے پر کچھ لگا کر جلد کو نرم، ملائم اور چمکدار بناتے ہیں کہ وہ خوبصورت نظر آئیں خاص طور پر خواتین۔ ہم نے بھی اپنی تحقیقات کو اس مقصد کے حصول پر مرکوز کیا۔ یعنی جلد کی خوبصورتی کیلئے کہ جلد کو نرم ملائم اور چمکدار ہو۔ طویل تحقیق کے بعد ہم ان نتائج کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جو کہ گتے ہی دو چار سیکنڈز میں اپنا اثر دکھاتا ہے۔ یعنی جلد نرم ملائم گوری اور چمکدار ہو جاتی ہے۔ دانے اور خارش ختم ہو جاتی ہے۔ ایسا ہماری دن رات تمکا دینے والی طویل تحقیق اور محنت سے ہی ممکن ہو سکا۔ رنگ گورا کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ کسی بھی پینچ کریم سے آسانی سے رنگ گورا ہو جاتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ رنگ بھی گورا ہو۔ اور معر اثرات بھی نہ ہو۔ اگر استعمال چھوڑ دیا جائے تو چہرہ بھی خراب نہ ہو اور ابھی دیر پا ہو اس وقت مارکیٹ میں مختلف ناموں سے ملتی سستی کریمیں دستیاب ہیں جن کے اثرات سے آپ بخوبی واقف ہیں کہ استعمال کرتے رہیں تو لہجہ چھوڑ دیں تو چہرہ ایک دم خراب لہذا ہم نے اپنی تحقیق میں سب سے زیادہ توجہ اس پر دی کہ روزانہ کا استعمال بھی نہ ہو استعمال چھوڑ دیں تو چہرہ خراب بھی نہ ہو اور دیر تک رہے سو ہم اس میں کامیاب ہوئے سکن ٹونر استعمال کرنے سے جلد 5 سیکنڈز میں ہی نرم ملائم گوری اور چمکدار ایک دفعہ استعمال کا اثر میٹھوں تک اپنی ہی جلد پر ہاتھ

تیار کردہ: اے۔ کے۔ کاسکو پائڈ، مینگورہ (سوات) 042-37666818 0300-9486848

نوٹ: سکن ٹونر حقوق (پبلنگ، ڈیزائن، برڈشر، مونو گرام، کیلی گرافی بڑی مارک وغیرہ) بحق رقیق شاکر محفوظ ہیں

"ایسا کرو۔ آج اسے الیٹریک شاک دو۔" دوسرے ڈاکٹر نے کہا۔

میں چھپت کر سلاخوں کے پاس آ گیا۔ "خدا کے لیے ڈاکٹر صاحب۔ رحم کریں مجھ پر۔ میں پاگل نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے زیروقتی یہاں پہنچایا گیا ہے۔ میں ایک پڑھا لکھا اور ہوش مند انسان ہوں۔"

"تو پھر تم نے اس آدمی پر حملہ کیوں کیا تھا؟"

"جناب! مایا کی بخت کی وجہ سے میں اس حال کو پہنچا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس نے ذرا سی بات کا بیٹھو بنا کر رکھ دیا ہے۔ خدا جانے وہ مجھ سے کیسی دشمنی نکال رہا ہے جبکہ میں اسے جانتا بھی نہیں تھا۔"

"اس کی باتیں تو ٹھیک ٹھاک ہیں۔" بڑے ڈاکٹر نے چھوٹے ڈاکٹر سے کہا۔ "پھر یہ خطرناک کیسے ہو گیا؟"

"اس کی ہسٹری سبکی بتاتی ہے سر۔ یہ کئی دفعہ اس آدمی پر حملہ کر چکا ہے۔"

"ہوسکتا ہے دونوں کے درمیان کوئی پرانی دشمنی رہی ہو۔"

"نوسر! کوئی دشمنی وغیرہ نہیں ہے۔ یہ خود کہہ رہا ہے کہ یہ اس آدمی کو جانتا بھی نہیں ہے۔"

"اوہ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی خاص آدمی کو دیکھ کر اس کے ہارمونل متحرک ہو جاتے ہیں۔"

"نیس سر! ایسا ہی ہوتا ہے۔" دوسرے ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ نوروڈ ٹینڈر سٹرورم کہلاتے ہیں۔ آپ خود دیکھ لیں۔ جیسے ہی وہ آدمی سامنے آیا، اس پر جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔"

"اوکے۔ وہ آدمی اس وقت بھی بیٹھا ہوا ہے۔ اسے بلاؤ تاکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔"

"نیس سر! ابھی بلا کر لاتا ہوں۔"

چھوٹے ڈاکٹر اس کم بخت کو بلانے کے لیے چلا گیا۔ اس وقت میں بہت تیزی سے سوچ رہا تھا کیا کرنا چاہیے مجھے۔ مجھے Rash نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا نتیجہ دیکھ چکا ہوں بلکہ اس کے سامنے مجھے بالکل نائل رہنا چاہیے بلکہ جنسی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر سکتا ہوں، وہ کرتا رہوں۔

بڑا ڈاکٹر تنہائی لگا ہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا، کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر اور وہی کم بخت آتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں تو اپنی پالیسی بدلنے کا فیصلہ کر ہی چکا تھا۔

اس کے قریب آتے ہی میں نے یوں شروع کر دیا۔

"ارے جناب! آپ بھی بہت بے مروت قسم کے انسان

ہیں۔ ایک طرف تو میرا اتنا خیال، دوسری جانب آپ مجھے یہاں داخل کر کے بھول ہی گئے۔"

وہ سب سنی خیر لگا ہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے پھر کہا۔ "آپ یقین کریں۔ سب کا خیال آیا کہ آپ کو کون کر کے بلا لیں گی یہاں اس قسم کی سہولت ہی نہیں ہے۔ بہر حال خوشی کی بات ہے کہ آپ نے ہی تشریف لے آئے ہیں۔"

"اب یہ کیا ہے؟" بڑے ڈاکٹر نے دوسرے سے پوچھا۔

"یہ تو اور بھی خطرناک علامات ہیں جناب۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"میں سمجھ گیا کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ یعنی یہ M.P.D. کا کھیل ہے۔" بڑے ڈاکٹر نے کہا۔

"نیس سر۔ سو فیصد وہی۔"

"اور یہ M.P.D. کیا ہے؟" اس کم بخت نے دریافت کیا۔

"مٹی ملی پرستانی ڈس آرڈر۔" بڑے ڈاکٹر نے بتایا۔ "اس میں مریض اپنی اندرونی کیفیات چھپا کر رکھتا ہے اور خود کو بہت مہذب ظاہر کرتا ہے لیکن اس کے اندر آگ بھری رہتی ہے۔ موقع ملے ہی وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"جی جناب۔ میں بھی یہی سمجھ رہا ہوں۔" اس شخص نے کہا۔ "یہ زبان ہے تو کچھ اور بول رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں کچھ اور بتا رہی ہیں۔"

"ارے بھائی تو کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔" میں کوڑا نے لگا تھا۔ "میں نے کیا بگاڑا ہے تیرا خدا کا خوف کر۔۔۔ مجھے کس عذاب میں ڈال دیا ہے تو نے۔"

"یہ اس کا تیسرا روپ ہے ڈاکٹر۔" بڑے ڈاکٹر نے چھوٹے ڈاکٹر کو بتایا۔ "بھردی حاصل کرنے والا۔"

"یا خدا کیا کروں میں؟" میں نے سلاخوں سے سر نکراتا شروع کر دیا۔

"یہ اس کا چوتھا روپ ہے۔ اپنے آپ پر ظلم۔ خود کشی کا رجحان۔"

پھر اسٹاف کے کچھ لوگ دوڑے ہوئے آئے۔ مجھے ایک بار پھر پکڑ کر بے ہوش کا انکیشن لگا دیا گیا۔ ہوش آیا تو وہی اکبر اعظم والا میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ہوش میں آتے ہی یوں شروع کر دیا۔ "میں اکبر اعظم کا باپ ہوں۔ اس کی چچی اولاد میری پانچویں پشت سے پیدا ہوئی ہے اور میں چھٹی پشت کا تایا ہوں۔"

"ہس ہس؟" اس نے مجھے خاموش کر دیا۔ "کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب بولنے کی، اس وقت نہیں کوئی نہیں دیکھ رہا۔"

"کوئی دیکھے یا نہ دیکھے میں سکندر اعظم ہوں۔"

"خاموش رہو۔ میں تمہارا دکھ بھگ رہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "تمہارے ساتھ واقعی بہت زیادتی ہو رہی ہے لیکن تم قنوت کرو، آج رات ہم یہاں سے بھاگنے والے ہیں۔"

"وہ کس طرح؟"

"رات کے وقت دعویٰ اپنی گاڑی لے کر آتا ہے۔" اس نے بتایا۔ "پوری دین ہے جس کے پچھلے حصے میں گندے کپڑے بھر دیے جاتے ہیں ہم اس دین میں چھپ کر بیٹھ جائیں گے۔"

"کسی نے دیکھا یا تو؟"

"کوئی نہیں دیکھے گا۔" اس نے کہا۔ "دین جہاں کھڑی ہوتی ہے وہاں بالکل اندھیرا ہوتا ہے۔ ہم اندھیرے میں جا کر بیٹھ جائیں گے، اوپر سے گندے کپڑے ہم پر ڈالیں جائیں گے۔ اس طرح ہم بالکل چھپ جائیں گے، پھر راستے میں کسی بھی سیکل پر جب گاڑی رکے گی تو اتر کر بھاگ لیں گے۔"

"ہاں۔ یہ اچھی ترکیب ہے۔" میں نے بھی اس ترکیب سے اتفاق کیا تھا۔ "بس ایک بار اس جنگل سے نکل جاؤں پھر دیکھ لوں گا سب کو۔"

لائڈری کی گاڑی آٹھ بجے آئی تھی۔ ہم سات بجے ہی بھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ اس وقت میں بہت پر جوش ہو رہا تھا۔ لائڈری کی گاڑی اپنے مقررہ وقت پر آئی تھی۔ گاڑی کا پچھلا حصہ کھول دیا گیا تھا۔

کپڑے اکٹھے کرنے والا اندر جا چکا تھا۔ میرے ساتھی نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے دین کی طرف دوڑ لگا دی اور ایک اور سڑک دے کی چھلانگ لگا کر اندر چل گیا۔

اس کے ساتھ ہی ایک قیامت سی برپا ہو گئی۔ وہ کم بخت اچھل کر شور کرنے لگا۔ "ارے پکڑو، پکڑو۔۔۔ اعظم کا بچہ پل زار سالا بھاگ رہا ہے۔ پھوٹی زار سالا بھاگ رہا ہے۔"

اس کی چیخ و پکار سن کر اسپتال کا اسٹاف وہاں آ گیا۔ کچھ دیر اچھل کر گئے چلا جا رہا تھا۔ "مغل اعظم، سکندر اعظم کہاں تم کہاں ہم، گئے دم توڑے مغل۔ چل میرے گھوڑے پر۔"

اس کو پکڑ کر اندر پہنچا دیا گیا۔ جبکہ اسپتال کا مملہ مجھ

پر تشدد کرتے ہوئے مجھے گاڑی سے نیچے کھینچ لایا تھا۔ ایک بار پھر وہی بے ہوشی کا انکیشن۔

کیا میری قسمت تھی۔ میں بس انکیشن کا ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ اکبر اعظم والا بندہ پوری طرح جیالہ مارا نہیں تھا۔ اس پر پاگل پن کے دورے پڑتے تھے اور جب وہ نائل حالت میں ہوتا تو اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ پاگل ہے۔

اس نے میرے ساتھ مل کر فرار ہونے کی پوری پلاننگ نائل حالت میں ہی کی تھی پھر بد قسمتی سے عین وقت پر اس کم بخت پر دورے پڑنے لگے اور اس نے مجھے پکڑا دیا تھا۔

اس بار مجھے خطرناک پاگل قرار دے کر علیحدہ کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ میری مایوسی اپنی انتہا پر تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ مجھے اب زندگی بھر اسی پاگل خانے میں رہنا ہے۔ میں اب یہاں سے کبھی نکل نہیں سکتا گا۔

سب ہی مجھے بھول چکے تھے کیونکہ میں ایک پاگل تھا اور پاگل سے کون تعلق رکھتا ہے؟ گھر والے بھول گئے تھے، دفتر والے بھول گئے اور باب بھی بھول گئی۔

ہاں صرف ایک آدمی نے مجھ سے تعلق رکھا۔ آپ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ وہ کون ہو سکتا ہے؟ جی ہاں وہی مردود۔ اب آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ جب میں پاگل خانے ہی میں ہوں تو پھر یہ کہاں کی طرح چھٹی گئی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے یہ کہاں ڈکلیٹ کر دئی تھی۔ میں بولتا رہا تھا اور وہ دیکھتا رہا تھا۔ کون۔۔۔ جی ہاں وہی مردود، میں نے اسی کو انکیشن دیا تھا۔

اب آپ ہی بتائیں۔ کیا ایسی حکمت ظریفی کا کوئی جواب ہو سکتا ہے؟

میں آخر میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر کبھی آپ راہ چلتے ہوئے کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑیں تو جلدی اٹھ کر فوراً ہی بھاگ نکلیں کی کوشش کریں۔ کیونکہ کوئی بھروسہ نہیں کہ اسی جیسا کوئی شخص آپ کے پیچھے پڑ جائے اور آپ کو میری طرح پاگل خانے آنا پڑ جائے۔

دیے ایک بات بتاؤں، اگر کبھی آپ کے ساتھ کوئی ایسی بات ہو اور آپ پاگل خانے آئیں تو آپ کو اندازہ ہونا چاہیے کہ میں آپ سے کیا کہوں گا؟

جی ہاں، میں یہی کہوں گا کہ تم اکبر اعظم کے پھوپھی زاد سالے ہو۔ پھوپھی زاد سالے ہو۔ پھوپھی زاد سالے ہو۔

مفل الشعر والسكن



صوبیدار (ر) انوار بخش شیرکٹ، کراچی
بہار خون سرکوں پر مگر اتنا تو تم سوچو
وطن جب خون مانگے گا، تمہارے پاس کیا ہوگا
اسد زبیر جہلم
زمین پہ چل نہ سکا اور آسمان سے بھی گیا
سکنا کے پر تو پرندہ اڑان سے بھی گیا
کسی کے ہاتھ سے نکلا ہوا تیر ہوں میں
جو ہدف کو چھو نہ سکا اور کمان سے بھی گیا
مہر عام حفظہ... لید، پنجاب
اب ذرا تفصیل سے اے قاصد خوش رویتا
اس نے پہلے کیا کہا، پھر کیا کہا، پھر کیا کہا



عمران حیدر بلوچ... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
تیرے جگر سے تعلق کو بھانے کے لیے
میں نے اس سال بھی بیٹے کی قسم کھائی ہے
عامم اقبال جہاں... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
کسی بے وفا سے وفا چاہتا ہوں
میں پھر کوئی دھوکا، وفا چاہتا ہوں
تیری راہ نکلتا رہا جرم یہ ہے
خطا کار ہوں میں سزا چاہتا ہوں
رانا مختار احمد... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
تم کو معطوم تو ہوگی کرامت اپنی
سنگ مرمر پر دھرو پاؤں تو عمل کر دو
عاطف عمیر... گلستان جوہر، کراچی
میرے دل کی سوزش کو کب اشک بھانے والے ہیں
بلکہ یہ تو اور زیادہ آگ لگانے والے ہیں
این ایس آریدش... ہلدیہ ڈن، کراچی
گویا اندازِ تعظیم ہے امیروں جیسا
میرے اندر کا انسان ہے فقیریوں جیسا
اس کے اوصاف و خصائل نے مجھے جیت لیا
میرے مریدوں میں تھا شخص وہ جیروں جیسا

شبنم ضیا... کراچی

سندر کے سفر میں اس طرح آواز دے مجھ کو
ہوائیں تیر ہوں اور کشتیوں میں شام ہو جائے
ظاہر ہائیکین... ضلع سرگودھا
سکتی عزیز تھی تیری آنکھوں کی آبرو
مفل میں ہے یہ بھی ہمیں ڈولنا پڑا
محمد رشید سیال... سبجانی محلہ، سکس
رات اچھا بھی آئے گا ہمار
لم نہ مگر زندگی پڑی ہے ابھی
خوب محمد رفیع سیٹھی... فیصل آباد
آسمان پر پردہ، اب رواں کوئی نہ ہو
اے خدا اک دن تو اپنے درمیاں کوئی نہ ہو
نور کے ناصر... اورالائی
روز روتے ہوئے کہتی ہے زندگی مجھ سے
یوں ایک شخص کی خاطر مجھے برباد نہ کر

محمد قدرت اللہ نیازی... حکیم خان وں، میانوال
جگر کی شب کا کسی ام سے کتنا مشکل
چاند پورا ہے تو پھر درد کا گھٹنا مشکل
مرزا ظاہر الدین بیگ... میرپور خاص
کوئی جھوٹا تو ادھر آئے گا خوشیاں لے کر
سوچ کر ہم بھی یہی وقت سحر بیٹھے ہیں
یاد کا دیپ جلا ہے تو یہ لگتا ہے ظلیل
میرے پہلو میں کئی شمس و قمر بیٹھے ہیں

ریاض بٹ... حسن ابدال
کیا چلے گا تجھے دل کو قید کرنے سے
یہ آزاد چھپی ہے اسے کئی فضاؤں میں چھوڑ دے
فیصل حسن پرنس... ستیانہ جنگ صدر
دل سے لٹ کر بھی سخاوت کی تمنا نہ مٹتی
کوئی اجزا ہوا آئے تو دعا لے جائے
احمد خان تو حیدی... پاکستان اسمبل، کراچی
نگاہ دتی جو سر جھپکتی تقدیر کو ٹال دیتی ہیں
تیرے ہاتھوں کی پکھلی پر ایسی کوئی لکیر نہیں
محمد قاسم... نورپور تحصیل، خوشاب
جب تک رہے نوٹے رہے، مٹتے رہے
ہم سانس سانس قرض کی صورت ادا ہوئے

محمد اشفاق سیال... شورکوٹ سٹی

اسے اس طرح میری محبت میں مصروف کر دیا
کہ اسے نیند تک نہ آئے میری یاد کے بغیر
محمد آصف ساجد... ارزانی پور، قصور
چھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا
تفسیر عباس باہر... اوکاڑہ
یونی اداس رہا تو دیکھنا ایک دن!
میں سارے شہر میں تھنایاں بچا دوں گا
یہ تیرگی میرے گھر کا ہی کیوں مقدر ہوا
میں تیرے شہر کے سارے دیے بجھا دوں گا
جنید احمد ملک... گلستان جوہر، کراچی
نہ ہوتا بے سروت نہ بے رخی دکھانا
بس سادگی سے کہنا، تم پوچھ بن گئے ہو
اقبال اکرم... کراچی

جو آئینے کو بھی حیرت میں ڈال دیتا ہے
کسی کسی کو خدا یہ کمال دیتا ہے
سزنا القمر سلطان... رتی بی، ساہیوال
ہم نے دیکھے ہیں احرام میں لپٹے کسی انیس
ہم نے میقانے میں کئی بار خدا دیکھا ہے
تکلیل الرحمن... کھاناں
زندگی کی دھوپ میں اس سر پہ اک چادر تو ہے
لاکھ دیواریں شکستہ ہوں پر اپنا گھر تو ہے

عون عباس باہر... اوکاڑہ
چمچے ہیں اگر عام تو یہ کس کی خطا ہے
اسے کس نے کہا تھا کہ پلٹ کر دیکھے
محمد اسماعیل، اجاگر... چنڈی کھیب
قافلے ریت ہوئے دشت جنوں میں کتنے
پھر بھی آوارہ حزاہوں کا سفر جاری ہے
محمد جاوید بلوچ... تحصیل علی پور
وہ چاند بن کے مرے ساتھ ساتھ چلا رہا
میں اس کے جگر کی راتوں میں کب اکلی ہوئی
علی، کاشف نصیر گول... منٹورا، پادشہ لہ
لاش پروانے کی آگے سے ہٹا دے کوئی
شع معصوم ہے بدنام ہوئی جاؤا ہے



انتظار

محنت آزاد

تیر دھوپ پو اور پیاس کی شدت بھی، تو آسمان زیادہ نہیں چل سکتا۔ بنا
آس و امید کے ساحل کی تلاش میں اس نے بھی بہت دور تنہا سفر کیا
مگر... تشنگی بھی کہ مسلسل اس کے نعاقب میں رہی۔ ناامیدی... یہ
اعتباری... تنہائی کا احساس... پرونگ اس کی سموچ میں شامل تھا
مگر... ان تمام رنگوں پر ایک رنگ غالب رہا اور وہ تھا عین پر کامل
یقین... یہ لگن پوری تو ہوئی مگر... اس وقت تک مقدر نے ایسا وار کیا
کہ زندگی... زندگی نہ رہی۔

• استثنائی انتظار... اور نازک احساسات کا خوبصورت اظہار

واقع ہے۔ مگر کے برآمدے میں بیٹھ کر سامنے دیکھو تو لوہے
کی سلاخوں والے گیٹ کے اُس پار سیدھی جاتی سڑک
نظروں کے سامنے رہتی ہے اور اس پر چلنے والی فریٹنگ بھی۔
ویسے تو یہ سادہ اور عام سا گھر ہے تاہم اس میں ایک
خاص بات بھی ہے جو اسے دوسرے گھروں سے منفرد کرتی

یہ سزا احمد کا گھر ہے۔
ان گھر میں ایسی کوئی خاص بات نہیں جو اسے ارد گرد
کے دوسرے گھروں سے ممتاز کرتی ہو۔ بالکل عام سا اور
پرائیویٹ قطع کا گھر ہے۔ چنی چار دیواری میں موجود چار
کمران کا یہ مکان قصبے کی طرف آنے والی مرکزی سڑک پر

جبران احمد... کراچی
ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
چوہدری مناظر علی گوندل... سڑک ٹیل سرگودھا
کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی
مجھ کمال انور... اورنگی ٹاؤن، کراچی
رستہ بھی ٹھن، دھوپ میں شدت بھی بہت تھی
سامنے سے مگر اس کو محبت بھی بہت تھی
زویب احمد ملک... گلستان جوہر، کراچی
وہ لوگ کیا چل سکیں گے جو اگیوں پہ سوچیں
سفر میں ہے دھوپ کس قدر ساتباں کتنا
حسین عباس بلوچ... سڑک ٹیل سرگودھا
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک
ارسلان افضل... سکسٹر
دنیا کو دیکھتی رہی جس کی نظروں سے میں
اس آنکھ میں مرے لیے پہچان بھی نہ تھی
رضوان... لاہور
جس گھر کے بیٹھ جانے کا دکھ ہے ہمیں
تاریخ کہہ رہی ہے کہ وہ بھی کھنڈر یہ تھا
عدنان صدیقی... ملتان
نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
قاسم نصیب... صدر آباد
بہت معمول ہوتا ہے مگر صورت ہے اک باقی
تم اپنی زندگی دو گے، یہ دل جاگیر کرنے تک
احمر علی... گوجرانوالہ
یہ کیا غضب ہے کہ لڑتے ہیں آپ بھی ہم سے
تمہارے واسطے دیکھو ہم اک جہاں سے لڑے

محفل شاعر و سخن

کوین
برائے
شمارہ
اکتوبر
2011

ہے اور وہ ہیں خود مسز احمد۔ وہ سن بلوغت کو پہنچی تھیں کہ ان کی شادی ہو گئی۔ تب سے وہ سسرال کے اسی گھر میں رہتی ہیں۔ شاید کسی کو یہ بات زیادہ اہم معلوم نہ ہو مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ مسز احمد اور تقریباً پچاس بیس برس سے جاری ان کا یہ انتقامی صرف وہ بات ہے جو اس گھر کو منفرد بناتے ہیں۔

مسز احمد کی چھٹی دہائی میں ہیں اور قہرے کے ایک کالج میں پڑھاتی ہیں۔ کالج سے لوٹنے کے بعد وہ کچھ دیر تو کھانا بنانے اور صفائی ستھرائی کے کام میں مصروف رہتی ہیں۔ اس کے بعد کتابیں، انتظامی کاپیاں اور لکھنے پڑھنے کی دوسری چیزیں لے کر براہ راست بس گیٹ کے رخ پر چلی ہوئی آرام دہ کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں۔ اس کے بعد وہ کام کرنے کے دوران میں گاہ بگاہ نظر میں اٹھا کر کچھ دیر تک سڑک کو گھنٹی رہتی ہیں اور پھر وہ بارہ سر جھکا کر اپنے کام میں منہمک ہو جاتی ہیں۔ اسی دوران میں کھانے کے گھر چلنے والے لیے ان کی آنکھ لگ جاتی ہے تو وہ کچھ ہی دیر بعد چنگ اٹھتی ہیں اور آنکھیں ملنے ہوئے گیٹ کو ایسے دیکھتی ہیں جیسے وہاں کوئی کھڑا ہو اور وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں اور پھر سامنے کسی کو نہ پا کر وہ خاموشی سے اپنے کام میں لگ جاتی ہیں۔

یہ ان کی برسوں پرانی عادت ہے۔ جوانی سے لے کر بڑھاپے تک، ان کا یہ انتقامی رنجی جاری ہے۔ انہیں اپنے شوہر کی آمد کا انتقام ہے جو تین دہائی قبل وہیں آئے کا کہہ کر گیا لیکن نہ وہ آیا اور نہ ہی اس کی کوئی خبر۔

شام ڈھلے جب سامنے والی سڑک پر لائیں جمل جاتیں اور پھر اندھیرا گہرا ہونے کے بعد آہستہ آہستہ سڑک بھی سناں ہو جاتی تو وہ خاموشی سے انہیں اور گھر کے اندر چلی جاتیں۔ بیڈروم میں جا کر کھڑکی کے ساتھ رکھے لیپ کوروش کرتیں۔

سردی ہو یا گرمی ان کے بیڈ کے سامنے والی کھڑکی ہمیشہ کھلی رہتی۔ اس کھڑکی سے گیٹ اور دھندلے میں کھولی ہوئی سڑک صاف نظر آتی تھی۔ وہ سویتے میں بھی جاتی ہی رہتی تھیں۔ بالکی سی آہٹ پر بھی ان کی آنکھ کھل جاتی اور پھر وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پانی سے کھڑکی کے اس طرف گیٹ کو اور پھر اس کے پار سڑک کی طرف دیکھنے لگتیں۔ یہی ان کی زندگی کا معمول تھا۔ وہ روز اول کی طرح کھولی کھولی آنکھوں سے اپنے شوہر کی واپسی کی منتظر تھیں۔ لوگ ان کے اس انتقام کو فضول کہتے تھے لیکن کسی میں یہ حس نہیں تھی کہ وہ ان کے منہ پر یہ بات کر سکتا۔ وہ خود بھی جانتی تھیں کہ لوگ ان

کے انتقام کو پاگل پن سے تشبیہ دینے لگے ہیں مگر انہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ انہیں صرف اپنے شوہر کی واپسی کا انتقام تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ان کا لاپتا شوہر ضرور اس گھر میں داخل ہوگا اور وہ کالج کے سوا، کبھی بھی نہیں آتی جاتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ ان کی غیر موجودگی میں آئے تو انہیں نہ پا کر بہتیشان ہوں گے۔ بس یہی وجہ تھی کہ ان کے گھر کا داخلی گیٹ اور بیڈروم کی کھڑکی ہر وقت کھلی رہتی تھی۔

مسز احمد کی زندگی کا دوسرا نام انتقام ہے۔ ان کی زندگی بالکل بے رنگ ہے۔ پوری زندگی کا حاصل صرف دو رنگ تھے، خاکی اور نیلا اور ان کے دونوں درمیان کھڑا ہے انتقام۔

مسز احمد کا نام کلثوم ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہیں۔ بچپن سے لے کر شادی ہو جانے تک وہ اپنے والد کے گھر آنے کا انتقام کیا کرتی تھیں خاکی فوجی وردی میں ملیوں ان کے والد کا سرحدوں پر تعینات رہتے تھے۔ جب وہ بھی بھار گھر آتے تو ان کے لیے ڈیویروں کھلونے لاتے لیکن اس بچی کو کھلونوں سے زیادہ باپ کے آنے کی خوشی ہوتی تھی۔ تھی کلثوم اپنے باپ کی وہ بارہ آمد کی اس شدت سے منتظر رہتی تھی کہ اگر اسے کوئی شخص خاکی رنگ کی پینٹ شرت میں ملیوں، آتا جاتا نظر آجائے تو یہ اس کے پیچھے بھاگ پڑتی کہ شاید یہی اس کے باپ ہیں۔ خاکی رنگ اور انتقام، ان دونوں کے بیچ اس کا بچپن گزر گیا۔

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ اس کے باپ نے ان کا رشتہ طے کر دیا۔ آسمانی بی بیڈروم میں ملیوں جس شخص کو اس نے پہلی بار دیکھا، وہ انفرورس کا پائلٹ تھا۔ کلثوم کے باپ کا خیال تھا کہ آرمی والوں کی نسبت انفرورس کے پائلٹ کے لیے جنگ میں خطرات بہت کم ہوتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنی بیٹی کے لیے پائلٹ کو بطور شوہر پسند کیا۔ سیدھی سادی کلثوم کے لیے اس رشتے کو پسند کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ انہوں نے خاموشی سے باپ کی پسند کو قبول کر لیا۔ اس طرح ایک اور رنگ ان کی زندگی میں شامل ہو گیا، آسمانی رنگ۔ اس کے بعد سے اب تک، ان کی پوری زندگی انہی دو رنگوں میں رچی ہوئی ہے۔

موسم نے کرٹ بدل دی۔ شادی کے بعد کلثوم کی زندگی نے بھی رخ بدلا مگر کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ بس ا وہ ایک فوجی کے گھر سے رخصت ہو کر دوسرے فوجی کے گھر میں آ گئی۔ البتہ اب اس کا نام بدل گیا تھا۔ کلثوم مسز احمد بن گئی تھی۔

شادی کو ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ جنگ چھڑ گئی۔ فرزند و جوان دونوں گھر پر ہی تھے۔ ایک دن انہیں ٹیلی گرام موصول ہوا۔ ان کی چھٹیاں منسوخ کر کے انہیں فوراً ڈیوٹی پر حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔ کم عمر اور نو بہتا دلہن کے لیے یہ عیب گزری تھی۔ شادی کے بعد چند ماہ ہی گزرے تھے کہ اس کا شوہر اسے تنہا چھوڑ کر اپنا فرض ادا کرنے جا رہا تھا۔ کلثوم تو اس عمر میں تھی کہ ذرا سی آہٹ پر بھی ڈر جاتی تھی مگر وہ کچھ نہ بولی۔ خاموش رہی۔

شوہر کا جنگ پر چلا گیا اور وہ تنہا رہ گئی۔ تنہائی کو اس نے مقدر سمجھ لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا باپ بھی فوجی تھا۔ اس کی ماں نے بھی اپنی ساری زندگی جنگ تنہا ہی، اپنے شوہر کا انتقام کرتے ہوئے بسر کی تھی۔ ماں کو بادل گرجنے کی دل دہلا دینے والی آواز سے کتنا ڈر لگتا تھا۔ جب بھی بادل گرجے تو وہ اسے اپنی آغوش میں سمجھ لیتی تھی۔

وہ تو بچپن میں لاکھ چاہنے کے باوجود، اپنے باپ کو بھی یہ بھی نہ کہہ سکتی تھی کہ "ابھی مت جاؤ۔ کچھ دن اور رگ جاؤ۔" اسے اپنی آرزو کو من ہی من میں مار دینے کا یہ سلیقہ لاشعوری طور پر شاید ماں نے سکھا دیا تھا۔

اس صبح کے دھندلے میں جب اس گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر انہوں نے دیکھے آسمانی رنگ کی بی بیڈروم میں ملیوں، فوجی جیب میں بیٹھے ہوئے، اپنے شوہر کو الوداعی انداز میں ہاتھ دلاتے دیکھ کر خود اپنا دہانہ ہاتھ اوپر اٹھا دیا تھا۔ تب بھی انہوں نے اسے رکنے کا اشارہ نہیں کیا۔ لب مسگرار ہے تھے مگر ان کی چلوں پر وہ آنسو آ کر ٹھہر گئے تھے۔ جوانی کی اس صبح کے دھندلے میں مسز احمد کا جو انتقام شروع ہوا تھا، وہ برسوں گزر جانے کے باوجود آج بھی زندگی کی اس شام تک، بدستور جاری تھا۔ زندگی کی ریت تو آنکھوں سے جا چکی تھی البتہ انتقام کے شباب کا وہی عالم تھا، روز اول کی طرح۔

گردش وقت میں زندگی کا خاکی رنگ کب کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ اب مسز احمد کی آنکھوں میں، ہلکا آسمانی رنگ ہی بے باوا تھا۔ ان کی زندگی میں اس رنگ کا دوسرا نام انتقام تھا۔ یہ انتقام راتاً شہید تھا کہ گھر کا دروازہ ہو یا بیڈروم کی کھڑکی۔ یہ دونوں ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ انتقام کے بند دھولے پردے کی آواز سننے کی آرزو اب تک تشہی تھی۔

☆☆☆

نوجوان مسز احمد اتنے بڑے گھر میں تنہا رہتی تھیں۔ ان کے شوہر ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھے۔ ماس سسرک کے ان جہان سے گزر چکے تھے۔ اب وہ تنہا تاریک راتوں میں

جاگ کر اپنے شوہر کا انتقام کرتیں یا پھر انہماک سے لرزتی رہتی تھیں۔

جنگ بدستور جاری تھی۔ فرزند و شوہر کو گئے ہوئے بہت دن ہو چکے تھے لیکن اب تک ان کی خبریت کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ مسز احمد کے روز و شب اپنے شوہر کی بھلاقت واپسی کے لیے دعا میں مگھتے ہوئے گزر رہے تھے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ مسز احمد اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھیں، جب انہیں محسوس ہوا کہ باہر گیٹ پر کوئی دستک دے رہا ہے۔ وہ بے تابی سے بستر سے اٹھیں۔ انہیں لگا کہ شاید احمد صاحب لوٹ آئے ہیں۔ ان کا دل خوشی سے اٹھنے لگا اور وہ ننگے پاؤں تقریباً دوڑتے ہوئے ٹینکٹ کی طرف بھاٹیں مگروہاں احمد صاحب نہیں، ڈاکیا کھڑا تھا۔ ان کا دل ایک انجانے خوف سے لرز اٹھا۔

"آپ مسز احمد ہیں؟" اس نے انہیں دیکھتے ہی سوال کیا اور ایک نوکور سفید لفافہ ان کی طرف بڑھایا۔ "آپ کے لیے ٹیلی گرام۔" مسز احمد نے کا پتے ہاتھوں سے رسید پر دھنچکے اور ڈاک کے سے ٹیلی گرام کا لفافہ لے لیا۔ انہیں یاد آیا کہ ان کی شادی ہونے میں لگ بھگ چار ماہ باقی تھے۔ ان کے پاپا سرحد پر اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہے تھے۔ تب بھی اسی طرح ایک ڈاکیا ان کے گھر پہنچا تھا اور انہوں نے ایسا ہی ایک ٹیلی گرام وصول کیا تھا، باپ کی شہادت کا ٹیلی گرام۔ جسے ان کی رجنٹ نے سمجھا تھا۔ اس وقت باپ سرحد پر تھے اور اب شوہر کا جنگ پر ہے۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھیں۔ ان کا دل شاخ سے لٹنے خواں رسیدہ پٹے کی طرح ڈولے جا رہا تھا۔ مسز احمد نے ٹیلی گرام پڑھنا شروع کیا:

"جنگ کے دوران میں حملے کے لیے مسز احمد نے آڑاں بھری لیکن پھر اس کے بعد ان سے کوئی رابطہ ممکن نہیں ہو سکا اور نہ ہی اب تک ان کا کچھ پتا چل پایا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے حیارے کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دشمن نے ان کا جہاز مار گرایا ہو اور وہ جنگی قیدی بنا لیے گئے ہوں یا ممکن ہے کہ وہ اب ہم منہ ہوں۔ بہر کیف، صورت حال جو بھی ہو، فی الحال ہم ان کی موت کی تصدیق نہیں کر سکتے۔ وہ اب تک لاپتا ہیں۔ جیسے ہی ان کے بارے میں کوئی اطلاع ملتی ہے، ہم آپ کو مطلع کر دیں گے۔"

انفرورس کی طرف سے جیسے جیسے اس نئی گرام کو پڑھ کر مسز احمد ہلک وقت دو کیفیت سے دوچار ہوتی تھیں۔ وہ نہایت دل گرفتہ تھیں اور طرح طرح کے دوسوے ان کے دل میں پیدا ہو رہے تھے۔ ساتھ ہی خوش بھی تھیں کہ اس اطلاع

کے مطابق کم سے کم انہیں مردہ قرار نہیں دیا گیا تھا۔ کافی دیر تک امید و نیک کی تلاش میں وہ گیت پر ہی کھڑی رہیں۔ اُن کے پاؤں جیسے زمین میں گڑ چکے تھے۔ ڈاکٹر کب کا جانچا تھا۔ کافی دیر بعد وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے میں آئیں اور بے سندھ ہو کر بستر پر گر گئیں۔ اُن کی آنکھوں سے سادون بھادوں کی برکھا بہ رہی تھی۔ بچے جھپٹکا جا رہا تھا۔

موسموں کا آنا جانا لگا رہا۔ اُن کا موسم صرف انتظار کا موسم تھا۔

”جیسے ہی اُن کے بارے میں کوئی اطلاع ملتی ہے، ہم آپ کو مطلع کر دیں گے۔“ ٹیلی گرام کا یہ جملہ اُن کے ذہن پر نقش ہو کر گیا تھا۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اُس اطلاع کا انتظار تھا جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔

جنگ کب کی ختم ہو چکی تھی۔ اس کے بعد کئی سال بھی آکر گزر گئے مگر انہیں وہ اطلاع نہ ملی جس کا وعدہ کیا گیا تھا اور نہ ہی شوہر گھر لوٹا۔ انتظار کرتے کرتے ان کی آنکھوں کی روشنی بھی مدھم پڑتی جا رہی تھی۔

جنگ ختم ہونے تک دونوں ممالک بہت سارے فوجیوں کو جی قیدی بنا چکے تھے۔ جنگ بند ہوئی تو غذا کرات شروع ہوئے اور پھر کئی برس کی کوششوں کے بعد دونوں ممالک جی قیدیوں کے تبادلے پر رضامند ہو گئے۔ جنگی قیدیوں کی رہائی سے انفرورس کے حاضر سروس اور ریٹائرڈ انفران کی اس کالونی میں بہار کا موسم اتر آیا تھا۔ اس اطلاع کے بعد سزا احمد بھی بہت خوش تھیں کہ اب ایک نیا نیا دن اُن کے شوہر بھی واپس آ جائے گا۔ ان کی زندگی میں بچے آسانی تک کا انتظار شدت اختیار کر چکا تھا۔

جب سے جنگی قیدیوں کا تبادلہ شروع ہوا تھا، اُس کے کچھ ہی دنوں بعد، کوئی نہ کوئی فوجی سامنے والی سڑک سے کالونی میں آتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ لوگ پھولوں کے گلدستے اور غریب گھائیوں کے مار لپے ان کے منتظر ہوتے۔ یہ انتظار بہت ہی مختصر ہوتا اور پھر کم کا موسم آ جاتا تھا۔ سزا احمد بھی ہر روز ملی الصباح اٹھ کر اپنے باپ سے سرخ گلاب، چنبیلی اور موتی کے پھول توڑ کر گلدستہ بناتیں، پار پر دوش اور انہیں اپنی گود میں رکھ کر برآمدے میں رکھتی ہوئی آرام کرتی پر آکر بیٹھ جاتیں۔ سڑک پر جو بھی ٹھیل دکھائی دیتی، فوجی جیتیں نظر آتیں آسانی تک لگا ہوں میں بھل اٹھتا مگر..... پھر شام کا وحدہ لاکھوں میں اتر آتا۔ ان حالات کے باوجود سزا احمد کا انتظار زندہ و جاوید تھا۔

ملن کا یہ موسم بھی کچھ عرصے میں ہی ختم کیا۔ جنگی قیدی

اپنے اپنے گھروں کو آچکے تھے۔ سامنے والی سڑک پر رہا کیے گئے فوجیوں کو پہنچانے والی بچوں کی آمد اب موقوف ہو چکی تھی۔ سزا احمد کے دل اور گھر پر بدستور تڑپاں کا ڈیرا تھا۔ اُن کے گلاب، چنبیلی اور موتی کا بانیچہ بھی انتظار کے اس طویل موسم میں آڑ چکا تھا۔ جب سے سامنے والی سڑک کی روشنی ختم ہوئی تھی، تب سے سزا احمد کی آنکھیں بھی پھولوں کے پار اور گلدستوں سے غالی ہو چکی تھیں۔ انتظار کا موسم اُن کی آنکھوں میں شاید ہمیشہ کے لیے ٹھہر چکا تھا۔

کئی اور برس ہو چکی تھیں۔ سزا احمد اور اُن کے دوست احباب نے لاکھ کوششیں کیں کہ فرزانہ احمد کو کوئی اتنا پتل سے مگر انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر ہر مگر بھاگ دوڑ کے بعد سب تھک مار کے بیٹھ گئے۔ ان کا پتا نہ ملتا تھا نہ ملا۔ سب اپنے اپنے دل میں یہ طے کر چکے تھے سزا احمد جنگ کے دوران ہی مارے گئے۔ اگر وہ جی قیدی بنائے گئے ہوتے تو کب کے واپس آچکے ہوتے۔ فرزانہ احمد کے ساتھی انفران بھی اپنی سروس پوری ہوئے پر ایک، ایک کر کے ریٹائر ہوئے گئے۔ ایک وقت وہ بھی آپا گمراہ فورس کے حاضر سروس انفران میں ایک شخص بھی ایسا نہیں بچا جو یہ جانتا ہو کہ سزا احمد اُن کے نوجوان پائلٹ افسر تھے جو جنگ کے دوران میں لاپتہ ہوئے اور اب تک ان کی کوئی اطلاع نہیں کہ وہ کہاں ہیں کسی حال میں ہیں؟ زندہ بھی ہیں یا اس دنیا سے چلے گئے؟ البتہ انفرورس کے ہیڈ کوارٹر میں سروسز کی فائونڈ ڈیپارٹمنٹ میں ایک فائل اُن کے نام کی بھی تھی۔ جس پر لکھا ہوا تھا ”فرزانہ احمد فلائٹ آفیسر..... دوران جنگ لاپتہ۔“ ان کی یہ فائل بینڈیشن کی گئی تھی مگر فائونڈ کے اس انبار میں یہ کسی کو یاد بھی نہیں رہی تھی۔ شوہر کے لاپتہ ہو جانے کے بعد بھی سزا احمد کو اُن کی خواہ اور دیگر مراعات ملتی رہیں لیکن زندگی بسر کرنے کے لیے صرف ریویس پیسائی ضروری نہیں۔ سزا احمد نے اپنے شوہر کے ساتھی انفران اور اُن کی بیویوں کے سمجھانے پر اپنی ادھوری تعلیم مکمل کی اور پھر انفرورس کے اسکول میں فوجیوں کے بچے بچوں کو تعلیم دینے لگیں۔

اس طرح کئی اور برس مزید بیت گئے۔ ان کے شاگردوں میں کئی ایسے بچے بچیاں بھی شامل تھے، جن کے باپ فوج میں بھی اُن کے شوہر کے ساتھی تھے۔ انہی بچے بچوں میں سزا احمد کو اپنے بیٹے بیٹیاں نظر آتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ کئی ایسے بچے بچیاں بھی اُن کے شاگرد بنے جن کے دادا، نانا اُس زمانے میں فلائٹ افسر

تھے، جب فرزانہ احمد بھی جنگی جہاز اڑاتے تھے۔ انہی بچے بچوں میں اب سزا احمد کو اپنے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں نظر آنے لگے تھے۔

گزرتے ہوئے شب و روز بھی سزا احمد کی عادت بدلنے میں کامیاب رہے تھے۔ اُس وقت جب کہ سب کا خیال تھا کہ فرزانہ احمد اس دنیا میں نہیں رہے ہیں، جب بھی انہیں یقین تھا کہ وہ ایک نیا نیا نیا ضرور لوٹ کر آئیں گے۔

اُس دن نہایت سردی تھی۔ آسمان پر کھرے سیاہ بادلوں چھائے ہوئے تھے۔ سزا احمد جب دستور برآمدے کی آرام کرسی پر نیم دراز تھیں لیکن ان کی نگاہیں گیت کے پار سامنے والی سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں پورا ماحول تاریکی کی آغوش میں سمٹ گیا۔ سزا احمد نے ایک گہری سٹشٹی آہ بھری۔ مثال کو اپنے گرو اور لپٹ لیا۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں اور بیڈروم میں جا کر کھڑکی کے پٹ کے ساتھ رکھا ہوا مٹی کے تیل سے طے والا لیپ روشن کر دیا۔ چاہے پورے گھر کی لائٹ بندی کیوں نہ ہو مگر کچھ رات کے کسی بھی پہر کوئی شخص گھر کے گیت پر کھڑے ہو کر دیکھتا تو تب بھی اس قتل کے لیپ کی روشن لو اس گھر میں زندگی کا پتا دیتی تھی۔ یہ لیپ اسی جگہ پر اُس صبح بھی روشن تھا جب فرزانہ احمد عاز پر جانے کے لیے کمرے سے نکلے تھے۔ اُس کے بعد سے اب تک یہ لیپ اسی جگہ ہر شام روشن ہوتا ہے، اگلی صبح تک کے لیے۔

☆☆☆

دوسری طرف ہوا یہ کہ فرزانہ احمد کو عاز جنگ پر فضائی نگرانی کا حکم دیا گیا۔ وہ بھرپور طریقے سے اپنے فرائض انجام دینے لگے۔ ایک رات معمول کے مطابق وہ اپنا جہاز لے کر اڑے۔ ان کے ساتھ معاون پائلٹ بھی تھا۔ دونوں نے جیسے ہی اپنے ملک کی فضائی حدود کو عبور کیا، ہوا سے میں کوئی جنگی خرابی پیدا ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے جہاز کی ڈیم پر آگ کا شعلہ نمودار ہوا۔ اُن دونوں کو کچھ سوچنے کیلئے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس کے ساتھ ہی جہاز کا سوا اسلامی راہیل بھی مکمل طور پر منقطع ہو گیا۔ جہاز کسی بھی لمحے دھماکے سے پھٹ سکتا تھا۔ انہوں نے اپنے معاون کو بھیرا شوٹ سے چھلانگ لگانے کا حکم دیا۔ مٹی ویر میں جہاز کا پچھلا حصہ مکمل طور پر شعلوں کی لپٹ میں آ چکا تھا۔ فرزانہ احمد نے کچھ جھن دیا۔ اگلے ہی لمحے جنگی جہاز کا شیشے سے بنا ہوا اوپری حصہ مکمل گیا۔ انہوں نے ایک اور جھن دیا اور اگلے ہی لمحے وہ فضا میں اوپر کی طرف اٹھنے چلے گئے۔ ان کے بدقسمت معاون کو موقع ہی نہ

اگلی بار

سیلون ہم تین برس پہلے بھی گئے تھے اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس تھی لیکن ہوائی جہازوں کی پروازوں کا حساب کچھ ایسا تھا کہ بس ایک رات اور ادھان ملتا تھا، ہم نے اسے قیمت جانا۔ راست ایسا نہیں، راوی لپٹی نہ گئے کو بیوہ جااتے۔ یہاں لیے اور گئے ہالوں اور ساتوں سے ملنے نفوذ والی وہ سنگھالی لڑکی ہمارے انتظار میں پہلے سے کھڑی تھی جس کا نام مائل ہے۔ ساتھ اس کے والد صاحب بھی تھے۔ 1964ء میں جو صاحب ہمیں ہوائی اڈے پر لینے آئے جب گھنٹا بھر اپنی کارروڑا گئے اور ہم نے آبادی کا نشانہ پایا تو ہم نے ان سے عرض کیا کہ بڑیرے کی سیر ہم بعد میں کریں گے۔ پہلے کو بیوہ شہر لے چلو۔ انہوں نے فرمایا۔ ہم کو بیوہ تو جا رہے ہیں۔ کو بیوہ شہر سے ہوائی اڈا انہیں میل کی سانس ہے اور ٹک پر چار راستوں میں پورا سوا گھنٹا لگتا ہے۔ آج بھی کئی ہوا۔ پہلے سفارقات قسم ہونے میں نہ آتے تھے۔ پھر شہر کی گلیاں بس ہو گئیں۔ آخر خدا خدا کر کے گال نہیں ہوئی کی صورت نظر آئی۔ پرانی مینج کا، کولونیل طرز کا بڑے بڑے کمروں اور مٹی وسیع کلام گردش والا یہ ہوئی مین سمندر کے قتب پر واقع ہے۔ پانی اس کی دیواروں کو چھیرے بارتا گزرتا ہے۔ نگے پاؤں والے دھوئی پوش جیروں نے ہمیں اور چارے سامان کو تھوں ہاتھ لیا اور منبر نے کہا۔ احلا دھلا ملڈ آفٹرون۔ فلاں نمبر کے ایئر کنڈیشنر کمرے میں چلے جائے۔

ہم چونکہ سمندر کے عاشق ہیں اور دوئی کا پردہ درمیان میں نہیں چاہتے لہذا ہم نے منبر سے کہا کہ اسے بعد پرش، ہمیں ان کنڈیشنر نہیں چاہیے ہمیں ایسا کمرہ جس کی کھڑکیاں سمندر پر کھلتی ہوں۔ اس نے کہا اچھی بات ہے۔ بے شک اس نے جو کمرہ اوپادوہ سمندر پر کھلتا تھا لیکن اس طور کہ آدھے دھڑ کو کھڑکی کے باہر لٹکا کر دائی طرف کو گردن موڑیں تو سمندر نظر آتا تھا۔ ہم نے منبر سے کہا۔ میاں سمندر تو ہم نے دیکھ لیا۔ لیکن ہماری گردن میں موج آگئی ہے، کوئی اور کمرہ دو۔ بولا اس وقت نہیں ہے۔ آپ اگلی بار تحریف لائیں گے تو میں سرے والا کمرہ دوں گا۔

ابن انشا کے سفر نامہ ”دنیا کول ہے“ سے اقتباس

نہ سکا۔ جس وقت وہ جلتے ہوئے جہاز سے باہر نکلے تھے، اسی لمحے معاون نے بھی بن دیا تھا لیکن اس وقت تک جہاز مکمل طور پر شعلوں کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ بن نے کام نہ کیا اور پھر اگلے ہی لمحے ایک زوردار دھماکا ہوا۔ جہاز ہم کی طرح پھٹ گیا۔ اس کے ٹکڑے دور دور تک بکھر گئے تھے۔

فرزاد اپنے جہاز اور معاون ساجی کو قسٹم ہوتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ جلتے ہوئے لمبے کے ٹکڑے اب کسی بھی وقت زمین پر گر نہ سکتے تھے۔ وہ خاصی لمبی پر تھے۔ جب شخصوں لمبی پر پھٹنے کے بعد وہ بھی تیزی سے زمین کی طرف گرنے لگے تو انہوں نے بے اثر شوٹ کو کھولنے والا ہلکے کھینچا مگر وہ نہ نکلا۔ وہ جتنی تیزی سے زمین کی طرف گر رہے تھے، اتنی ہی شدت سے وہ بے اثر شوٹ کھولنے کی بھی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ نہیں کھل پاتا تھا۔

یہ سب کچھ محسوس کیا۔ فرزاد احمد نے جان لیا کہ وہ جلتے ہوئے جہاز سے تو نکل کر نکل آئے لیکن اگر بے اثر شوٹ نہ نکلا تو اگلے چند لمحوں میں ہی وہ موت سے منسلک ہو جائیں گے۔ انہوں نے کئی بار ہلکے کھینچا مگر بے اثر شوٹ نہ نکلا اور پھر چند لمحوں کے بعد ہی وہ زمین کے آگے قریب پہنچ چکے تھے کہ انہیں اپنی موت چھٹی دکھائی دینے لگی اور پھر اگلے ہی لمحے وہ زمین پر جا گرے۔ زمین پر گر کر ہی ان کا سر ایک بڑے سے پتھر سے ٹکرایا۔ اگلے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔

زمین پر گرنے کے باعث ان کے جسم کی کئی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں لیکن سر پر لگنے والی چوٹ نہایت ہی سنگین تھی۔ سر سے بڑی طرح خون بہہ رہا تھا۔ وہ کسی بھی وقت موت کی آغوش میں جا سکتے تھے۔

فرزاد احمد کا جہاز اسی ملک کی سر زمین پر گر رہا تھا، جس سے وہ برسرِ پیکار تھے۔ یہ جگہ چونکہ سرحد سے کافی دور تھی اور یہاں پر حملے کا امکان بھی نہیں تھا اور نہ ہی ایسی تنصیبات تھیں کہ جن کی بنا پر شبہ ہو کہ اس مقام پر حملہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے فوجیں یہاں سے بہت دور سرحدوں پر موجود تھیں۔

جس وقت یہ حادثہ پیش آیا، تب تک رات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ جس جگہ حادثہ پیش آیا، وہ کبھی کھلیان پر مشتمل تھا۔ جہاز کے گرنے سے ہونے والے دھماکے نے گاؤں والوں کو نیند سے بیدار کر دیا اور پھر جلتے ہوئے جہاز کے ٹکڑے کو دیکھ کر گھبردار نے فوج کو اطلاع دینے کا فیصلہ کیا۔

دوسری صبح جب فوج اس مقام پر پہنچی تو انہوں نے سب سے پہلے لمبے کو اپنی فوج میں لے لیا۔ اسی دوران میں انہیں مقامی چرواہے نے ایک بے ہوش زخمی شخص کی موجودگی کی

اطلاع دی۔ کچھ ہی دیر بعد فرزاد احمد کو اسپتال منتقل کیا گیا تھا۔

دونوں ممالک ایک دوسرے کے مد مقابل تھے اور جنگ کا دوسرا نام ہی تھا ہی ویرابادی ہے۔ فرزاد احمد بھی جنگ کے ناقابلِ تہذیب اصولوں کا شکار ہوئے۔ انہیں جتنی قیدی کر کے ہوش کی حالت میں فوجی اسپتال منتقل کر دیا گیا تھا۔

فرزاد احمد بہت بڑی طرح زخمی ہوئے تھے۔ کئی سال تک ان کا علاج کیا جاتا رہا۔ جسمانی طور پر تو وہ صحت یاب ہو چکے تھے لیکن دماغ پر لگنے والی چوٹ نے ان سے ان کی یادداشت چھین لی تھی۔ جب وہ پتھر پر گرے تو اس کی وجہ سے ان کا لباس بھی بڑی طرح پھٹ چکا تھا۔ دوسری طرف ان کے لباس سے بھی کوئی ایسی شاخھی علامت نہ تھی، جس سے ان کے نام، عہدے یا کسی اور ایسی چیز کے بارے میں معلوم مل پاتیں، جس سے ان کی شناخت ممکن ہو سکتی تھی۔ اتنا تو ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ دوسرے ملک کی فضا سے تعلق رکھتے ہیں مگر اس انداز سے کے سوائے اور بات کا پتہ نہ چل سکا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد کئی برس گزر چکے تھے۔ روزِ رفتہ سارے جتنی قیدیوں کا تبادلہ ہو گیا لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود سرفراز احمد کے حوالے سے نہ تو کوئی دعویٰ سامنے آیا اور نہ ہی ان کے بارے میں کچھ پتا چل سکا۔

دن گزرتے چلے گئے۔ تمام جتنی قیدی رہا ہونے کے بعد اپنے اپنے گھروں پہنچ گئے مگر وہ بدستور قیدی رہے۔ جتنی قیدیوں کی رہائی مکمل ہونے کے بعد جتنی قیدی تکب بند کر دیے گئے اور انہیں ایک جیل میں منتقل کر دیا گیا انہیں اپنے بارے میں کچھ یاد نہیں تھا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کہاں ہیں اور کیوں ہیں؟

فرزاد احمد جیل والوں کے لیے بے ضرر، قابلِ رحم اور شریف قیدی کا درجہ اختیار کر چکے تھے۔ ان کی حالت کے پیش نظر جیل حکام بھی ان کا خاص خیال رکھتے۔ جیل کے ایک بڑے افسر کی مداخلت پر ایک بار پھر ان کا دماغی علاج کروانے کی کوشش کی گئی مگر نتیجہ بے سود رہا۔ البتہ انہیں صرف اپنا دھور نام یاد آ گیا تھا مگر اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

جنگ کو قسٹم ہوئے چھتیس برس بیت چکے تھے۔ دونوں ملکوں کے درمیان مکمل سفارتی، سیاسی اور تجارتی تعلقات بحال ہو چکے تھے۔ ایک دن سمندری حدود کی خلاف ورزی پر ایک کشتی میں سوار گیارہ پاکستانی مای گیارہ کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا گیا۔ دو لوگ اس جیل میں کم بیش میڈیا بھر

قید رہے، جہاں سرفراز احمد بھی موجود تھے۔ جیل میں ہی ایک مای گیر کو عمر قید کانے والے ایک بوزے قیدی سے فرزاد احمد کے بارے میں پتا چلا۔ یہ مای گیر کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دونوں ملکوں کے مابین بہت عرصہ پہلے جنگ ہوئی تھی۔ کوئی ایک مہینے کے بعد جب ان مای گیروں کو رہا کر کے زمینی راستے سے ان کے اپنے ملک کے حوالے کیا گیا تو انسانی حقوق کی تنظیم کا ایک اہلکار بھی انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے اسلام آباد سے واکم سرحد پر آیا ہوا تھا۔

سرحد پر ان مای گیروں کے اعزاز میں ٹھہرانے کا بھی بندوبست کیا گیا۔ جس کا اہتمام اسی تنظیم نے کیا تھا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”کریم بخش۔“ کھانے کے دوران میں تنظیم کا وی لہا کہ وہ اس مای گیر کے پاس پہنچا، جو فرزاد احمد کو نہ صرف دیکھ چکا تھا بلکہ یہ بھی جان چکا تھا کہ وہ اس کا نام وطن ہے۔

”کیسے دن گزرے وہاں پر؟“

”صاف اوپر والے کی سہرا بیاری۔ ویسے بھی جیل تو جیل ہوتی ہے چاہے کھن کی کیوں نہ ہو۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”یہ قسمت کا مکمل ہوتا ہے۔ تم نے تو کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا کہ پرانے ملک میں جیل کا نا پڑے کی پر گھبراہٹ نقدیر میں شاید یہی لکھا ہو تھا۔“

”جی صاحب..... شکر ہے کہ اپنے وطن پہنچ گئے۔“

”اور کوئی خاص بات، ایسا واقعہ جو چھپیں اس جیل میں پیش آیا ہو؟“

”نہیں جی..... ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔“ یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگا۔ ایسا لگا کہ وہ کوئی بات یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر وہ ایسے چوکا چھپے اسے وہ خاص بات یاد آگئی ہو۔ ”اگر بے صاب بنے.....“ اس نے جلدی سے اس غائبانہ کو متوجہ کیا جو کچھ دیر پہلے اس سے گفتگو کر رہا تھا اور اب کسی دوسرے مای گیر سے بات چیت میں مشغول تھا۔

”کو..... کیا ہوا؟“ وہ کریم کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”صاف..... وہاں میں اکثر ایک قیدی کو شلٹے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ وہ بہت بوڑھا تھا۔“ اس نے بات شروع کی۔ چونکہ وہ شخص بھی چونک گیا۔ اس کی پوری توجہ اس کی طرف کی۔ ”وہ شخص کسی سے بات چیت نہیں کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ذہنی مر لیں ہے۔ دوسرے قیدی بھی اس کا احترام

زاویہ

بڑی اور نیکی کے درمیان صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے، ایک قدم پیچھے ہٹ جائیں تو تنگ کانات اور ایک قدم آگے بڑھ جائیں تو شرفِ انصاف۔ درمیان میں ٹھہر جائیں تو محض جہمِ آبادی۔ 14 اگست 1947 کو بعض لوگوں نے یہ قدم پیچھے کی جانب اٹھایا تھا، تاریخ آگے بڑھ رہی تھی اور تاریخ ساز پیچھے ہٹ رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ مالِ نیست مفت ملا تھا مگر بے بازو زبانی میں سب سے گراں لگی۔ جن کے سامنے غمِ غم نہ تھا وہ خود مالِ نیست کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ یہ مالِ نیست ہی تو تھا جس کی وجہ سے غزوہ بدر کے بعد خدا کی طرف سے تہذیب نازل ہوئی۔ خود ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مالِ نیست کے مقابلے میں کتنے ہی ستارے ڈوبے، سورج کھنسے، بت گرے اور جہاز بیلے گئے۔

ماخذ: آوازِ دوست از علی مسعود
سرمد، مومن مہاشا، ماہر، ادکارہ

کرتے تھے۔ لوگ جب اس کے متعلق بات چیت کرتے تھے تو سب اسے جزل صاب کہہ کر پکارتے تھے۔

”جزل صاب.....“

”جی ہاں..... دو سب لوگ اسے یہی کہتے تھے۔“

کریم نے پھر اپنی بات شروع کی۔ ”ایک دن ہم کھانا پکا رہے تھے کہ ایک بوڑھا قیدی ہمارے پاس آیا۔ کہنے لگا کہ کریم مسلمان ہو؟ میں نے ہاں میں جواب دیا۔ تب وہ کہنے لگا کہ جزل صاب بھی تمہارا ہم مذہب ہے۔ اس کے لیے ایک مسلمان قیدی کھانا بنایا کرتا تھا، وہ آج رہا ہو گیا ہے۔ جزل صاب کا کہنا ہے کہ جب تک تم یہاں ہو، اس کے لیے کچھ کھانا بنادیا کرو۔“

”یعنی وہ ہمارے ملک کا کوئی فوجی ہے؟“ این جی او کے نمائندے نے حیرانی سے دریافت کیا۔

”یہ تو پتا نہیں مگر میں اس کے لیے کئی دن تک کھانا بناتا رہا ہوں۔“

”اور کچھ سنا تھا تم نے اس جزل صاحب کے بارے میں؟“

”ایک دن ایک بوڑھے قیدی نے مجھے ہاتوں ہاتوں میں بتایا کہ جزل صاب کو جنگ کے دنوں میں فوج نے پکڑا

مقبول عام ٹی وی سیریلز اور شاہکار ناولوں کی تخلیق کار

عمیرہ احمد کا پیغام پاکیزہ بہنوں کے نام

پاکیزہ کے لیے میرا پہلا سلسلہ وار ناول اور مجموعی طور پر میری تیسری تحریر ہے۔ تقریباً چار سال بعد میں کسی بھی ڈائجسٹ کے لیے کوئی ناول لکھ رہی ہوں۔ قارئین سے زیادہ میں خود ایکسٹنڈ ہوں۔ آپ کی توقعات سے واقف ہوں لیکن اب اس کی عادی ہو چکی ہوں۔

آئندہ آنے والے سالوں میں اگر زندگی رہی تو میں پاکیزہ کے لیے انشاء اللہ قاتالی ہر سال باقاعدگی سے کچھ نہ کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے ڈائجسٹ کے ذریعے مزید شہرت، شناخت یا پیسے کی ضرورت ہے بلکہ صرف

اس لیے کہ پاکستان کے بہت سے علاقوں میں لوگ میری تحریریں کتاب کی شکل میں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اس کا ادراک مجھے پہلے نہیں تھا۔ ڈائجسٹ کی دنیا میں واپسی کی بنیاد ہی وہی ہے۔ میں اپنے پڑھنے والوں کا وہ خرس لوٹنا چاہتی ہوں جو انہوں نے عزت و پسندیدگی، ستائش اور نام کی صورت میں مجھے دیا۔

میرے تحریری سفر میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں ایک وقت میں دو مکمل ناولز پر کام کر رہی ہوں۔ درنجات اور عکس۔ درنجات اس سے پہلے میں نے ہمیشہ ایک وقت میں ایک مکمل ناول پر کام کیا ہے۔ درنجات کو میں پہلے شائع کروانا چاہتی تھی لیکن پھر بالکل آخری لمحات میں، میں نے عکس کو پہلے شائع کروانے کا فیصلہ کیا۔

درنجات اپنے موضوعات کے اعتبار سے زیادہ hard hitting اور complex ہے۔ کہانی کا کیڑوس بھی بڑا ہے تو میں نے سوچا درنجات کی صورت میں seven course meal دینے سے پہلے آپ کو عکس کی صورت میں ایک appetizer دے دیا جائے۔

تو آئیں عکس کے ونڈر لینڈ میں چلیں اور محبت اور تعلق کی کچھ نئی بنیادیں، نئی جہتیں کھولیں۔

عمیرہ احمد کے قلم سے نکلا ہوا ناولوں کی گہرائیوں کو چھو لینے والا ناول

ماہنامہ پاکیزہ میں ملاحظہ فرمائیں

عکس

عکس



تھا۔ تمہارے ملک کا فوجی ہے مگر اب تک بے چارہ نہیں پڑا ہوا ہے۔ لگتا ہے تمہاری فوج بھی اسے بھول گئی ہے؟
"کیا کہہ رہے ہو تم؟" یہ سنتے ہی این جی او کے نمائندے نے اسے بازو سے پکڑا اور ایک کونے میں لے گیا۔ "اور کیا کچھ پتا ہے تمہیں اس کے بارے میں؟" اس نے نہایت رازداری سے سرکوشی میں پوچھا۔

"وہ قیدی بن رہا تھا کہ جب جہاز سب کو پکڑا گیا تو یہ زخمی تھا۔ بس تب سے یہ ایسا ہو گیا ہے لگتا ہے کہ سر پر گہری چوٹ لگی ہوئی۔ اسی لیے اس کا دماغ کام نہیں کرتا۔ نہ بولتا ہے اور نہ ہی کسی کی سنتا ہے۔"
"تمہیں معلوم ہی نہیں کہ تم نے کتنی بڑی خبر مجھے دی ہے؟" کریم بخش کی بات سن کر وہ ہکا بکا اور پھر چپکوں کے بعد نہایت جوشیلے لہجے میں کہنے لگا۔ "تم اپنے گھر کا مکمل پتا اور فون نمبر مجھے لکھو اور وہ ہو سکتا ہے کہ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے۔"

کریم بخش نے اسے اپنا پتا، فون نمبر نوٹ کر لیا اور مزید درکار معلومات بھی فراہم کر دی۔ وہ خوش تھا کہ جن لوگوں نے اس پر احسان کیا ہے، اس طرح شاید وہ ان کے احسان کا بدلہ چکا پائے گا۔

این جی او کے اس نمائندے کا نام علی رضا تھا۔ انسانی حقوق کی سرگرمیوں میں اس کا نام نہایت معروف تھا۔ کریم بخش کی بات اس کے لیے ایک نئی کم آواز بات ہوئی۔ یہ سننے کے بعد وہ جلد سے جلد اسلام آباد پہنچنا چاہتا تھا تاکہ پتا چلا سکے وہ کون سا فوجی ہے جو جنگ ختم ہو جانے کے مدتوں بعد بھی دشمن ملک کی جیل میں قید ہے اور سب اس کے بارے میں لاعلم ہیں؟

☆☆☆

اسلام آباد میں انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والی این جی او کا ایک اہم مشنر کہ اجلاس ہو رہا تھا۔ یہ اجلاس علی رضا کی جانب سے اس تحریری رپورٹ کے بعد منعقد کیا گیا تھا جس میں ایک ماہی گیر کے انکشاف کو بنیاد بنا کر اس فوجی کی رہائی کے لیے متعلقہ اہل عمل اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ اجلاس میں اس حوالے سے فیصلہ کیا گیا کہ سب سے پہلے بھارتی حکومت سے درخواست کی جائے کہ سفارتی تصدیق کی جائے کہ دونوں ملکوں کے درمیان ہونے والی آخری جنگ کا کوئی قیدی کیا ان کے پاس ہے؟ جب اس سوال کا جواب مل جائے گا تو پھر اگلا قدم اس کی واپسی کا

ہوگا۔ علی رضا کو اس مقصد کے لیے قائم کی گئی کمیٹی کا سربراہ منتخب کیا گیا۔ اگلے چند ہی روز میں کمیٹی نے کام شروع کر دیا۔
فرزاد احمد کے حوالے سے ماہی گیر کے انکشاف کی اطلاع میڈیا کو بھی دی گئی۔ اخبارات میں بھی اس خبر کا چرچا ہونے لگا۔
اس کے بعد کئی ماہ گزر گئے۔ سفارتی ذرائع ست روٹی سے کام کر رہے تھے۔ آخر چھ ماہ گزر جانے کے بعد بھارتی حکومت نے کمیٹی کو آگاہ کیا کہ تمام تر کارڈز کا جائزہ لینے کے بعد ایک بات سامنے آئی ہے کہ ان کی قید میں... ہمسایہ ملک کا کوئی فوجی نہیں ہے، تاہم مختلف الزامات کے تحت ان کے بعض شہری قیدی ہیں، جن کے کوائف جلد ارسال کر دیے جائیں گے۔ کمیٹی کو اس جواب سے خاصی ناامیدی ہوئی لیکن انہوں نے کوششیں جاری رکھیں اور پھر مزید ایک سال گزر گیا۔ کمیٹی نے دوسری انسانی حقوق کے حوالے سے کام کرنے والی تنظیموں سے بھی رابطے استوار کیے۔ آخر دونوں ملکوں کی این جی او کی مشترکہ کوششیں رنگ لائیں۔ کمیٹی کو ایک فہرست فراہم کر دی گئی، جس میں قیدیوں کی تفصیلات موجود تھیں۔ ایک نام کے آگے لکھا تھا۔
نام : نامعلوم۔ جرم : نامعلوم۔ سزا : کوئی نہیں۔ شہریت : پاکستانی۔
علی رضا کو یہی وہ مطلوبہ شخص نظر آیا۔ جب اس نے جیل کا نام دیکھا اور پھر اپنے پاس موجود ریکارڈز سے اس کا موازنہ کیا تو پتا چلا کہ یہ وہی جیل ہے، جہاں سے اس ماہی گیر کو رہائی ملی تھی، جس نے اس شخص کی موجودگی کی اطلاع دی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔ لگ بھگ دو سال کی کوششوں کے بعد آخر کار یہ تو پتا چل گیا تھا کہ ان کا ایک نامعلوم ہم وطن دوسرے ملک کی جیل میں تھا۔ اس کے لیے یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔
علی رضا نے اس کامیابی سے تمام تنظیموں کو آگاہ کیا اور آخر کار ملے پایا کہ اب اس شخص کی رہائی کے لیے کوششیں تیز کر دی جائیں گی۔ جب کمیٹی نے رہائی کے لیے کوششیں شروع کیں تو پہلے بھارت نے یہ تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا کہ ان کے پاس دوسرے ملک کا کوئی فوجی جیسی قیدی بنا ہوا ہے۔ جنگ کو ختم کرنے سے بھی پچیس پچیس برس گزر چکے تھے۔ اس دوران باہمی مذاکرات کے نتیجے میں جنگ کے دو تین سال کے اندر اندر تمام جیسی قیدی اپنے اپنے ملکوں کے حوالے کر دیے گئے تھے۔

اگر کئی فراز احمد کی رہائی اور دین واپسی کے لیے کوششیں کر رہی تھیں لیکن تو خود مسز احمد یہ بات جانتے تھے اور نہ ہی مسز احمد اس بات سے آگاہ تھیں کہ ان کا انتہا ختم کرنے کے لیے نہ جانے کتنے لوگ اپنی راتوں کی نیند اور دن کا نینک تیاگ چکے ہیں۔ وہ بدستور اپنے شوہر کی واپسی کی منتظر اور ان کی سلامتی کے لیے دعا گو تھیں۔ اب بھی وہ معمول کے مطابق دوپہر سے شام ڈھلے تک برآمدے کی آرام کری پر بیٹھ کر شوہر کی راہ دیکھتے ہوئے وقت گزار دیتی تھیں۔ کبھی کبھار کے پٹ کے ساتھ اب بھی مٹی کے تیل کا لیمپ روزانہ شام ہوتے ہی جل اٹھتا اور صبح تک اس کی نور مستطیل ٹھناتی رہتی تھی۔

☆☆☆

ماہی گیر کے اکتشاف کو کافی عرصہ صحت چکا تھا۔

علی رضا اور اس کی این جی او نے یہ تو پتا چلایا تھا کہ ان کے ملک کا ایک شخص جنگ کے زمانے سے ہی بھارت کی قید میں ہے لیکن لاکھ کوششوں کے بعد یہ ثابت نہیں ہو پا رہا تھا کہ آیا۔ جس شخص کے بارے میں بات کی جا رہی ہے، وہ ان کے ملک کا شہری ہے بھی یا نہیں؟ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے، اسے کسی طور پر بھی علی رضا کی این جی او یا ان کے ملک کے حوالے نہیں کیا جاسکتا تھا۔

کافی تک و دو کے بعد آخر یہ طے پا گیا کہ یہ سانس سے بدلے کر کم از کم یہ بات جاننے کی کوشش کی جائے کہ اس شخص کی شہریت کس ملک کی ہے؟ آخر ڈی این اے ٹیسٹ کروانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ٹیسٹ کے نتیجے میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ وہ شخص علی رضا کے ملک ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ بات طے ہو جانے کے بعد طویل بحث و مباحثہ ہوا۔ آخر بھارت اس شہری کو واپس کرنے پر رضا مند ہو گیا۔ فیصلہ کیا گیا کہ اس شخص کو وطن واپس لا کر سب سے پہلے علاج کروایا جائے گا۔ اگر اس کا ذہن جاگ گیا تو ٹھیک ورنہ فوج کے ریکارڈ کی پڑتال کا کام تو جاری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے کوئی سراغ مل جائے، جس سے اس کے اہل خانہ کا پتا چل سکے؟

آخر کار وہ وقت آ گیا جب فراز احمد کو وطن واپس لے آیا گیا۔ ڈاکٹروں کے ایک بورڈ نے ان کا علاج کرنا شروع کر دیا۔ انہیں روزانہ شام کو کھلانے کے لیے باہر لے جایا جاتا تھا۔ بالآخر ڈاکٹروں کی محنت رنگ لائی۔ ان کے دماغ نے چیزوں کو کچھ کچھ پہچانا شروع کر دیا۔ ڈاکٹروں کا بورڈ بہت خوش تھا کہ ان کی محنت رنگ لاری ہے۔

”ڈاکٹر کمال آپ کی رائے میں مریض کی یادداشت واپس لانے کے لیے کیا چیز زیادہ مؤثر ثابت ہو سکتی ہے؟“ ایک روز صحافیوں کی ایک ٹیم نے اسپتال کا دورہ کیا تو ان کا علاج کرنے والے ڈاکٹروں کی ٹیم کے سربراہ سے ایک صحافی نے سوال کیا۔

”یہ شخص ہمارا شہری ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ زندگی کے کسی حصے میں انہوں نے کراچی کا سفر بھی کیا ہوگا۔“ ڈاکٹر کمال نے صحافی کو جواب دینا شروع کیا۔ ”ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہفتے میں دو تین بار انہیں کراچی کی تاریخی عمارتوں کی سیر کروانے کے لیے لے جایا کریں گے۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح انہیں اپنے ماضی سے متعلق کچھ باتیں یاد آنے لگیں۔“

”بہت خوب۔“ صحافی نے جواب دیا

☆☆☆

کئی ہفتے گزر چکے تھے۔ ڈاکٹر فراز احمد کو باقاعدگی سے تاریخی مقامات کی سیر پر لے جاتے۔ اگرچہ سیر سے ان کی طبیعت پر کافی اچھا اثر پڑا تھا۔ جسمانی لحاظ سے ان کی صحت پہلے کے مقابلے میں کافی بہتر ہو چکی تھی مگر اب تک وہ فراز کے علاوہ کچھ اور کہنے سے قاصر تھے۔ یہ ایک لفظ بھی وہ اس طرح ادا کرتے کہ سننے والا بہت مشکل سے ہی اسے سمجھ پاتا تھا۔

ڈاکٹر کمال نے فیصلہ کیا کہ انہیں مزار قادم لے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ مزار قادم ہی وہ جگہ ہے جہاں شہری زندگی میں کم از کم ایک بار یا پھر جی مون کے دوران میں تو ضرور آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کا مریض بھی وہاں اپنی شادی کے بعد آیا ہو۔ شادی کا لمحہ وہ ہوتا ہے کہ جس سے بڑی یادیں انسان کے دماغ پر دوسری چیزوں کی نسبت زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ دوسری بات یہ بھی کہ مزار قادم ملک کی ان معروف ترین عمارتوں میں سے ایک بھی ہے جس سے ملک کے تمام لوگ نہایت ہی اچھی طرح واقف ہیں۔ ڈاکٹر کمال نے اپنی یہ تجویز بورڈ کے سامنے رکھی۔ بورڈ میں شامل باہر نفسیات نے بھی تجویز کو پسند کیا اور پھر چند روز کے بعد انہیں ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کے ہمراہ مزار قادم لے جایا گیا۔

ایک ایسوسی ایٹ بھی ساتھ لے جاتی تھی، جس میں دماغ کی حالت کو جانچنے والی کئی مشینیں خاص طور پر نصب کی گئی تھیں۔ ڈاکٹر چاہتے تھے کہ جیسے ہی وہ وہاں سے واپس، ان کے دماغ کی فوراً اسکننگ شروع کر دی جائے۔ ڈاکٹروں نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ سیر کے دوران میں باہر نفسیات ان کا ہاتھ مشاہدہ کریں گے تاکہ پتا چل سکے کہ کیا عمارت کو دیکھ کر ان

کے دماغ پر کوئی اثر بھی ہو رہا ہے یا نہیں؟ ڈاکٹروں کی یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ مزار قادم پر جاتی نظر پڑی تو فراز کچھ دیر تک ٹنگی باغ سے اسے دیکھتے رہے اور پھر گھٹنوں کے تل زمین پر بیٹھ گئے۔ ان کی ظاہری حالت ایسی تھی کہ جیسے میں میں ایک طوفان آ گیا ہو۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھے اور عالم بے خودی میں ان کا ہاتھ ماتھے کی طرف اس طرح اٹھا پیسے وہ قادم کو سیٹ چوڑ کرنا چاہتے ہوں۔

”تم ٹھیک کہتے تھے ڈاکٹر کمال۔“ باہر نفسیات نے مسز فراز احمد کو زمین پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو ڈاکٹر کا ہاتھ دباتے ہوئے پرجوش لہجے میں آواز میں کہا۔

”سیر ابھی یہی خیال ہے۔“ ڈاکٹر کمال کا لہجہ بھی خوشی سے بھر پور تھا۔ کچھ دیر کے بعد فراز احمد نہایت بے تابی سے اٹھے اور تیزی سے ادھر سے ادھر پھر لگانے لگے۔ ان کے چہرے پر مختلف رنگ اور حارہ تھے۔ ہر لمحے چہرے پر نیا اثر تھا۔ وہ کھٹنا بھر ادھر سے ادھر پھرتے رہے۔ ڈاکٹر بدستور انہیں اپنی نظروں میں لیے مشاہدہ کر رہے تھے۔ آخر کافی دیر بعد وہ تک کر ایک بچہ پر گر پڑے۔ ایسوسی ایٹس سے اس پر مٹکوا لیا گیا اور فوراً ہی واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔

راستے میں ڈاکٹروں نے دماغ کی اسکننگ شروع کی تو انہیں حیرت ہوئی کہ ان کا دماغ نہایت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ یہ ایسی دماغی ٹھیک ٹھیک تھی جو اس سے پہلے انہوں نے ان کے کسی بھی ٹیسٹ میں نہیں دیکھی تھی۔ ڈاکٹروں کو ایک نیا حوصلہ چکا تھا۔

اسپتال پہنچنے کے بعد بھی انہیں بدستور اسکننگ مشین پر رکھا گیا۔ ڈاکٹر حیران تھے کہ دماغ بدستور پہلے جیسی پوزیشن میں تھا۔ جس کا مطلب ہے کہ مریض کا دماغ کسی شدید معاملے سے دو چار ہے۔ ڈاکٹروں کو یقین تھا کہ مزار قادم سے ان کی کوئی ایسی جذباتی وابستگی ضرور تھی، جس نے ان کے ذہن کو کھینچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ وہ پرامید تھے کہ اب مریض کی یادداشت واپس آسکتی ہے۔ انہیں یقین تھا کہ ایک بار یادداشت لوٹ آئی تو ان کی شخصیت کے گرد دنیا ہوا پرامن ریت کا ہالہ بھی خود بخود ختم ہو جائے گا۔ شام تک ان کا دماغ بدستور شدید شش میں جتا رہا۔ کئی گھنٹے صحت چکے تھے۔ اب ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ انہیں سکون آور انکیشن لگا دیا جائے۔ وہ پریشان تھے کہ اگر دماغ کی یہی کیفیت رہی تو ممکن ہے کہ اس کا الٹا نتیجہ برآمد ہو۔ شدید ذہنی دباؤ سے مریض کے خون کی گردش خیر تھی اور جس کے باعث دل

سورای

گا کہ۔ ”سرور صاحب دو اٹھ دس دیکھیے۔“

سرور۔ ”سورای میں مرنی نہیں، دکا عدار ہوں۔“

☆☆☆☆☆☆

جلدی

سرور ہوائی جہاز میں جھگڑا کر رہا تھا کہ میں پچھلی سیٹ پر بیٹوں گا۔ سب سمجھا کر تھک گئے کہ آپ کی سیٹ آگے ہے۔

ایک آدمی اٹھا اور سرور کے کان میں کچھ کہا۔ سرور بھاگ کر آگے سیٹ پر بیٹھ گیا۔ لوگوں نے حیران ہو کر اس آدمی سے پوچھا۔ ”آپ نے ایسا کیا کیا کہ سرور فوراً مان گیا؟“

آدمی بولا۔ ”میں نے بس اتنا کہا ہے کہ آگے والے جلدی بیٹھ جائیں گے۔“

☆☆☆☆☆☆

عیادت

سرور دوست سے۔ ”اب تمہاری کھانسی کا کیا حال ہے؟“

دوست۔ ”کھانسی تو بند ہو گئی ہے بس ذرا سانس رک رک کر آ رہی ہے۔“

سرور۔ ”پریشان مت ہو۔ سانس بھی بند ہو جائے گی۔“

☆☆☆☆☆☆

COMMING SOON

سرور کی اپنے باپ سے لڑائی ہو گئی۔ سرور نے غصے میں اپنے باپ کی تصویر اٹھائی اور قبرستان میں جا کر دروازے کے ساتھ لٹا کر کچھ لکھ دیا۔

"COMMING SOON"

مرسلہ: تبصرہ عا س باہر، ادا کاڑھ

کی دھڑکن بھی بڑھ چکی تھی۔ ایسے میں مریض کو مکنتہ طور پر پریکٹس جبرج سے بچانے کے لیے انہیں سکون آور دوا کا انجکشن لگا دیا گیا۔ رفتہ رفتہ وہ نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ صبح پھر ان کی دماغی حالت کو جانچا جائے گا اور یہ پتا چلانے کی کوشش کی جائے گی کہ مزار قاتل کی سر کے بعد جوان کی دماغی حالت بھی کیا وہ یادداشت لوٹانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے؟

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ڈاکٹر مطمئن تھے کہ مریض پر سکون نیند سوا ہوا ہے۔ انہوں نے رخصت لی اور کمرانرس کے حوالے کر دیا۔ یہ دوسری صبح کا ذکر ہے۔

علی رضا اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا انفرورس کی طرف سے آنے والے ایک خط کو پڑھ رہا تھا۔ خط پڑھتے ہوئے اس کا چہرہ خوشی سے دھک رہا تھا۔ خط میں لکھا ہوا تھا:

”انفرورس کے ریکارڈ کے مطابق فلائٹ آفیسر فرازا احمد وہ واحد شخص تھے جو جنگ کے دوران میں دشمن ملک کی فضا کی سرحد کو عبور تو کر گئے تھے لیکن اس کے بعد ان کا کوئی پتا نہیں چلا اور نہ ہی وہ جنگی قیدیوں کے تبادلے کے نتیجے میں واپس لوٹائے گئے اور نہ ہی اب تک ان کی موت کی تصدیق ہو پائی ہے۔ ریکارڈ کے مطابق وہ اب تک بدستور لا پتہ ہیں۔“

”تیرا گھر ہے اوپر والے۔“ علی رضا نے خط پڑھ کر اپنا موبائل فون اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ سب سے پہلے ڈاکٹر کمال کو یہ خبر سنانا چاہتا تھا کہ اس کی محنت کیا رنگ لائی ہے؟ ابھی وہ نہر ملانے ہی والا تھا کہ میز پر رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

”علی رضا؟“ دوسری جانب سے گھبراہٹ ہوئی آواز میں سوال کیا گیا۔

”بول رہا ہوں۔“

”ڈاکٹر کمال بول رہا ہوں۔“

”ارے واہ۔ میں ابھی آپ کا نمبر ہی ملا رہا تھا۔ پتا چل گیا ہے۔ وہ شخص ہماری انفرورس کا پائلٹ ہے۔“

”کیا؟“ ڈاکٹر کمال نے حیرت سے کہا۔ ”خیر اس پر بعد میں بات کریں گے۔ تمہارے لیے بہت بڑی خبر ہے۔ وہ اسپتال سے غائب ہیں۔“

”کیا؟“ اب حیران ہونے کی باری علی رضا کی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ میں کراچی پہنچ رہا ہوں۔ آپ انہیں تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ ویسے بھی میں اب ان کے گھر کا پتا مل سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے تم پہنچو۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر کمال نے فون رکھ

دیا۔

☆☆☆

اتوار کا دن تھا۔ کالج کی چھٹی تھی۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔ سزا احمد اتوار کو دیر تک سوئی رہتی تھیں۔ کھڑکی حسب معمول کھلی ہوئی تھی اور کیمپ روشن تھا۔ اچانک چھانکے کی آواز آئی اور ان کی آنکھ کھلی۔ وہ چونک کر اٹھ گئیں۔ بستر سے اٹھ کر انہوں نے آنکھیں ملے ہوئے دھڑک دھڑک کر دیکھا شروع کیا۔ کھڑکی کا پردہ تیز ہوا ہے اور ہاتھ اور لیمپ نیچے گرا ہوا تھا۔ اس کی چھٹی ٹوٹ چکی تھی اور ٹیٹھے کی کرچیاں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ اس لیمپ کے ساتھ ان کی جذباتی وابستگی تھی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ لیمپ گرا تھا۔ یہ دیکھ کر ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ ان کا دل دوسروں میں غوطے کھانے لگا۔

اچانک انہیں اپنے بچپن کی ایک بات یاد آئی۔ جب وہ بہت چھوٹی تھیں تو ایک بار شیشے کا گلاس ان کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ یہ دیکھ کر کئی کلوم کا بپ بھی تھی۔ وہ ڈر گئی کہ ماں گلاس ٹوٹنے پر اسے مارے گی مگر جب ماں نے ہنسی کو سہے ہوئے دیکھا تو آگے بڑھیں اور اسے ہچکارتے ہوئے کہا تھا ”کالج کا ٹوٹا اچھی بات ہے۔ اس سے تو مستحکم دور ہو جاتی ہیں۔“ واقعی ایسا ہی ہوا۔ اس شام جب اس کے باپا گھر لوٹے تو انہوں نے بتایا کہ جس بس میں وہ آرہے تھے، اسے حادثہ پیش آ گیا۔ جس میں کئی لوگ ہلاک ہوئے مگر انہیں خراش تک نہیں آئی۔ یہ سن کر ماں نے کلوم کو گود میں لیے ہوئے کہا تھا۔ ”دیکھا۔ میں نے کیا کہا تھا۔“

”ہاں ماں۔“ کالج ٹوٹنے سے مستحکم دور ہو جاتی ہیں۔ یہ سن کر پاپا نے اس کے گال پر پیارا کیا۔

”کاش ایسا ہی ہو۔“ انہوں نے زہرباب کہا۔ ”کاش اس بار بھی ایسا ہی ہو جائے۔“ انہوں نے دل ہی دل میں اپنے شوہر کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا اور اٹھ کر کالج کی کرچیاں اٹھنی کرنے لگیں۔

ایک کاغذ پر کالج کے تمام نکلے جمع کرنے کے بعد وہ اسے چھپنے کے لیے لے گئیں۔ وہ ڈراما آگے بڑھیں تو اچانک ان کے منہ سے ایک آہ نکل گئی۔ کالج کا ایک ٹکڑا ان کے پاؤں میں چھب گیا تھا۔ بوزی سزا احمد لوٹ کر انہیں اور اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکیں۔ وہ لہراتے ہوئے نیچے گرے لگیں اور گرے گرے ان کی ٹہنی ہڈی کے کونے سے ٹکرائی۔ چوٹ لگنے کے بعد وہ چیخیں کریں اور دوسری چوٹ سر کے چپٹے حصے پر لگی اور بھل بھل کر کے خون بہنے لگا۔ نیچے گرتے ہی وہ ب

ہوش ہو گئیں۔ خون بدستور بہہ رہا تھا۔

صبح کے دس بجے کا وقت ہوگا جب سزا احمد کے گھر میں صبح داخل ہوئی۔ صاحبہ ان کی بہت جیتی جاگرتا اور منہ بولی جاتی تھی۔ وہ قریب میں ہی رہتی تھی۔ اس کا شوہر بھی انفرورس میں پائلٹ تھا۔ وہ ہر اتوار کو اس وقت ان کے گھر آتی تھی اور پھر سارا دن ”تین گز ادائیگی“۔

و خوش خوش قدم اٹھاتے ہوئے برآمدے تک پہنچی مگر اسے بہت حیرت ہوئی۔ برآمدے میں ان کی آرام کرسی خالی پڑی ہوئی تھی۔ وہ حیران ہو کر کھڑے ہوئے گھر کے اندر چلی گئی اور جب وہ بیڈ روم میں پہنچی تو اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی۔ اس نے جلدی سے ڈاکٹر کو فون کیا۔

ڈاکٹر فوراً پہنچے۔ انہوں نے سزا احمد کو کیستے ہی موت کی تصدیق کر دی۔ ڈاکٹر کے مطابق سزا احمد کے زخم کی بنیادی وجہ سر پر لگنے والی چوٹ تھی جب کہ موت کی وجہ خوں بہے ہوئی اور خون کا نریا وہ بہ جاتا ہے۔ مگر انہیں بروقت طبی امداد مل جاتی تو ان کا بچا ممکن تھا۔

سزا احمد کے گھر سے جب ان کا جنازہ اٹھایا گیا تو سیکور لوگوں کا مجمع تھا۔ سب کے چہرے اُداس تھے۔ ان لوگوں میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا کہ جس سے ان کا خون کا رشتہ ہو سیکر ہر آنکھ نہ صرف اٹھ کر ہی بلکہ جنازے میں شریک ہر فرد کا دل بھی رو رہا تھا۔

☆☆☆

شام کے سات بجے گھر پرے تھے۔ ماحول آہستہ آہستہ دھندلنے لگے میں گم ہوتا جا رہا تھا۔ سامنے سڑک سمنان پڑی ہوئی تھی۔ البتہ ایک سایہ آگے بڑھتے ہوئے چلا آ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ سایہ قریب آتا چلا گیا۔ سزا احمد کے گھر کا گیٹ اور بیڈ روم کی کھڑکی بدستور کھلی ہوئی تھیں لیکن پورا گھر مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ چاروں طرف افسردگی پھیلی ہوئی تھی۔ صرف گیٹ پر ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ یہ روشنی بھی سڑک کنارے لگے بجلی کے کھمبے پر موجود بلب سے آرہی تھی۔ وہ سایہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے گیٹ تک پہنچ گیا۔ اس نے گیٹ پر ایک نظر ڈالی اور پھر گیٹ کے برابر لڑا کر پڑ پڑنے لگا۔ وہاں سفید رنگ مرمری کی ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر لکھے سیاہ الفاظ دھندلا چکے تھے۔ اس شخص نے آگے بڑھ کر اس تختی پر نظریں گاڑ دیں اور پھر بڑے پیار سے اس پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ تختی پر لکھا ہوا تھا:

”فرازا احمد فلائٹ آفیسر“

سایہ آگے بڑھا اور گیٹ عبور کر کے برآمدے تک پہنچ گیا۔ ”کلوم۔۔۔ کلوم۔۔۔“ گھر میں دوبار آواز گونجی لیکن اسے جواب نہ ملا۔ وہ سایہ تھوڑا سا آگے بڑھا۔ اسے آرام کرسی نظر آئی۔ وہ اس کرسی پر اپنے ڈھکے لگے کیمپے طویل سفر کے بعد اب اس کا مکمل جسم مزید کھڑے رہنے کی تاب نہیں لکھتا ہو۔ ”کلوم۔۔۔“ ایک بار پھر اس کے منہ سے آواز نکلی۔ یہ آواز ایسے سنائی دی جیسے کسی گھر کے کونوں سے آرہی ہو۔

☆☆☆

صبح کے سورج نے مشرق سے سر اٹھایا۔ برآمدے کی آرام کرسی پر آج سزا احمد نہیں بلکہ کوئی بڑا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں گیٹ اور اس کے باہر سامنے والی سڑک پر جمی تھیں۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے کسی کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اچانک انفرورس کی کئی گاڑیاں گیٹ پر آکر رکیں۔ آسمانی رنگ کے یونیفارم میں پلیس انفرورس کے کچھ باوردی افسران جپ سے اترے۔ دوسری جپ سے ڈاکٹر کمال کمال اور علی رضا باہر نکلے۔ وہ سب لوگ آگے بڑھے۔ فرازا احمد بدستور ہر شے سے لاشعق بیٹھے ہوئے تھے۔ فوجی آگے بڑھے۔ ان میں ایک سینئر افسر تھا۔ ان سے کچھ دور کھڑے ہو کر انہوں نے سلیوٹ کیا۔ ڈاکٹر کمال آگے بڑھے اور جیسے ہی انہوں نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا وہ آگے کی طرف گرتے چلے گئے۔

”اوہ سزا احمد۔۔۔“ ڈاکٹر کمال نے چلاتے ہوئے کہا۔ سزا احمد کا وقت تھا جب فرازا احمد کا جنازہ اٹھایا گیا۔ ان کی میت کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ قبرستان لے جایا گیا اور تدفین کر دی گئی۔

کل سزا احمد کو دفنایا گیا تھا۔ ان کی قبر کی ٹیلی منی سے سوئس سوئس میٹک اٹھ رہی تھی۔ قبر پر ڈھیر مں چھائے ہوئے پھول پڑے ہوئے تھے۔ جس وقت فرازا احمد کی میت کو لحد میں اتارا گیا، اس وقت اچانک ہوا کا تیز جھوٹا آیا۔ سزا احمد کی قبر سے چند سوکے گلاب کی چپاں اڑیں اور لحد میں فرازا احمد کے گفن پر اس جگہ جا گریں، جہاں گفن کے اندر ان کے ہاتھ تھے۔ ایسا لگا کہ سزا احمد نے آگے بڑھ کر انہیں وہ گلدستے پیش کیے ہوں جو ان کی آمد کے انتظار میں انہوں نے پڑے تھے۔ جب قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی اس وقت بھی اچانک ہوا کا ایک تیز جھوٹا آیا۔ سزا احمد کی قبر پر سے مٹی بھری اڑی اور پھر مٹی، مٹی میں مل گئی۔

بھگت



اناٹری

قسط نمبر 65

خوب صورت دل رنگ جڑوں سے گت ہی ایک تیز رفتار کہانی

قسمت کے پھر میں الجھے ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہانہ اسے دیار غیر لے گیا جہاں وہ اناٹری تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی ہسٹل پر شکست نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کا اناٹری پن اسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اسے پردیس راس آگیا تھا جہاں کی ہنگامہ خیزیاں اس کا دل لہواتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اس کی لاٹری کھل گئی، ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اسے لوٹنا تھا۔ اناٹری سے کھلاڑی بننے کے بعد... وہ لوٹا... تو ہنگامے اور شرارتیں اس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لمحہ لمحہ قہقہوں سے لبریز اس اناٹری کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

دورانے کے قتل اور حالات کی عکاس ایک داستان رنگ پر رنگ

دہرایا۔ مسلح قید اور ذہنی آزیت کے باعث میں اتنا بے زار تھا کہ میں سے اس کا سوا بھگور کر لیا۔ معاملہ بے پایاں کہ میں جاگیر اور کوٹھت کروں گا۔ بعد ازاں راجہ نے مجھ سے رابطہ کر کے اپنی محبت کا اظہار کیا اور شادی کی درخواست کی جس میں نے انکار کیا تو وہ اپنی ناکامی پر دہاڑے کا لہجہ پر کربت ہو گئی۔ یہاں مجھے یہ اطمینان ضرور ہو گیا تھا کہ اب میری زندگی محفوظ ہے کیونکہ وکیل اور راجہ کے درمیان میں آجائے سے جان کا خطرہ نہ تھا۔

قید کے دوران میں ایک دن میری عمرانی پر مامور خرواں سے ایک کے دل میں آخروم نیکی کا جذبہ پیدا ہوا اور اس نے قید خانے کی دیوار میں دھند ڈال کر مجھے رہائی دلا دی۔ میں باہر نکلتا تو معلوم ہوا کہ کوئی مڑوگ گھسٹ ہوا تھا۔ میرا نے میں مجھے ایک دیہاتی جو انٹر آفیا جھٹھے ایک سابق فوجی محل صاحب کے گھر تک لے گیا جہاں میں صاحب اور ان کی اہلیہ نے میری بہت مدد کی اور میں راجہ سے رابطہ کرنے اور وہ جھٹکے ہوئے میں کامیاب ہو گیا۔ راجہ کی مہر اور گمشدہ پریشان کنی۔ راجہ مجھے ایک اسپتال لے گیا تاکہ میری صحت پر سے مٹی اثرات زائل ہوں۔ پھر مجھے رستم کے ہاں ولادت اور شیشہ کے ساتھ وحید کی شادی کی خوشخبری ملی۔ جاگتہ راجہ نے بھی فون پر مجھ سے بات کی جہاں میں خدا جانے اسے جھڑکے۔ کچھ وقت گزارا تھا کہ پاپس آپسٹر نے اطلاع دی کہ کسی عورت کی لاش پائس کے علاقے میں ملی ہے۔ میں نے اسپتال جا کر دیکھا تو لاش اور وہ لاشیں سے وہ راجہ گات ہوئی جس کا چہرہ مٹا تھا۔ اس شخص وہاں آ رہا تھا کہ میرے عصب میں آتی کہ رگڑ کی گاڑی دھاکے سے تپا ہو گئی اور ایک غولی معرکے بعد جس جی وہاں پہنچا تو فوراً فون پر بتایا کہ وہ پاکستان آ رہی ہے لہذا میں اسے لینے کے لیے روانہ ہوا لیکن راستے میں سولہ گار نامی ڈاکو نے مجھے اغوا کر لیا۔ سولہ ڈاکو بڑے پریشان ہو کر آئی تھیں اس کے ساتھ اس کے گھر میں سے وہاں سے لے کر ایک ڈاکو کے ساتھ جب انڈیوٹ پہنچا تو دیکھا تو فوراً فون پر بتایا کہ وہاں سے اس کے بارے میں اس سے ملنے لگی ہے۔ میں نے وضاحت کی تو اس نے فون پر راجہ کو مجھ کو کاشف کیا اور اس کی آواز میں کربش پکڑ کر رہ گیا۔

راجہ میرے لیے وہ دربار بن چکی تھی جبکہ اس نے فوراً کبھی میرے خلاف جھوک دیا تھا۔ لیکن فوراً ٹھنڈی کا عجوتہ دیتے ہوئے راجہ کی عمرانی کی جس کے ذریعے انکشاف ہوا کہ راجہ کا حوصلہ میں کسی سے رابطہ قائم ہے۔ لہذا میں نے ایک گاڑی کے ساتھ راجہ کے محل میں جا کر ایک مختصر ٹرائی کے بعد میں نے اس پر قابو پا لیا۔ وہ میری جانب وحید کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک مقام پر مجھے بغاوت کا بھی قیدی بنانے کے لیے میں نے فوراً لوکل میں منتقل ہوئے اور راجہ کی عمرانی سخت کرنے کی ہدایت کی اور راجہ کو جاننا چاہا لیکن راجہ نے مجھے معلوم کر دیا کہ وہ خود راجہ کے پاس ہے۔ جبکہ قید میں سے حاصل کی گئی معلومات کے مطابق ان ساری کارروائیوں کے پیچھے وہ راجہ کا ہاتھ تھا۔ یہاں میرے لیے جاتا تھا جسے اور شیشہ کا ایک بین الاقوامی اسکور تھا۔ وہ ایکشن میں اپنے حق میں میری دستبرداری کا خواہش مند تھا مگر میں نے اسے پہنچ کر دیا۔ رات کی تاریکی میں مجھے ایک نسواری قلعہ مل گیا۔ میں نے اپنے کمرے سے نکل کر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ قلعہ چھینا کی کسی سے کامیاب ہوئے۔ وہ قلعہ رکھا تھا۔ میری مداخلت پر وہ فرار ہو گیا۔ اطلاع دی کہ وہ حوصلہ میں موجود کی بافت لٹو میں تھی۔ وہی دوران میں ڈاکو شہناز کی کزن شہلا جو انڈیوٹ تھی، جہاں میں ایک رکن بن گئی۔ سخت گفتگو کے بعد شہلا نے حوصلہ کو دھوکہ دیا کہ وہ راجہ کو آویختہ کر دے گی۔ بعد ازاں شہلا نے اپنی ایک جھولی کھلی سائی کی کس طرح وہ لاوار کے قہقہے میں پھنسا۔ مگر اب وہ حقیقت جان کر دلاوار کو کھنکھانے لگا۔ میں اس کے جھانے میں اس کی گلیاں میں نے چھین کر رکھا ہے۔ اپنے دوست کی نیت سے جو میں نے دیکھا جھلا ڈاکو شہناز نے حقیقت محسوس کر لی۔ راجہ کا فون آیا اور اس نے اطلاع دی کہ وہ باہر ہو گئی ہے۔ ہم نے جہاں کے بارے میں معلومات کے لیے ایک شخص کو روانہ کیا۔ جس کی روایت کے بعد ایک نامعلوم کال کے ذریعے اطلاع دی گئی کہ وہ اسپتال میں زخمی حالت میں ہے۔ ہم حیران تھے کہ کیا اتفاق ہے وہ دارمیر صاحب نے میرے ہسپتال کی سائی کے دو درجن میں اسے ایک ایک وائس راجہ کی اور ساتھ میں پر جوش تھا۔ وہ چھین میں بدل گیا لہذا اس سے قید خانے میں شہد کے ذریعے معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں وہ وہ شہلا کی ہو گیا اور اس کی حالت میں فوت ہو گیا۔ اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ اسے پیچھے والا زہر بیہ تھا۔ راجہ نے اطلاع دی کہ وہ اور اور پاکستان آ رہے ہیں لہذا اسے لینے میں اپنے گاڑے کے ساتھ انڈیوٹ پہنچا جہاں ایک گاڑے نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھا۔ اسی دوران میں ایک خاتون اور میں نے ایک گاڑے کو گرتے دیکھا۔ یہ بڑی بڑی عورت تھی۔ اس صورت حال پر پاپس نے برکت پہنچ کر پوچھا کہ کسلسٹ شروع کرتی ہے۔ راجہ اور لاوار بڑی بڑی سے برآمد ہوتے ہیں۔ لاوار بڑی عمر ہے معاملہ پچھری کا ہے لہذا انکی دو ہی رکن پڑتا ہے۔ اسی دوران میں ایک رکن پر فوراً دست اندازہ ہو کر اس کا حال ہے ان کی مدد کرتا ہے۔ فراغت کے بعد یہ لوگ دست بدھائی قلعہ جاتے ہیں جہاں ڈاکو شہلا کو اپنے گھر سے بلا دے۔ لاوار بڑی بڑی سے ذریعے روانہ کیا جاتا ہے لیکن سرور کی حالت میں اس کا اطلاع دیتا ہے کہ شہلا کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ یہاں بھی راجہ کا دست نامرکام آتا ہے اور شہلا کو بازیاب کر لیا جاتا ہے اس کے بعد رقی سکون کا سانس لیتا ہے کہ ایک فون کال اس کا سکون غارت کر دیتی ہے۔

کال راجہ کی تھی اور اس نے اپنی منظوری کا ایسا نقشہ کھینچا کہ کئی بار جھڑکنے کے بعد بالآخر میں اس کی مدد پر آمادہ ہو گیا اور اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا جہاں مجھے قید کر کے ذہنی چارج کیا جاتا ہے لیکن ایک بار پھر کئی کی برکت مداخلت سے اسے رہائی ملتی ہے اور ساتھ ہی راجہ کو بھی آزاد کر لیا جاتا ہے اس کے ساتھ ہی ایک شخص چھو کو کبھی یہ فعال بنا کر قید کر دیا جاتا ہے۔ راجہ اپنی رام کہانی سنانے لگے۔ لاوار میں ہم کئی کے ایک دوست کی کوئی قیام کرتے ہیں۔ جہاں پھر ایک ملا گیا جاتا ہے۔ کوئی گھٹے سے زخمی ہو جاتا ہوں۔ عرفانی کے منہ سے ایک نیا مہشا کر سامنے آتا ہے جو لاوار کا ننڈا ہے۔ اس سلسلے کے سلسلے میں بیان لینے میں اس شخص آتا ہے اور شکار کر کے متعلق بتاتا ہے لیکن رقی لاش کا اظہار کرتا ہے۔ اسی دوران میں راجہ کے لیے میری کسی سے بحث کی آواز آتی ہے۔

حوالی میں ایک بلی عورت میں آئی تھی جس سے گاڑے لٹے ہوئے تھے۔ میں نے گاڑے کو ان کی سے پرانی پر سرور کی اور پاپس کو روانہ کر دیا۔ راجہ نے سے مامور کا فون آیا، اس کا بھید نہ ہو گیا تھا۔ ہم نے اس کی مزاح پر کی کے لیے اسپتال جانے کا فیصلہ کیا جبکہ نیم نے بھی اپنے والد

سے میری خواہش کا اظہار کیا لہذا وہ بھی ساتھ ہی۔ راستے میں نہ معلوم افراتفرانے ہم پر حملہ کیا۔ ٹیم نے پھر پورا عمارت میں مدد کی اور ہجرات کی کئی کشتی کی مدد کی بدولت میں اسپتال تک پہنچ گیا جہاں سے راجہ کا فون پر اطلاع دی اور وہ آ کر دست بدھائی کے گیا۔ اس معرکے کے دوران میں میں اس کو لے کر گیا تھا۔ اسی دوران میں میری کفریال کو لے کر گیا تھا۔ اس کی لاش کے پاس میں میرا موہاں ملا ہے۔ یہ انتہائی شوشینک صورت حال تھی لیکن راجہ کے تعلقات اور ذہنی کشتی مدد سے اس صورت حال پر قابو پایا گیا۔ ایک دن مجھے شکار کا فون موصول ہوا جو مجھ سے فوراً ملنا چاہتا تھا۔ میں نے پریشانی کے عالم میں مجھے ایسے متعلق خبر دی۔

راجہ نے ڈراما کر کے پتھر پٹنے کی کوشش کی لیکن اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ پچھلے نے ایک بار بحر حویلی میں داخل ہونے کی جرأت کی جس پر اسے حویلی بلالیا گیا جس نے انکشاف کیا کہ وہ پاگل پن کا ڈھونڈ کر چارویں کی رانا کے قلم کی وجہ سے۔ لیکن بعد ازاں وہ جھولی ثابت ہوئی۔ اور حویلی سے فرار ہو گئی۔ وہی دوران میں میں لاندن سے سوئی کا فون آیا اور ایک بڑے معاہدے کے سلسلے میں لاوار کو لاندن واپس جانے پر زور دیا۔ اس بار راجہ وہاں پتھر پٹنے کی کوشش کی اسی اسپتال لے جایا گیا جہاں سے وہ بیماری کی حالت میں فرار ہو گئی۔ لاندن روایتی سے پہلے لوری شاپنگ کے سلسلے میں لاوار جاتے ہوئے راستے میں ایک ہول میں شکار سے حادثاتی ملاقات ہوئی اور اس نے اپنے اور لاوار کے درمیان جاری تنازعات کے بارے میں بتایا۔ واپسی میں کچھ لوگوں نے لوپ رقی اور لاوار کو اغوا کر کے قید کر لیا۔ جہاں میں نے مسلسل کر کے ایک ڈاکو کو پکڑ لیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

”شمرہ!“ میں نے تجزی سے خبردار کرتے ہوئے کہا۔ ”دراوازہ بند کرو۔“ وہ بری طرح لرز رہی تھی۔ اس نے کبھی کبھی نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے میری بات ہی نہ سنی ہو۔ ”دیکھو، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہاں سے زہرہ نکل جاؤ گے تو یہ تمہاری جھول ہے۔“ میرا افکار غمی آواز میں بولا۔ ”میرا پاؤں اب بھی اس کی گردن پر تھا اور چہرے کا رخ فرش کی طرف تھا۔“

”یہ ڈائلاگ میں نے اپنی دفتر سے کر اب مجھے اس سے چڑھنے لگی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بناؤ تم لوگ کون ہو اور یہیں یہاں کیوں لائے ہو؟“ ”میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔“ میرا افکار کراہ کر بولا۔ ”کیونکہ میں نے اس کی گردن پر اپنے پیر کا پاؤں بڑھا دیا تھا۔“ ”میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے سب کچھ سچ بتاؤ ورنہ میرا وحشر بعد میں ہوگا، لیکن تمہاری کھوپڑی میں پہلے ضرور سوراخ ہو جائے گا۔“ ”آپ میری بات کا یقین کریں، مجھے کچھ نہیں معلوم، میں تو پیسے لے کر ان لوگوں کے لیے اکثر کام کرتا ہوں۔“ ”اور وہ لوگ کون ہیں؟“ میں نے طنز سے لہجہ میں پوچھا۔

”مجھے حضور بخش یہاں لایا تھا ہی!“ اس نے کہا۔ ”وہی ان لوگوں کے بارے میں جانتا ہوگا۔“ ”اور یہ حضور بخش کون ہے؟“ ”وہ لاوار کا ایک بڑا ننڈا ہے۔ عموماً چھوٹی موٹی ڈاکوتیاں کرتا ہے، مارکیٹ میں دھشت پھیلا کر جتنا وصول کرتا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”میرا سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا سر پکڑا اور خاصی قوت کے ساتھ اپنے کدو جیسے سر سے نکرا دیا۔ میری آنکھوں میں لمبے بھر کو دھبک کے ساتوں رنگ لہرائے اور میں کٹے ہوئے درخت کی طرح فرش پر گر پڑا۔ ابھی میرے حواس کام کر رہے تھے لیکن میں نے اپنی ظاہر کیا کہ میں اس کی عمر سے بے ہوش ہو گیا ہوں۔ وہ اتنا آسان شکار تھا نہیں جتنا میں اسے سمجھ رہا تھا۔“

چاہے وہ عقل سے پیدل ہو لیکن لانے بھرنے میں ماہر تھا۔
میں آنکھیں بند کیے پڑا ہوا دگر گہرے گہرے سانس
لیتا رہا۔
”ٹھک... کیا... تم نے اسے مار دیا؟“ شمرہ نے
لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”ابھی نہیں مرا ہے تو کچھ دیر بعد مر جائے گا۔“ اس
نے بے نیاز سی کہا۔ ”شادے کو رگڑا دینا کوئی عجل نہیں
ہے۔ وہ بھی اس جیسا شہری بابو... دل تو جاہ رہا ہے کہ ابھی
اس کی گردن کاٹ دوں۔ اس کی اتنی جرات کہ شادے
پہلو ان پر ہاتھ اٹھائے لیکن میں حضور بخش کی وجہ سے مجبور
ہوں۔ وہ ابھی اس حرام زادے کو زندہ رکھنا چاہتا ہے۔“
وہ کچھ زیادہ ہی بول رہا تھا۔ ”خپلے میں اس کا کچھ
بندوبست کر دوں۔“ اس نے کہا۔ پھر شمرہ سے بولا۔ ”اپنا
دو پٹا اتارنا۔“

”میں... دو... پٹا... کیوں؟“ وہ ہٹکا کر بولی۔
پھر نیچے شمرہ کی انگلی کی چیخ سنائی دی۔ شاید اس نے شمرہ
کا دو پٹا چھین لیا تھا۔

میری توانائی تیزی سے بحال ہو رہی تھی۔ میں نے
آنکھوں کی خفیف سی جھری سے دیکھا، وہ شمرہ کے دوپٹے کو دو
حصوں میں تقسیم کر رہا تھا لیکن اس کا رخ میری ہی طرف تھا۔
میں سمجھ گیا کہ یا تو وہ دوپٹے کے ان ٹکڑوں سے شمرہ کے ہاتھ
پاؤں باندھنا چاہتا ہے یا پھر مجھے بے دست و پا کرتا چاہتا ہے۔
پھر وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا اور کچھ سوچ کر
رک گیا۔ اس نے دروازے کا نہ صرف بولٹ کھولا بلکہ
دروازہ بھی کھول دیا اور شمرہ سے بولا۔ ”یہاں سے باہر نکلنے
کی کوشش مت کرنا۔ میں نے جھوٹ بولا تھا، باہر اب بھی تن
آدی موجود ہیں۔ وہ تمہیں ماریں گے تو بعد میں، پہلے۔“
اس نے خواہش بھرے اعزاز میں کہا۔

میں جانتا تھا کہ وہ شمرہ کو خوف زدہ کرنے کے لیے اب
جھوٹ بول رہا ہے۔ وہاں کوئی ہوتا تو شمرہ کی چیخیں، نور کی
آوازیں اور یہ دھماچوکڑی سن کر ادھر ضرور آتا۔

وہ گھوم کر میرے سر کی طرف آیا اور جھک کر میرا ہاتھ
پکڑنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش اسے بہت بھی پیڑی۔

میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ پر اتنا زوردار
گھونسا مارا کہ وہ سب پہلو انی داؤچ بھول گیا۔ میں پلک
چمکتے میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کی سائڈ بھی گردن دیوچ
لی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کھٹنے سے اس کی ناف پر دار
کیا۔ وہ ادھوا سا ہو کر فرش پر گر پڑا۔

میں نے شمرہ ہی کے دوپٹے سے پہلے اس کی دونوں
ہاتھیں مضبوطی سے باندھیں، پھر میں اس کے ہاتھ باندھ رہا
تھا کہ کوئی گرج دار آواز میں بولا۔ ”خیر دار! اب تمہارا
کھیل ختم ہو گیا۔“ میں بری طرح اچھل پڑا۔ شمرہ کے منہ
سے توجہ کھل گئی۔

کھلے ہوئے دروازے سے دو آدمی اندر آ گئے۔ وہ
دونوں مسلح تھے اور ان کی کلاشکوفوں کا رخ میری طرف تھا۔
”ہیں نواب صاحب! آپ کا کھیل اب ختم ہو گیا۔
دونوں ہاتھ دیوار سے ٹیک کر کھڑے ہو جائیں۔“ ان میں
سے ایک فرما کر بولا۔

”تم لوگ تو حکم کے غلام ہو۔ اس لیے میں یہ نہیں
پوچھوں گا کہ مجھے یہاں کس کے حکم سے لائے ہو۔“ میں نے
ہنر سے لہجہ میں کہا۔

”رہیں!“ دوسرے کمرے سے نور کی وحشت زدہ
آواز آئی۔ ”تم ٹھیک تو ہو، وہاں کیا ہو رہا ہے؟“

”یہ حکم کے غلام شاید کوئی تماشا کرنے والے
ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم قمر مت کرو، میں بائٹل ٹھیک ہوں
البتہ ان کے ایک آدمی کے چار چھ دانت اس مسخرے کے
کام آ گئے ہیں۔“

میں اس موقع کی تلاش میں تھا جب وہ لوگ میری
طرف سے کچھ غافل ہوں لیکن وہ پوری طرح محتاط تھے۔
ان میں سے ایک کمرے کے ایسے گوشے میں چلا گیا جہاں
سے مجھے نشانہ بننا بہت آسان تھا۔

دوسرے شخص نے کلاشکوف ایک ہاتھ میں سنبھالی اور

دوسرے ہاتھ سے ماہرانہ انداز میں میری تھامی لے کر میر
ریو اور نقد رقم وغیرہ سب نکال لیا۔ اس کا ردوائی کے بعد وہ
دو قدم پیچھے ہٹا۔ مجھے دیوار پر لگی ہوئی پینٹنگ کے شیشے کے
فریم میں سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ میری تھامی لینے والے نے
جب سے پتلی کی ریشمی کی ڈوری نکالی۔ اس کے سرے پر غلابا
کوئی دو تین پتے یا نو یا دو تیرہ تھا۔ اس نے وہ رسی گھما کر میرے
پیروں پر پھینکی۔ رسی کے ایک سرے پر وزن ہونے کی وجہ
سے وہ میرے پیروں میں لپٹ گئی۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ بکھتا، اس نے مجھے ہوں بے
رحمی سے کھینچ لیا مجھے قربانی کے موقع پر قصاب گانے کو
گرانے کے لیے کہتے ہیں۔ اگر میرے دونوں ہاتھ آزاد نہ
ہوتے تو میرے چہرے کا بھی حلیہ بگڑ جاتا۔ میں ہاتھوں کے
بل فرش پر دھڑام سے گرا۔

دوسرے آدمی نے میری پشت پر سوار ہو کر میرے دونوں

ہاتھ بھی اس پتلی لیکن مضبوط ریشمی ڈوری سے باندھ دیے۔
”تو بہت بڑا سوراخ ہے؟“ ان میں سے ایک فرما کر
بولا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس
دوران میں شمرہ مسلسل چیخ رہی تھی۔

”خاموش ہو جاؤ!“ ان میں سے ایک ڈپٹ کر بولا۔
”ارے...“ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

شمرہ کی چیخیں اس کے حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئیں۔

اس دوران میں پہلو ان شادے کو بھی بوش آ گیا تھا۔
اس نے منہ سے پھنکے والا خون تھوک تو دو دانت بھی فرش پر
آ کرے۔ اپنا خون اور ٹوٹے ہوئے دانت دیکھ کر پہلو ان
غضب پک ہو گیا۔ وہ پھر کر میری طرف بڑھا۔ اسلحہ بردار
میں سے ایک نے اسے روک لیا اور بولا۔ ”ہیں اوئے،
زیادہ جوش مت دکھا۔ تو پہلو ان ہے! ایک شہری پاؤں سے مار
کھا گیا؟“

”اس نے مجھے بے خبری میں مار لیا۔ جسم پاک پر زوردار
کی ورنہ۔“

”میں کراؤں! اب اس پر ہاتھ مت اٹھانا۔ حضور
بخش نے جو کچھ کہا تھا وہ یاد ہے؟“

”یار، مجھے تو یہ کام بہت مہنگا پڑا۔“ پہلو ان نے کہا۔

”کام تو کام ہی ہوتا ہے پہلو ان جی۔“ دوسرے آدمی

نے مسکندہ خیر لہجہ میں کہا۔ ”استاد نے میں ہزار روپے نفع
کے لیے تو نہیں دیے تھے؟“ پھر وہ خاموش ہو کر بولا۔
”شاید استاد آ گیا؟“

باہر کی گاڑی کے رکنے کی آواز مجھے بھی آئی تھی۔

”رہیں! اتم ٹھیک تو ہوتا؟“ نور نے کہا۔ اس کی آواز
رندھی ہوئی تھی۔

”یہ تو ابھی تک ٹھیک ہے۔“ ایک کلاشکوف والے
نے کہا۔ ”تو اپنی خیر منا، اس کے بعد تیرا ہی نمبر ہے۔“

”اگر تو رکاباں بھی بڑا ہوتا تو میں۔“

”تو تو پوری دنیا کو آگ لگا دے گا۔ یہ بھی کسی ظلم کا
انکسار ہے۔“

دروازے کے باہر انہیں سنائی دیں، پھر دو آدمی
تیر کرے میں آ گئے۔

ان میں سے ایک کا قد درمیان لیکن جسم ورزش تھا۔

اس نے بڑے بڑے بال رکھے ہوئے تھے۔ وہ بوکسی کے
گرتے اور لٹھے کی شلوار میں لمبوس تھا۔ پیروں میں تھے
الٹے جتنی کھسے تھے اور گتے میں ایک جتن بھی گئی۔ اس نے

کرتے میں سونے کے بن لگا رکھے تھے لیکن گریبان کھ ہوا
تھا۔ وہ اپنے حلیے سے کوئی ایسا شوقین مزاج ظلم ساز لگ
رہا تھا جو محض معروف ہیرہوں کے پکر میں ظلم سازی شروع
کر دیتے ہیں۔

دوسرا آدمی پینٹ شرٹ میں لمبوس تھا۔ اس کا لباس
بے داغ اور جوئے چمک رہے تھے۔ وہ حلیے سے بھی بڑھا
لگتا نظر آ رہا تھا۔ اس کا بدن اکہرا تھا اور آنکھوں پر نیس فریم
کا چشمہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس بھی تھا۔

”چل بھی، شروع ہو جا۔“ ظلم ساز نظر آنے والے
شخص نے اس سے کہا۔ پھر وہ کلاشکوف والوں سے مخاطب
ہوا۔ ”اس نے زیادہ پریشان تو نہیں کیا؟“

”اس نے پہلو ان کو مار مار کے کتا کر دیا ہے استاد!“
ان میں سے ایک بولا۔ ”اگر میں وقت پر ہم یہاں نہ پہنچتے تو
یہ پہلو ان کا چھٹکا کر کے یہاں سے نکل گیا ہوتا۔“

پینٹ شرٹ والا شخص اس دوران میں اپنا بریف کیس
کھول کر اس میں سے سرخ اور کوئی آنکھیں نکال چکا تھا اور اس
وقت بہت انہماک سے آنکھیں کی دوسری سرج میں منتقل کر رہا تھا۔
دوا بھرنے کے بعد اس نے استاد کی طرف دیکھا۔

”اومیاس! امیری محل کیا دیکھ رہا ہے، اپنا کام شروع
کر۔“

وہ آنکھیں لے کر میری طرف بڑھا۔

”کیا آنکھیں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”قمر مت کرو، یہ زہر کا آنکھیں نہیں ہے۔“ استاد نے
ہنس کر کہا۔ ”جسمیں مارنا ہی ہوتا تو وہیں کوئی مار دیتے۔“

پینٹ شرٹ والا میری طرف بڑھا اس نے میری کلائی
کے جوڑے کے نزدیک خون کی شریان ڈھونڈ لی اور دوسرے ہی
لحظ بہت احتیاط سے وہ آنکھیں میری رگ میں اتار دیا۔

کچھ دیر بعد میرا سر بھاری بھاری سا ہونے لگا اور جسم
میں عجیب سی سنسنیات دوڑ رہی تھی۔ ان لوگوں نے میری
حالت دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔

میری آنکھیں کھلی گئیں، ہاتھوں پیروں کو خفیف سی
حرکت بھی دے سکتا تھا لیکن ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھے

اب ان کی آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ ہر طرف
ساتھ تھا، گہرا سا آواز اور تھائی کا احساس! ایسی تھائی کہ حسن تمام
یاد آتا نہیں، اتنا سنا کہ اپنا نام یاد آتا نہیں، لیکن میں دیکھ

سب بکھر رہا تھا۔

پینٹ شرٹ والے نے دوسری سرج میں دوا بھری
اور وہ دوا شمرہ کی کس میں اتار دی۔ اس کے چہرے کے کشیدہ

عضلات اچانک پرسکون ہو گئے۔ اس کی آنکھوں میں اب مجھے وحشت کے بجائے غماز نظر آ رہا تھا لیکن میں کچھ بھی بولنے سے قاصر تھا۔

پھر پینٹ شرٹ والا شخص جو یقیناً ڈاکٹر تھا، اسٹیکو اسکوپ سے میرا معائنہ کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے یہی عمل ٹمرہ کے ساتھ کیا اور اہانتا میں گردن ہلا کر رخصت ہو گیا۔

میں سب کچھ خواب کی سی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ ان لوگوں نے وہاں لائسنس فٹ کیں، پھر اسٹینڈ پر تین اطراف سے کمرے فٹ کیے اور میرے کپڑے اتارنے لگے۔ میں نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی۔ میرے ہاتھ پیر میرے قاپو میں نہیں تھے۔ پھر ان لوگوں نے مجھے اٹھا کر کمرے کے واحد بیڈ پر لٹا دیا۔ ٹمرہ کے ساتھ بھی انہوں نے لیٹی کیا۔ اس نے ذرا برا مزاحمت نہ کی بلکہ اس کے چہرے پر تو غماز ہی کی کیفیت تھی۔ یہ شاید میری قوت ارادی کا کمال تھا کہ میں کچھ نہ کچھ گڑبگڑ محسوس کر رہا تھا۔ ٹمرہ کو شاید اس کا بھی احساس نہیں تھا۔

اچانک تیز روشنیوں سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ روشنیاں تقریباً آدھے گھنٹے تک پورے کمرے میں پھیلی رہیں، پھر اچانک وہ گل ہو گئیں اور یوب لائٹ کی روشنی کے باوجود مجھے ایسا لگا جیسے کمرے میں اندھیرا چھا گیا ہو۔

اس کے بعد ان لوگوں نے جیسے جیسے ہمیں کپڑے پہنانے اور ان میں سے ایک آدی نے مجھے کندھے پر اٹھالیا۔ پھر آہستہ آہستہ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ دوبارہ میری آنکھ ایک آرام ست خواب گاہ میں کھلی۔ پہلے تو مجھے کچھ دیر تک یاد ہی نہیں آیا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے اور میں اس وقت اس کمرے میں کیوں ہوں؟ یہ میرا بیڈروم تو ہرگز نہیں تھا۔

یہاں کے باعث میرے مطلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے اور مجھے شدید کمزوری بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن میں اپنے جسم کو حرکت دے سکتا تھا۔

میں نے پانی کی تلاش میں ارد گرد کا جائزہ لیا تو بری طرح اچھل پڑا۔

میرے ساتھ بیڈ پر ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ قابل اعتراض حالت میں پڑی تھی۔ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اس سے پہلے اسے کہاں دیکھا ہے؟ اس کی شکل البتہ مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔

بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر پانی کا جگ اور گلاس رکھا تھا۔

میں کیے بعد دھیرے دو گلاس پانی پی گیا۔ پانی بھی گویا قدرت کا عطا کردہ ایک ٹانک ہے۔ پانی پیتے ہی مجھے اپنے جسم میں کچھ توانائی محسوس ہوئی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر لڑکی کو غور سے دیکھا اور میرے ذہن میں اچانک جھماکا سا ہوا۔ یہ تو وہی لڑکی تھی جو میرے ساتھ قید تھی۔ اس کا نام۔ ہاں اس کا نام ٹمرہ ہے۔ مجھے اس کا نام بھی یاد آ گیا۔

میں ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟ پھر اچانک ہی مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ بدعاش فلم سازوں کے طبعیے والا استاد یاد آیا، وہ دونوں کلاسکوف برادر یاد آئے، پینٹ فیس والا یاد آیا، پھر میری یادداشت نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ ہاں شاید اس شخص نے مجھے کوئی انکشن دیا تھا، پھر۔۔۔۔۔ پھر کیا ہوا تھا؟ لاکھ کوشش کے باوجود مجھے یاد نہیں آیا کہ پھر کیا ہوا تھا؟ دیوار پر لٹری موجود تھی، اس میں ساڑھے تین بج رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ بج کے ساڑھے تین کا وقت ہے یا شام کا؟ مجھے کمرے میں ایک کھڑکی بھی نظر آئی جس پر دیز پر دھکا تھا، کمرے میں دو دروازے تھے، ان میں سے ایک دروازہ غالباً ہاتھ روم کا ہوگا۔

میں ہمت کر کے اپنی جگہ سے اٹھا اور ہاتھ روم کی طرف بڑھا۔ تو میری چال میں ایسی لڑکھائیت تھی جیسے میں نے شراب پی رکھی ہو۔ میں جیسے جیسے ہاتھ روم میں پہنچا اور واش بین کھول کر منہ پر پھٹے پانی کے پھینٹے مارے۔ اس سے میری طبیعت مزید بحال ہوئی۔ ہاتھ روم میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی، حتیٰ کہ گرم اور ٹھنڈے پانی کی لائٹیں بھی تھیں۔ میں نے سوچا کہ نہانے سے شاید کسل مندی دور ہو جائے تو ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو۔ نتائج کی پروا کیے بغیر میں دیر تک نیم گرم پانی سے نہا تا رہا۔

نیم گرم پانی نے گویا میرے تن مردہ میں جان ڈال دی۔ میں ہاتھ روم سے نکلا تو اب میری چال میں لڑکھائیت نہیں تھی۔ جسم میں بھی وہ پہلے جیسی کمزوری اور قہارت نہیں تھی اور ذہن بھی سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔

میں نے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ حسب توقع باہر سے بند تھا۔

اب مجھے ٹمرہ کی فکر ہوئی۔ وہ تو بڑی بے خبری کی نیند سو رہی تھی جیسے اپنی خواب گاہ میں ہو۔

میں نے پہلے اسے بلایا بلایا، آواز میں دیر لیکن وہ کچھ کسمسا کر رہی تھی۔ میں نے اس کے منہ پر پانی کے پھینٹے

مارے۔ ایک منٹ کے اندر اندر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ دیران ویران اور اپنی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی، پھر اس نے چپخٹے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے چپخٹے کی کوشش کی لیکن اس کے جسم میں اتنی جان ہی نہیں تھی، وہ بس مل کر کھڑکائی۔

ہوش میں لانے سے پہلے میں نے وہاں رکھا ہوا ایک کپل اس کے جسم پر ڈال دیا تھا۔

اس نے اپنے منہ سے میرا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی۔ "دیکھو اگر تم خود شرابا نہ کرنے کا وعدہ کرو تو میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا سکتا ہوں۔"

اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا تو وہ گہرا سانس لے کر بولی۔ "پانی۔۔۔۔۔ مجھے ایک گلاس پانی دے دو۔"

میں نے پانی کا گلاس بھر کے اسے دیا۔ اس نے وہ گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

پانی پی کر اس نے مجھے خوف زدہ نظروں سے دیکھا اور بولی۔ "خون بوتل اور میرے بیڈروم میں کیا کر رہے ہو؟"

"ٹمرہ، ٹیم! ڈرا غور فرما میں، یہ آپ کا بیڈروم نہیں ہے۔"

"میرا بیڈروم نہیں ہے؟" اس نے اچانک اٹھنا چاہا، پھر کمزوری کے باعث ہتھ پر گر گئی۔

اس نے بھی کبھی آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لیا، پھر کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ "ہاں، یہ میرا بیڈروم نہیں ہے۔ لیکن۔۔۔۔۔ پھر یہ کس کا بیڈروم ہے اور تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟"

"تم ابھی اپنے ذہن پر زور مت دو۔" میں نے کہا۔

"پہلے ہاتھ روم میں جا کر شاور لے لو تو طبیعت خاصی بہتر ہو جائے گی۔"

"لیکن تم ہو کون؟" وہ جھنجھلا کر بولی۔

"میں خدائی فوجدار ہوں۔" میں نے بھی اس کے لہجے میں جواب دیا۔ "تم انھوں اور ہاتھ روم میں جاؤ۔"

وہ پہلے مشکل تمام اٹھنے میں کامیاب ہوئی، جب وہ ہاتھ روم کی طرف بڑھی تو اس کی چال میں مجھ سے زیادہ لڑکھائیت تھی۔ میں اگر بڑھ کر اسے سہارا نہ دیتا تو وہ اونچے مندر فرش پر گر جاتی۔

اچانک اس کی نظر اپنے لباس پر پڑی۔ اس نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اس کا منہ پھر بند

کر دیا۔ میں نے اسے کپڑے اٹھا کر دیے اور اسے ہاتھ روم تک لے گیا۔ اس نے منہ دھویا تو اس کی حالت میں نمایاں تبدیلی آ گئی۔

"تم گرم پانی سے شاور لو، میں دیکھتا ہوں کہ یہاں سے نکلنے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا اہم یہاں قید ہیں؟"

"تو تمہارا کیا خیال ہے، ہم ایک اس وقت ایوان صدر میں سرکاری مہمان ہیں؟" میں نے طنز سے لہجے میں کہا۔

اسے ہاتھ روم تک چھوڑ کر میں کمرے میں آیا اور ایک مرتبہ پھر غور سے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں صرف ایک ہی کھڑکی تھی اور میں جانتا تھا کہ یا تو وہ بند ہوگی یا پھر اس کے سامنے آہنی گرل لگی ہوگی۔ ہمیں یہاں قید کرنے والے اسے اتنے احمق ہرگز نہیں ہو سکتے تھے کہ ہمارے فرار کا کوئی راستہ باقی رہنے دیتے۔

میں نے کھڑکی کا دیز پر دھکا دیا تو مجھے باہر گھور اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ کھڑکی میں گرل نہیں تھی بلکہ صرف کھٹے لگے ہوئے تھے لیکن جلد ہی میری یہ خوشی کا غور ہو گئی۔ ہم کسی عمارت کی تیسری یا چوتھی منزل پر تھے۔

میں اگر کسی طرح کھڑکی سے باہر نکل بھی جاتا تو نیچے پہنچنے تک میری ہڈیوں کا سرسبز چکا ہوتا۔

اچانک مجھے نور کا خیال آیا۔ وہ بھی تو ہمارے ساتھ ہی تھی، ممکن ہے وہ بھی اسی عمارت کے کسی کمرے میں ہو؟

ٹمرہ ہاتھ روم سے نکل تو اس کی حالت بھی اب قدرے بہتر تھی اور ذہن بھی کام کر رہا تھا۔

"تم۔۔۔۔۔ تم وہی ہونا۔ جو میرے ساتھ اس کمرے میں بھی بند تھے؟" وہ ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بولی۔

"شکر ہے، جنہیں یاد تو آیا۔" میں نے کہا۔ "تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ جنہیں انوکھا کیا گیا تھا؟"

"ہاں۔۔۔۔۔" وہ ذہن پر زور دے کر بولی۔ "مجھے کچھ لوگوں نے انوکھا کر لیا تھا، پھر وہ لوگ جنہیں بھی وہاں لائے تھے اور۔۔۔۔۔ تم نے اس آدی کو گڑھی کر دیا تھا۔

پھر۔۔۔۔۔ دو آدی کن لے کر آگئے تھے اور۔۔۔۔۔ جنہیں باندھ دیا تھا۔ پھر انہوں نے جنہیں کوئی انکشن لگایا تھا اور۔۔۔۔۔ مجھے بھی۔۔۔۔۔ پھر کیا ہوا تھا؟"

"پھر میں آگے اس کمرے میں کھلی تھی اور تم بھی میرے ساتھ۔۔۔۔۔" میں نے کہا۔

میری بات سن کر اس کا چہرہ شرم سے گلزار ہو گیا۔ پھر

سینئر ذالجت 179

ستمبر 2011

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سینئر ذالجت 178

ستمبر 2011

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "تم نے مجھے اس حالت میں....."

"میں نے تمہارے جسم پر کھیل ڈال دیا تھا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"ہاں ہمارے ساتھ والے کمرے میں کوئی عورت اور بھی تھی جو کچھ کرکسی روٹھ کو پکار رہی تھی۔"

"رفتہ میرا نام ہے اور وہ لڑکی بھی میرے ساتھ ہی انوا ہوئی تھی۔ اس وقت نہ جانے وہ کہاں ہے؟"

وہ اچانک بولی۔ "تمہارے پاس سیل فون ہے؟"

مجھے اس کی بات پر ہنسی آئی۔ "سیل فون ان لوگوں نے ہمارے کپڑے چھوڑ دیے، یہی کیا کم ہے؟"

"تم فکرت کرو۔" شمر نے کہا۔ "میرے باپا بہت بڑے سرکاری انفرجین۔ وہ پولیس کے پورے محکمے کو ہلا کر رکھ دیں گے۔"

"تم نے تو کہا تھا کہ تمہارے باپا کسی کہنی میں ہیں؟"

میں نے کہا۔

"میں نے اس وقت جھوٹ بولا تھا۔ میں جھیں بھی انوا کرنے والوں کا سامھی بکھری تھی۔"

"تمہارے باپا کیا صدمہ پاکستان ہیں؟" میں نے پس کر پوچھا۔

"تم میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو؟" وہ برا مان کر بولی۔ "باپا ڈپٹی سیکریٹری ہیں، اب تک تو انہوں نے ایک طوفان کھڑا کر دیا ہوگا۔"

"اس سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "جن لوگوں نے ہمیں انوا کیا ہے، ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔"

"تم کیا پریس رپورٹر ہو؟" اس نے پوچھا۔ "اس قسم کی زبان تو وہی استعمال کرتے ہیں۔"

"اس قسم کی زبان تمہارے باپا جیسے لوگ استعمال کرتے ہیں بے نی انکی کو قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دی جائے گی، ملک دشمن عناصر سے آہنی ہاتھوں سے نشتا جائے گا، قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہیں، وغیرہ اور کیا معلوم تم اب بھی سچ بول رہی ہو یا جھوٹ؟ میں تمہاری کس بات پر اعتبار کروں؟"

وہ پریشانی کے باوجود میری باتوں پر مسکرائے گی۔

"تم تو مذاق بھی کر لیتے ہو؟" وہ طنز سے لہجے میں بولی۔

"میں اس دفعہ واقعی سچ بول رہی ہوں۔" شمر نے باپا ڈپٹی سیکریٹری ہیں۔ ویسے تم خامسے زندہ دل آدمی ہو۔ ایسے وقت میں بھی مذاق کر لیتے ہو۔"

"مجھے تمہاری حالت سدھرنے کا انتظار تھا، تم چلے پھرنے اور سوچنے مجھے کے قابل ہو جاؤ تو کچھ سوچوں۔" میں نے کہا۔

"اس کھڑکی میں اگر گرل نہ ہو تو ہم یہاں سے بھی نکل سکتے ہیں۔" اس نے گویا انکشاف کیا۔

"اس کھڑکی میں گرل نہیں ہے، صرف شیشے کے سلائیڈنگ ڈور ہیں۔" میں نے کہا۔

"پھر کیا مسئلہ ہے؟" وہ خوش ہو کر بولی۔ "شیشہ تو توڑا جاسکتا ہے۔"

"شیشہ تو ٹوٹ جائے گا۔" میں نے تنبیہ کی سے کہا۔

"لیکن یہاں سے باہر نکلنے میں ہم خود بھی ٹوٹ جھوٹ جا کر گمے۔"

"کیا تم اسنے ہی تازہ ہو؟" وہ طنز سے بولی۔ "کر ایک کھڑکی سے چھلانگ لگنے سے ٹوٹ جاؤ گے؟"

"میں اتنا تازہ نہیں ہوں لیکن اتفاق سے کھڑکی اس وقت بلڈنگ کی چوتھی منزل پر واقع ہے۔" میں نے کہا۔

اس کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات ظاہر ہوئے۔

"لیکن تم فکرت کرو، میں کچھ کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا۔

باہر ابھی تک محو تارکی کا راج تھا، سردیوں میں سورج ویسے بھی خاصی دیر میں طلوع ہوتا ہے۔

"تم کیا کرو گے؟" وہ سبے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کیا یہاں سے چھلانگ لگاؤ گے؟"

"ابھی میں نے مرنے کا ارادہ نہیں کیا ہے۔" میں نے کہا۔

میں نے کھڑکی کا سلائیڈنگ دروازہ کھولا تو جھٹ بھٹ کا جھونکا میرے چہرے سے گھرایا میں نے کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ وہ شاید کوئی کمپلیکس تھا۔ وہاں مجھے قیث دکھائی دے رہے تھے۔ چند قیثوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ دیواریں بالکل سیاہ تھیں۔ صرف ایک ہی طرف تھا کہ یا تم میرے پاس اتنا لمبا سا ہوجس کی مدد سے میں نیچے اتر سکوں یا پھر میں سر میں کی طرح اڑنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔

"کیا کر رہے ہو؟" وہ جھنجھلا کر بولی۔ "کھڑکی بند کرنا۔"

سردی سے میری جان لگی جا رہی ہے۔

"تمہاری جان تو ابھی نکلے گی جب وہ لوگ آجی گے۔" میں نے کہا۔

وہ برا سامنے بنا کر خاموش ہو گئی۔

اچانک مجھے کپڑے درمیں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

میں کھڑکی بند کر چکا تھا۔ میں نے تیزی سے پردہ برابر کیا اور فری سے کہا۔ "بیل پر لیٹ جاؤ اور یہ ظاہر کرنا کہ ابھی تک بے ہوش ہو۔" بیل بھی اڑھ لیتا۔ "پھر میں خود بھی سرعت سے بستر میں گس گیا۔"

ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ ممکن ہے آنے والے کسی دوسرے قیث میں آئے ہوں لیکن قدموں کی آہٹ ہمارے کمرے کے سامنے آ کر روک گئی۔ پھر تالے میں چابی کھونٹنے کی آواز آئی، میں نے جسم ڈھیلچھڑا کر آنکھیں موند لیں۔

دروازہ کھلا تو میں نے آنکھوں کی جھری سے دیکھا، کمرے میں داخل ہونے والا استاد حضور بخش اور وہ ڈاکٹر نما آئی تھا۔ اس کے پیچھے دونوں کلاشکوف برادر بھی تھے۔

"اؤے، یہ تو ابھی تک نہیں ہیں۔" استاد نے کہا۔ "تو نے ڈاکٹر نہیں زیادہ نہیں دے دی ڈاکٹر؟"

"نہیں استاد، ڈاکٹر نے کہا۔" میں نے تو ان دونوں کو مار ڈال دوزی دی تھی۔"

"پھر یہ ابھی تک بے ہوش کیوں ہیں؟"

"استاد جو لوگ پان، ونگریٹ، تمباکو یا کسی فراگولائزر کے عادی نہیں ہوتے، ان پر یہ دوا دیر تک اثر کرتی ہے۔ دپے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "نہیں تو اس لڑکی کی ٹھیک چل رہی ہے، سانس بھی نارمل ہے۔" اس نے غایا حشرہ کی ہنسی چیک کی تھی۔

"انہیں ہوش میں لاؤ۔" استاد نے کہا۔

"ابھی دس پندرہ منٹ میں خود ہی ہوش میں آجائیں گے استاد، ڈاکٹر نے کہا۔"

"اؤے ایک گھنٹے بعد تو یہاں پولیس پہنچ جائے گی۔ اس سے پہلے ان کا ہوش میں آنا ضروری ہے۔"

"پھر میں انہیں دوسرا انجکشن دے دیتا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"جو بھی کرتا ہے، جلدی کر ڈاکٹر! استاد نے ورثت لہجے میں کہا۔ "ورنہ میرا سارا پروگرام چھوٹ جاتا ہے گا۔ لڑکی کا باپ ہانگوں کی طرح اسے تلاش کر رہا ہے۔"

"لیکن استاد پولیس یہاں تک کیسے پہنچے گی؟" ایک کلاشکوف برادر نے پوچھا۔

"فصلول باتیں مت کیا کرنا" استاد نے اسے جھڑک دیا۔ "پولیس کو ہم اطلاع دیں گے کہ وہ اب رفتہ شیرازی نے اس لڑکی کو انوا کر لیا ہے اور یہ لوگ اس قیث میں موجود لگا۔ بس پھر تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔"

"تو اس میں ان کا ہوش میں آنا کیا ضروری ہے؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "پولیس انہیں اس حالت میں پکڑے گی جب بھی کیا فرق پڑے گا؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"یار، تو نے پہلی دفعہ عقل کی بات کی ہے۔ پولیس والے تو یہی سمجھیں گے کہ یہ شراب کے نشے میں لپٹ ہیں۔ یہاں شراب کی ایک دو بوتلیں بھی رکھ دو اور ان کے کپڑوں اور جسموں پر شراب چھڑک بھی دو تا کہ ہمارا پلان ہر طرح سے پورا ہو جائے۔" پھر وہ ایک کلاشکوف برادر سے بولا۔ "جاوے، گاڑی سے شراب کی دو بوتلیں نکال لا۔"

میں نے سوچا کہ اب ہوش میں آ جانا چاہیے۔ ان کا ایک آدمی فوری طور پر کم ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر یوں بھی بے ضرر تھا۔ اصل مسئلہ استاد اور کلاشکوف برادر سے منٹنے کا تھا۔

میں نے کراہ کر کہا۔ "پاپا، نی۔"

"یہ ہوش میں آ رہا ہے۔" استاد چونک کر بولا۔ "اسے پانی پلاؤ۔"

کلاشکوف والے نے اپنی گھٹن سے اٹکائی، جگ سے پانی لیا اور میرے نزدیک پہنچ گیا۔ اس بے وقوف کو یہ خیال بھی نہ آیا کہ پھر ہوا جگ آدھے سے زیادہ خالی کیسے ہو گیا؟

اس نے پانی کا گلاس جوں ہی میرے ہونٹوں سے لگایا۔ میں نے ایک ہاتھ اس کی کلاشکوف پر مارا اور دوسرا اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔

وہ الٹ کر پیچھے گرا تو اس کی کلاشکوف میرے ہاتھ میں آ گئی۔ اس سے پہلے کہ استاد سمجھا، میں نے اس کے چہرے پر بھی زوردار لات رسید کر دی۔ وہ دیوار سے ٹکرایا اور مجھے انتہائی غلیظہ کا لیا ل دینے لگا۔

میں اچھل کر ایک دم کھڑا ہو گیا اور گرج کر بولا۔ "کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا ورنہ جھون کر رکھ دوں گا۔"

استاد اور اس کا سامھی ساکت ہو گئے۔ ڈاکٹر تو سم کر پہلے ہی دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو گیا تھا۔

میرے پاس وقت کم تھا۔ میں نے ایک لات میں کلاشکوف والے کو تانک آؤٹ کر دیا، پھر استاد کے سر پر کلاشکوف کے دتے سے ضرب لگائی۔ وہ بھی فوراً زخمی ہو گیا۔

میں ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم نے مجھے کون سا انجکشن دیا تھا؟ تمہارا بریف کیس کہاں ہے؟"

بریف کیس اس نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد فرش پر رکھ دیا تھا۔

"میں بالکل بے قصور ہوں، بس پیسوں کے لانچ میں آ گیا تھا۔"

میں نے اس سے کہا۔ ”ابھی ان کا ایک ساتھی شراب کی بوتل لے کر آئے گا۔ دروازہ تم کھولو گے اور کوئی چالاک کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ۔“

میرا جملہ ادھر ادھر گیا کیونکہ باہر سے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ میں نے استاد اور شاگردوں کو کھینٹ کر بیٹھ کے دوسری طرف ڈال دیا تاکہ آنے والے کو پہلی نظر میں وہ دکھائی نہ دیں۔

دروازے پر دستک ہوئی تو ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ میں دروازے کے ساتھ دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔

”یہ دروازہ بند کیوں کر دیا تھا؟“ اس نے اندر داخل ہو کر پوچھا۔ ”اور یہ استاد اور۔۔۔۔۔“

اس کا جملہ ادھر ادھر گیا۔ میں نے پیچھے سے اس کی گردن پر اور کیا تھا۔ وہ اوپر سے منہ گر پڑا۔ میں جانتا تھا کہ اب ان تینوں میں سے کوئی ایک کھٹے سے پیپلہ ہوش میں نہیں آئے گا۔

”نور کہاں ہے؟“ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ”نور؟“ ڈاکٹر نے حیرت سے دہرایا۔ ”کون نور؟“

”وہ لڑکی جو ہمارے ساتھ دوسرے کمرے میں بند تھی۔“ میں نے کہا۔

”اسے تو استاد گاڑی میں کہیں لے گیا تھا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”کہاں لے گیا تھا؟“ میں نے دشت زدہ لہجے میں پوچھا۔

وہ میرے لہجے سے گھبرا گیا اور بولا۔ ”مجھے۔۔۔۔۔ نہیں معلوم۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ وہ اسے کہاں لے گیا تھا؟“

”تم میرے ساتھ چلو اور بتاؤ کہ ان کی گاڑی کون سی ہے؟“

گاڑی کی چابیاں اس شخص کے پاس تھیں جو شراب کی بوتلیں لینے گیا تھا۔ میں نے اس کی جیب سے گاڑی کی چابیاں نکالیں اور شمرہ سے کہا۔ ”اب اٹھ جاؤ اور یہاں سے نکلو، ان لوگوں سے میں بعد میں نمونوں کا، پہلے تمہیں گھر چھوڑ دوں۔“

شمرہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ ڈاکٹر اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”چلو باہر نکلو؟“ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”یہاں استاد کے اور کتنے آ دی ہیں؟“

”مجھے نہیں معلوم؟“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”ویسے ابھی تک تو

مجھے ان لوگوں کے علاوہ کوئی نظر نہیں آیا۔“

باہر نکل کر میں نے وہ کمرہ باہر سے لاک کر دیا اور ڈاکٹر کو آگے بٹھایا۔

میں خود بہت محتاط تھا۔

”اس بلڈنگ میں لفٹ بھی موجود ہے۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔

”لفٹ کو چھوڑو۔“ میں نے کہا۔ ”زیروں سے نیچے اترو۔“ میں کسی بھی قسم کا خطرہ اب مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ لیکن بے لفٹ کے اس پاس استاد کا کوئی آ دی موجود ہو۔

بہم ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر آگے پیچھے زمین سے اترے اور اس بلڈنگ کے بارکنگ لاٹ میں آ گئے۔

وہ کوئی بڑی اور جدید بلڈنگ تھی لیکن ابھی تک میری کچھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ بلڈنگ کے کس علاقے میں ہے؟

ڈاکٹر ایک ٹویٹر کا رولڈ لائٹ پینچا اور بولا۔ ”یہ استاد کی گاڑی ہے۔“ گھر وہ کمرہ بولا۔ ”اب میں جاؤں؟“

”تم کہاں جاؤ گے ڈاکٹر؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور گردن پکڑ کر اسے گاڑی میں دھکیل دیا۔

میں نے اسٹینٹ پر بیٹھے ہوئے کلاشکوف شمرہ کو دے دی اور اس سے کہا۔ ”اگر یہ ڈاکٹر تھوڑی سی بھی ہوشیار ہو دکھائے تو اسے کوئی ماروینا۔“

میں نے گاڑی پارکنگ لاٹ سے باہر نکالی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ مائل ٹاؤن کا کوئی علاقہ ہے۔

مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ پولیس شمرہ کو سارے شہر میں تلاش کر رہی ہوگی۔ پولیس کی کوئی پارٹی میں بھی روک سکتی تھی۔

میں نے شمرہ سے کہا۔ ”میں تمہیں تمہارے گھر کے پاس چھوڑ دوں گا۔ وہاں سے تم پیدل چلی جاؤ۔ تمہارا گھر کس طرف ہے؟“

”تمہارا گھر گھبرگ میں ہے۔“ اس نے بتایا۔

یہ تو قسمت ہے کہ راستے میں کسی پولیس پارٹی سے ہمارا ٹکراؤ نہیں ہوا۔

میں نے شمرہ کو روڈ پر اس جگہ چھوڑ دیا جہاں سے اس کا بگلا بالکل نزدیک تھا، پھر میں نے تیزی سے واپسی کا سفر اختیار کیا۔

میری کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون لوگ تھے، انہوں نے مجھے انہوں کیوں کیا تھا؟ وہ شمرہ کے ساتھ مجھے گرفتار کیوں کر آ چاہتے تھے؟ اور نور کہاں ہے؟

”وہ لوگ نور کو کہاں لے گئے ہیں؟“ میں نے ڈاکٹر سے سرد لہجے میں پوچھا۔

”نور کون؟“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”وہ لڑکی جو میرے ساتھ تھی۔“

”اسے ابھی آپ نے خود ہی گھبرگ چھوڑا ہے۔“ ڈاکٹر کے لہجے میں الجھن تھی۔

میں نے ایک جھگڑے سے گاڑی روک دی۔ ”الو کے پٹے!“ میں چیخ کر بولا۔ ”وہ شمرہ تھی، میں نور کی بات کر رہا ہوں۔“

”میں نے وہاں شمرہ کے علاوہ کوئی لڑکی نہیں دیکھی۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

میں نے مشتعل ہو کر اس کے منہ پر زور دیا تو چھوڑ دیا۔

”بکواس کرنا ہے، تو نور کو کہیں جانتا؟“

”میں واقعی نہیں جانتا۔“ اس نے پتلی کی پشت سے اپنے ہونٹ صاف کرتے ہوئے کہا۔ میرے پیچھے سے اس کے ہونٹ سے خون نکل آیا تھا۔

”استاد کہاں رہتا ہے؟“ میں نے اچانک پوچھا۔

”استاد کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں ہے۔ ویسے وہ عموماً کاشی چوک کے ایک ہونٹ میں بیٹھا ہے۔“

”وہ لوگ نور کو کہاں لے گئے ہیں؟“

”میں نہیں جانتا کہ وہ لوگ اسے کہاں لے گئے ہوں گے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”کاشی چوک کے اس ہونٹ کا نام بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

اس نے ہلچل مچا دی اور ہونٹ کا نام بتا دیا۔

میں نے اس ہونٹ کی طرف جانے کا ارادہ کیا، پھر یہ سوچی کہ اسے روک دیا کہ اگر میں وہاں ڈاکٹر کو لے کر گیا تو یہ شور مچا دے گا۔ میں اسے کہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے وہ شخص بے ضرر نظر آ رہا تھا لیکن بے ضرر نظر آنے والے لوگ بھی اکثر شیطان ثابت ہوتے ہیں۔ وہ ان جرائم پیشہ افراد کے ساتھ تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ شریف آدمی ہرگز نہیں ہے اور ذرا سا موقع ملنے پر مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے۔

مجھے رہ رہ کر غصہ اور اپنے دوسرے گارڈز پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ وہ لوگ اس وقت کہاں مرے ہوئے تھے جب ان مجھے اور نور کو اغوا کر رہے تھے؟

میں نے سئل فون کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ سب چیزیں تو وہ لوگ نکال چکے تھے البتہ میرے پاس استاد اور اس کے آدمیوں کے سئل فون تھے۔

”الو! سئل فون بھی میرے پاس ہی تھا۔ میں نے وہ سب سئل فون آف کر دیے تھے۔ میں نے ان ہی میں سے ایک

سئل فون نکال کر ان کی آدھ فنی کا نمبر ڈائل کر دیا۔

دوسری طرف سے پہلی ہی تیل پر فون ریسیو کر لیا گیا۔ ”ہیلو! مجھے فنی کی آواز سنائی دی۔“

”فنی! احم لوگ کہاں ہیں؟“

”آ۔۔۔۔۔ آپ ٹھیک تو ہیں سر؟“ فنی نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں، اس وقت تم لوگ کہاں ہو؟“

”ہم آپ کی تلاش میں ہیں سر!“ فنی نے کہا۔

”تم فوراً ہونٹ پہنچو، میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔“ یہ ہدایت مجھے کمرے میں سے سلسلہ قطع کر دیا۔ پھر فنی کا نمبر اس سئل فون سے مٹایا اور سئل فون آف کر دیا۔

اب میرا رخ ہونٹ کی طرف تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ رانا سمیت اپنے تمام دشمنوں کو زندہ جلا دوں۔ ان لوگوں نے میرے لیے سکھ کا ایک لمحہ بھی حرام کر دیا تھا۔ وہ بدبخت نور کو جانے کہاں لے گئے تھے اور اب وہ نہ جانے کس حال میں ہوگی؟

میں جتنی رفتار سے سوچ رہا تھا، اس سے دگنی رفتار سے ذرا اونٹنگ کر رہا تھا۔

میں ہونٹ پہنچا تو فنی مین گیٹ پر موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دیا نہ دار میری طرف بڑھا اور مجھ سے لپٹ گیا۔

”آپ خیریت سے تو ہیں سر؟“ فنی نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”دوسرے لوگ کہاں ہیں؟“

”وہ سب موجود ہیں۔“ فنی نے کہا۔

”ان میں سے کسی سے کہو کہ اس گاڑی کو کہیں ٹھکانے لگا دو۔“ پھر میں ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔ ”تم اس میں سے اپنا ضروری سامان اتار لو۔“

ڈاکٹر نے اپنا بھاری بھر کم بریف کیس گاڑی سے اتار لیا۔

میں ڈاکٹر کو لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

مجھے ڈاکٹر کے رویے پر بھی حیرت ہو رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہاں پہنچ کر کچھ مزاحمت کرے گا۔ میرے ساتھ جانے سے انکار کرے گا لیکن اس نے کسی بھی قسم کی کوئی مزاحمت نہ کی ورنہ میں نے ہی سوچا تھا کہ اسے فنی گئے۔

حوالے کر دوں گا۔ وہ اس سے اپنے طور پر منٹ لے گا۔

تھوڑی دیر بعد فنی بھی واپس آ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”فنی! اچار چار گاڑی کی موجودگی میں وہ لوگ کیسے

سرگزشت

ماہنامہ

شمارہ ستمبر 2011ء کی جھلک

مہاراجا

ایک یک چشم شخص کی داستان جس نے زور بازو سے پورے پنجاب کو مطیع بنایا تھا

واہی مرگ

اس واہی کا تذکرہ جو صدیوں سے انسانی قدم کو ترس رہی تھی

فیلم مارشل

پاکستان کی ایک باکمال شخصیت کا مختصر سا ذکر جس نے دلوں پر راج کیا

انقلابی قزاق

تہلکہ مچا دینے والے شخص کی روداد ایک وقت کے کھانے کو ترسے والا راب پتی کیسے بنا؟

ہونی انہونی

دل میں طوفان اٹھا دینے والی آپ بیتی

رنگی گلزار

دلچسپ سفر نامہ تاریخی عمارت سندھ اسمبلی کا تذکرہ فلمی الف لیلا طویل

آپ بیتی "سراب" اور مزید سیوں آپ بیتیوں جگ بیتاں بچے واقعات

بس ایک بار سرگزشت پڑا کر دیکھیں

آپ یقیناً گرویدہ ہو جائیں گے

خاص شمارہ... ہر شمارہ... خاص شمارہ... ہر شمارہ... خاص شمارہ

گا۔ تم یہ بتاؤ کہ وہ انجکشن کیسا تھا؟

"وہ انجکشن لگنے سے انسان تقریباً مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "وہ سب کچھ دیکھتا ہے لیکن اسے سنائی دیتا نہیں دیتا۔ انجکشن کا اثر ازل ہونے کے بعد اسے کچھ یاد بھی نہیں رہتا کہ اس دوران میں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"مجھے تو ان لوگوں نے وہاں سے روانہ کر دیا تھا لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟" ڈاکٹر نے کہا۔ "استاد نے آپ کی اور اس لڑکی کی انتہائی قابل اعتراض تصویریں اور ویڈیو بنائی ہے۔"

"کیا؟" میرا ہاتھ انجکشن پر بہک گیا اور گاڑی لہرا مئی۔

"جی ہاں، اس نے آپ دونوں کی ویڈیو بنائی ہے اور اب وہ غالباً آپ کو بیک سیٹ کرے گا۔ وہ یہ کام اس سے پہلے دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی کر چکا ہے۔"

"میں ان لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے پھر کر کہا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا نواب صاحب! ڈاکٹر نے کہا۔ "استاد نے وہ ویڈیو اب تک ان لوگوں تک پہنچا دی ہوگی جن کے لیے وہ کام کر رہا ہے۔"

"تم ڈاکٹر ہو کر ایسے گھٹیا کام میں ان لوگوں کا ساتھ دے رہے ہو؟"

میں حالات سے مجبور ہوں نواب صاحب! ڈاکٹر نے کہا۔ "مجھ پر تین جوان بہنوں اور بوڑھے ماں باپ کا بوجھ ہے۔ والد قلع کے سرٹیف ہیں اور برسوں سے بستر پر ہیں۔ میں نے ایم بی بی ایس کس مشکل سے پاس کیا ہے، یہ میں ہی جانتا ہوں۔" وہ ایک دم جذباتی ہو گیا۔

"تمہارے والد کرتے کیا تھے؟"

"وہ محکمہ ڈاک میں پوسٹ ماسٹر تھے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اور آپ جانتے ہیں کہ ایک پوسٹ ماسٹر کی تنخواہ کیا ہوتی ہے؟ پھر انہیں تو اپنی اولاد کو تعلیم دلوانے کا شوق بھی تھا۔ انہں نے میری تعلیم کے لیے چیکے چیکے اپنا زور بچ دیا ہے۔ وہ برسوں سے اپنی منشیوں کے لیے محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے نوٹس پڑھنا شروع کر دیں۔ میں ایم بی بی ایس کے حتمی امتحان میں تھا تو ابو پر قلع کا ایک ہوا۔ میرے پاس اس وقت اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں ان کا اچھی طرح علاج کر سکا ورنہ

"جی ہاں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

اس وقت یہ سوچنے کا موقع نہیں تھا کہ شاہ جی میرا دشمن کیوں ہو رہا ہے؟ میں نے فنی سے کہا۔ "تم ان لوگوں کو قید سے نکالنا اور کہنا کہ مجھے شاہ جی نے بھیجا ہے، شاہ جی کے آدمیوں نے نواب کو پکڑ لیا ہے۔"

"ہاں، یہ سنتے ہی وہ ان کے ساتھ آ جائیں گے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔

میں نے فنی کو اس بلڈنگ کا پتا سکھایا اور اسے فوراً روانہ ہونے کو کہا۔

"سرمہ آپ میرا سیل فون رکھ لیں۔" فنی نے کہا۔

"آپ کو اس کی ضرورت پڑے گی۔ میں غلام نبی سے اس کا سیل فون لے لوں گا۔ وہ تو یوں بھی زخمی ہے۔"

"ہاں، اس کا اب کیا حال ہے؟ وہ کس اسپتال میں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ہمارے ساتھ ہی ہے سرمہ" فنی نے کہا۔ "اس کے بازو میں گولی لگی ہے لیکن ہڈی محفوظ ہے۔ ہاں، میں آپ کی گاڑی لے آیا تھا۔ وہ پارکنگ میں موجود ہے۔" یہ کہہ کر فنی نکلتا تھا وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میں بھی اسی وقت ہوئی سے باہر آ گیا۔ پارکنگ میں میری لینڈ کرورز موجود تھی۔

ڈاکٹر کی تابعداری سے میرے ساتھ ساتھ جیسے وہ میرا ملازم ہو۔ مجھے اس کے روپے پر حیرت ہو رہی تھی۔

وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

مجھے رہ رہ کر نور کا خیال آ رہا تھا اور میرا دل گویا بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ یہ سوچ کر ہی میری کپٹیاں جھنجھکیں گیں۔ اگر ایسا ہو تو میں انہیں بتاؤں گا کہ وہشت گردی کیا ہوتی ہے اور دشمنی کیسے کی جاتی ہے؟

"ایسا کریں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ مجھے اگلے چوک پر اتار دیں۔ وہاں سے مجھے اس وقت بھی کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔"

"تم کیا سمجھ رہے ہو کہ میں تمہیں اتنی آسانی سے چھوڑ دوں گا؟" میں نے کہا۔ "تم بھی تو ان لوگوں کے جرم میں برابر کے شریک ہو بلکہ تمہارا جرم تو ان سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ تم تو اپنے مقدس پیشے کو بدنام کر رہے ہو۔"

"لیکن نواب صاحب... میں... مجھے اب جانے دیں۔"

"تم تو میرے خاص مہمان ہو۔" میں نے طنز پر لہجے میں کہا۔ "تمہاری تو میں بہت اچھی طرح خاطر مدارت کروں

میں انہوں کر کے لے گئے؟"

"سرمہ، پہلے ان لوگوں نے بے آواز رائفل سے فائر کر کے گاڑی کی گاڑی کے دو ٹائر ناکارہ کر دیے، پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھے، آپ کی گاڑی تیز رفتاری سے روانہ ہو گئی۔ ان کی گاڑی سے گاڑی پر بھی فائرنگ ہوئی اور ہمارا ایک گاڑی زخمی ہو گیا۔ میں نے پولیس اسٹیشن میں اس واقعے کی رپورٹ درج کرا دی ہے۔ پھر میں آپ کی گاڑی کے تعاقب میں روانہ ہوا لیکن کچھ فاصلے پر مجھے آپ کی گاڑی تو مل گئی لیکن آپ اس میں نہیں تھے۔"

مجھے یاد آ گیا کہ ان لوگوں نے فوراً ہی مجھے اور نور کو دوسری گاڑی میں منتقل کر دیا تھا۔

"سرمہ وہ میڈم نور... فنی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔"

میں نے مختصر اسے بتایا کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔

"سرمہ، اس ڈاکٹر کو معلوم ہوگا کہ وہ لوگ میڈم کو کہاں لے گئے ہیں؟" فنی نے کہا۔

"اسے کچھ بھی نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔

"تمہیں وہ مکان تو معلوم ہوگا جہاں وہ لوگ نواب صاحب کو لے گئے تھے؟" فنی نے درشت لہجے میں ڈاکٹر سے پوچھا۔ "جہاں تم نے انہیں انجکشن دیا تھا؟"

"ہاں، مجھے اس مکان کا علم ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "وہ

مکان روڈ پر کالی آگے جا کر اگ ملک سا ایک مکان ہے۔"

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے

استاد اور اس کے دو آدمیوں کو ماڈل ہاؤس کے ایک فلیٹ میں بند کر دیا تھا۔ اگر انہوں نے شور شرابا نہیں کیا ہوگا تو وہ لوگ اب بھی وہیں موجود ہوں گے۔ میں نے فنی سے کہا۔ "تم اس

بلڈنگ کی نگرانی کرو بلکہ میری منزل کے فلیٹ نمبر تین سو اٹھارہ کا جائزہ لو۔ موقع ملے تو ان لوگوں کو وہاں سے نکال کر سٹ بدھائی لے جاؤ۔ ان سے نور کا پتا معلوم ہو جائے گا۔"

"سرمہ، آپ اس ڈاکٹر کو لے کر سٹ بدھائی چلے جائیں، میں بھی ان لوگوں کو لے کر پہنچتا ہوں۔"

"وہ لوگ اتنی آسانی سے ان کے ساتھ نہیں آئیں گے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"استاد کس کے لیے کام کرتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"استاد آج کل شاہ جی کے لیے کام کر رہا ہے۔"

"شاہ جی ا؟" میں نے کہا۔ "صوبائی وزیر سید مسکین

شاہ؟"

وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتے۔ میرے گھر والوں کا خیال تھا کہ میرے ڈاکٹر بننے کے بعد ہمارے دن بھر جائیں گے اور گھر میں بن رہے لگے گا۔

اس نے ایک سرد آہ بھری اور اپنی بات جاری رکھی۔
 "ہاؤس جاب کرنے کے بعد مجھے تو کبھی ملازمت بھی نہ ملی۔ بہت بھاگ دوڑ کے بعد مجھے سرکاری ملازمت ملی لیکن پس ماندہ ہے ایک گاؤں میں بھیج دیا گیا۔"
 "میں نے جہیں داستان الم سنانے کو نہیں کہا تھا۔ میں نے صرف یہ پوچھا ہے کہ تم نے ان جرائم پیشہ افراد کے لیے کیوں کام شروع کر دیا؟ قتل و صورت سے تو خاصے شریف اور معقول آدمی لگتے ہو۔"

"میں وہی تو آپ کو بتا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔
 "یار، پہلے تو تم اپنا نام بتاؤ۔" میں نے کہا۔ "آئی ویر سے میرے ساتھ ہوا اور مجھے تمہارا نام تک معلوم نہیں لیکن نام صحیح بتانا۔"

"میرا نام سعید ہے، سعید الرحمان!" اس نے کہا۔
 "میں یہ بتا رہا تھا کہ اس گاؤں میں دو زمینداروں کے درمیان جھگڑا ہوا۔ ان میں سے ایک کا آدمی مارا گیا۔ اس کی لاش اسپتال آئی تو میں ڈیوٹی پر تھا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا زمیندار میرے پاس آیا اور بولا۔ "ڈاکٹر صاحب! پوسٹ مارٹم رپورٹ تو آپ ہی تیار کریں گے؟"

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔ "رپورٹ تو میں ہی تیار کروں گا۔ کیا مرنے والا آپ کا کوئی عزیز تھا؟"
 "وہ میرے دشمن کا آدمی تھا۔" اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ موت کا وقت دس کے بجائے گیارہ بجے درج کریں۔"

"کیوں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔
 "اس لیے کہ قتل کا الزام میرے بھائی پر آ رہا ہے۔ گیارہ بجے وہ علاقے کے ایس ڈی او کے ساتھ موجود تھا۔ موت کا وقت گیارہ بجے درج ہوگا تو میرے بھائی پر الزام ثابت نہ ہو سکے گا کیونکہ اس کی موجودگی کا گواہ نہ صرف ایس ڈی او ہے بلکہ ضلع کا ایکس سی این جی ہے۔" پھر اس نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور بولا۔ "یہ ایک لاکھ روپے ہیں۔"

"میں بھی غربت کی چکی میں نہیں کر ادھ مو اہو چکا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ سماجی، ایمان داری سب کتابی باتیں ہیں اور ایس باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو یا تو بزدل ہوتے ہیں یا پھر انہیں موقع نہیں ملتا۔ میں بھی لالچ سے مغلوب ہو گیا۔ میں

نے کہا۔ "چودھری صاحب! آپ اپنے بھائی کی جان کی قیمت صرف ایک لاکھ روپے لگا رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے کیا ہوگا؟"
 "تم اتنے سیدھے ہو نہیں ڈاکٹر جتنے نھر آتے ہو۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "چلو میں جہیں ایک لاکھ روپے دوں گا۔"
 "چودھری صاحب!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ لوگ بھی آئے تھے جن کا بندہ مارا گیا ہے۔"
 "کون۔۔۔ ملک ڈاکٹر؟" چودھری نے پریشان ہو کر کہا۔

"جی ہاں۔" میں نے ہٹ دھرمی سے جھوٹ بولا۔
 "وہ مجھے ان پیسوں سے کئی کتنا زیادہ کی پیشکش کر رہے تھے اور وہ ایک گھنٹے بعد پھر آئیں گے۔"
 "جہیں کیا چاہیے؟" چودھری تنبیہ ہو گیا۔
 "میں دس لاکھ روپے لوں گا۔" میں نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا لیکن مجھے ایسا لگا جیسے میرے اندر چھٹانے سے کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ گھر میں نے نظر انداز کر دیا۔
 "دس لاکھ روپے تو بہت زیادہ ہیں۔" چودھری نے کہا۔

"آپ کی مرضی ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس سے کہیں زیادہ رقم ملک ڈاکٹر سے مل جائے گی۔"
 "وہ تمہیں جہیں کیا دے گا؟" چودھری نے نفرت سے کہا۔
 "پھر آپ ہی سنی بن جائیں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
 "وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ "ٹھیک ہے، رقم جہیں مل جائے گی۔"

"پوسٹ مارٹم رپورٹ کل شام یا پرسوں تک تیار ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔ "مجھے رقم کل ہی چاہیے۔"
 "تم تو بہت بے میرے آدمی ہو۔" چودھری نے کہا۔
 "بات بے صبر سے پن کی نہیں بلکہ اصول کی ہے۔"
 "اگر ملک ڈاکٹر نے تمہیں اس سے زیادہ رقم کی پیشکش کر دی تو؟" چودھری نے پوچھا۔

"جب آپ سے بات ہوئی ہے تو پھر وہ مجھے نہیں لاکھ بھی دے تو میں نہیں مانوں گا۔ یہ بھی میرا اصول ہے لیکن چپے میں اپنے وائس لیتا ہوں۔" یہ میری پہلی نا جائز کمانی تھی۔ پھر تو میں اس دلدل میں دھنسا چلا گیا۔ کل حضور بخش میرے پاس آیا اور مجھے بتایا کہ اسے مجھ سے کیا کیا لینا ہے۔

"اس نے جہیں اس کام سے کتنے پیسے دیے تھے؟"
 میں نے پوچھا۔
 "اس نے کہا تھا کہ کام معمولی ہے، ایک لاکھ روپے میں اس سے سوا ہوا تھا۔"
 "تم تو اب لکھ پتی بلکہ کروڑ پتی ہو گے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"نہیں تو اب صاحب اجرام کی کمائی مجھے رس نہیں آئی۔ جس دن میں نے چودھری سے دس لاکھ روپے وصول کیے تھے، اسی صبح میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے سال بھر بعد والدہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ میں نے ماڈل ٹاؤن میں بہت شاندار رہنقا تعمیر کرایا ہے لیکن وہ نیا گھر ابھی مجھے رس نہیں آیا۔ میری ایک بہن چھ ماہس کا شکار ہو کر مر گئی، دوسری بہن کسی آوارہ لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔ تیسری بہن کی میں نے شادی کر دی لیکن وہ شادی کے ایک سال بعد ہی بیوہ ہو کر واپس میرے پاس آ گئی۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "یہ آپ جا کہاں رہے ہیں؟"
 "یہ خیال تمہیں بہت دیر بعد آیا۔" میں نے کہا۔
 "میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔"

"آپ لاہور میں نہیں رہتے؟" اس نے کہا۔
 "میں ست بدھائی میں رہتا ہوں۔ جو میری جاگیر ہے۔ میں جہیں وہیں جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔
 "کیا آپ مجھے پولیس کے حوالے نہیں کریں گے؟"
 پولیس کے ذکر پر مجھے یاد آیا کہ میں نے استاد اور اس کے دو آدمیوں کو لاہور کی ایک بلڈنگ کے قلیٹ میں بند کر دیا تھا۔

مجھے نوری گھڑتے لگی تھی مگر ابھی تو فوری طور پر مجھے ست بدھائی پہنچنا تھا۔ میں نے گاڑی کی رفتار مزید بڑھا دی۔
 میں ست بدھائی پہنچا تو پوری حویلی میں ایک پچاس سی ٹی گئی۔ میری آمد کی خبر سن کر راجا، شہناز، شہلا اور حویلی کے تمام لوگ وہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔ راجا بھی مجھ سے اس والہانہ انداز میں ملا کہ دوسرے دیکھنے والے بھی حیران رہ گئے۔ مجھے اس کی آنکھوں میں نئی صاف نظر آرہی تھی۔
 "نیکے پترا!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
 "تو اس انکشن ویکشن کے چکر کوچھوڑ اور کچھ عرصے کے لیے لندن چلا جا۔"

"راجا! یہ تو کہہ رہا ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔
 "ہاں، یہ میں کہہ رہا ہوں۔" راجا نے کہا۔ "رانا اور ہم سے لوگ تیرا جینا دو بھر کر دیں گے بلکہ انہوں نے تیری

زندگی عذاب کر دی ہے۔ تو جب سے پاکستان آیا ہے، تو بے سکون کا ایک لمحہ بھی نہیں گزارا ہے۔ لغت بھیج اس انکشن پر اور واپس لندن جا کر پیش کر۔ یہاں کے معاملات میں سنبھال لوں گا۔"

"مجھے بزدلی کا مشورہ مت دے راجا!" میں نے کہا۔ "تو جانتا ہے نیچو سلطان نے کیا کہا تھا؟"
 "زیادہ بکواس مت کر۔" راجا نے کہا۔ "نہ تو نیچو سلطان ہے، نہ تو تیرے اور نہ تیرا جھگڑا انگریزوں سے ہے۔"
 "یہ دشمن تو انگریز سے زیادہ خطرناک ہے راجا! یہ تو ہمارے ملک کی بنیادیں محو رہا ہے۔ میں ان لوگوں کو کھل کھینچنے کا موقع نہیں دوں گا۔"
 "پھر تو بھی نیچو سلطان کی طرح مارا جائے گا۔"

"مرنا تو ایک دن ہے۔" میں نے کہا۔ "موت سے کس کو رستگاری ہے؟"
 "بکواس نہیں کیے پترا! اس وقت میں کوئی شعر سننے کے سوا میں نہیں ہوں۔"
 "زینت!" شہناز نے اچانک پوچھا۔ "نور کہاں ہے؟"

"نور؟" میں نے نظریں جھکا کر کہا۔ اس سوال کا جواب میرے پاس تھا ہی نہیں تو اسے کیا بتاتا۔
 "ہاں نور!" راجا نے چونک کر کہا۔ "نور جہاں یا ماہ نور یا پھر اس کی کوئی اور نشانی بتاؤں؟"
 "وہ تمہارے ساتھ ہی؟" شہناز نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"ہاں، وہ میرے ساتھ ہی تھی لیکن۔۔۔"
 "لیکن کیا کیے؟" راجا نے جھجکا کر کہا۔ "صاف صاف بتا کیوں نہیں کہ بات کیا ہے؟"
 "وہ۔۔۔ لوگ اسے۔۔۔ لے گئے ہیں۔" میرے حلق میں گول سا تنگ گیا۔
 "کون لوگ لے گئے ہیں؟" شہناز نے چیخ کر کہا۔
 "وہی لوگ جنہوں نے مجھے اغوا کیا تھا۔" میں نے نظریں جھکا کر کہا۔

اس وقت تو میں خود اپنی ہی نظروں میں گر گیا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سب حقارت سے مجھے دیکھ رہے ہوں اور ان کی نظریں سوال کر رہی ہوں کہ تم کیسے مرد ہو؟ اپنی عزت کی بھی حفاظت نہ کر سکے اور اپنی جان بچا کر بھاگ آئے۔ نور اب میری عزت ہی تھی۔
 "تم اسے ان لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر آ گئے؟"

شہناز ہسپتالی انداز میں بولی۔

”میں اسے دھڑکنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ غنی بھی اسی سلسلے میں گیا ہے۔ میں نور کو اتنی آسانی سے نہیں چھوڑ سکتا۔“ میں نے بلند آواز میں کہا۔ ”اور میں آج بھی آپ سب لوگوں کے سامنے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر نور کو کسی بھی قسم کی شہرت پہنچی تو میں ان سب کو ہتھکڑیاں لگا کر دہشت گردی کیا ہوئی ہے۔ میں ان میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ان کی ٹانگیں تباہ کر دوں گا۔ میں پورے علاقے کو نیست و نابود کر دوں گا۔ ابھی تک میں نے شرافت کا مظاہرہ کیا ہے لیکن اب نہیں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ طاقت صرف انہی کے پاس ہے، کان بھول کر سن لے راجا اودھ ریشی شیرازی مر گیا جو لندن سے پاکستان آیا تھا۔ اب ان سب کا واسطہ ایک ایسے ریشی شیرازی سے پڑے گا جو قہر و غضب کا چلتا پھرتا نمونہ ہوگا۔ میں ان سب کو۔۔۔“

”ہوش میں آئیے!“ راجا نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

اس نے شاید مجھے تھپڑ بھی مارا تھا۔ میں اس وقت واقعی ہوش میں نہیں تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میں بیانیاتی انداز میں چیخ رہا تھا، اپنے دشمنوں کو برا بھلا کہہ رہا تھا، انہیں گالیاں دے رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں پکڑا کر گر پڑوں گا۔

”ریشی!“ شہناز نے کہا۔ ”اس وقت تمہیں ذہنی سکون کی شدید ضرورت ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ۔“

میں گیت پر کوئی گاڑی آ کر رکی۔ پھر گیت کھلا اور غنی کی ڈبل کین پک اپ اندر داخل ہوئی۔ میں اس وقت تک حویلی کے برآمدے میں قفل چکا تھا۔ راجا نے زبردستی مجھے کرسی پر بٹھا دیا۔ یہ سوچ کر میرا ذہنی دباؤ خاصا کم ہو گیا کہ غنی کے آدمی استاد اور اس کے گروگوں کو اٹھالائے ہوں گے۔ تھوڑی دیر بعد غنی میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی اور ٹھکرانے کے سامنے تھے۔

”کیا ہوا غنی؟“ میں نے پوچھا۔ ”ان لوگوں کو لے آئے؟“

غنی نے نظریں جھکا کر غنی میں سر ہلا دیا۔

”کیوں؟“ میں چیخ کر بولا۔

”پالیسٹم سے پہلے وہاں موجود تھی۔“ غنی نے کہا۔ ”ان تینوں کو کسی نے بہت بے رحمی سے قتل کر دیا ہے۔ انہیں جانوروں کی طرح ذبح کیا گیا ہے۔ اسی جڈنگ کا ایک آدمی پر چٹک پر پس میں کام کرتا ہے۔ وہ نائٹ شفٹ کے بعد گھر

واپس آیا تو اسے اس قلیت سے خون بہتا دکھائی دیا جہاں وہ تینوں بندھے تھے۔ اس نے فوراً پولیس کو فون کر دیا۔“

”تو کیا ان تینوں میں سے کوئی بھی نہیں بچا؟“ میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

”جی، سر، کسی نے ان تینوں کو زندہ کر دیا۔“

”جھوٹ بولتے ہو تم؟“ میں قلع چھاڑ کر چیخا۔ ”وہ نور کا پتا بتائے بغیر کیسے مر سکتے ہیں؟“

غنی سر جھکا کر کھڑا رہا۔

”تمہیں وہاں پہنچنے میں دیر ہوئی ہوگی۔“ میں چیخ کر بولا۔ ”تم سب گئے اور نا کارہ ہو۔ دن ہو جاؤ یہاں سے۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔“ میں ہانگوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ ”کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اب جو کچھ کروں گا، میں خود ہی کروں گا۔ میں ابھی رانا زویب کی حویلی میں جا کر اسے موت کی نیند سلا دوں گا۔“ میں غنی سے مخاطب ہوا۔ ”اپنی رائے مجھے دو۔“

”سر۔۔۔ آپ۔۔۔“

”رائے مجھے دو۔“ میں اتنی زور سے چیخا کہ میری آواز پھٹ گئی۔

غنی نے گھبرا کر رائے مجھے دے دی۔

میں نے اس سے رائے لے کر میگزین چیک کیا، پھر اسے شانے پر لٹکا کر گاڑی کی طرف بڑھا۔

”شہناز! مجھے نیند کا الجھن مت دینا، میں ابھی سو نہ نہیں چاہتا۔“

”یہ نیند کا الجھن نہیں ہے۔“ شہناز نے کہا۔ ”تمہارا بلڈ پریشر نارمل کرنے کے لیے یہ الجھن تمہیں دے رہی ہوں۔“

”شہناز پلیز!“ میں نے کہا ”مجھے اس وقت کسی الجھن کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اچھا شیک ہے۔“ شہناز نے کہا۔ ”میں الجھن نہیں لگائے گی، تم ایسا کرو، دودھ میں اوٹینین ملا کر پی لو۔“ میں ریشم کو بھینتی ہوں۔

تھوڑی دیر بعد ریشم اوٹینین اور دودھ کا گلاس لے آئی۔ اس نے دودھ میں اوٹینین ملائی اور گلاس میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے دودھ کا گلاس ایک سانس میں خالی کر دیا۔

”ایک گلاس اور پی لیں صاحب جی!“ ریشم نے کہا۔

”نہیں، بس کافی ہے۔“ میں نے کہا۔

”نیکے پترا! اب تو کچھ دیر آرام کر لے۔“ راجا نے کہا۔

”ابھی تو مجھے اس ڈاکٹر سے پوچھ کچھ کرنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آرام کرنے کو تو ایک عمر پڑی ہے، میں۔۔۔“

”وہ اندر آئی اور بولی۔“ صاحب جی اٹھنا لگاؤں آپ کے لیے؟“

”تم پہلے تو یہ بتاؤ کہ مجھے دودھ میں کیا ملا کر پلایا تھا؟“ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”اوٹینین ملائی تھی صاحب جی!“ ریشم نے مصمویت سے کہا۔ ”آپ کے سامنے تو ملائی تھی۔“

”اور کیا ملا یا تھا؟“ میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”اور تو کچھ بھی نہیں ملا یا تھا صاحب جی!“ ریشم میرے درشت لہجے سے کم گئی۔

”اس کا مطلب ہے کہ میں تمہاری لائی ہوئی چیزیں کھانا پینا چھوڑ دوں۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”آج کے بعد تم میرے لیے کچھ بھی لے کر نہیں آؤ گی۔ میرے دودھ میں کسی نے بے ہوشی کی دوا ملا دی تھی۔ آئندہ میرا کوئی دشمن میرے کھانے میں زہر بھی ملا سکتا ہے۔“

”مجھ سے قسم لے لیں صاحب جی!“ ریشم رونے لگی۔ ”مجھے تو وہ دودھ ڈاکٹر صاحب نے دیا تھا کہ نواب صاحب کو پلا دو۔“

”ڈاکٹر صاحب کچن میں کب سے کام کرنے لگیں؟“

میں نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ میرے دودھ میں شہناز ہی نے خواب آور دوا ملائی ہوگی۔ اوٹینین کی وجہ سے مجھے دودھ کے ڈانکے میں زیادہ فرق محسوس نہیں ہوا یا پھر میں نے اس پر توجہ ہی نہ دی۔

”وہ جی! اس وقت خود ہی کچن میں آگئی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کافی باتیں کر کھیا اور دودھ گلاس میں دودھ نکال لیا۔ پھر مجھ سے پوچس کہ پہلے یہ دودھ نواب صاحب کو دے آؤ، اوٹینین بھی لے جاؤ۔ مجھے نہیں پتا کہ انہوں نے دودھ میں کیا ملا یا تھا؟“

شہناز کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ ”اٹھ گئے نواب صاحب!“

”میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ۔۔۔“

”تمہاری حالت اس وقت ایسی نہیں تھی کہ تم مزید اپنے ذہن پر زور دے۔“ شہناز نے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب! احباب جی تو مجھ پر غصہ ہو رہے ہیں کہ میں نے دودھ میں کچھ ملا دیا تھا۔“

”اس بے چاری کا کوئی قصور نہیں ہے۔“ شہناز سنے۔

”دودھ میں خواب آور دوا کے قطرے میں نے ہی ملائے تھے، الجھن تو تم نے نہیں رہے تھے اس لیے مجبوراً ایسا کرتا پڑا۔“ پھر وہ چونک کر بولی۔ ”راجا کہاں ہے؟“ وہ

ریشم سے مخاطب تھی۔

”انہیں جی تھوڑی دیر پہلے میں نے باغ میں دیکھا تھا۔“

”اچھا تم کھانا لگاؤ، رفیق کے پکر میں ہم نے بھی کھانا نہیں کھایا۔“

مجھے خود بھی شدید بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے صبح تا صبح بھی نہیں کھایا تھا۔ رات کو بھی کھانا بس یوں ہی کھایا تھا۔ پھر شکر سے ٹانگرا ہو گیا تھا۔

شاگرد کا خیال آتے ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ وہ واقعی اگر میرے ساتھ قتل تھا تو اس معاملے میں میری مدد کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ ابھی سب فون پر اس سے رابطہ کرتا ہوں۔ میں نے حسب عادت سب فون کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن سب فون نہ پا کر مجھے مایوسی ہوئی۔ شاگرد کا نمبر میرے سب فون میں محفوظ تھا لیکن سب فون میرے پاس نہیں تھا۔ نہ جانے استاد نے سب فون کہاں رکھا تھا؟ جب میں نے اس کی تلاش کی تو مجھے نہ اپنا سب فون ملا تھا، نہ پرس اٹھے ایک وفد بھر یہ حدش پیدا ہوا کہ دشمن مجھے پھانسنے کے لیے میرا سب فون یا پرس استعمال نہ کریں۔

شہناز نے دوسری مرتبہ کمرے میں آکر کھانے کے لیے کہا تو میں ڈانٹنگ ٹیبل پر جا بیٹھا لیکن شدید بھوک کے باوجود مجھ سے زیادہ نہیں کھایا گیا۔

کھانے کی میز سے اٹھتے ہوئے میں نے راجا کو کمرے میں آنے کا اشارہ کیا اور خود کمرے میں آگیا۔ تھوڑی دیر بعد راجا بھی وہیں آگیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ریشم بھی گئی۔ وہ ہمارے لیے کافی لے کر آئی تھی۔

”اب آپ کو کیا چاہتا ہے نواب صاحب؟“ راجا نے پوچھا۔

”لگتا ہے آج کل انڈین چینل خوب دیکھ رہے ہو۔“

میں نے کہا۔

”جیسے پترا ہمارے تو بڑے بڑے سیاست دان انڈین چینلز اور ہندی فلمیں دیکھ رہے ہیں، کسی کو انشور یا رائے اچھی لگتی ہے، کوئی رائی ٹھہرنی کا بیوانہ ہے، کوئی آج بھی دیکھنا کے نام کی مالا جب رہا ہے۔“

”یاد تو چھوڑ ان قتلوں باتوں کو۔“ میں نے کہا۔

”افوا کے وقت ان لوگوں نے میرا سب فون، پرس اور ریو اور سب کچھ چھین لیا تھا۔ میں نے روائی سے پہلے ان لوگوں کی تلاش کی تھی لیکن مجھے کچھ نہیں ملا۔“

”یہ بات تجھے اب یاد آئی ہے؟“ راجا نے مجھے

مکھوڑا۔ ”وہ سب قتل ہو چکے ہیں، ٹیکے پترا اب اگر تیرا سب فون یا پرس ان لاشوں کے پاس ملا ہوگا تو پولیس پارتی تجھے گرفتار کرنے کے لیے ست بدعاشی روانہ ہو چکی ہوگی۔“

”یار انور کی وجہ سے میرا ذہن منتشر ہو گیا تھا۔“

”چل اٹھ، پہلے تو حسب معمول بیک ڈیٹ میں ایف آئی آر کھوانا پڑے گی۔“

میں نے اپنا حلیہ درست کیا اور باہر نکلنے ہی والا تھا کہ دستک دے کر فنی اعدہ آر گیا اور بولا۔ ”سراوہ شاکر صاحب آتے ہیں۔“

”انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ، میں ابھی آ رہا ہوں۔“

”میں نے انہیں باہر والے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔“ فنی نے کہا۔

”یار راجا“ میں نے کہا۔ ”یہ وہی شاکر ہے جو۔۔۔“

”میں سمجھ گیا۔“ راجا نے کہا۔ ”یار ٹیکے آتو اسے قتل لال چھوڑ پہلے ہم ایف آئی آر درج کروا دیں۔“

”یار، بس اس سے سلام دعا کر کے چلے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”چل پھر جلدی کر۔“ راجا نے کہا۔

”فنی اچھا گاڑی نکالو۔“ میں نے فنی سے کہا اور خود تیزی سے بیرونی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

شاگرد مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آج بھی خامے معقول لباس میں تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی انجان آدمی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ خوش لباس، خوش شکل اور مہذب نظر آنے والا آدمی اتنا بڑا بدعاش ہوگا۔

میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے راجا کا تعارف کرایا۔

”انہیں کون نہیں جانتا نواب صاحب؟“ شاگرد نے کہا۔

”یہ تو کوئی نام بڑا رنگ بھی کرتے رہے ہیں۔“

”شاگرد صاحب؟“ میں نے کہا۔ ”آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن میں اس وقت ایک انتہائی ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ بس میں آدھے گھنٹے تک وہاں آ جاؤں گا، پھر آپ سے تفصیلی ملاقات ہوگی۔“

”نو پرالہم!“ شاگرد نے کہا۔ ”میں آپ کا انتظار کروں گا۔“ پھر وہ چمک کر بولا۔ ”ابھی آپ اپنی امانت تو سنبھال لیں۔“

”میری امانت؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”جی ہاں، آپ کی امانت!“ شاگرد مسکرا کر بولا اور اپنا

بریف کیس کھولنے لگا۔ راجا نے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں جلدی چلنے کا اشارہ کیا۔

اس نے بریف کیس سے جو چیزیں نکالیں، انہیں دیکھ کر نہ صرف میں بلکہ راجا بھی بری طرح چونک اٹھا۔

اس کے ہاتھ میں میرا پرس اور سب فون تھا۔

”یہ آپ کو۔۔۔“

”کہاں سے ملا؟“ شاگرد نے نہیں کر کہا۔ ”بات کافی طویل ہے اور مجھے لگ رہا ہے کہ آپ کہیں جانے کی جگت میں ہیں۔ راجا صاحب آپ کو وہ دفعہ چلیکا اشارہ بھی کر چکے ہیں۔“

شاگرد اگر اتنا بڑا بدعاش تھا تو میں ہی تو نہیں تھا۔ اس نے راجا کا خفیہ سا اشارہ بھی بھانپ لیا تھا۔ راجا خود بھی حیران تھا۔

میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ اس لیے میں اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”میں دراصل اپنے سب فون اور پرس کے کم ہونے کی ایف آئی آر درج کرانے ہی جا رہا تھا۔ آپ کو یہ چیزیں کہاں سے ملیں؟“

”پھر یقیناً یہ دونوں پہل بھی آپ ہی کے ہوں گے؟“ شاگرد نے اپنے بریف کیس میں سے دو پہل بھی نکال کر میری طرف بڑھا دی۔

میں نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا۔ ”ہاں یہ بھی میرے ہیں۔“

”شاگرد صاحب؟“ راجا نے کہا۔ ”اب یہ بھی بتا دیں کہ یہ چیزیں آپ کو کہاں سے ملیں؟“

”رات کو جب میں نواب صاحب کے ساتھ بیٹھا تھا تو وہاں مجھے کچھ مشتبہ پنچرے نظر آئے تھے۔“ شاگرد نے کہا۔

”اس کا تذکرہ میں نے نواب صاحب سے بھی کیا تھا۔ انہی لوگوں میں مجھے غلامو کا شمار تھا۔ غلامو دو سال پہلے میرے لیے چھوٹے موٹے کام کرتا تھا۔ پھر میں نے اس سے کام لیتا چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ بیرونی کے نقشے کا عادی ہو گیا تھا۔“

”شاگرد صاحب! آپ تو یوں بات کر رہے ہیں جیسے آپ کوئی قلمی ادارہ چلا رہے ہیں۔“ راجا نے طنز یہ لہجہ میں کہا۔

”بیشتر جرائم پیشہ افراد تو کرتے ہیں۔“

”آپ کی بات بالکل درست ہے لیکن بیرونی کا نشہ انسان کو کھاتا ہے۔ وہ چھٹیوں میں ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے میں بیرونی کے عادی افراد سے کام نہیں لیتا۔ یہ نشانہیں سب جس اور بے غیرت کر دیتا ہے۔ وہ کوئی بھی اہم بات شخص بیرونی کی ایک خوراک کی خاطر دوسروں کو بتا سکتے ہیں۔“

غلامو بھی اس نشے میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ باقاعدہ میرے ساتھ شامل نہیں تھا۔ میں اکثر اس سے کام لیتا تھا۔ مجھے غلامو کو وہاں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ پھر وہ اچانک ہی وہاں سے غائب ہو گیا۔ میں صبح تا صبح اسے اٹھ کر انکسار کرتا ہوں، پھر ابراہیم کی دکان پر جا کر کسی کے دو گلاس پیتا ہوں، آج صبح میں کسی پی کر اٹھ ہی رہا تھا کہ مجھے غلامو نظر آیا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا۔

وہ کچھ گھبرایا ہوا بھی تھا اور جگت میں دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اسے بتا کر کہنے کو کہا تو وہ رک گیا۔ ہاتھ کے دوران میں اس نے مجھے بتایا کہ اب اس نے بیرونی چیتا چھوڑ دی ہے۔

”ایسا تو قتل میرے پاس آ جاؤ۔ میں تمہیں اپنے ساتھ کام پر لگا دوں گا۔“

غلامو حیرت سے ہنسا اور بولا۔ ”شاگرد صاحب! جتنے پیسے آپ مجھے دیتے تھے، آج اس سے چار گنا زیادہ پیسے مجھے ملتے ہیں۔ میں اس وقت ایک بہت بڑے آدمی کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ اب تو پولیس بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔“

”او بھائی، ایسا کیا کام کر رہے ہو؟“ میں نے فس کر پوچھا۔

”ابھی تو میں جلدی میں ہوں، کل کسی وقت آپ کی طرف پھر لگاؤں گا۔“ غلامو کے انداز میں بے نیازی تھی۔

مجھے اس کی بے نیازی پر مزید شہ ہوا۔ میں نے پوچھا۔

”تم اس وقت جا کہاں رہے ہو، ابھی کسی کیا جلدی ہے؟“

”مجھے یہ چیزیں ایک جگہ ڈالنا ہیں۔“ اس نے چھوٹے سے ایک بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور مجھے اس معمولی سے کام کے پورے پچاس ہزار روپے ملے ہیں۔“

”پورے پچاس ہزار!“ میں نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ”اس بیگ میں ہے کیا؟“

”کوئی نواب رفیق ہے۔ ہاں رفیق شیرازی۔ یہ اسی کی چیزیں ہیں لیکن مجھے اس سے کیا غرض کہ وہ کس کی چیزیں ہیں؟ مجھے تو میرے کام کا معاوضہ مل رہا ہے۔“

اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ آپ کو بچھاتا نہیں ہے۔

”لیکن اس میں ہے کیا؟“ میں نے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

”اسی نواب کا سب فون، پرس اور دو پہل ہیں۔“

میں نے اس سے کہا۔ ”چلو، میں تمہیں وہاں تک چھوڑ دیتا ہوں، تمہیں پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔“

سینس ڈائجسٹ 191 ستمبر 2011

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سینس ڈائجسٹ 190 ستمبر 2011

سینس ڈائجسٹ 190 ستمبر 2011

سینس ڈائجسٹ 190 ستمبر 2011

”ہاں، اگر آپ مجھے ماڈل ڈاؤن تک چھوڑ دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔“ غلامو نے لپٹا ہت سے کہا۔

میں نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور روانہ ہو گیا۔ میرا رخ گلبرگ کی طرف تھا۔ وہ چونک کر بولا۔ ”یہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”خاموش بیٹھو“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولا۔ ”شاہر صاحب آپ مجھے تنگ اٹا رہے ہیں۔“

”میں نے کہا تھا کہ خاموش بیٹھو۔“ میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا اور اچانک رپا اور نکال لیا۔ ”اب اگر تمہارے منہ سے ایک لفظ بھی نکلا تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں صرف دھمکیاں نہیں دیتا ہوں، گولی مار بھی دیتا ہوں۔“

”لیکن... شاہر... صاحب...“

میں نے رپا اور کا سٹیجی کچ بٹھایا تو وہ بولنے لگے رک گیا۔ غلامو بیادہی طور پر بڑول آؤں ہے۔ وہ اپنے طور پر چھوٹی موٹی وارداتیں کر لیتا ہے۔ میرے ساتھ میں رپا اور اور چہرے پر غصہ دیکھا تو وہ بدحواس ہو گیا۔

میں اسے اپنے ہتھکے پر لے گیا اور بے رحمی سے ہتھکے کے ایک کمرے میں دھکیل دیا۔

”ہاں، اب بتاؤ غلامو، یہ چیزیں جہیں کس نے دی جہیں اور کیوں؟“

وہ مجھ سے اچھی طرح واقف ہے، میرے ساتھ کام کر چکا ہے اس لیے جانتا ہے کہ میں آسانی سے اس کی جان نہیں چھوڑوں گا۔ میرے ایک ہی چھپرہ پر وہ سہم گیا۔

میں نے کمال کر اس کی کٹھنی پر رکھ دی اور کہا۔ ”جو کچھ میں پوچھ رہا ہوں، سچ کچھ بتانا۔ میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے، جھوٹ بولا تو میں دوبارہ کچھ نہیں پوچھوں گا، لیکن تو کچھ بتانے کے قابل نہیں رہے گا کیونکہ تیری گلو بڑی بکھر چکی ہوگی تو جانتا ہے کہ میں گولی مارنے میں ایک لمبے کی تاخیر بھی نہیں کرتا۔ یہ چیزیں تجھے کس نے دی ہیں؟“

”یہ مجھے منظور سے نے دی ہیں اور کہا تھا کہ انہیں ماڈل ڈاؤن کے ایک فلیٹ میں ڈال آؤ۔“

”کیوں؟“ میں نے گرج کر پوچھا۔

”یہ مجھے اس نے نہیں بتایا تھا۔“ غلامو نے سہم کر کہا۔

”منظور اکون؟“ میں نے پوچھا۔

”نچلے درجے کا ایک بد معاش ہے۔“ شاہر نے جواب دیا۔ پھر آگے بٹانے لگا۔ ”پھر میں نے غلامو سے

پوچھا۔ منظور اس وقت کہاں لگا ہے؟“

”وہ اس وقت شاہ عالمی میں پہلوان کی والے کی دکان پر ہوگا۔“

میں نے آپ کی تمام چیزیں بیگ میں رکھیں، پھر اپنے ایک آؤں کو بلا کر کہا۔ ”غلامو کو لے جا کر بند کر دو۔ میرے واپس آنے تک یہ یہاں سے نکلنے نہ پائے۔“

”میں نے سب کچھ کچ تو بتا دیا ہے۔ اب مجھے یہاں کیوں روک رہے ہو؟“ غلامو ٹھٹھکیا کر بولا۔

”اگر یہ شور شرابا کرے یا زیادہ بکواس کرے تو اسے گولی مار کے کسی کوڑے کے ذریعہ پر پیچیدہ دیتا۔“

مجھے آپ کی طرف سے بہت پریشانی ہوئی تھی۔ پھر میں نے اس فلیٹ پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں وہاں پہنچا تو پولیس کی موبائل... اور لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر ٹھٹھکیا گیا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ آپ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ میں نے اپنی گاڑی وہاں سے کچھ فاصلے پر پارک کی اور نکلتے ہوئے دوبارہ وہاں پہنچا۔ لوگ چار چار اور چھوٹی ٹولیاں میں بٹے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

میں بھی ایک ٹولی کے پاس جا کھڑا ہوا اور ایک آؤں سے پوچھا۔ ”یہاں کیا ہوا ہے بھائی؟“

”یہاں پر تین آدمیوں کو کسی نے ذبح کر دیا ہے۔ وہ برا سامنے بنا کر بولا۔ ”ذبح کرنے کا مطلب مجھے ہیں آپ؟“

وہ شخص بولا۔ وہ کچھ زیادہ ہی باتوں تھا۔ ”بالکل جانوروں کی طرح ان تینوں کے گلے پر چھری چلائی گئی ہے۔“

”آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”خالق صاحب نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ان کا فلیٹ اس فلیٹ کے سامنے ہی ہے جس میں یہ واردات ہوئی ہے۔ ان تینوں کا اتنا خون بہا ہے کہ کوہ پیرور میں بھی آ گیا ہے۔“

”کچھ معلوم ہوا کہ مرنے والے کون تھے؟“

”یار، اب یہ کچھ بھی شریفوں کے رہنے کے قابل نہیں رہی۔“ ایک صاحب نے کہا۔

”مجھے تو ذہنی کی واردات لگتی ہے۔“ ایک اور آؤں بولا۔

”ذہنی کیسی یار؟“ پہلا آؤں بولا۔ ”اس فلیٹ میں سوائے پرانے فرنیچر اور برتنوں کے کچھ ہی کیا؟ یہ فلیٹ تو گزشتہ سات آٹھ مہینے سے خالی ہے۔ اسد صاحب نے

گلبرگ میں ایک بنگلا خریدا ہے۔ وہ اس فلیٹ کو فروخت کرتا چاہ رہے تھے۔“

میں نے سوچا کہ یہاں سے کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ مرنے والے کون تھے؟ وہاں کے مقامی قاتلے میں ایک سب انسپکٹر میرا دوست ہے۔ ایسے دوست لاہور کے قاتلے یا ہر قاتلے میں ہیں۔ مجھے ان لوگوں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔

میں وہاں سے سیدھا قاتلے پہنچا اور سب انسپکٹر وسم ملک سے ملا۔ اس نے میرے لیے انتہائی پر تکلف چائے بنا کر دیا۔ وہ جانتا ہے کہ اس چائے کا بل بھی میں ادا کروں گا۔ ہم چائے پی رہے تھے کہ وہ ہم واپس آئی جو ماڈل ڈاؤن کے اس فلیٹ پر گئی تھی۔ اس ہم کے ساتھ جانے والا سب انسپکٹر ریاض چوہدری سید حامد کے پاس آیا اور بولا۔ ”ہم وہاں خوار ہو کر آ رہے ہیں اور تم اکیلے کیلے جانے لے رہے ہو۔“

”تم بھی پی لو یار! وسم نے کہا، پھر اس سے پوچھا۔ ”تس کی واردات ہے یا... خودکشی کی ہے ان لوگوں نے؟“

”خودکشی؟“ سب انسپکٹر ریاض طنز یہ لہجے میں بولا۔ ”کوئی آؤں اپنا گلا خودکشیے کاٹ سکتا ہے؟“

”یہ تو معلوم ہو ہی گیا ہوگا کہ مرنے والے کون تھے؟“

”مرنے والوں ہی نے تو ہم پر وقت ڈال دیا ہے۔ مرنے والا استاد حضور بخش ہے جو عرف جام میں استاد کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دو چھپے بھی تھے۔ بلڈنگ والوں کا بیان ہے کہ وہ فلیٹ کی تختیوں سے خالی تھا، پھر استاد حضور بخش وہاں کیوں گیا؟ وہاں کوئی لوگ بھی تھی کیونکہ بند پر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے بھی ملے ہیں۔“

میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ میں قاتلے سے باہر نکل آیا اور اپنے دو آدمیوں سے کہا کہ منظور سے کو اٹھا لاؤ۔ مجھے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ آپ محفوظ ہیں۔

تھوڑی دیر بعد میرے آدمیوں نے اطلاع دی کہ منظور وہاں نہیں ہے۔ انہوں نے اس کے دوسرے ٹھکانے بھی دیکھ لیے تھے۔ وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ میں نے انہیں تلاش جاری رکھنے کو کہا اور درخواست بدعالتی آگیا۔ یہاں آ کر جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ ست بدعالتی پہنچے ہیں اور خبریت سے ہیں تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ ”پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ”اب آپ ہی بتائیے، یہ سب کیا تھا؟“

میں نے نظروں سے گزرا کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ میں نے احتیاطاً اسے یہ نہیں بتایا کہ ڈاکٹر اب میرے قبضے میں ہے۔

”شاہد جی کے بارے میں اڑتی اڑتی خبریں تو میں نے سنی تھیں لیکن میں نے ان پر یقین نہیں کیا تھا۔ لوگ تو بڑے سے بڑے آدمی کے لیے بھی ایسی افواہیں اڑا دیتے ہیں۔“ شاہر نے کہا۔ ”میرے آدمیوں نے اب تک منظور کے کسراغ لگایا ہوگا۔ اسے معلوم ہوگا کہ انہوں نے میڈم نور کو کہاں رکھا ہے؟ اب میں یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی کروں گا کہ مسکین شاہد عرف شاہد جی کے لیے کون لوگ کام کر رہے ہیں؟ وہ اکیلا تو اس قسم کے کام نہیں کر سکتا، اس کے ساتھ پورا ٹیمنگ ہوگا۔ اگر آپ اس ڈاکٹر کو روک لیتے تو شاید اس سے شاہد جی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو جاتیں۔“

اس دوران میں حریف کا ایک ملازم دو دفعہ ہمارے لیے چائے لا چکا تھا۔

شاہر نے اچانک کہا۔ ”قواب صاحب اب مجھے اجازت دیں۔ آپ کا بل نمبر میرے پاس ہے، جیسے ہی میڈم کے بارے میں کچھ معلوم ہوا، میں آپ کو اطلاع دے دوں گا۔ آپ گھر مت کریں، میں بہت جلد میڈم کو ان کے چنگل سے نکال لوں گا۔“ پھر وہ چونک کر بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ رانا ارشد جی کا بھی گتہ جوڑے ورنہ شاہد جی کو آپ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟“ یہ کہتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔

اس نے باری باری ہم دونوں سے ہاتھ ملایا اور روانہ ہو گیا۔ غنی اسے باہر تک رخصت کرنے چلا گیا۔

”کیا بات ہے مہاراجا؟“ میں نے کہا۔ ”تو بہت خاموش ہے؟“

”میں اس شخص کی باتوں پر غور کر رہا ہوں۔“ راجا نے کہا۔ ”آخر اسے ہم سے ایسی کیا ہمدردی ہوئی ہے کہ وہ ست بدعالتی تک دوڑا چلا آیا؟“

”یہ ہم سے ہمدردی نہیں بلکہ دلاور سے دشمنی کی خاطر یہاں آیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اچھا اس پر ابھی مٹی ڈال، چل ڈرا اس ڈاکٹر کا بھی انٹرویو کر لیں، وہ یہ کیا ہے؟“ راجا نے کہا۔

ڈاکٹر سنیق روم میں بہت بے زاری کے عالم میں بیٹھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بولا۔ ”قواب صاحب! آپ مجھے پولیس کے حوالے کر دیں یا پھر جانے دیں۔“

”کیوں بھی، تم نے ایسا کون سا نیک کام کیا ہے کہ جہیں پولیس کے حوالے کیا جائے؟“

”نیک کام؟“ ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔

”اوسے یہ تو تمہارے ساتھ نیکی ہی ہوگی کہ جہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے اور تم کم مکا کر کے جان

چھڑا لو۔" راجا نے کہا۔

"آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا؟" ڈاکٹر نے بہت مہذب انداز میں راجا سے پوچھا۔

"اوپر میرا تعارف حاصل کر کے کیا کرو گے۔ میں تو بہت بدنام آدمی ہوں۔ جرنل تو آج کل دیسے بھی بدنام ہیں۔" "اچھا اچھا؟" ڈاکٹر نے کہا۔ "میں آپ کو پہچان گیا ہوں، یہی میں سوچ رہا تھا کہ میں نے آپ کو کہاں دیکھا ہے؟" "اب تو سوچ لیا نا؟" راجا نے کہا۔ "اب شروع ہو جاؤ اور بالکل سچ بولا ورنہ جھوٹ بولنے والے اس حوصلے سے کبھی باہر نہیں نکلتے۔"

"میں نواب صاحب کو سب کچھ بتا چکا ہوں۔" "تجربہ یہ کام کرنے کے لیے کس نے کیا تھا؟" راجا نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"میں نے بتایا تو ہے کہ استاد۔۔۔۔۔"

"میں نے کہا نا کہ جھوٹ مت بولنا۔" راجا نے درشت لہجے میں کہا۔ اس وقت تو اس کی پوری شخصیت ہی بدل کر رہ گئی تھی۔

"تو پھر جو آپ کہیں میں کہنے کو تیار ہوں۔" ڈاکٹر نے ڈھٹائی سے کہا۔

"تمہارا وہ دواؤں کا بیگ کہاں ہے؟" راجا نے اچانک پوچھا۔

"وہ تو گاڑی میں ہے۔" ڈاکٹر کچھ پریشان ہو گیا۔ "بچے پترا جی سے کہہ کر اس گاڑی سے ڈاکٹر کے بیگ سمیت تمام سامان نکال لے اور گاڑی کو ٹھکانے لگا دے۔" اس نے فنی کو آواز دی۔

فنی ہمیشہ میرے ارد گرد ہی موجود رہتا تھا۔ وہ فوراً کمرے میں آ گیا۔ میں نے اسے گاڑی کی چابیاں دیں اور کہا کہ میری گاڑی کا تمام سامان نکال کر لے آؤ اور اس گاڑی کو فوری طور پر کہیں چھپا دو۔ اس کا سراغ نہیں ملنا چاہیے۔

فنی تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر کا بھاری بھر کم بیگ لے کر آ گیا۔ بیگ کیادہ پھر ساسوٹ کیس تھا۔ "ان میں کون کون سی دوائیں اور انجکشن ہیں؟" راجا نے پوچھا۔

"میں نواب صاحب کو بتا چکا ہوں۔" ڈاکٹر نے کچھ ناگواری سے کہا۔

"جہیں شاید معلوم نہیں کہ یہاں مہتاب کے بہترین اسپتالوں میں سے ایک اسپتال تعمیر ہو رہا ہے۔ یہاں

پاکستان بھر کے ڈاکٹروں کی کریم موجود ہے۔" راجا نے فنی کے ان چند ڈاکٹروں کو پاکستان بھری کریم بنا دیا۔ "ہمارے پاس پاکستان کے کسی بھی مدد یا ہسپتال کے معیار کی مشینری، آلات، لیپ اور آپریشن جینز بھی موجود ہے۔ میں تمہارا بیگ ابھی ڈاکٹر شہود احمد کے حوالے کر دوں گا۔ وہ خود بتا دیں گے کہ اس میں کس قسم کی دوائیں ہیں۔"

ڈاکٹر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ڈاکٹر شہود کے نام سے میں بھی واقف تھا۔ وہ پاکستان بلکہ ایشیا کے بہترین فزیکیٹر اور سرجنزمیں سے ایک تھے۔ "ڈاکٹر شہود؟" ڈاکٹر نے تھوک گل کر کہا۔ "وہ تو سان فرانسسکو میں تھے۔ وہ۔۔۔۔۔"

"وہ اب یہاں ست بدحالی میں ہیں۔" راجا نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

"دیکھیے اس بیگ میں میری کئی پرسنل چیزیں بھی موجود ہیں۔" ڈاکٹر نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"دواؤں کے علاوہ تم اس میں سے اپنی تمام ذاتی چیزیں نکال لو۔" راجا نے بیگ ڈاکٹر کے سامنے رکھ دیا۔ ڈاکٹر نے بیگ کھولا تو اس کے ہاتھوں میں لڑائی تھی۔ راجا کی نظریں اس کے بیگ پر جمی ہوئی تھیں۔

اس نے بیگ کے اندر ہاتھ ڈال کر دواؤں الٹ پلٹ کیں، پھر پھرٹی سے دو لفافے نکال لیے۔ وہ خاک کی رنگ کے لفافے تھے۔ ڈاکٹر کے اٹھانے کے انداز سے وہ خامسے وزنی لگ رہے تھے۔ پھر اس نے ان سے کچھ چھوٹا ایک اور لفافہ نکالا اور بیگ راجا کے حوالے کر دیا۔ ڈاکٹر کے چہرے پر پینے کے قطرے تھے۔

"ان دواؤں کو تو میں ابھی لیپ بھجوا دوں گا۔ ممکن ہے ان پر لیپل کسی اور دوا کا ہو اور اندر پھر پھر ہو۔" راجا نے کہا۔ "تم پہلے یہ لفافے کھول کر دکھاؤ۔"

"میں نے کہا نا کہ یہ میری ذاتی چیزیں ہیں۔"

"ان میں دواؤں بھی ہو سکتی ہیں۔" راجا نے کہا۔

"لفافے کھول دو۔ کوئی دوائیں ہوئی تو میں انہیں جوں کا توں واپس کر دوں گا۔"

"جب میں نے آپ سے کہہ دیا کہ یہ میری پرسنل چیزیں ہیں تو آپ۔۔۔۔۔"

"تم لفافے دیتے کیوں نہیں؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"یہ میں نہیں دے سکتا۔" ڈاکٹر نے لفافے اپنے پیچھے چھپاتے ہوئے کہا۔

"فنی! میں نے بلند آواز میں کہا۔

فنی فوراً ہی اندر آ گیا۔ "جی سر!"

"ڈاکٹر صاحب سے یہ لفافے لے لو۔" میں نے کہا۔

"دیکھیے نواب صاحب! یہ آپ زیادتی کر رہے ہیں۔"

"میں زیادتی کر رہا ہوں؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تم نے میرے ساتھ جو کچھ کیا، وہ کیا تھا؟ میں نے تو ابھی تک کچھ بھی نہیں کیا۔"

"میں آپ کو سب کچھ بتا چکا ہوں۔" اس نے کہا۔

"فنی! میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "تم نے سنا نہیں؟"

فنی آگے بڑھا تو ڈاکٹر نے لفافے پوری قوت سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے۔

فنی نے لفافے جھیننے کے بجائے ڈاکٹر کی کٹھنی پر ہلکا سا ایک ہاتھ رسید کر دیا۔ ڈاکٹر پکڑا کر صوبنے پر مگر پڑا۔ وہ ہوش میں تھا لیکن اب اس کے ہاتھوں میں سکت نہیں رہی تھی۔ فنی نے اطمینان سے تینوں لفافے اس کے ہاتھوں سے نکال کر میری طرف بڑھا دیے۔ وہ خامسے وزنی لفافے تھے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ان میں کاغذات کے بجائے کچھ اور ہی ہے۔

راجا نے وہ لفافے میرے ہاتھ سے لے لیے اور ان میں سے سب بڑا لفافہ کھولنے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر اپنی جگہ سے اٹھ کر راجا پر بھڑکا۔ ان لفافوں میں جینا کوئی ایسی چیز بھی تھی جسے ڈاکٹر ہم سے چھپا چاہتا تھا۔

فنی نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا۔ پھر تو کوئی ڈاکٹر پر جنون طاری ہو گیا۔ فنی نے ایک مرتبہ پھر اس کی کٹھنی کو ٹھٹھانا دیا۔ اس مرتبہ اس کا ہاتھ قدرے سخت پڑا تھا۔ ڈاکٹر لڑھک کر صوبنے پر مگر اور بے سندھ ہو گیا۔

"نہیں یہ مروت نہیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"سر! یہ اتنی آسانی سے نہیں مرے گا۔ میں نے ہاتھ بٹا ہی رکھا ہے۔ یہ ابھی تھوڑی دیر بعد ہوش میں آ جائے گا۔"

فنی نے کہا۔

راجا نے ایک لفافہ کھولا تو اس کے اندر سے بہت سی ڈی وی ڈیز کے علاوہ کاغذات بھی نکلے۔ اس نے تہ شدہ ایک فل اسکیپ کاغذ کو کھولا اور بلند آواز میں پڑھنے لگا۔

"تمہارے پاس جو لڑکیاں بھیجی جا رہی ہیں، انہیں انجکشن دو اور ان کی ویڈیوز بنا کر ان کے عاشقوں کے حوالے کر دو۔ روٹی اور حنا کو انجکشن نمبر دو دینا۔"

"یہ انجکشن نمبر دو کیا ہے؟" راجا نے بڑبڑا کر کہا۔ پھر دوسرا تہ شدہ کاغذ کھول لیا۔

"نواب رفیق شیرازی اور اس لڑکی کو انجکشن نمبر ایک دے کر ویڈیو بناؤ، پھر انہیں استاد کے حوالے کر دو۔ استاد جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔"

تیسرے کاغذ میں تحریر تھا۔ "نواب شیرازی کے ساتھ جو لڑکی ہے، اس کے گلہ زاپ بھی بنانا، نواب بھی کیا یاد کرے گا کہ اس کا کون کون سے بالا پڑا ہے۔"

دوسرے لفافے میں صرف ڈی وی ڈیز تھیں، تیسرے لفافے میں پچاس لاکھ روپے کا بھر چیک تھا جو کسی ڈاکٹر اہمل کے نام جاری کیا گیا تھا۔

"یہ انجکشن نمبر ایک، دو اور تین کیا ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا جواب تو یہ ڈاکٹر ہی دے گا۔" راجا نے کہا۔

"بچے پترا! تو بھی کیسے کیسے جو بے لے کر آتا ہے؟"

"فنی! میں نے کہا۔ "اسے ہوش میں لاؤ۔"

فنی نے پانی کا بیگ اٹھایا اور ڈاکٹر کے منہ پر پانی کے جھینے مارنے لگا۔

اس دوران میں راجا اس کے دواؤں کے بیگ کی تلاشی لے رہا تھا۔ اس میں کئی سرخ، انجکشن کے دائل اور فرسٹ ایڈ کا سامان تھا۔ کسی بھی انجکشن کے دائل پر کوئی نمبر نہیں تھا۔

"ان تمام دواؤں کو لیپ میں ٹیسٹ کرا کر پڑے گا۔"

راجا نے کہا۔

اس وقت تک ڈاکٹر نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ پہنی پہلی نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

پھر اس نے کہا۔ "نواب صاحب! اگر مجھے پینے کو کچھ مل جائے تو۔۔۔۔۔"

"یہاں جہیں پانی، کوئلہ ڈرنگ اور چائے کافی کے سوا کچھ بھی نہیں ملے گا۔" میں نے کہا۔ "فنی! اسے پانی پلاؤ۔"

ڈاکٹر نے ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔

"میں نے کہا تھا کہ صرف سچ بولنا۔" راجا نے کہا۔

"لیکن بات تمہاری کچھ نہیں آتی۔"

ڈاکٹر ہنٹوں پر زبان بھیر کر رہ گیا۔

"یہ انجکشن ایک، دو، تین کیا ہیں؟"

"یہ اصل میں طاقت کے انجکشن ہیں۔" ڈاکٹر صبر سے کہا۔ "نمبروں کے حساب سے ان کی اثر انگیزی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔"

”تم پھر جھوٹ بول رہے ہو؟“ میں نے کہا۔ ”کسی بھی لڑکی کو وہ انجکشن دینے کا قاعدہ کیا ہے؟ کیا انہیں ریسٹلنگ میں حصہ لینا ہے۔“

”آپ انہیں کریں، ایسا ہی ہے۔ مجھ سے تو جو کچھ کہا جاتا ہے، میں کرتا ہوں وہ انجکشن بھی مجھے اس شخص نے فراہم کیے تھے؟“

”کس شخص نے؟“ میں نے پوچھا تو جواب میں اس نے ایک صوبائی وزیر کا نام بتایا جو انتہائی نیک نام تھا۔

”اس سے اس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مقصد تو وہی جانا ہوگا۔ وہ مجھے ہر ایسے کام کے دس لاکھ روپے دیتا ہے۔“

”وہ انجکشن اس وقت تمہارے پاس ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں وہ اس وقت تو میرے پاس نہیں ہیں۔“ اس نے کہا۔

”تھک ہے۔“ راجا نے کہا۔ ”اس وقت تمہارے بیگ میں جو انجکشن ہیں، وہ کس مقصد کے لیے استعمال ہوتے ہیں؟“

”ان میں سے کچھ اغشی پچک ہیں، کچھ اغشی بائیونک ہیں اور کچھ وہ من لی پیسٹیکس کے انجکشن ہیں۔“

”یہ انجکشن انسانوں پر کوئی منفی اثرات تو نہیں ڈالتے؟“ راجا نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے کہ ان کے لگنے سے کسی کی موت واضح ہو جائے یا پھر وہ ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو جائے؟“

”نہیں، اس میں ایسی کوئی دوا نہیں ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”ان تمام دواؤں کو لیپ ٹیسٹ کے لیے بھجوا دو۔“ میں نے کہا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے؟“ راجا نے کہا۔ ”میں باری باری یہ تمام انجکشن اس ڈاکٹر کو گواہوں گا۔ یہ سب بے ضرر دوا ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کے آئٹریکٹ ہوں گے۔ وہ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس ڈاکٹر ہیں۔ وہ اسے سنبھال لیں گے۔“

ڈاکٹر کے چہرے پر اچانک موت کی سی زردی کھڑ گئی۔ وہ ہڈیانی لہجے میں بولا۔ ”نہیں... نہیں... ایسا مت کرنا۔ یہ دوا میں... ان کے آئٹریکٹس بہت زیادہ ہوتے ہیں۔“

”فکرت کرو۔ یہاں ڈاکٹر زکی پوری ہم موجود ہے۔“

وہ جھپٹیں مرنے نہیں دے گی۔“ راجا نے اس کے بیگ سے ایک سرنج اور انجکشن نکالا اور سرنج کا رچرچہ بھارت لگا۔

”نہیں، پلیز نہیں!“ ڈاکٹر چیخا۔ ”مجھ پر رحم کریں۔ میں آپ کو کچھ بچتا ہوں گا۔“

”یوں۔“ راجا نے کہا۔

”میں جس شفر کے لیے کام کرتا ہوں، وہی مجھ سے یہ سب گرتا ہے۔“

”تمہارا نام اجمل ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں، میرا نام اجمل ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نے آپ کو سب کچھ بچ بچا تھا۔ بس ان انجکشنز کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔“

”آپ ذرا ان کے بارے میں بھی بتا دو۔“ راجا نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

”انجکشن نمبر ایک میں ایسی دوا ہے جو میں نے آپ کو اور اس لڑکی کو دی تھی۔ ششروہ انجکشن لگانے کے بعد لوگوں کی قابل اعتراض ویڈیوز بناتا ہے اور انہیں بلیک میل کرتا ہے۔ انجکشن نمبر دو لگنے کے بعد وہ شخص واقعی طور پر اپنے حواس میں نہیں رہتا اور کچھ بھی اول فول بک سکتا ہے۔ انجکشن نمبر تین لگنے کے بعد وہ شخص ہمیشہ کے لیے پاگل ہو جاتا ہے، پھر اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔“

”اور تم یہ انسانیت سوز کام کرتے ہو؟ ایک ڈاکٹر ہوتے ہوئے تمہیں ہانگ شرم نہیں آتی کہ تم نے انسانی زندگیوں کو مذاق سمجھ لیا ہے؟“ میں نے پھر کر کہا۔ ”کیا نام ہے اس حرام زادے ششروہ؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ اس کا نام مسکین شاہ ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”اور وہ جہیں اس کام کے دس لاکھ روپے دیتا ہے۔“

”وہ کبھی بھی اس سے دگنے بھی دیتا ہے۔“ ڈاکٹر نے ڈھٹائی سے کہا۔

”اتنی دولت کا کیا کرو گے؟ اگر تم مر گئے تو یہ دولت کس کے کام آئے گی؟“

ڈاکٹر نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

”تم نے میری ویڈیو بس سلسلے میں بنائی تھی؟“

”مجھے شاہی نے حکم دیا تھا کہ استاد ایک بندے کو بلا دو۔ اس کی ویڈیو بنانا ہے۔ لڑکی کو استاد پہلے ہی اغشا پکا تھا۔“

”اور میرے ساتھ جو لڑکی تھی اس کے بارے میں تمہارے شاہی نے کیا حکم دیا تھا؟“

”اس نے کہا تھا کہ آپ کی ویڈیو بنانے کے بعد اس لڑکی کو بھی استاد کے حوالے کر دوں۔“

”یہ ویڈیو کیسی ہیں؟“ راجا نے پوچھا۔ وہ بھی لمبے بر کوٹنگ ہو کر رہ گیا تھا۔

”یہ ویڈیو بھی میں ان لوگوں کو ارسال کرتا ہوں، شاہی نے کہا تھا کہ کل ہر حالت میں ان میں سے کچھ ویڈیوز ارسال کرنا ہیں۔ آج مجھے اسلام آباد میں جانا تھا، پھر آپ کی ویڈیو بھی بنائی تھی۔ میں نے جلدی میں دو مہینے کے اندر اندر بنائی ہوئی تمام ویڈیوز اس بیگ میں رکھ لیں کہ اسلام آباد پہنچ کر ان میں سے ارسال کرنے والی ویڈیوز چھانٹ لوں گا۔“

”تم کس اسپتال میں سروس کرتے ہو؟“

”میں آج کل کسی بھی اسپتال میں سروس نہیں کرتا۔ ویسے میں میو اسپتال میں تھا۔ وہاں سے ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نکالا گیا۔ شاہی سے پہلے ہی تعلقات ہو گئے تھے۔ وہ چاہتا تو مجھے دو بار وہی گواہ سنا تھا لیکن اس نے کہا کہ نوکری کو چھوڑو، میرے ساتھ کام کرو۔ تم اتنا کماؤ گے کہ تم نے تصور بھی نہ کیا ہوگا؟“

”استاد اور شاہی کے درمیان کیا تعلق ہے؟“

”استاد تو اس کا معمولی سا ایک مہرہ ہے۔ وہ اکثر اس سے ٹوکڑیں گواہ کرانے، دھوکہ فساد کرانے، مخالفین کے جلے اور ہم پر ہم کرانے کے کام لیتا ہے۔ اس نے تو شاید کبھی شاہی کی کوڑ بھینکا نہ ہو۔“

”میری ویڈیو کا ماسٹر پرنٹ کہاں ہے؟“ میں نے اچانک پوچھا۔

”وہ میں نے ایک بندے کے ہاتھ شاہی کو روانہ کر دیا تھا۔ اب وہ اس کی مختلف ڈی وی ڈیز بناے گا اور پھر وہی کرے گا جو وہ کرتا ہے۔“

”اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟“ راجا نے

پوچھا۔

”میں نے تو سب کچھ آپ کو بچ بچ بتا دیا ہے۔ اب آپ چاہیں... تو مجھے کوئی مار دیں۔ میں جانتا تھا کہ ان کاموں کا انجام آخر میں ملتا ہوتا ہے۔“

”میں نہیں اتنی آسان موت نہیں دوں گا بے ضمیر، حرام زادے!“ میں پھر کر بولا۔ ”تمہیں بھی وہی انجکشن نمبر تین دے کر لاہور کی سڑکوں پر چھوڑ دیا جائے گا۔“

”نہیں، ایسا مت کریں... میں...“

”تم نے بھی کسی پر رحم کیا ہے جو میں ایسا نہ کروں؟“ میں نے کہا۔ ”صرف ایک صورت میں تمہیں اس صورت سے نجات مل سکتی ہے۔ مجھے اپنی ویڈیو کا ماسٹر پرنٹ، تمام ڈی وی ڈیز اور شاہی کے خلاف ٹھوس ثبوت چاہئیں۔ اگر تم یہ کر سکتے ہو تو کرورنہ میں وہی کروں گا جو میں نے کہا ہے۔“

”میں نہیں جانتا کہ شاہی وہ تمام اسٹاک کہاں رکھتا ہے۔“ ڈاکٹر نے چارکی سے کہا۔

”ایک انجکشن میں تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“ راجا نے کہا۔

”آپ مجھے کچھ دن کی مہلت دیں تو میں معلوم کرنے کی کوشش کروں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں شاہی سے مل کر اس سے اگواںے کی کوشش کروں گا کہ اس نے وہ تمام مواد کہاں رکھا ہوا ہے؟“

”اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہے، سب کرنا ہے۔“

”میں یہاں رہ کر کیا کر سکوں گا؟“ ڈاکٹر نے بے بسی سے کہا۔

”تم ہمیں ان لوگوں کے بارے میں تو بتا سکتے ہو جو شاہی کے دست راست ہیں؟“

”ہاں، میں ان لوگوں کے بارے میں بتا سکتا

اہم انتباہ

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک فنی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ اشتہارین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضائع کر دی جاتی ہے، قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست اشتہارین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔
 "میں ان لوگوں کی ایک لسٹ بھی چاہیے جنہیں شاہ
 جی اب تک بلک بلیک کر کے اپنے کام نکال چکا ہے۔"
 "میں ان کی لسٹ بھی دے دوں گا بلکہ میرے پاس
 یہاں بہت سی ویڈیوز بھی ہیں۔"
 "ہاں تو بہت کم لسٹ تیار کرو۔ جب تک شاہ جی ہمارے
 جال میں نہیں پھنس جاتا تم ہمارے مہمان رہو گے۔"
 ڈاکٹر کوئی کے حوالے کرنے کے بعد میں اور راجا
 دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئے۔
 ہمارے پیچھے پیچھے نیکم کمرے میں داخل ہوئی اور
 بولی۔ "صاحب جی! ڈاکٹر صاحب پوچھ رہی ہیں کہ آج کھانا
 نہیں کھانا ہے؟"
 "تم چلو، ہم آرہے ہیں۔" راجا نے کہا، پھر وہ مجھ
 سے بولا۔ "ٹیکے پتر! اس مرتبہ تو بہت بری طرح پھنس گیا
 ہے۔ یہ سبکین شاہ! میں تو اسے واقعی سکین سمجھتا تھا۔ آج تک
 اس کے بارے میں اس کی کوئی خبر میں نے اڑتی اڑتی بھی نہیں
 سنی تھی۔ اسے جرم ثابت کرنے میں دانتوں پینا آجائے گا۔
 میڈیا کا کوئی آدی ہماری بات پر یقین نہیں کرے گا۔"
 "ہمارے پاس اس کی تیار کردہ ویڈیوز ہیں۔" میں
 نے کہا۔

"ان سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ ویڈیوز اس
 نے بنائی ہیں؟ وہ ایک پریس کانفرنس کرے گا اور سارا الزام
 تجھ پر دھر دے گا کہ یہ مجھے بدنام کرنے کی سازش ہے۔ تیار
 سیاسی کیریئر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا ٹیکے پتر!
 میڈیا شاہ جی کی بات کو زیادہ اہمیت دے گا۔ وہ پریس اور
 ملک دونوں میں بہت نیک نام ہے، کئی رفقاء ادارے اس کی
 سرپرستی میں چلتے ہیں، بہت سی بیادوں اور خیمہ بچوں کی وہ
 امداد کرتا رہتا ہے۔ تیری بات کا کون یقین کرے گا؟"
 "پھر پھر کیا، کہا جائے؟"
 "فی الحال تو کھانا کھاتے ہیں، پھر کچھ سوچیں گے۔"

راجا نے کہا۔
 کھانے کی میز پر سبھی موجود تھے۔ سبھی نے میری
 خاموشی کو محسوس کیا۔ شہناز نے تو پوچھ بھی لیا۔ "کیا بات ہے
 رفیق! اتھارٹی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"
 "ہاں، رات بھر جاتے کی وجہ سے کچھ صحت محسوس
 ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔
 کھانے کے بعد بھی میں دیر تک یہی سوچتا رہا کہ آخر
 اس شاہ جی کو مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟

راجا نے مجھے چونکا دیا۔ "ٹیکے پتر! کہاں کھو گیا؟"
 "میں سوچ رہا ہوں کہ تمہیں لندن بھیج دوں۔" میں
 نے تنقید کی سے کہا۔
 "ہرگز نہیں۔" راجا نے کہا۔ "میں بھلا وہاں جا کر کیا
 کروں گا؟"
 "انتھوں والی باتیں مت کرو۔" میں نے کہا۔ "سوشی کا
 فون آیا تھا۔ اسٹیٹ ایجنٹ نے انسٹ پیسلی کا گاہک ڈھونڈ
 لیا ہے۔ ایسے سوچنے پر میری یا کسی ایسے شخص کی موجودگی
 وہاں ضروری ہے جسے میں نے پاور آف انارنی دیا ہو۔"
 "یہ پاور آف انارنی تو سوشی کو بھی تو دے سکتا ہے۔"
 راجا نے کہا۔

"تم بات بھنی کی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔ "میں فی
 الحال ست بد حالی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ یہاں
 کی جاگیر کا سودا کر کے مستقل طور پر لندن شفٹ ہو جاؤں۔
 ایسے دو تئیسوں میں کب تک سفر کیا جا سکتا ہے؟ کشتیاں بھی
 ایسی جو ہر وقت طوفانی موجوں کی زد میں رہتی ہیں۔ تم لندن
 جاؤ، میں بھی پیچھے سے نکلی جا ہوں۔"
 "نہیں ٹیکے پتر! میں ان حالات میں تجھے تنہا نہیں
 چھوڑ سکتا اور اب بحث مت کرنا۔" راجا نے کہا۔
 راجا کا انداز دیکھ کر میں خاموش ہو گیا۔ مجھے یقین تھا
 کہ آج کل میں سوشی کا فون آجائے گا کیونکہ میں نے ایجنٹ کو
 انسٹ پیسلی خالی کرنے کی جو مہلت دی تھی، وہ پختہ دس دن
 میں پوری ہونے والی تھی۔

"میں سوشی سے خود بات کروں گا۔" راجا نے کہا۔
 "تو بھی اس سے بات کر لیتا۔" میں نے کہا۔
 "لیکن ابھی نہیں، ابھی وہ سوڈ کھڑے روٹا شروع کر دے
 گی کہ رفیق صاحب کے نہ ہونے سے یہ نقصان ہو گیا۔ وہ
 ڈیل نہیں ہوگی، فلاں اسائنمنٹ ہم وقت پر نہیں دے
 سکے، میں نے تو اسے یہ کہہ کر ڈال دیا کہ وہاں کے معاملات
 کا علم فوراً کو ہے۔ وہی کچھ بتا سکتی ہے۔ تم فی الحال تمام
 معاملات کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ نور کی طبیعت ٹھیک نہیں
 ہے۔ اسے ڈسٹرب مت کرنا۔"

اپنا کبھی راجا نے کہا۔ "ٹیکے پتر! کیا نام ہے اس ڈبئی
 سیکریٹری کی جس کی دفتر ایک آخر کے ساتھ حری ویڈیو بنی ہے؟"
 "پارام تو اس نے بتایا تھا۔ ہاں، شیروانی، جمال
 خان شیروانی! میں نے کہا۔
 "جمال خان شیروانی؟" راجا نے حیرت سے کہا۔
 "ٹیکے پتر! تو تو دونوں طرف سے مارا گیا۔ یہ جمال خان

شیروانی بہت دنگ بندہ ہے۔ یہ تو دس بیروں اور سفیروں کو بھی
 خاطر میں نہیں لاتا۔ یہ تجھے نہیں چھوڑے گا۔" پھر وہ کچھ سوچ
 کر بولا۔ "ایک صورت ہے، ہم آج ہی اس سے مل کر اسے
 تمام صورت حال بتا دیتے ہیں۔ اسے کسی اور ذریعے سے
 اس بات کا علم ہو تو وہ تیرا دشمن ہو جائے گا۔"
 "لیکن یار مہاراجا! میں ایک باپ کو کیسے بتاؤں گا
 کہ....."

"بتانا پڑے گا پتر جی! تو تیاری کر، ہم ابھی اسلام
 آباد جا گئے۔ میں تاسر کو فون کر دیتا ہوں۔ اس قسم کے
 انسروں سے اس کے ایسے تعلقات ہیں۔ ممکن ہے شیروانی
 سے بھی اس کے تعلقات اچھے ہوں۔"

ہم اسلام آباد کے لیے نکلے تو موسم بہت خوشگوار تھا۔
 گاڑی حسب معمول فنی ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں نے راجا کے
 کہنے پر مزید گاڑی ساتھ نہیں لیے تھے۔ ہم لوگ بہت
 خاموشی سے اسلام آباد آباد جانا چاہتے تھے۔ ہمارے اعلان
 جانے سے شاہ جی کو علم ہو جاتا کہ میں شیروانی سے ملا ہوں یا
 اسلام آباد جا رہا ہوں تو وہ یقیناً کوئی مشکل کھڑی کرنے کی
 کوشش کرتا۔ مجھے یقین تھا کہ ابھی تک میری ویڈیو کی ڈی وی
 ڈی شیروانی تک نہیں پہنچی ہوگی۔ اسے ارسال کرنے والا تو
 ہمارے قبضے میں تھا۔ شاہ جی پہلے تو ایک دو دن اسے تلاش
 کرتا، پھر کوئی مقبول بندوبست کرتا۔

"یار مہاراجا!" میں نے کہا۔ "ایک بات میری کچھ
 نہیں آتی۔ اس شاہ جی کو مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ میں تو
 اسے جانتا بھی نہیں۔"

"ٹیکے پتر! تو نے یہ سوال بہت دیر میں کیا۔" راجا
 نے ہنس کر کہا۔ "دشمنی کی ایک وجہ تو وہی تیرا پرانا حریف اور
 رقیب رانا ہے۔"

"رانا؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "رانا کا شاہ جی سے
 کیا تعلق؟"

"بظاہر تو کوئی تعلق نہیں ہے لیکن ایگنٹن نزدیک ہیں۔
 لیکن یہ رانا اور شاہ جی کا کوئی گٹھ جوڑ ہو گیا ہو؟"

"ہاں، یہ ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔
 "دوسری وجہ یہ ہے کہ شاہ جی نے مجھے صرف مہرہ بنایا
 ہو۔ اصل حکار شیروانی ہو۔ شاہ جی کو یہ تو معلوم ہوگا کہ تو
 کروڑوں روپے کی آسامی ہے۔ اس نے ایک تیرے دو
 لاکھ کیے ہوں۔ شیروانی کو قہر کرنے کے لیے اور تجھ سے
 دولت بنانے کے لیے۔"

"سری جی! فنی نے کہا۔" شاہ جی جیسا نیک بندہ ایسے
 کام کیسے کر سکتا ہے؟"
 "ٹیکے پتر! اتیرے تو گھری میں شاہ جی کے حمایتی
 موجود ہیں۔ بن کر لے لے لے!"

"میں شاہ جی کی حمایت نہیں کر رہا ہوں۔" فنی نے
 کہا۔ "میں تو صرف یہ بتا رہا ہوں کہ وہ بہت نیک بندہ ہے،
 نماز روزے کا پابند ہے لاہور اور اسلام آباد میں اس نے
 بہت بڑی بڑی مسجدیں بنائی ہیں۔ ایسا بندہ بھی یہ کام کر سکتا
 ہے تو انسان کس پر اعتبار کرے؟"

"تم سانسے دیکھو اور گاڑی چلاؤ۔" راجا نے کہا۔
 "آج کل ایسے ہی بندے اس قسم کے کام کرتے ہیں ملک
 سے باہر کے بینکوں میں اربوں ڈالرز پڑے ہوئے ہیں اور
 انکم ٹیکس دینے کے موقع پر ان سے زیادہ غریب اور نادار کوئی
 نہیں ہوتا۔ ٹیکے پتر!"

اسلام آباد پہنچے تک راجا اسی طرح دل کے پھپھولے
 چھوڑتا رہا۔ ہم لوگ سیکرٹریٹ آفس پہنچے تو تاسرواں پہلے
 سے ہمارا انتظار تھا۔ راجا نے اسے مختصر آسانی صورت حال
 سے آگاہ کیا تو وہ بھی فکر مند ہو گیا۔

"یار راجا! یہ شیروانی بہت میٹھی لکھر ہے۔ اس کے
 بارے میں مشہور ہے کہ ہر وقت اپنا استغنی جیب میں رکھے
 رہتا ہے لیکن وہ میڈیا کو زیادہ مت نہیں لگتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ
 نانوائے فیصد صحافی بلیک میٹر ہوتے ہیں۔ خیر، میں اس سے
 نواب صاحب کو ملوانے کی کوشش کرتا ہوں۔"
 "مجھے..... لیکن..... میں اس سے کیا کہوں گا.....
 میں....."

"تو فکر مت کر ٹیکے پتر! میں تیرے ساتھ ہوں گا۔
 میں تو فوراً بہت اس کی نفسیات کو سمجھتا ہوں۔"

شیروانی کے دفتر کے باہر کی لوگ موجود تھے۔ وہ سب
 اس کے ملاقاتی تھے۔ اس کا بی بی اسے راجا کو بھی جانتا تھا اور
 تاسر کو بھی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ "اوہو تاسر صاحب! آج یہاں
 کیسے بھول پڑے؟"

"یار! یہ نواب صاحب، شیروانی صاحب سے ملنا
 چاہتے ہیں۔"

"نواب صاحب!" بی بی اسے نے حیرت سے مجھے
 دیکھا۔

میں اس وقت بہترین سوٹ میں ملبوس تھا، میں نے
 بہت مہنگا پر لیوم لگا رکھا تھا، اچھ میں رے بن کا چٹر تھا جو
 میں نے دفتر میں داخل ہونے کے بعد اتار لیا تھا۔

”کیوں جناب، کیا میں شکل سے آپ کو نواب نہیں لگتا یا پھر؟“

”نہیں سہ! وہ جلدی سے بولا۔ ”اصل میں اس سے پہلے آپ سے ملاقات نہیں ہوئی اس لیے۔“ آپ نے شیردانی صاحب سے ملاقات کا وقت تو لیا ہوگا۔“

”یاد رہی تو مسئلہ ہے۔ نواب صاحب کو بہت اہم چنی میں شیردانی صاحب سے ملنا ہے۔“

”پھر تو مشکل ہے۔“ بی بی اس نے کہا۔ ”خیر، آپ اپنا کارڈ مجھے دے دیں۔“

میں نے اپنا کارڈ نکال کر اسے دیا۔ اس نے کارڈ پر ایک نظر ڈالی، پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ”نواب رفیع احمد شیرازی آف ست بدھائی۔“ سر! میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کی اسٹیٹ کہاں ہے؟“

”ست بدھائی دینے کے نزدیک بی بی روڈ سے تقریباً سولہ سترہ کلومیٹر اندر کی طرف واقع ہے۔“ میرے بھائی نے راجا نے جواب دیا۔ ”میں نواب صاحب کا پرسنل اسسٹنٹ بھی ہوں اور بی بی آراو بھی!“ راجا نے کہا۔

”میں خوش کرتا ہوں کہ شیردانی صاحب اس ملاقات پر راضی ہو جائیں۔ دراصل وہ بہت پریشان ہیں۔ ان کی بیٹی لاپتہ ہو گئی تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ وہ صبح ہونے سے پہلے ہی گھر پہنچی تھی۔ آج ان کی دو تین اہم میٹنگ ہیں ورنہ شاید آج بھی وہ آفس نہ آتے۔ ان کا سوڈ بہت خراب ہے۔ صبح سے کئی بار کئی افسران ان کی جھاڑن چکے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ میرا کارڈ لے کر اندر چلا گیا۔

اس کے پیچھے پیچھے میں، راجا اور ناصر بھی لپکے۔ مجھے دیکھ کر وہ بی بی سے بولے۔ ”بی بی فرمائیے؟“

سکرٹری نے ان کے کہنے پر گھوم کر ہمیں دیکھا اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

وہ جلدی سے بولا۔ ”سر، یہ نواب رفیع احمد شیرازی آف ست بدھائی ہیں۔ میں ان ہی کا کارڈ لے کر آیا تھا۔ انہیں شاید بہت زیادہ اہم چنی ہے۔“

”تم وہاں کس لیے بیٹھے ہو؟“ شیردانی صاحب کی آواز بھی بہت گرجن دار تھی۔ ”تم کارڈ لے کر خود ہی دوڑے پلے آئے۔ کیا سارے بیون مر گئے ہیں؟“

”سر! نواب صاحب نے استدعا کی تھی کہ۔۔۔۔۔۔“

”شٹ اپ، اینڈ کیٹ لاسٹ!“ انہوں نے گرج کر کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”بی بی فرمائیے، کیا پرالم ہے آپ کو؟“

”سر! بات ذرا تفصیلی ہے۔“ میرے بھائی نے راجا نے کہا۔ ”میں نواب صاحب کا بی بی آراو ہوں۔“

”اس کے لیے آپ کو پہلے سے وقت لینا چاہیے تھا۔ آج تو میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ میں خود بھی آفس تین چار گھنٹے لیٹ پہنچا ہوں۔ آپ کل کسی وقت آجائیں، ابھی مجھے بہت کام ہے۔“

”سر! معاملہ بہت سیریس ہے۔“ راجا نے کہا۔ ”نواب صاحب خود بھی بغیر وقت لیے نکلنے کے قائل نہیں ہیں۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ لندن میں گزارا ہے اس لیے وقت کی اہمیت سے واقف ہیں لیکن معاملہ اتنا بڑک ہے کہ آپ سے آج ہی ڈسکس کرنا بہت ضروری ہے۔“

”میں آپ کو پانچ منٹ دے سکتا ہوں سسر بی بی آراو۔“ شیردانی صاحب نے اپنی کانٹی کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”سر، معاملہ آپ کی بیٹی سے متعلق ہے۔“ راجا نے جلدی سے کہا۔

”میری بیٹی ہے؟“ شیردانی صاحب چونک کر بولے۔ ”وہ تو گھر پہنچ چکی ہے۔“

”بی بی! اسے نواب صاحب ہی نے گھر پہنچایا ہے۔ اسے کچھ لوگوں نے اغوا کر لیا تھا اور۔۔۔۔۔۔“ راجا انہیں تفصیل بتانے لگا۔

”آپ کو یقین ہے کہ ان لوگوں نے آپ کی بیٹی کو بٹائی ہے؟“ شیردانی صاحب کا سارا قصہ ختم ہو گیا۔ وہ آواز کسی مجبور اور بے بس باپ کی آواز تھی۔

”بی بی! سر! مجھے یقین ہے۔“ میں نے کہا۔

شیردانی صاحب نے اپنا سر ہٹا دیا۔ وہ چند لمحوں تک اسی پوزیشن میں رہے، پھر انہوں نے ٹھٹھکی۔

”ابھی ابھی بیون کمرے میں داخل ہوا۔“

”ابھی ابھی کچھ۔“ انہوں نے کہا۔ وہ اتنے حواس باختہ ہو گئے تھے کہ انٹرکام پر ابھرا کر بولنے کے بجائے بیون کے ذریعے بول رہے تھے۔

ابراہیم مجھ بھاگ وہاں پہنچا۔ ”نہیں سر!“

”ابراہیم! سارے آپائنٹ منٹس کیسٹل کر دو۔ دونوں میٹنگ بھی کیسٹل کر دو۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ میں اب آفس میں نہیں بیٹھ سکتا۔ میں گھر جا رہا ہوں۔“

”اوکے سر!“ ابراہیم نے جلدی سے کہا۔ ”میں آپ کے ڈرائیور سے کہتا ہوں کہ گاڑی لٹکالے۔“ ابراہیم تیزی سے واپس چلا گیا۔

شیردانی صاحب خامسے دراز قد آدمی تھے لیکن ایسا

لگ رہا تھا کہ اس شیردانی میں اور پندرہ منٹ پہلے کے شیردانی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ اچانک مجھے بڑے بڑے گھٹنے لگے تھے۔

انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”آئیے نواب صاحب اباقی بائیں گھر پر ہوں گی۔“

مجھے دیکھ کر غبی بھی گاڑی پورچ میں لے آیا تھا۔ شیردانی صاحب کی گاڑی وہاں پہلے سے موجود تھی۔ ہماری گاڑیاں آگے پیچھے لگیں۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے سترے شیردانی صاحب کو سلام کیا۔

گھر پہنچ کر وہ ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گئے اور ایک صوفے پر تقریباً ڈھسے گئے۔ مجھے ان کی طبیعت واقعی غراب لگ رہی تھی۔

”سر، کیا آپ یہاں تنہا رہتے ہیں؟“ راجا نے پوچھا۔

”نہیں میری بیٹی بھی میرے ساتھ رہتی ہیں۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں ڈاکٹر کو بلا دوں؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے آپ کی طبیعت بہتر نہیں لگ رہی ہے۔“

”میں شیک ہوں۔“ پھر انہوں نے کسی ملازم کو آواز دی اور بولے۔ ”بیکر صاحب سے کہو کہ مہمانوں کے لیے کھانے کا بندوبست کریں۔“

”شیردانی صاحب! یہ تکلف چھوڑیے۔“ میں نے کہا۔

”تکلف کیسا نواب صاحب! کھانا تو کھانا ہی پڑے گا۔“ انہوں نے کہا۔

پھر انہوں نے مجھ سے ساری تفصیل پوچھی۔ مجھے بتاتے ہوئے بھی عجیب سا لگ رہا تھا۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک چارہ تھا۔

”یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟“ شیردانی صاحب نے کہا۔

”آپ یقین نہیں کریں گے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ ہمارے ملک کے سرفہرست سیاست دان سکین شاہ کی حرکت ہے۔“

”ہائیکمن!“ شیردانی صاحب نے کہا۔ ”میں شاہی کو بھی طرح جانتا ہوں۔ بی بی باران سے ملاقات ہو چکی ہے۔ ایک منٹ ہی میں وہ میرے پاس بھی رہے ہیں۔ آپ کو کھانا بھی کھانے سے نواب صاحب ایسا ان کی حرکت نہیں ہو سکتی۔“

”میں ابھی فوری طور پر توجہ نہیں کر سکتا لیکن جلد ثابت کر دوں گا کہ یہ شاہ بی بی کی حرکت ہے۔“ پھر میں کچھ

سوچ کر بولا۔ ”آپ ذرا قہقہہ پر زور ڈالیں۔ شاہ بی بی نے ابھی حال ہی میں آپ سے کوئی کام کہا تھا؟“

”نہیں۔“ وہ پریکٹین لہجہ میں بولے۔ ”وہ کبھی کوئی ناجائز کام نہیں کرتا۔“

”ان کے حوالے سے یا ان کے کسی دوست کے حوالے سے کوئی آپ کے پاس کام لے کر آیا ہو؟“ میں نے کہا۔

وہ چند لمحوں سوچتے رہے پھر چونک کر بولے۔ ”ہاں، ایک شخص ان کے حوالے سے آیا تو تھا۔ مجھے اس وقت اس کا نام یاد نہیں آ رہا۔ آفس میں اس کی فائل موجود ہے۔ اس میں اس کا نام بھی ہوگا۔ وہ کام انتہائی ناجائز تھا۔ میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا اور کہا تھا کہ اگر تم نے شاہی کا حوالہ نہ دیا ہوتا تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دیتا۔ اب یہاں سے دھج ہو جاؤ۔ شاہ بی بی نے اگر تمہاری سفارش کی ہے تو ان سے گھبرا کر لے آؤ یا ان سے کہو، مجھ سے فون پر بات کریں۔“

”شہو خط لایا ہوگا، شاہ بی بی نے فون کیا ہوگا۔ وہ آپ کو اپنی تحریر تو دینے سے رہے، فون بھی اس لیے نہیں کیا کہ آپ اپنے فون کی ہر کال ریکارڈ کرتے ہیں۔“ راجا نے کہا۔

”آپ کو کیسے معلوم کہ میں اپنے فون پر کال ریکارڈ کرتا ہوں۔“

”سر، میں نواب صاحب کا بی بی آراو ضرور ہوں لیکن گزشتہ کئی برس سے کچھ صحافت کی خاک بھی چھان رہا ہوں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کے سیل فون پر کال بھی کسی مخصوص سسٹم کے تحت ریکارڈ ہوتی ہے۔ جب یہ بات میں جانتا ہوں تو شاہ بی بی بھی جانتا ہوگا۔“

”ہاں، لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے شخص شاہ بی بی کا نام لیا ہو؟“ شیردانی صاحب اب کسی حد تک سنبھل گئے تھے۔

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”آپ ایسا کریں، خود ہی شاہ بی بی کو کال کریں اور اس سے کہیں کہ پچھلے دنوں آپ کا ایک آدمی اپنا ایک کام لے کر میرے پاس آیا تھا۔ مجھے اس پر شبہ تھا اس لیے میں نے اسے منع کر دیا۔ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ میں نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ آپ کل اس شخص کو بھیج دیں۔ اس کا کام ہو جائے گا۔ اب اگر واقعی شاہ بی بی نے اسے بھیجا ہوگا تو وہ آدمی کل پھر آ جائے گا۔“

”بات تو آپ کی شیک ہے۔“ شیردانی صاحب نے کہا۔ ”اس سے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس شخص کو واقعی شاہ بی بی نے بھیجا تھا یا وہ شخص ان کا نام استعمال کر رہا تھا۔ میں ابھی

شاہ جی کو فون کرتا ہوں۔ انہوں نے سائز ٹیبل پر رکھا ہوا فون سیٹ اپنی طرف کھکھکایا اور اس کا ایکٹر فون آن کر کے شاہ جی کا نمبر ملا۔

دوسری طرف دو گھنٹیاں بچیں، پھر ریسیور اٹھا لیا گیا اور کسی نے بہت نرم لہجے میں کہا۔ ”السلام علیکم“
”وعلیکم السلام! شاہ جی، میں جمال شیردانی بول رہا ہوں۔“

”زے نصیب!“ شاہ جی نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔ ”شیردانی صاحب آج آپ کو اس ناچیز کی یاد کیسے آگئی؟“

”سرا کافی عرصے سے آپ سے گفتگو نہیں ہوئی تھی۔“

آپ سے بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔“

”ارے شیردانی صاحب! یہ تو میری خوش قسمتی ہے۔“

بکھی غریب خانے پر تعریف لائیں۔“

”اللہ اللہ وقت ملتے ہی حاضری دوں گا۔ ہاں، پچھلے دنوں ایک صاحب اپنا ایک کام لے کر آئے تھے۔“ شیردانی

صاحب نے کہا۔ ”کام تو کوئی مشکل نہیں تھا۔ مجھے صرف ایک دستخطی تو کرنے تھے۔ وہ آپ کا نام لے رہے تھے کہ آپ

نے انہیں بھیجا ہے، اس وقت تو میں نے انکار کر دیا لیکن بعد میں خیال آیا کہ ناحق میں نے اس شریف آدمی پر شبہ کیا۔

ظاہر ہے آپ کا نام لے کر کوئی ایراضیہ تو انہیں ملتا۔ میں نے ان کا کام کر دیا ہے۔ ان سے کہیں کل پرسوں کی وقت

آکر اپنی فائل لے جائیں۔“

”جناب! یہ تو محبت ہے آپ کی۔ نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ میرے پاس آتے ہیں؟ آپ جانتے ہیں کہ میں

سفارش کو سخت ناپسند کرتا ہوں لیکن وہ شخص بے چارہ بہت مجبور تھا۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ آپ شیردانی صاحب کو میرا

حوالہ دے دیں لیکن اگر کام ناجائز ہو تو وہ کریں گے نہیں۔“

”سرا! آپ کسی ناجائز کام کی سفارش کریں نہیں

سکتے۔“ شیردانی صاحب نے کہا۔ ”بہر حال میں نے ان کا کام کر دیا ہے۔“

”آپ کی بہت نوازش شیردانی صاحب! آپ نے

مجھ ناچز کا بھرم رکھ لیا۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ کسی دن

بھائی اور بھین کے ساتھ غریب خانے پر تعریف لائیں۔“

”جی ضرور!“ شیردانی صاحب نے کہا۔ ”میں تو خود

بھی آپ سے ملاقات کا مشتاق ہوں۔ اللہ اللہ جلد ہی

ملاقات ہوگی۔“

”میں آپ کا بہت ممنون ہوں شیردانی صاحب! اللہ

آپ کو خوش رکھے فی امان اللہ!“ انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
شیردانی صاحب کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ”کسے وہیل کریں، کس سے

مصلحتی چاہیں؟ میں تو اس شاہ جی کو بہت برگزیدہ سمجھتا تھا۔ آپ

جانتے ہیں کام کیا تھا؟“ انہوں نے کہا۔ ”وہ کروڑوں روپے کا

کام تھا۔ میری جگہ کوئی اور ڈیپٹی سیکریٹری ہوتا تو وہ اس شخص سے

کم از کم ایک کروڑ روپے وصول کرتا۔“ پھر وہ مدعی منہ میں

بڑبڑانے لگے۔ ”لیکن اس شخص کا نام کیا تھا؟“

”سرا! آپ کے لیے اسے کو تو معلوم ہوگا۔“ راجا نے کہا۔

”اس نے پہلے تو آپ کے لیے اسے کو شاہ جی کا حوالہ دیا ہوگا۔“

”ہاں، اب ہر کو معلوم ہوگا۔ میں ابھی اس سے معلوم کرتا

ہوں۔“ شیردانی صاحب نے کہا اور فون پر نمبر ملانے لگے۔

سلسلہ ملتے پر وہ بولے۔ ”ہاں ابراہیم۔۔۔ ہاں طبیعت

اب بہتر ہے۔۔۔ یہ بتاؤ، کچھ دن پہلے ایک شخص شاہ جی کے

حوالے سے آیا تھا۔ سکین شاہ صاحب!۔۔۔ تم شاہ جی کو

نہیں جانتے؟“ ہاں، یہ بتاؤ کہ اس کا نام کیا تھا؟“ اچھا

ٹھیک ہے۔“ انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور بولے۔ ”اس

فصل کا نام شاہاب الدین تھا۔ اب کل وہ پھر آئے گا۔“

”اس کا نام تو آپ نے کیا نہیں۔“ میں نے کہا۔

”آپ اس سے کیا کہیں گے؟“

شیردانی صاحب ہلکی دھند مسکرائے۔ ”میں اس سے

کہوں گا کہ شاہ جی سے میری بات ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا

تھا کہ کوئی جائز کام ہو تو ضرور کر دیں۔ تمہارا کام تو سراسر

ناجائز ہے۔“ پھر وہ گھر مند ہو کر بولے۔ ”نواب صاحب!

اس غصیٹ نے میری بیٹی کی شرم ناک ویڈیو بنائی ہے۔ وہ

مجھے اس حوالے سے بلک سیل کرے گا۔ اگر میں انکار کروں

گا تو وہ ویڈیو۔“

”آپ پریشان نہ ہوں شیردانی صاحب!“ میں

نے انہیں تسلی دی۔ ”میری بھی عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔

میں کوشش کر رہا ہوں کہ کسی طرح اس سے ویڈیو کا بائس

پرٹ اور اگر اس نے ڈی وی ڈیز تیار کر لی ہیں تو وہ

حاصل کروں۔“

”اصل میں، میرا تعلق لاہور ہی سے ہے۔“ شیردانی

صاحب نے کہا۔ ”میں نے زندگی بھر کی جمع پونجی لگا کر وہیں

گھر بنایا۔ ٹھہر وہاں اپنی ٹیکس رتی ہے بلکہ میرا بیٹا اور بیوی

وہاں ہیں۔ میرا بیٹا انجینئر ہے اور لاہور ہی کی ایک فرم میں

ملازمت کرتا ہے۔“

”شیردانی صاحب! میں نے تو یہ سب کچھ آپ کو قبل

از وقت اس لیے بتا دیا کہ اگر آپ کو کسی اور ذریعے سے علم

ہوتا تو آپ مجھ پر بھی شبہ کرتے، میں اپنی سی ہر ممکن کوشش

کروں گا کہ آپ کی عزت پر آج نہ آئے۔“

ملازم نے آکر بتایا کہ کھانا تیار ہے۔

شیردانی صاحب نے کہا۔ ”آئیے، پہلے کھانا کھالیں،

پھر بات کریں گے۔“

کھانے کی میز پر ان کی بیگم بھی موجود تھیں۔ وہ خاصی

خوش اخلاق خاتون تھیں۔ انہیں صورت حال کا علم نہیں تھا اس

لیے وہ خوب فنی مذاق کر رہی تھیں۔ میں نے ان لوگوں کو

ست بدحالی آنے کی دعوت دی۔

”نواب صاحب! میں بھی کام کر کے بہت تھک گیا

ہوں۔ اب کچھ دن کا پرسکون جگہ پر آرام کرنا چاہتا ہوں۔

جیسے ہی موقع ملا، میں آپ کے دولت خانے پر حاضری ضرور

دوں گا۔“

ان سے رخصت ہوتے وقت میں نے کہا۔ ”شیردانی

صاحب! جب تک میں اس غصیٹ شاہ جی سے وہ ویڈیو

حاصل نہ کروں، آپ یہی ظاہر کریں کہ مجھے جانتے ہی نہیں

تھیں۔ یہ بہت ضروری ہے ورنہ وہ فتنہ کر کوئی نیا فتنہ بھی مچا

کر سکتا ہے۔“

ان سے رخصت ہو کر میں ست بدحالی کی طرف لوٹا

تو میرا ذہن بہت ہلکا چلکا ہو گیا تھا۔ شیردانی صاحب یقیناً ایک

نکتہ گیر اور جنگ افسر تھے لیکن ایک بیٹی کے باپ بھی تھے۔

ہم ست بدحالی پہنچے تو اندر جرائیل چکا تھا۔ شہناز نے

مجھ سے پوچھا۔ ”تم لوگ اچانک کہاں چلے گئے تھے؟“

بچنے لگی۔ میں نے جیب سے سیل فون نکال کر اس کی اسکرین

پر نظر ڈالی تو مجھے سوشی کا نام نظر آیا۔

”گڈ آفون سر!“ اس نے کہا۔ ”کیسے ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں، تم بتاؤ، وہاں کے معاملات ٹھیک

چل رہے ہیں؟“

”ٹھوڑی بہت پریشانی تو ہوتی ہے سرا!“ اس نے

کہا۔ ”لیکن میں اس سے نمٹ سکتی ہوں۔ اس وقت میں نے

اس لیے کال کی ہے کہ اس اسٹیٹ ایجنٹ کا فون دوسرا چکا

ہے۔ آپ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ چھ مہینے کے اندر اندر

ارنٹ تیس اس کے حوالے کر دیں گے۔“

”میں نے اس سے وعدہ نہیں کیا تھا سوشی، بلکہ اس

نے مجھے چھ ماہ کا وقت دیا تھا کہ اس دوران میں وہ ارنٹ

تیس کے لیے گا کہ حاش کر لے گا۔“

”ٹیلے یوں ہی سہی۔“ سوشی غائباً دوسری طرف

مسکرائی تھی۔ میں جانتا تھا کہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر سہی

رہتی ہے۔ اس نے گا کہ تلاش کر لیا ہے اور وہ جلد از جلد

تیس کا قبضہ چاہتا ہے۔“

”اس سے پندرہ دن کی مہلت لے لو۔ نو کی طبیعت

آج کل کچھ خراب ہے ورنہ میں اسے کل ہی روانہ کر دیتا۔“

میں نے کہا۔

”میڈم کی طبیعت خراب ہے؟“ سوشی گھر مندی سے

بولی۔ ”کیا ہوا ہے انہیں؟“

”ارے انہیں معمولی زلزلہ بخار ہے۔ ایک دو دن میں

ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”دیے میں نے اس ایجنٹ سے ایک ماہ کا وقت لے

لیا ہے۔“ سوشی نے ہنس کر کہا۔

”گڈ گرل!“ میں نے کہا۔ ”تم تو واقعی ضرورت سے

زیادہ ذہین ہو۔“

”تھیک یوسرا!“ اس نے کہا۔ ”میڈم لندن کب تک

آ رہی ہیں؟“

اچانک اس کی کال پھر آگئی۔ "سرا! میڈم کا سیل تو آف ہے۔ آپ پلیز مجھے بتائیے، کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟"

"نہیں سہی، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے پھر سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں تازہ دم ہو کر کمرے سے نکلا تو راجا میری رائٹنگ چیئر پر بیٹھا جھول رہا تھا۔

"ٹھیکے پترا!" اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"اس دو نمبری ڈاکٹر نے دو نام بتائے ہیں۔ دونوں شاہ جی کے خاص آدمی ہیں۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ ان دونوں میں سے کسی کے پاس ویڈیو فلموں کا مواد ہوگا اور نہ ہی ہوا تو انہیں معلوم ضرور ہوگا۔"

"وہ دونوں کہاں رہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ دونوں لاہور میں رہتے ہیں۔ ایک لاہور کا بہت بڑا ٹرانسپورٹر ہے اور دوسرا فیلے درجے کا ایک سیاست دان ہے۔ دونوں شاہ جی کے گویا مرید خاص ہیں۔ وہ بھی خود کو غریبوں کا بہت دھرم اور خیر خواہ ظاہر کرتے ہیں۔"

"اس ڈاکٹر نے ان لوگوں کی لسٹ دی جنہیں اب تک بیک سیل کیا جا چکا ہے؟"

"ہاں، اس نے ایک لسٹ بنائی تو ہے لیکن اس نے کہا ہے کہ یہ عمل لسٹ نہیں ہے۔ مجھے جیسے جیسے نام یاد آتے جاں گئے میں بتاتا جاؤں گا۔"

"مہاراجا!" میں نے کہا۔ "اس دو نمبری ڈاکٹر نے اپنی جان بچانے کے گھجوت تو نہیں بولا؟"

"جھوٹ بول کر اسے کیا ملے گا؟" راجا نے کہا۔ "ہم اسے چھوڑنے سے تو رہے اور اگر اس نے کچھ نہ بتایا تو میں واقعی اسے وہ انجکشن نمبر تین دے دوں گا۔"

"یارا تو ان انجکشن کو ایب میں نیٹ تو کرا۔" میں نے کہا۔ "آخر مغرور تو ہو کر ان میں کون سی دوا انہیں شامل ہیں؟"

"میں نے یہ کام حیرے کہنے سے پہلے ہی کر لیا ہے۔ میں نے وہ سب انجکشن اور دوا انہیں ایب میں دے دی ہیں۔ آج شام تک ان کی رپورٹ مل جائے گی۔ میں نے انہیں اگرچہ رپورٹ بنانے کے لیے کہا ہے۔"

"ان لوگوں کے نام کیا ہیں جو شاہ جی کے خاص آدمی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ٹرانسپورٹر کا نام آفتاب خان ہے اور سیاست دان خود کو احسان علی قدوائی کہتا ہے۔ پھر وہ میری شکل دیکھ کر بولا۔ "اس ڈاکٹر نے ان کے پتے بھی دے دیے ہیں۔"

"مہاراجا! اب مجھے شدت سے احساس ہوا ہے کہ ہمارے پاس لاہور اور اسلام آباد میں بھی کوئی ٹھکانا ہونا چاہیے۔"

"لاہور میں تو ماڈل ڈاؤن میں ایک گھر بھی ہے۔"

"وہ گھر تو پولیس کی نظروں میں آچکی ہے۔" میں نے کہا۔

"میں اس گھر کی بات نہیں کر رہا ہوں ٹھیکے پترا! میں اپنے ایک دوست کی گھر کی بات کر رہا ہوں۔ جیسے ملے اس سے بات ہوئی تھی تو اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنی فیملی کے پاس کینیڈا جا رہا ہے اور لاہور والی کو بھی بچتا جا رہا ہے۔ اس نے مجھ سے گپ کشاں کرنے کو کہا تھا ممکن ہے کسی ایسٹ ایجنٹ سے بھی بات کی ہو۔"

"یارا اگر بات ایک ہفتہ پرانی ہے تو وہ گھر تو اب تک بک چکی ہوگی۔"

"وہ دو کمال کی گھر ہے ٹھیکے پترا! اتنی بڑی گھرگیاں اتنی جلدی نہیں بکتیں۔ میں ابھی اس سے بات کر لیتا ہوں، کب تک بھی ہوگی تو کیا ہے۔ لاہور میں بنگلوں اور گھریلوں کی کمی تو نہیں ہے۔"

اس نے جب سے سیل فون نکالا اور نمبر ڈائل کر کے بولا۔ "ہیلو..... وٹیکم السلام! کیا حال ہیں؟..... اچھا، یار! میں تو سمجھ رہا تھا کہ تو اب تک کینیڈا چلا گیا ہوگا لیکن تو ابھی تک نہیں موجود ہے۔ یار وہ گھر تیرے گھر پر ہی ہوئی ہے تو اسے کرائے پر کیوں نہیں دے دیتا؟..... کیا کہتے ہیں؟..... اچھا..... تیری ڈیمانڈ کیا ہے؟..... چل میں کوئی گاہک دیکھتا ہوں..... ہاں، میں کل لاہور آ رہا ہوں، خدا حافظ!"

"ابھی تک گھر کی نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں اتولا لاہور چلنے کی تیاری کر ٹھیکے پترا!" راجا نے جھنجھکا۔

"ایسا کر تو فی الحال لاہور جا کر گھر کی کا سودا کر لے۔ میں ایک دو دن بعد آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "ہوسکتا ہے اس دوران میں شیر والی صاحب کی کال آجائے اور مجھے اسلام آباد جانا پڑے۔ ویسے بھی فوری طور پر میرا لاہور جانا ضروری تو نہیں ہے۔"

"ضروری تو نہیں ہے۔" راجا نے کہا۔

"میں اس دو نمبری ڈاکٹر سے مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ ممکن ہے اس دوران میں شاہ جی کوئی کام کی خبر ملے۔"

"یہ شاہ جی ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔" راجا نے

کہا۔

"وہ اگر مجھ سے غلط نہ ہوتا تو میرا سیل فون، پرس اور ہتھوڑا مجھے واپس نہ کرتا۔"

راجا اٹھ کر شہناز کی طرف چلا گیا۔

لاہور روانگی سے پہلے راجا، شہناز سے ملنے کے بعد برے پاس آیا اور بولا۔ "میں ابھی لاہور کے لیے نکل رہا ہوں۔ اب گھر کی حالت میں بھی ہو۔ میں آج ہی اس کا سودا کر لوں گا۔"

"راجا! گھر کی ایسے نام سے خریدنا جس سے بظاہر ہمارا کوئی تعلق نہ ہو۔ ایک قسم کا بے نامی سودا ہونا چاہیے تاکہ کل کلاں خدا خواست کوئی گڑبڑ نہ ہوئی ہے تو ہم پر کوئی الزام نہ آئے۔"

راجا کو رخصت کر کے میں صوبیدار میجر صاحب کی طرف چلا گیا۔ وہ حسب معمول اپنے معمولات میں مصروف تھے۔ وہ مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے لیکن کبھی خود سے ملنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ میں خود ہی ان سے مل لیتا تھا۔ میں نے ٹی کو ہدایت کی تھی کہ وہ صوبیدار میجر صاحب کو اپ ڈیٹ رکھا کرے تاکہ انہیں کوئی شکایت پیدا نہ ہو۔

"آئیں رفیق میاں! آپ سے تو آج کل ملاقات ہی نہیں ہوتی۔" پھر وہ اچانک بولے۔ "رفیق میاں! یہ شاہ جی کا کیا چکر ہے؟"

"میں تو خود حیران ہوں صوبیدار میجر صاحب کہ اس سے میری کیا دشمنی ہے؟"

"میں اس شاہ جی کو اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ مائیکلو کے منچر لگا یا کرتا تھا۔"

"مائیکلو کے منچر؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"لیکن میں نے تو سنا ہے کہ یہ جدی پشتی رہیں ہے؟"

"جدی پشتی رہیں!" صوبیدار میجر صاحب نے طنز یہ لہجہ میں کہا۔ "اس نے بہت ہی گھٹیا طریقوں سے دولت کمانی ہے جا رہے ہیں جب میں آئے تو یہ سید بن بیٹھا۔ آج سارا زمانہ اس کی شرافت، پارسانی اور ایمان داری کے گن گنا ہے لیکن میرے لیے وہ آج بھی مجرمانہ ذہنیت رکھنے والا سکینہ منچر والا ہے۔"

"آپ جانتے ہیں، اس نے میرے ساتھ کیا، کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" انہوں نے کہا۔ "رفیق میاں! انہیں اب بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ پہلی فرصت میں اس سے وہ ویڈیو حاصل کرو۔ تم نے شیر والی صاحب کو اتنا دس لے کر ہر گز اچھا کیا ہے۔"

میں تھوڑی دیر تک ان کے ساتھ رہا۔ ان کے ہاتھ کی جلی ہوئی چائے مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ وہ اپنے لیے چائے خود ہی پیتے تھے اور نہ جانے کون سا فارمولا استعمال کرتے تھے کہ کسی اور چائے میں وہ مزہ ہی نہیں آتا تھا۔

ان سے رخصت ہو کر میں اسپتال کی طرف چلا گیا۔ میں ایب کی طرف جا رہا تھا کہ ڈاکٹر شہناز مجھے اسپتال کے برآمدے ہی میں مل گئی۔

اس نے مجھ سے کہا۔ "نواب صاحب! ان دواؤں کی لیپ رپورٹ آگئی ہے۔ ان میں کئی دوا میں تو بہت ہولناک ہیں۔ ان کی تفصیل تو ڈاکٹر شہناز ہی بتائیں گی لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ان دواؤں میں ایک ڈیپا انہی بھی ہے جس میں سونیاں بھری ہوئی ہیں۔ ان سونیاں کی نوک پر کسی گیمیکل کے ساتھ کس کر کے سائیکائیڈ کا کوٹ کیا گیا ہے۔ ہمارا ایب ٹیفیشن اگر احتیاط سے کام نہ لیتا تو ان میں سے کوئی سونیاں اس کے ہاتھ میں بھی چھپ چکی تھی، پھر سوت بیٹھی تھی۔"

میں غور سے سوچا کہ ملک کا اتنا نیک نام آدمی جب اس قسم کی گھٹیا حرکتیں کر رہا ہے تو عام سیاست دان تو نہ جانے کیا کرتے ہوں گے؟

میں ڈاکٹر شہناز کے کمرے میں پہنچا تو وہ اس رپورٹ کا جائزہ ہی لے رہی تھی۔ وہ رپورٹ دیکھنے میں اتنی جھنجھکی اسے میری آمد کا علم نہیں ہو سکا۔

میں کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھا تو وہ چوکی اور گہری سانس لے کر بولی۔ "رفیق! یہ دوا میں تو بہت ہولناک ہیں۔ اس کی۔ ذرہ برابر مقدار کے اثرات بھی انتہائی تباہ کن ہوتے ہیں۔ اس کے اثرات سے انسان پر جنون طاری ہو سکتا ہے اور وہ وقتی طور پر زندہ بن سکتا ہے۔ اس عالم میں وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کسی کو قتل کر دے یا خود کو گولی مار لے۔ دوسری دوا اس سے بھی زیادہ تباہ کن ہے۔ اس میں انسان کے اعصاب بالکل ست ہو جاتے ہیں لیکن ذہن جاگتا رہتا ہے پر کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اسے سب کچھ نظر آتا ہے، ہاتھ پاؤں بھی معمولی طور پر حرکت کرتے ہیں لیکن وہ کچھ بھی سننے اور بولنے سے قاصر ہوتا ہے۔ تم پر شاید ایسی انجکشن کا استعمال کیا گیا تھا۔ تیرا انجکشن بھی بہت تباہ کن ہے۔ اس میں دو تین دواؤں کی آمیزش ہے۔ اس کے اثرات سے انسان کا ذہن ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو جاتا ہے۔ وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو جاتا ہے اور اسی عالم میں مر جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سائیکائیڈ میں بھی دو ہی ہزاروں کی تعداد میں سونیاں ہیں اور ان کی صرف نوک

جھونے سے انسان کی موت واقع ہو سکتی ہے۔
 ”ہزاروں کی تعداد میں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔
 ”ڈاکٹر شہناز نے تو مجھے بتایا ہے کہ ایسی ایک ڈیڑھ ہے؟“
 ”بریف کیس کی دو ٹیکس ہیں۔ اس کی ہنگی میں اس
 جسم کی سونکوں کے تقریباً چھ ڈیڑھ ہیں۔“
 ”لیکن شہناز! انہیں استعمال کرنے والا بھی تو اسے
 ہی خطرے میں ہوتا ہے۔ ذرا سی چوک ہو جائے تو وہ سوئی
 خود اسے بھی تو چھ سکتی ہے۔“
 ”وہ عام سونیاں نہیں ہیں رفیق! شہناز نے کہا۔
 ”ان کے اوپری حصے پر پلاسٹک کا کور ہے۔ سوئی کی بہت
 معمولی سی ٹوک باہر نکلی ہوئی ہے اور انہیں دستانے پہن کر
 استعمال کیا جاتا ہوگا کیونکہ وہ معمولی سی ٹوک بھی استعمال
 کرنے والے کی جان لے سکتی ہے۔“
 ”مجھے وہ سونیاں دکھاؤ۔ تو ہمارے بھی کام آسکتی
 ہیں۔“

شہناز نے الماری میں سے پلاسٹک کی ایسی مضبوط قسم
 کی ڈیڑھ نکالی جیسی عموماً نوچر جس کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔
 وہ ڈیڑھ لمبائی میں چھوٹی لیکن موٹی میں زیادہ تھی۔ اس کے
 اوپر والے حصے پر کھولنے کے لیے ایک اوپر کا تھا جو اس پر
 لگے ہوئے پلاسٹک کو انگوٹھے کی مدد سے دھکیلنے پر خلیف سا
 کھل جاتا تھا اور ڈیڑھ میں سے سوئی کا پلاسٹک والا حصہ خود بہ
 خود باہر آ جاتا تھا۔

”احتیاط سے!“ ڈاکٹر شہناز تجیز لہجے میں بولی۔
 میں نے بہت احتیاط سے اس میں سے ایک سوئی
 نکال لی۔ سوئی کا اوپر کا تقریباً پورا حصہ مضبوط پلاسٹک میں
 چسپا ہوا تھا، بس نیچے سرے پر بہت خلیف سی ایک ٹوک تھی۔
 اتنی معمولی ٹوک بھی کہ وہ پہلی نظر میں دکھائی بھی نہیں دیتی تھی۔
 سوئی کے اوپری حصے پر پلاسٹک میں چھگی میں پکڑنے کی
 گرپ بھی تھی۔ اس کے باوجود یہ سونیاں خطرناک تھیں۔
 شہناز نے پر خیال انداز میں کہا۔ ”سوال یہ ہے کہ وہ
 ڈاکٹر اتنی خوفناک چیزیں ساتھ لے کر کیوں گھوم رہا تھا؟ وہ
 شاہی کا کوئی خاص آدمی ہے؟“

”خاص آدمی تو وہ ہے۔ رہا یہ سوال کہ وہ یہ چیزیں
 لے کر کیوں گھوم رہا تھا تو اس کا جواب بھی اس سے مل جائے
 گا۔ ابھی وہ ہمارے ہی قبضے میں ہے۔“
 ”رفیق! شہناز نے اچانک کہا۔ ”تم یہ سیاست کا
 چکر چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ کیا صرف فلانی کام نہیں کر سکتے۔
 اسکول بناؤ، سڑک بناؤ، لوگوں کو زمین آباد کرنے کے لیے

قرضے دو۔“

”میں یہ سب کچھ تو کر رہی رہا ہوں لیکن رانا یہ سب کچھ
 بھی نہیں ہونے دے گا۔ جتنے بڑے جاگیردار اور زمیندار
 ہیں، سب یہی چاہتے ہیں کہ ان کے حزار سے اور کھیت حردور
 ہمیشہ ان کے محتاج رہیں۔ میں اب میدان چھوڑ کر بھاگنے
 والا نہیں ہوں۔“

”وہ تو خیر میں تمہیں برسوں سے جانتی ہوں۔“ شہناز
 نے کہا۔ ”انگل اگر تمہیں زبردستی لندن نہ بھیج دیتے تو تم یہاں
 سے بھی میدان چھوڑ کر بھی نہ بھاگتے۔“

”سونیوں کی ایک ڈیڑھ مجھے دے دو۔“ میں نے کہا۔
 ”جن حالات میں اس وقت میں گرفتار ہوں، مجھے اس قسم
 کے ہتھیاروں کی شدید ضرورت ہے۔“
 ”نہیں رفیق! شہناز نے سختی سے انکار کر دیا۔ ”یہ
 میں ابھی تمہیں نہیں دے سکتی۔“

”حالات کو سمجھو شہناز! ہم جس قسم کے کینے اور گھنپا
 لوگوں کے درمیان گھرے ہوئے ہیں ان کے لیے یہ ہتھیار
 بہت ضروری ہیں۔ تم نے انگریزی کی کا وہ خاورہ تو سنا ہوگا کہ
 قرض کی ادائیگی اس کے سکوں میں کی جائے۔ میں بھی ان ہی
 ہتھیاروں سے انہیں نشانہ بناؤں گا۔“
 شہناز نے میرے اصرار پر وہ ڈیڑھ میرے حوالے کر
 دی۔

اسے میں نے بہت احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لی۔
 ”راجا! ہور کیوں گیا ہے؟“ شہناز نے پوچھا۔
 ”ایک ضروری کام تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اب میں بھی
 لاہور کے لیے نکل رہا ہوں۔ تم یہاں کا خیال رکھنا۔“
 میں شہناز کے کمرے سے باہر آ گیا۔
 میں نے غمی سے گاڑی نکالنے کو کہا اور بتایا۔ ”ہم اسی
 وقت لاہور جا رہے ہیں۔“
 ”سڑک کوئی گاڑی۔“

”کوئی گاڑی نہیں۔“ میں نے سختی سے منع کر دیا۔ ”اس
 سے فضول میں قصہ ہوتی ہے کہ نواب صاحب کیس جا رہے
 ہیں۔ زیادہ سے زیادہ احمد شاہ کو ساتھ لے لو۔“ میں نے کہا۔
 ”ہاں، ہنڈ اسوک کے بجائے لینڈ کروزر رکھنا۔“
 میں اپنے کمرے میں آ گیا اور چھوٹے سے ایک
 ونڈر بیگ میں جان لیوا سونیوں کی ڈیڑھ اور دستانہ رکھ دیا۔ پھر
 میں نے دونوں ہتھیاریوں اور چیک کیے اور ہر طرح سے تیار
 ہو کر باہر آ گیا۔

غمی گاڑی کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ احمد شاہ

بھی تھا۔ میں غمی کے ساتھ پنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ احمد شاہ غمی
 نشست پر بیٹھا غمی نے گاڑی حویلی کے پھاٹک سے باہر
 نکال لی۔

ست بد حالی سے غمی ٹی روڈ تک جو سڑک میں غوار ہا
 تھا۔ اس کا کام ابھی تک ادھورا تھا۔ سڑک بنانے والے ٹھیکے
 دار کو رانا ہاؤس کے کسی بد معاش نے نہ جانے کیا دھمکی دی تھی
 کہ وہ کام چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

میں نے غمی کر لیا تھا کہ اب یہ سڑک میں گاڑیں
 والوں کی مدد سے خود بنائیں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے خود بھی
 حزاروں کے ساتھ کام کرنا پڑے یا روڈ ورک چلانا پڑے۔

سڑک پر پتھر بچھے ہوئے تھے۔ اس لیے غمی کنارے
 کے کچے راستے پر بہت احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔ میں نے
 غمی آگے میں دیکھا۔ احمد شاہ یوں چونکا پٹھا جیسے ابھی کوئی
 حملہ آور چھاڑیوں سے نکل کر ہم پر حملہ کرنے والا ہے۔ غمی اور
 سرور کے بعد وہ میرا تیسرا گاڑی تھا جو مجھے بہت پسند تھا۔
 راوی کا پلہ اس کرنے کے بعد میں نے بل فون پر
 راجا سے بات کی۔

”میں بیٹیں ماڈل ٹاؤن میں ہوں۔“ راجا نے کہا۔
 راجا نے ماڈل ٹاؤن کا ایڈریس بتایا تو میں نے غمی
 سے ماڈل ٹاؤن چلنے کو کہا۔ ہم ماڈل ٹاؤن کی ایک سڑک سے
 گزر رہے تھے کہ ایک وسیع و عریض دھکے سے کتے کا ایک چلا
 نکلا اور ٹریفک کے شور سے ڈر کر ادھر ادھر بھاگنے لگا۔

غمی نے فوراً گاڑی روک دی۔
 ”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔
 ”سر، وہ جرمن شیفرڈ کا چلا ہے۔ بہت زبردست کتا
 ہوتا ہے۔“ پھر وہ احمد شاہ سے بولا۔ ”احمد شاہ اس پلے کو اٹھا
 لاؤ۔“

احمد شاہ تیزی سے نیچے اتار اور پلے کی طرف بھاگا۔
 ”کہ کسی کو بھی میں سے نکلا ہے غمی! ان ہی کو غمی والوں کا
 ہوگا۔ تم اب کتے بھی چوری کر دو گے؟“ میں نے کہا۔

”میں نے تو اس سے پہلے بھی کتے چوری کیے تھے
 سرا، غمی نے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں، جرمن شیفرڈ دنیا کا
 خوف ناک ترین کتا ہوتا ہے۔ یہ اپنے حریف کو گھون میں چر
 پھا کر رکھ دیتا ہے۔“

میں خاموش ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ غمی کو کتوں سے
 شوق ہے۔ وہ اگر میری بات مان بھی گیا تو بہت بے دلی سے
 مانے گا۔

اس دوران میں احمد شاہ نے وہ چلا پکڑ لیا تھا اور اسے

لے کر تیزی سے گاڑی کی طرف آ رہا تھا۔
 کچھ لوگوں نے یہ منظر دیکھا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ
 مجھے احمد شاہ گاڑی میں سوار ہو گیا۔ دیکھنے والے بھی مجھے
 ہوں گے کہ اتنی تیزی سے گاڑی رکنے والے چور نہیں ہو سکتے۔ یہ
 کتا اسی گاڑی سے نکلا ہوگا۔

غمی نے فوراً گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کی نظریں
 عقب نما آگے پر بھی جیس کر کوئی ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہا۔
 انسان کے دل میں چور ہونا تو اسے ہر گاڑی اپنے تعاقب میں
 نظر آتی ہے لیکن ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔

غمی دس منٹ کے اندر اندر اس کو غمی کے سامنے پہنچ گیا
 جس کا ایڈریس راجا نے بتایا تھا۔

وہ کو غمی اتنی بری بھی نہیں تھی۔ اس کے اگلے حصے میں
 خاصا بڑا لان تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہاں رہنے والا لان کی
 باقاعدہ دیکھ بھال کرتا ہو، گھاس ترشی ہوئی تھی، کھار یوں میں
 خوش رنگ پھول بھی لہلہا رہے تھے۔ لان کے بعد خاصا وسیع
 و عریض کار پورج تھا جس میں بیک وقت چار گاڑیوں کی
 گنجائش تو ہوگی۔ پورج میں اس وقت دو گاڑیاں موجود
 تھیں۔ ایک گاڑی تو راجا کی تھی، دوسری یقیناً کو غمی کے مالک
 حبیب کی ہوگی۔

گاڑی کی آواز سن کر راجا اور درمیانی عمر کا ایک آدمی
 باہر برآمدے میں نکل آئے۔

”آئیے نواب صاحب!“ راجا نے آگے بڑھ کر
 گاڑی کا دروازہ کھولا۔ پھر اس نے کو غمی کے مالک حبیب کا
 اور میرا تعارف کرایا۔

”نواب صاحب! آپ پہلے کو غمی دیکھ لیں، باقی
 باتیں بعد میں کریں گے۔“

”احمد شاہ!“ غمی نے کہا۔ ”تم گاڑی لے جاؤ اور
 مارکیٹ سے ایک فیڈر اور نیٹرا بیک دودھ کا ایک ڈبہ لے
 آؤ۔“

”کیوں بھی؟“ راجا نے ہنس کر کہا۔ ”کیا اب تم نے
 فیڈر سے دودھ پینا شروع کر دیا ہے؟“

”نہیں سرا، غمی نے ہنس کر کہا۔ ”یہ دودھ تو میں اپنے
 کتے کے لیے منگا رہا ہوں۔ میں نے ابھی لاہور آتے ہوئے
 یہ چلا لیا ہے۔“ اس نے کتے کا چلا راجا کو دکھاتے ہوئے کہا۔

حبیب بہت دھمکی سے کتے کے اس پلے کو دیکھ رہا
 تھا۔ پھر اس نے غمی کے ہاتھ سے لے کر کتے کے پیچھے دیکھے،
 اس کے کان دیکھے، اس کی آنکھیں دیکھیں اور بولا۔ ”ویری
 گڈ! بالکل بھر جرمن شیفرڈ ہے۔ کراس نہیں ہے۔“

”کیا آپ کو بھی کتے پالنے کا شوق ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ حبیب نے کہا۔ ”میرے پاس تو اب سے ایک مینا پہلے کم سے کم چھ کتے تھے۔ میں نے وہ کتے بیچ دیے۔ اصل میں یہاں کتوں کے قدر دان بہت کم ہیں۔ دیکھ جرن شیفر ڈکے یہ سل نایاب ہے۔ یہ کتا آپ کو کہاں سے مل گیا؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”یہ کتا میرا چیف سیکورٹی آفیسر لایا ہے۔“ میں نے کہا۔ اب میں اس سے یہ کہنے سے تو رہا کہ چیف سیکورٹی آفیسر کتا چر رہی ہے۔

وہ کوئی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بڑی تھی۔ اس میں پانچ بیڈروم تھے، ایک ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، خاصا بڑا لی وی لاؤنج تھا اور کوئی کے قطعی حصے میں بیٹے، آم اور جاسن کے درخت لگے ہوئے تھے۔ وہ کوئی آبادی سے ذرا ہٹ کر تھی۔ مجھے وہ جگہ پسند آئی۔

ہم دوبارہ ڈرائنگ روم میں آئیے۔ اس دوران میں احمد شاہ واپس آ گیا تھا۔ وہ نہ صرف فیڈر اور دودھ لے آیا تھا بلکہ کافی کریم، بسکٹ وغیرہ بھی لایا تھا۔

”میں نے سوچا کہ یہاں اس وقت کوئی لگ تو ہوگا نہیں۔ نواب صاحب کو کافی پیسے کی عادت ہے اس لیے میں یہ سامان لے آیا۔“

”مجھے کوئی بہت پسند آئی ہے۔“ میں نے راجا سے کہا۔ ”باقی تفصیلات تم خود طے کر لو۔ مکان کس کے نام ہوگا، وغیرہ؟“

احمد شاہ اس دوران میں کافی بنا کر لے آیا۔ کافی پیسے ہوئے حبیب نے کہا۔ ”نواب صاحب! میں نے مکان کو بہت احتیاط سے رکھا ہے۔ یہ عمارت گو پرانی ہے لیکن میں نے اس کے رنگ و روغن اور دیکھ بھال پر بہت توجہ دی ہے۔ خاص طور پر میں نے لان کا بہت خیال رکھا ہے۔ میں آپ سے بھی گزارش کروں گا کہ اس کو بھی کے لان اور کچھ بھال کا خیال رکھیے گا۔ میرا بچپن، لڑکپن اسی مکان میں گزرا ہے۔ میں بھی پاکستان آیا تو مجھے اتنی تواجارت ہوگی کہ میں اس مکان کو اندر سے دیکھ سکوں؟“

”حبیب صاحب! آپ صرف دیکھنے کی بات کر رہے ہیں، میری طرف سے تو آپ کو آفر ہے کہ آپ جتنے دن بھی رہیں، یہاں میرے مہمان بن کر رہیں۔ آپ کو وہی کمرادیا جائے گا جس میں آپ اس وقت رہتے ہیں۔“

”نواب صاحب! میں چاہتا ہوں کہ آج رات آپ

میں قیام کریں۔ اتنی رات کو آپ کہاں جا سکتے ہیں؟“ میں نے بتانا بھول گیا کہ حبیب نے مکان کی قیمت پچاس لاکھ روپے لگائی تھی، اس میں موجود سامان بھی وہ بیچنا چاہتا تھا۔ میں نے وہ سامان بھی ایک لاکھ روپے میں خرید لیا تھا۔ مجھے یہ سودا بہت سستا پڑا تھا۔

مجھے ست بدھائی سے اپنا کچھ ضروری سامان لینا تھا، اپنے کپڑے، ہتھیار اور لیپ ٹاپ وغیرہ، پھر سرور اور صوبیدار سبج صاحب کو کچھ ضروری ہدایات دینا تھیں۔ اس لیے میں نے حبیب سے معذرت کرنی اور کہا کہ کل مجھے اسلام آباد میں بہت ضروری کام ہے۔ راجا البتہ ہمیں رہے گا اور یہ تمام قانونی کارروائی پوری کرنے کے بعد ہی لوٹے گا۔

☆☆☆

ہم واپس ست بدھائی پہنچے تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میں غیر شعوری طور پر نور کے کمرے میں چلا گیا اور اسی کے بیڈ پر لیٹ گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے نور میرے پاس آکر بیٹھ گئی ہے۔

وہ مجھے دیکھتے ہی سکون بھرے انداز میں بولی۔ ”کل میری رواگئی ہے اور تمہیں میری اتنی بھی فکر نہیں کہ تم کچھ وقت میرے ساتھ گزار لو۔“

”آپ بھول رہی ہیں میڈم ماہ نور! آپ کی فلاحات کل نہیں بلکہ برسوں ہے۔“

”بارہ بچے کے بعد تاریخ بدل جاتی ہے نواب صاحب!“ نور نے ہماری لہجہ میں کہا۔ ”اب میری فلاحات کل ہی ہوگی۔“

”ابھی تمہاری فلاحات میں چوبیس گھنٹے سے زیادہ کا وقفہ ہے۔ اتنی دیر میں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا اور اسے شانوں سے پکڑنے کی کوشش کی۔

میں اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رک گیا۔ میرے اس انداز پر نور ہلکھلا کر ہنس دی۔ میں نے بہت دن بعد اس کی ہلکھلی ہوئی ہنسی سنی تھی۔ میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے احتیاط سے بیڈ پر لٹا دیا۔

ایسے لمحات ست بدھائی میں ہمیں کسی ہی میسر آتے تھے کیونکہ پہلے تو میں اپنے پکڑوں پھنسا رہا، پھر زخمی ہو گیا۔ اس وقت گویا میرے چاروں طرف رنگ و نور کی برسات ہو رہی تھی۔ نور میرے کانوں میں نہ جانے کیا سرگوشیاں کر رہی تھی لیکن مجھے کچھ سنا ہی نہیں دے رہا تھا۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے دریا میں طغیانی آگئی ہو، سیلاب تھا کہ جسے کام نام نہیں لے رہا تھا بالآخر جب تند و تیز لہروں کا

زور ختم ہوا تو نور کے چہرے پر آسودہ میسر ابھٹ گئی۔ اس نے ہنس کر کہا۔ ”ریشم! آج کی یہ پوری رات میرے نام!“

”منظور ہے جان!“ میں نے کہا۔ ”یوں بھی اب میں تونج رہے ہیں۔“

اچانک باہر سے ریشم کے چنچنے کی آواز آئی۔ میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہاں نور کوئی نہ اس کی مصوٰر کو خوشبو اودھ گویا خواب تھا۔

میں جھنجھلا کر باہر نکلا۔ باہر ریشم اور فنی ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ ریشم پوری قوت سے فنی رہی تھی۔ ”میں تو آج فیصلہ کر لے کہ مجھے رکھے گا یا اس کتے کے پلے کو؟“

”کتے کا وہ معصوم پتا تجھے کیا کہہ رہا ہے؟“ فنی نے کہا۔

”کیا بات ہے ریشم؟“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”کیوں اس وقت دوسروں کی فینڈیں حرام کر رہی ہو؟“

”صاحب جی! پہلے یہ دو شخص کتے لایا تھا تو میں خاموش رہی، اب یہ ایک اور بڑا اٹھالایا ہے۔“

”تم پہلے بھی کب خاموش رہی تھیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بے چارہ بن ماں کا پتا ہے، کسی گاڑی کے نیچے آکر مر جاتا۔ فنی اگر اسے اٹھالایا تو تم اتنا غصہ کیوں کر رہی ہو؟“

”صاحب جی! یہ جب سے آیا ہے، اس بچے کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ اسے بوتل بھر بھر کر دودھ پلا رہا ہے، اس کے لیے اس نے میرے بچے کا گنا گنا کال لیا اور کتے کے نیچے بچھا دیا۔ اسے اپنے بچے کا بھی خیال نہیں ہے۔“

”ریشم!“ میں نے بلند آواز میں کہا۔

”نیل بھی اس ہنگامے سے بیدار ہوئی تھی اور وہاں قریب موجود تھی۔“ جی صاحب جی! ”وہ جلدی سے بولی۔

”اس کتے کے پلے کا دھیان اب تم رکھو گی۔ اسے کب اور کیسے دودھ دیا جائے گا، کیا کھلایا جائے گا۔ یہ سب نہیں فنی سمجھا دے گا اور ہاں، آج کے بعد میرے سارے کام ہی تم کرو گی۔“ میں نے غصے میں کہا۔ مجھے ریشم کے اس بے وقت ہنگامے پر واقعی غصا آ گیا تھا۔

”کیوں صاحب جی؟“ ریشم حواس باختہ ہو کر بولی۔ ”جب تم ایک کتے کے پلے کے لیے اتنا ہنگامہ کر سکتی ہو تو میرے کام بھی اسی بے دلی سے کرتی ہو گی۔ آج کے بعد میرے تمام کام ختم کر دیں گی۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ریشم کے لیے فی الحال یہی سزا کافی تھی۔

دوسرے دن سر پھر تک راجا واپس آ گیا۔ اس نے کوئی کے تمام قانونی معاملات طے کر لیے تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ فوری طور پر کسی مالی کا بندوبست کر دو جو اس کوئی کے لان کی دیکھ بھال کر سکے۔ وہی مالی اس کوئی کا چوکیدار بھی ہوگا۔

”اس کے لیے کوئی بہت زیادہ اعتبار کا بندہ چاہیے۔“ راجا نے کہا۔ ”ہم نے وہ کوئی تقریباً توخرید لی نہیں ہے۔“

اس کا کہنا درست تھا۔

”میں فنی سے کہتا ہوں، وہ ہمیں سے کسی آدمی کو ہاں بھیج دے گا۔“

☆☆☆☆

دوسرے دن علی الصباح راجا میرے پاس آ گیا۔ میں نے جب سے نور کو خواب میں دیکھا تھا، میرا حال تھا۔ وہ نہ جانے کس حال میں تھی؟

”کچھ بڑا!“ راجا نے کہا۔ ”اتنا غم کرے گا تو کام کیسے پلے گا؟“ راجا جانتا ہے ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ وہ کمینہ شاہ جی کسی بھی وقت کوئی اور بھی حرکت کر سکتا ہے۔ ہمیں آج ہی سے اپنے منصوبے پر عمل کرنا ہوگا۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ صبح کا اچالا تیزی سے پھیل رہا تھا اس لیے مجھے اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا جس پر تنیدگی اور فکھ کے تاثرات تھے۔

”ابتدا پھر اس ٹرانسپورٹر آفتاب خان سے کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں، وہ اس شخص شاہ جی کے زیادہ قریب ہے۔“ راجا نے کہا۔ ”یار، ویسے مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ شاہ جی نے ابھی تک ڈاکٹر کی تلاش میں کچھ نہیں کیا؟“

”یہ تو کیسے کہہ سکتا ہے؟“ راجا نے کہا۔ ”وہ در پردہ ڈاکٹر کو تلاش کر رہا ہوگا۔ اسے شاید امید نہیں ہوگی ڈاکٹر کو میں اٹھالایا ہوں ورنہ وہ ست بدھائی تک پولیس لے کر دوڑ پڑتا۔“

”اس خوش فہمی میں رہنا بھی مست!“ راجا نے کہا۔ ”وہ جانتا ہے کہ تیری غولی کی تلاشی آسان کام نہیں ہے۔ وہ ہمارا بندوبست کرنے کے بعد ہی ادھر کا رخ کرے گا۔“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”دیکھ پتر امیر انوخیال ہے کہ اس ڈاکٹر اور دوسرے قیدیوں کو ست بدھائی سے نوری طور پر کہیں منتقل کر

دیا جائے۔

”کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ کام فنی بہت آسانی سے کر لے گا۔ یہ پہلے بھی ایسے کام کرتا رہا ہے۔“ پھر فنی سے بولا۔ ”کیوں فنی! میں فیک کبہا ہوں؟“

”سر، آپ حکم کریں۔ میں ان سب کو ایسے غائب کر دوں گا جیسے وہ بھی اس دنیا میں تھے ہی نہیں۔“ فنی نے کہا۔

”میں انہیں ہمیشہ کے لیے غائب کرنا نہیں چاہتا۔ ان سے بعد میں بھی تو کام پڑ سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بس فوری طور پر انہیں سب برحالی کی حویلی سے منتقل کر دو، یہ خانے میں پرانا سامان اور کاشٹھ کھاڑا بھردو۔ یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ یہ یہ خانہ بھی آباد تھا۔“

”اس کی تو آپ فوری نہ کریں سر!“ فنی نے کہا۔ ”یہ کام آج ہی ہو جائے گا۔“

”یہ کام آج شام تک ہو جانا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”رات میں میں پھر لاہور جانا ہے۔“

”یہ کام تو ابھی دوپہر تک ہو جائے گا۔“ فنی نے کہا۔ ان امور سے فارغ ہو کر میں نے کچھ دیر آرام کیا کیونکہ آج رات مجھے بہت کام کرنا تھا۔ میں نے آفتاب خان کو اٹھانے کا منصوبہ بنالیا تھا۔

”میں جیسے کہ قریب فنی نے بتایا کہ کام ہو گیا ہے۔ تمام قیدیوں کو یہاں سے منتقل کر دیا گیا ہے۔“

”تم لاہور چلنے کی تیاری کرو۔“ میں نے کہا۔ ”صرف سرور اور احمد شاہ کو ساتھ لیں، زیادہ بھیڑ بھڑکی ضرورت نہیں ہے۔“

فنی سر ہلا کر چلا گیا۔ وہ کمرے سے نکل ہی رہا تھا کہ راجا آگیا اور بولا۔

”ٹیکے پتر اتار ہے؟“

”ہاں یارہ میں تیار ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے اپنا ضروری سامان اور کچھ پڑے ایک سوٹ کپڑے میں رکھ لیے ہیں۔ ممکن ہے ہمیں لاہور میں کچھ زیادہ دن لگ جائیں۔“

”یارہ ایک بات کہوں، براہ راست ماننا۔“ راجا نے کہا۔ ”اب تو میں ضرور برامانوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اوسے کو تے دے کھرا کچھ بھی یہ پوچھنے کی ضرورت ہے؟“

”میں یہ کبہر ہا کھرا تو نیم کو بھی لاہور ساتھ لے چلا ا“

”نیم کو؟“ میں نے حیرت سے کہا اور راجا کی شکل

دیکھی کہ کہیں اس کے چہرے پر طرک کوئی تاثر تو نہیں ہے لیکن وہ بالکل سنجیدہ تھا۔

”یارہ وہاں اگر ہمیں دو چار دن بھی رہنا پڑا تو کھانے اور چائے کی ضرورت تو پڑے گی نا! ہم کسی فانیو اسٹار ہو گئے ہیں تو پھر نہ جانیں رہے ہیں۔“ پھر وہ ہنس کر بولا۔ ”ویسے میں آئے سے پہلے کبھی کے مکن میں ضرورت کا تمام سامان ڈال آیا تھا۔ فریج میں بنزیاں، پکچن، دودھ اور کھن سب کچھ بھر دیا تھا۔“

”راجا! اس کام کے لیے تو احمد شاہ بھی برا نہیں ہے، پھر نیم ہی کیوں؟“

”کسی بھی گھر میں عورت ہو تو لوگ کم سے کم شک کرتے ہیں۔ وہ تو ویسے بھی تیری۔“

”بکواس کرے گا تو میرے ہاتھ سے مارا جائے گا۔“ میں نے کہا۔

”یارہ میں اب تجھ سے مذاق بھی نہیں کر سکتا؟“ راجا نے ہنس کر کہا۔ ”ویسے بھی فنی کے کتے کی دیکھ بھال کے لیے اس کی ضرورت تو پڑے گی نا!“

اس نے یوں کہا جیسے وہ کتے کی پٹے کی نہیں فنی کے بچے کی بات کر رہا ہو۔ پھر وہ ہنس کر بولا۔ ”یارہ فنی نے مالی کا بد دوست بھی کر دیا ہے۔ وہ ہمارا ایک گارڈ شوکا ہے۔ نام تو اس کا شوکت ہے لیکن لوگ اسے شوکا کہتے ہیں۔“

”اقتبار کا آدمی ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔ ”ہم وہاں تیر یا شیر کے شکار کو نہیں جا رہے ہیں۔“

”ہم سے بہتر یہ سب کچھ فنی جانتا ہے۔“ راجا نے کہا۔ ”ویسے یارہ، اسی بہانے لاہور میں ایک معقول ٹھکانا ہو گیا ورنہ ہمیں ہوٹلوں میں ٹھہرنا پڑتا تھا۔ اب کم سے کم شرفیظانہ طریقے سے وہاں رہ تو سکیں گے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”تو نیم سے کبہر کو بھی چلنے کی تیاری کرے۔“

”راجا! کیا تو سنجیدہ ہے؟“

”ہاں بھئی۔“ راجا نے کہا۔ ”نیم پہلے بھی اس قسم کے واقعات سے نمٹتی آئی ہے۔ اس کا باپ بھی کوئی نیک نام آدمی نہیں تھا۔ وہ بہت کام آئے گی۔“

راجا کے جانے کے بعد میں نے نیم کو بلوایا تو رستم آگئی اور روتے ہوئے بولی۔ ”صاحب جی! آپ مجھ سے ناراض ہیں؟“

”ہاں بھئی۔“ راجا نے کہا۔ ”نیم پہلے بھی اس قسم کے واقعات سے نمٹتی آئی ہے۔ اس کا باپ بھی کوئی نیک نام آدمی نہیں تھا۔ وہ بہت کام آئے گی۔“

راجا کے جانے کے بعد میں نے نیم کو بلوایا تو رستم آگئی اور روتے ہوئے بولی۔ ”صاحب جی! آپ مجھ سے ناراض ہیں؟“

”ہاں بھئی۔“ راجا نے کہا۔ ”نیم پہلے بھی اس قسم کے واقعات سے نمٹتی آئی ہے۔ اس کا باپ بھی کوئی نیک نام آدمی نہیں تھا۔ وہ بہت کام آئے گی۔“

راجا کے جانے کے بعد میں نے نیم کو بلوایا تو رستم آگئی اور روتے ہوئے بولی۔ ”صاحب جی! آپ مجھ سے ناراض ہیں؟“

”ہاں بھئی۔“ راجا نے کہا۔ ”نیم پہلے بھی اس قسم کے واقعات سے نمٹتی آئی ہے۔ اس کا باپ بھی کوئی نیک نام آدمی نہیں تھا۔ وہ بہت کام آئے گی۔“

راجا کے جانے کے بعد میں نے نیم کو بلوایا تو رستم آگئی اور روتے ہوئے بولی۔ ”صاحب جی! آپ مجھ سے ناراض ہیں؟“

”ہاں بھئی۔“ راجا نے کہا۔ ”نیم پہلے بھی اس قسم کے واقعات سے نمٹتی آئی ہے۔ اس کا باپ بھی کوئی نیک نام آدمی نہیں تھا۔ وہ بہت کام آئے گی۔“

بھال شاہ کے بارے میں بہت سی روایات مشہور تھیں۔ کچھ لوگ انہیں ایک خدا رسیدہ آدمی سمجھتے تھے جس نے دولت کی ریل کیل کے باوجود تیشا سے کنارہ کر رکھا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ شاہ صاحب کی جیتیں خالی ہو چکی ہیں۔ صرف حویلی باقی رہ گئی ہے اور محض اپنا بھرم رکھنے کے لیے انہوں نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ نادرہ نیم کی موت کے بعد شاہ

صاحب کا دنیا سے دل اجاٹ ہو گیا ہے اور اسی لیے انہوں نے حویلی میں گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ غرض جتنے مذاقی ہی باتیں۔ حقیقت بس اتنی ہی تھی کہ شاہ صاحب فلرنا بہت بچوس انسان تھے۔ نادرہ نیم کی زندگی میں تو ان کی ایک نہ پلٹی تھی۔ وہ ٹھہریں خاندانی رئیس، وطن، دولت میں مبتلا ہوئی اور شاہ صاحب

نادرہ نیم کی زندگی میں شاہ صاحب اکثر ان بنگاموں

خیرخواہ

ایم اے راحت

کبھی کبھی کسی چیز کی محرومی انسان کی کمزوری دہتے دہتے طاقت بن جاتی ہے۔ بشرطیکہ اسے کمزوری چھپانے کا فن آتا ہو۔ ایسا ہی ایک موقع زندگی نے اسے بھی دیا مگر... جب وہ درے سے آفتاب بنا تو رو شمنی پھیلانے کے بجائے اس نے تیش کا احساس بڑھا دیا۔ جس میں خود اس کی شخصیت جل کر خاکستر ہو گئی... ایسے میں کوئی اس کا خیر خواہ کیسے بن سکتا تھا۔

ہوشیاری کے رستے پر چلتے چلتے بے وقوفی کی راہ پٹانے والوں کا قصہ



بہ بیویچ و سنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

پر جھپٹایا کرتے جو نادرہ بیگم کے دم سے تھے۔ چار ملازم، شاگرد پیشہ، ان کے بال بچے، موت زندگی، شادی بیاہ، ملازموں کے ان سارے مسائل میں نادرہ بیگم برابر کی شریک رہیں۔ میراٹھیں، بھانڈا اور نقال بڑے مان سے آتے اور ٹیکڑوں روپے بطور انعام لے کر جاتے۔ ان میل قماشوں سے نادرہ بیگم بہت خوش ہوئیں اور شاہ صاحب دل ہی دل میں جلتے جلتے رہتے۔ بھی بھی جب یہ سب کچھ ان کی برداشت سے باہر ہو جاتا تو وہ صحت پڑتے۔

”یہ حویلی ہے یا کسی لٹکے کا منڈھوا؟ ہر وقت یہاں نت نئے ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ میں یہ سب کچھ قطعاً برداشت نہیں کر سکتا۔“

نادرہ بیگم پہلے تو خاموشی سے ان کا مگر جتنا برداشت کرتیں پھر پیار سے کہیں۔ ”شاہ جی! پھر تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں؟ اللہ نے اولاد دھارے مقدر میں ہی نہیں لکھی۔ اس کے لیے میں نہ تمہیں دوش دیتی ہوں، نہ اپنے آپ کو۔ اولاد ہوتی تو گھر میں قلعہ گریاں گونجتیں۔ مصروفیت ہوتی تو دل ان چھنگلوں کو ہرگز نہ چاہتا۔ یہ سارے کھیزے نہ پھیلاؤں تو زندہ کیسے رہوں؟ اجنبی سے دل بھلا لیتی ہوں اور پھر یہ نوکر بھی بھلا کس کا منہ دیکھیں۔ ہم ان کا خیال نہیں رکھیں گے تو بھلا اور کون رکھے گا؟“

”اٹا دو، سب کچھ ان پر لٹا دو۔ بڑھاپا نہ جانے کتنا طویل ہوگا؟ جب ہمارے ہاتھ خالی ہو جائیں گے تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوگا۔ سارا نشہ ہرن ہو جائے گا۔ کس کے آگے ہاتھ پھیلاؤ گی، دنیا مذاق اڑائے گی کہ کل کیا تھا۔ آج کیا ہو گی؟“

”جو کل تھا۔ وہ آج نہیں ہے اور جو آج ہے وہ کل نہ ہوگا۔ شاہ جی، پھر کل کی پروا کیوں کی جائے؟“

”گمیا میری بات نہیں مانو گی اور دولت پوچھنی لگاتی رہو گی؟“

”مٹا کچھ ہے، کرو گے کیا اس کا؟ ساری عمر لڑتے رہو گے تو بھی کم نہ ہوگا۔ کیوں مرے جاتے ہو؟“

”کس کے لیے مر رہا ہوں۔ کل جب ہاتھ پاؤں نہیں ملیں گے تو..... تو.....؟“

”بھالے احم حد سے بڑھ رہے ہو۔“ نادرہ بیگم نے منہ سے یہ جملہ نکالا تو اس جملے کے بعد شاہ صاحب کے ہونٹ سل جاتے، گردن لٹک جاتی اور پھر وہ جھکے جھکے قدموں سے واپس لوٹ جاتے۔ بڑی سے بڑی لڑائی ہو جاتی۔ شاہ جی جنوں میں کیا کچھ نہ کہہ دیتے لیکن نادرہ بیگم کے منہ سے جب لفظ ”بھالے“ نکلا، لڑائی کا اختتام ہو جاتا۔ شاہ صاحب کی ہانگوں کی جان لٹک جاتی۔ ان کا دل چاہتا کہ وہ وہیں بیٹھ جائیں۔ بڑی مشکل سے وہ اپنے کمرے تک پہنچ پاتے تھے۔

اس ایک لفظ ”بھالے“ کے کوزے میں پورا سمندر بند تھا۔ ایک ایسی کہانی جس سے شاہ صاحب کی زندگی کے تار بندھے ہوئے تھے۔ یہ لفظ ان کے لیے ایک دقتی بم تھا جو ان کے کان کے قریب پھٹتا تھا اور ان کا سارا وجود زخموں سے چور ہو جاتا تھا۔ ان کا دل اتنی تیزی سے دھڑکتا جیسے سینے کے پتھر سے کوئلہ ڈگر باہر نکل آئے گا۔ وہ خوف سے کانپتے تھے اور ان کی آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیل جاتی۔ موت کا سیاہ پھندا انہیں اپنے حلق پر تنگ ہوتا محسوس ہوتا اور ان تمام کیفیات کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہ ”بھالے“ ہی تھے۔

ہاں! وہ بھال شاہ نہیں بلکہ بھالا ہی تھے، چودھری نواز کے ذرا نیچر۔ بک ٹیک کے اچھے، سٹول اور چوڑے چپکے سینے کے مالک جبکہ چودھری نواز تاروں کے پنے ہوئے چودھری تھے۔ دھان پان بدن، تیز ہوا سے نزلے بخار میں جتنا ہو جانے والے۔ میٹا لباس دیکھ کر بتا کر پڑ جانے والے۔ سبکی وجہ تھی کہ نادرہ بیگم کو ایک آنکھ نہ بھاتے۔ کوئی بات تو ہوتی مردوں کی ہی۔ وہ اس وقت تک کڑھتی رہیں جب تک بھال ذرا نیچر بن کر نہ آگیا۔ بھالا، نادرہ بیگم کے من کو بھا گیا تھا۔ اسے دیکھ کر ان کے خشک ہونٹوں پر سرگرمی لوٹ آئی تھی اور بھالے کے دن پھر گئے۔ کھد کر کا کرت اور گارڈرے کا پاجاما، پوکلی کے کرتے اور سفید براق لباس میں بدل گئے۔ لکھنؤ کے محل کے کرتے بڑی چاہ سے منگوائے۔ گھر اور بھالے کے کڑیل بدن کی لذت بن گئے۔ آنکھوں میں سرمد اور ہونٹوں پر پان کی دھڑکی بجائے جب وہ نادرہ کے سامنے سے گزرتے تو ان کی آنکھوں میں قد ملیں روشن ہو جاتیں۔

چودھری نواز، چودھری تھے اور سب کچھ دیکھ رہے تھے اور پھر جب ایک روز ضرورت سے نادرہ کو دیکھ لیا تو دوبارہ پر آؤں اور ان کو وارنٹ کر بھالے کی گردن پر ایک وار کیا۔ کامیاب ہو جاتے تو گردن ہی اتر جاتی۔ ایک ماہ اسپتال میں رہا اور نادرہ بیگم نے دن رات ایک کر دیا۔ اب وہ محل کر آئی تھیں۔ چچا جی جیل جاب کے مقابلے میں ہجرت بچاؤ

مشکل ہوئی تھی چودھری صاحب کو۔ بتا کر پڑ گئے اور ایک تار یک اور سردرات، جب دم ٹپنے سے آنکھ کھلی تو بھالے اور نادرہ بیگم سر پر موجود تھے اور ان کی گردن بھالے کے چوڑے ہاتھوں کے گھٹنے میں دبی ہوئی تھی۔

ان کی نازک گردن بھلا اس گرفت کی تاب کہاں سے لاتی؟ مٹھی سا بدن تڑپا اور پھر ساکت ہو گیا۔ بناری کا سہارا لے کر موت کا اعلان کر دیا گیا اور پھر بڑے تڑک و احتشام سے تدفین بھی ہوئی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ اصل واقعہ کیا تھا لیکن دونوں کے دلوں میں چور تھا۔ ساری دنیا کی نگاہیں مشتبہ محسوس ہوتی تھیں۔ لوگوں کو دکھانے کے لیے ایک دوسرے سے دور ہی دور رہتے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں دونوں نے محسوس کیا کہ اس حویلی میں وہ سکون سے نہیں بیٹھ سکتیں گے۔ اس کے علاوہ نادرہ بیگم اگر ایک ذرا نیچر سے نکاح کر لیں تو دنیا کی نگاہیں انہیں کی۔ لوگ سوچیں گے اور ممکن ہے کہ کسی کی سوچ گہرائی اختیار کر جائے۔ چنانچہ دونوں نے فیصلہ کیا کہ یہ جگہ ہی چھوڑ دی جائے اور کسی اجنبی کو شے میں پناہ لی جائے۔

نادرہ بیگم بیوی کا سوگ مناری تھیں۔ پروگرام کے تحت انہوں نے لوگوں کے سامنے وادیا شروع کر دیا کہ چودھری صاحب کے بغیر یہ حویلی کاٹنے کو دوڑتی ہے اور اب وہ انہیں اور جا کر رہیں گی۔ ہمدردوں نے بہت دلا سے دیے لیکن نادرہ بیگم نے کسی کی نہ سنی۔ چاند اور رخت کر دی گئی اور ساری دولت اکٹھی کرنے کے بعد ایک دن نادرہ بیگم چل دیں۔ بھالا بھی ساتھ تھا لیکن بظاہر وہ بھی دوسرے ملازموں کی طرح علیحدہ کر دیا گیا اور اس نے سفر بھی نادرہ بیگم کے ساتھ نہ کیا۔

پھر جب دونوں اس جگہ سے اتنی دور نکل آئے کہ کسی شاسا کا شہر تک نہ رہا تو دونوں بیکار ہو گئے۔ نادرہ بیگم نے بھالے سے نکاح کر لیا۔ وہ حویلیوں کی عادی تھیں چنانچہ ملک کے ایک دور افتادہ علاقے میں ایک حویلی خریدی اور دونوں مہاں ہوئی اس میں قیام ہو گئے۔

خاصی زندگی سکون سے گزر گئی تھی۔ بھالا اب بھال شاہ بن گیا تھا اور لوگ اسے اسی نام سے جانتے تھے۔ دونوں کی زندگی میں کوئی خوشگوار تبدیلی نہیں آئی تھی اور حویلی اسی طرح خاموش تھی۔ بس اس خاموشی میں بھی بھلا اس وقت شکار پڑ جاتا۔ جب کسی ملازم کے ہاں بچہ پیدا ہوتا یا کسی بیٹی یا بیٹے کی شادی ہوتی۔ نادرہ بیگم خوب خوشیاں منا تیں۔ ناچ گانا ہوتا اور خوب رنگ بنتا۔ اس کے بعد پھر وہی خاموشی۔ بھال شاہ کو یہ ہنگامہ بالکل پسند نہیں تھا۔ انہوں نے

زندگی میں تنگ دقتی اور حسرت دیکھی تھی اور جب دولت ملی تو وہ اس خوف کا شکار ہوئے کہ کہیں یہ سب کچھ ختم نہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ دل کا چور بھی ابھرا آتا تھا اور اس وقت ان کی حالت بری ہو جاتی تھی جب نادرہ بیگم انہیں غصے میں ”بھالا“ کہہ کر غائب کر دیتیں۔ انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے ان کی گردن چودھری نواز کے گھٹنے میں ہے اور اس پر ان کی گرفت تنگ ہوتی جا رہی ہے۔

لیکن ہر روز کی دوا ضرور ہوتی ہے۔ بالآخر بھال شاہ اس خوف سے آزاد ہو گئے۔ اچانک نادرہ بیگم کا پتا خراب ہو گیا۔ کئی بار شدید درد اٹھا اور آخر کار یہ درد جان لیوا ثابت ہوا اور وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو گئیں۔ شاہ صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کے دل سے ایک عظیم بوجھ اتر گیا ہو۔ اب حویلی پر صرف ان کی سکرانی تھی۔ اب وہ اس دولت کے تنہا مالک تھے۔ لیکن وہ دولت کو خرچ کرنے کے قائل نہ تھے۔ دولت خرچ ہو جائے تو پھر انسان دولت مند کہاں رہتا ہے؟ انہوں نے ایک ایک کر کے تمام ملازمین کو نکال دیا۔ تمام فالتو اخراجات بھی بند کر دیے۔ تنہا ذات تھی۔

کھانے پینے کے لیے بھی کوئی خاص چیزوں کی ضرورت نہ تھی۔ کوئی اور مصروفیت نہیں تھی۔ چھوٹے سے باغ کو سنوارتے، اپنا کھانا خود پکاتے اور اس کے بعد بھی کافی وقت بچ جاتا لیکن اس فالتو وقت کو بھی وہ تنہا گزارنا پسند کرتے۔ دوستوں کا مجبوت انہیں پسند نہیں تھا کیونکہ اس میں بھی روپے کے خرچ ہونے کا ڈر تھا۔

کچھ مدت کے بعد کتابیں پڑھنے کا شوق ہوا اور بازار سے پرانی کتابیں خرید لائے لیکن یہ بھی بیسیوں کا زیاں تھا۔ اس لیے ڈائری لکھنے کا شوق ہوا۔ ڈائری لکھتے بیٹھے تو سوچا کہ کیا لکھا جائے؟ دنیا سے اس قدر دور ہو چکے تھے کہ اب کسی سے ملاقات کا کوئی امکان نہیں تھا۔ چنانچہ ذہن میں یہ بات سا گئی کہ خود اپنی کتاب لکھی جائے اور اپنی کہانی میں نادرہ بیگم کے ذکر کے سوا اور کیا تھا۔

ابتدائی زندگی تو مصائب کا شکار تھی چنانچہ مصائب کا اعتنا ہو جاتا تو نادرہ بیگم کا ذکر آیا اور نادرہ بیگم کے تذکرے کے ساتھ چودھری نواز کے نام کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لہذا اپنے جرم کو انہوں نے الفاظ کی قفل دے دی۔ چودھری نواز کو قتل کرنے کے اعتراف کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے اس خوف کا اعتراف بھی کیا جس نے انہیں وقت سے پہلے یوزر حاکم کر دیا تھا۔

ڈائری میں اپنی زندگی کے حالات بلام وکاست لکھ کر

ہوں لیکن یقین کریں کہ مجھے شادی کی قطعاً خواہش نہیں اور نہ ہی باورچی یا چوکیدار کی ضرورت ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ، براہ کرم اب جائے۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“

”اے، کوہا بد ہوئی بد اخلاقی کی۔ میں تو کیا چڑیلے کر آیا تھا اور آپ کس طرح اس کی پذیرائی کر رہے ہیں، لاجول ولاقوت۔ خدا کی بد اخلاقی پر وی سے واسطہ نہ ڈالے۔ ماہاں بد اخلاقی پر وی کے تو پردوں میں رہتا بھی گناہ ہے۔ میں فوراً یہ مکان بدل لوں گا۔ لاجول ولاقوت۔“

محس الدین اٹھ کھڑے ہوئے، پھر شاہ صاحب کو سمجھوتے ہوئے باہر نکل گئے اور شاہ صاحب سر جڑ کر بیٹھ گئے۔

بہر حال اس کے بعد محس الدین نہ آئے۔ البتہ شاہ صاحب کو اپنی ڈائری کے لیے ایک دلچسپ واقعہ ضرور مل گیا۔

زندگی کے روز و شب اسی یکسانیت سے گزرتے رہے لیکن ایک..... صبح جب شاہ صاحب جاگے تو انہیں اپنے کمر اخلاص میں کچھ تھریلی محسوس ہوئی۔ دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ وہ سراپید سے ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ کئی چیزیں غائب تھیں، الماری کھلی ہوئی تھی۔ وہ دیوانہ وار دوسرے کمرے کی طرف بھاگے لیکن چوری ہمت دوسرے کمروں میں جانے کی نہیں ہوئی تھی اور وہ اسی کمرے تک محدود رہا تھا۔ شاہ صاحب کے حواس ساتھ چھوڑنے لگے۔ وہ اس جیتی سامان کی کشمکش پر پریشانی میں تھک چکا تھا؟ کیا پولیس کو اطلاع دیں؟ لیکن پولیس کے نام سے ہی ان کی روح کا نینٹ تھی۔ یہ لوگ ہال کی کمال اتارنے کے ماہر ہوتے ہیں اور انہوں نے ہال کی کمال نکال لی تو؟

وہ شام تک رنج و غم میں ڈوبے رہے اور خود کو تسلیاں دیتے رہے لیکن رات کو اس وقت ان کا سکون ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا جب وہ چوری کا واقعہ ڈائری میں درج کرنے بیٹھے۔ ڈائری اپنی جگہ پر موجود نہیں تھی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیل گئی۔ وہ ڈائری..... وہ ڈائری تو ان کے لیے موت کا پھندا بن سکتی ہے۔ اس میں تو..... اسی میں تو..... ان کے تمام راز محفوظ ہیں۔ ”اب کیا ہوگا؟“

رات بھر وہ ایک جگہ بیٹھے رہے۔ نیند کا آنکھوں میں شائبہ تک نہ تھا۔ پوری رات پریشان رہے، کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس وقت کوئی بھر کر کوس رہے تھے جب ڈائری لکھنے کا خیال دل میں آیا تھا۔ خود ہی اپنے ہاتھوں چمائی کا تختہ تیار کیا تھا۔ آہ، اب کیا ہوگا؟ لیکن اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ زندگی کو ایک اور دوگ لگا بیٹھے تھے لیکن

کمان سے نکلے تیر واپس نہیں آتے۔ تین چار منٹ گزر گئے۔ گزرتے وقت کے ساتھ اضطراب کی حد تک کم ہونے لگا تھا لیکن ایک شام تھک لگی آیا۔

چوڑے چنگے بدن کا ایک خوش پوش نوجوان سرگین پیتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ شاہ صاحب پر آمدے میں نکل آئے اور اس کے قریب آنے کا انکار کرنے لگے۔

”میں جمال شاہ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔“ نوجوان نے کہا۔ شکل سے وہ خطرناک آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ”کیوں ملنا چاہتے ہو؟“ شاہ صاحب نے پوچھا۔ ”ایک ذاتی کام ہے۔“

”میرا ہی نام جمال شاہ ہے، کام بتاؤ؟“ ”واہ، شاہ صاحب! آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، بہت حیرت ہے میں آپ کے۔ کیا آپ مجھے اندر آنے کے لیے نہیں کہیں گے؟“

”نہیں۔“ شاہ صاحب بولے۔

”آپ کی مرضی، دیے میں ایک ضروری کام سے آیا تھا۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا تم لوگ اس طرح مندا مہائے کیوں پہلے آتے ہو، کیا کام ہے مجھ سے؟“ شاہ صاحب جھنجھلا گئے۔

”آپ کی ایک امانت تھی میرے پاس۔“ نوجوان نے کہا اور جب میں ہاتھ ڈال کر شاہ صاحب کی ڈائری نکال لی۔ شاہ صاحب اچھل پڑے۔ ”خوب! تو تم ہو وہ چور جس نے میرے گھر میں چوری کی تھی۔ لاؤ ادھر لاؤ یہ ڈائری، میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“

”چوری.....؟“ نوجوان ہنس پڑا۔ ”نہیں شاہ صاحب! میں چوری جیسے گھٹیا کام نہیں کرتا، پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ عزت سے حق حلال کی کھاتا ہوں۔ چوری تو وہ کرتے ہیں جو دنیا میں اور کچھ نہیں کر سکتے۔“

”اگر یہ بات ہے، تو تم نے ضرور اس چور کو پکڑ لیا ہوگا جس نے میرے گھر سے یہ ڈائری اور دوسری بہت سی چیزیں چرائی ہیں۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں، تم نے میرے اوپر بڑا احسان کیا ہے۔ لاؤ براہ کرم یہ ڈائری مجھے دے دو۔“

”بے مہربانی! اچھی چیز نہیں ہوتی شاہ صاحب! آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ میں آپ تک کس طرح پہنچ گیا؟“ وہ مسکرا کر بولا۔

”ہاں۔ یہ بھی درست ہے خیر اب بتا دو۔“ شاہ صاحب بولے۔

”تمہارے کہا تھا ہاں کہ پڑھا لکھا آدمی ہوں، یہ ڈائری پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ یہ آپ کی ہے۔“

”اوہ..... اچھا اچھا..... ہاں..... ایسا.....؟“

اجا تک شاہ صاحب کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ان کے حلق میں جیسے کوئی شے انگ گئی۔ ”ڈائری پڑھ کر.....؟“ ان کے منہ سے یہ مشکل تمام نکلا۔

”جی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ لیکن اب شاہ صاحب کی زبان بند ہو گئی تھی۔ اس نوجوان نے ڈائری پڑھ لی ہے۔ وہ ان کے جرم سے واقف ہو گیا ہے۔ وہ ان کی، یعنی جمال شاہ کی اصلیت سے واقف ہو چکا ہے۔ وہ خوفزدہ نکلا ہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ”بہت دلچسپ اور اچھی تحریر ہے شاہ صاحب آپ کی۔“ اس نے کہا۔

اور جمال شاہ کے کان میں جیسے بارہ جیم کی آواز ابھری۔ ”جھالے۔“ اور وہ ہم گئے۔

”مگر کون ہو؟“

”میرا حلق پولیس سے ہے۔ سادہ لباس میں آیا ہوں آپ کے پاس۔“

”پولیس۔“ شاہ صاحب کا بدن کانپنے لگا۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے چمائی کا پھندا ان کی گردن کے گرد لٹک رہا ہو جا رہا ہو۔

”نہیں شاہ صاحب! پولیس سے میرا حلق نہیں ہے، یہ تو میں نے جو بھی لکھن ملیج کے لیے کہا تھا۔“ وہ شاہ صاحب سے چوہے ملی کا ٹھیکر اٹھ رہا تھا۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھتے رہے۔ ”میں درست کہہ رہا ہوں شاہ صاحب! پولیس سے میرا کوئی حلق نہیں ہے اور نہ میں وہ چور ہوں جس نے آپ کے ہاں چوری کی ہے، میں تو ایک شریف آدمی ہوں۔ چلن روڈ، مکان نمبر بارہ میں رہتا ہوں۔ طویل مرمے سے بے کار ہوں، کوئی روزگار ہی نہیں تھا۔ بھلا ہوا اس چور کا جس نے آپ کے ہاں چوری کر کے یہ ڈائری بیکار سمجھ کر چھینک دی اور میں نے دیکھا کہ ایک صاف ستھری چیز پڑی ہے، تو اسے اٹھا لیا، لیکن جوں ہی میں نے اسے پڑھا میری لائری نکل آئی۔“

”کیا لکل آیا؟“ شاہ صاحب نے بے اختیار سوال کیا۔

”لائری۔“ وقیفہ مقرر ہو گیا سرکار کی طرف سے۔ ”سرف پندہ ہزار دے، ماہوار، ملکی میرا خرچہ ہے۔ ہال بچے تو ہیں نہیں کہ زیادہ لالچ ہو۔ مہنگائی آسمان سے ہاتھیں کر رہی ہے لیکن خیر گزارہ کر لوں گا۔ جی سرکار تو میری کھلی قسطا

”تم بلیک میل ہو؟“ شاہ صاحب نے نہایت حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

”ویر میں کچھ شاہ صاحب! جی ہاں یہی بات ہے لیکن خون خراب نہیں ہے۔ میں حق حلال کی کھاتا ہوں۔ دیکھیے ہاں، میں آپ سے پچاس ہزار ایک لاکھ کا مطالبہ بھی کر سکتا تھا اور آپ کے جیسے آدمی کے لیے یہ مشکل بھی نہ تھا کیونکہ چودھری نوازی دولت اتنی معمولی بھی نہیں تھی کہ وہ آدمی اسے ختم کر سکے اور اب تو آپ تنہا رہ گئے ہیں لیکن میں کسی کو دکھ نہیں دے سکتا، آئوٹ نکل آتے ہیں میرے کسی کو تکلیف میں دیکھ کر۔“ اس نے جیب سے رومال نکالا اور آنکھیں صاف کرنے لگا۔

”مذاقی اڑا رہے ہو میرا۔“ شاہ صاحب مضحل لہجے میں بولے۔

”کیا کروں، دل کمزور ہے۔ ہاں تو سرکار، پہلی قسط ابھی مل جانی چاہیے۔“

”تم یقین کر دو میرے پاس اب کچھ نہیں ہے۔ بس سا کچھ قلم رکھے ہوئے ہوں اس لیے لوگوں کو بھی نکال دیا ہے، گھر کے سارے کام خود ہی کرتا ہوں، کبھی سے ملتا بھی اسی لیے نہیں ہوں۔ میں ہر ماہ اتنی رقم کہاں سے دوں گا۔“

خواتین حضرات گھر بیٹھے اخلاص

انگلش ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن
ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن
ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن
ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن
ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن
ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن
ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن
ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن
ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن
ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن	ایجوکیشن

اسلام آباد ایکسپریس

1237

2011

”شاہ صاحب ایسا باتیں نہ کریں۔ بہت غمزدہ ہوں میں اس وقت، ویسے میری طرف سے مبارک باوقول کریں کہ یہ ڈائری کسی پولیس والے کے ہاتھ نہیں گئی ورنہ کیا ہوتا؟ ذرا سوچیں تو سہی، رسوائی، ذلت اور پھر موت، خوفناک موت..... اور شاہ صاحب، پندرہ ہزار روپے تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ آپ لاکھوں روپے خرچ کر کے بھی اپنی جان نہیں بچا سکتے تھے۔“

”مگر..... میں..... میں یہ رقم کہاں سے دوں گا؟“

شاہ صاحب روپے دے والے انداز میں بولے۔

”آپ کی مرضی شاہ صاحب! میں نے تو آپ کے ساتھ بڑی رعایت برتی ہے اب آپ نہیں مانتے تو ٹھیک ہے۔ میں یہ ڈائری پولیس میں گوارا نہیں دے دیتا ہوں۔“

”ارے نہیں، نہیں۔“ شاہ صاحب کی آواز کانپنے لگی۔

”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے شاہ صاحب۔ آپ فیصلہ کریں، میں چلتا ہوں۔“

اب اس کا لہجہ کسی قدر سرد تھا۔ شاہ صاحب سوچ میں ڈوب گئے۔ رندھی ہوئی آواز میں بولے۔ ”ٹھیک ہے، کسی سے ادھار لے لوں گا۔ مگر کا پتا دے دو، پہنچا دوں گا۔“

”بعد شوق، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ خوشی سے آئیں بلکہ اپنے ساتھ کسی اور کو بھی لانا چاہیں تو لے آئیں لیکن اگر آپ نے میرے ساتھ کوئی گڑبڑ کی تو میں ایسے انتقامات ہر طرح سے کروں گا کہ ڈائری تھانے پہنچ جائے۔“

”نہیں نہیں، میں کیا گڑبڑ کروں گا۔ تم بے فکر رہو۔ میں پیسے پہنچا دوں گا۔“

”برہمنیہ کی پہلی تاریخ کو۔ اگر رقم ملنے میں دیر ہوئی تو.....“ وہ خوفناک انداز میں مسکرایا اور شاہ صاحب گردن ہلانے لگے۔

”میرا پتا لکھ لیں۔“ اس نے پتا لکھوایا اور شاہ صاحب نے گردن ہلا دی۔ ”کب آ رہے ہیں؟“

”کل بارہ بجے۔“

”میں انتظار کروں گا۔“ وہ جانے کے لیے مڑا اور چند ساعت کے بعد گاڑیوں سے اوجھل ہو گیا۔

اس سے پہلے بھی اتنا بد وقت نہیں پڑا تھا۔ جوانی ہوتی تو نہ لے لیتے نہ جنت سے لیکن اب ان کروڑ ہڈیوں سے کسی کا کیا پاؤ لیتے کیا ضرورت تھی ڈائری لکھنے کی۔ مصیبت تو خود انہوں نے بلائی تھی۔ وہ خود کو کون سے گئے لیکن اب کیا ہو سکتا

تھا۔ آہ..... پندرہ ہزار روپے ماہوار؟ تاروہ جنگ کے بعد تو خرچ ہی نہ رہا تھا۔ مگر اب.....؟ وہ سر ہٹ کر بیٹھ گئے اور وہیں بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی کوئی راہ نہ تھی، کوئی ٹیل نہ تھی۔ دینے ہی پڑیں گے۔ زندگی اور عزت بچانے کے لیے پندرہ ہزار روپے سینے کا غم سہنا ہی پڑے گا۔

حوالی کے ایک ہارک کمرے میں پہنچ کر ایک = خانے میں ٹھہری ہوئی تجوری سے انہوں نے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور دھندلائی ہوئی آنکھوں اور کانپتی انگلیوں سے پندرہ ہزار روپے کے نوٹ گنے اور جیب میں ٹھونس لیے۔ تجوری گڈیوں سے بھری ہوئی تھی۔ کروڑوں روپے کی مالیت کے زیورات ملے تھے۔ انہوں نے انہیں نولا اور دل کو کچھ تقویت پہنچی جب وہ تجوری بند کر کے واپس پلٹ آئے لیکن غم سے نہ حال تھے۔ اب جب تک زندہ ہیں پندرہ ہزار روپے ماہوار دینا ہوں گے۔ ”ہائے یہ کیا ہو گیا۔“

دوسرے دن گیارہ بجے حوالی سے نکل آئے۔ ایسے راستے اختیار کیے جہاں شاہ صاحب نے آئیں اور چکن روڈ پر پہنچ گئے۔ پیدل سفر کیا تھا۔ اس لیے تھکے تھکے بارہ بج گئے۔ مکان نمبر بارہ کے دروازے پر دستک دی اور وہ دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

”ارے شاہ صاحب! ابھی وقت کی پابندی میں تو انگریزوں کو بھی مات کر دیا آپ نے۔ لے آئے؟“

”ہاں، بڑی مشکل سے قرض ملے ہیں۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولے۔

”یہ مشکل تو اب آپ کو ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو پیش آئے گی شاہ صاحب ورنہ دوسری صورت میں آپ ”بجلا“ کہلا سکتے۔ بلکہ تھوڑے دن کے بعد ”مردم بھلا“ کہلا سکتے۔ لائے رقم کہاں سے؟“

بھال شاہ نے نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھا دیے۔ اس نے نوٹ گنے اور جیب میں ٹھونسے ہوئے بولا۔

”کیا کروں شاہ صاحب بتا چکا ہوں کہ گھر میں میرے سوا کوئی نہیں ہے اس لیے جانے وغیرہ نہیں پاسکتا۔“

شاہ صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا اور واپس چل پڑے۔

اس وقت وہ بہت اداس تھے لیکن کیا کرتے، یہ اداسی تو مقدر میں چکی تھی اور مقدر کی اس خرابی کو وہ کسی طرح دور نہیں کر سکتے تھے۔ ہر ماہ پندرہ ہزار روپے اس کے حوالے کر آتے تھے۔ کئی مہینے گزر گئے، اس غم سے شاہ صاحب کی صحت کچھ اور خراب تر ہو گئی تھی۔

ایک دن وہ بازار سے خریداری کر رہے تھے کہ شمس الدین نظر آئے۔ شاہ صاحب کو دیکھ کر انہوں نے منہ پھیر لیا لیکن شاہ صاحب کے دل میں تجانیہ کیا آئی کہ چہرہ روشن ہو گیا۔ برسوں کے بعد کھوئی ہوئی مسکراہٹ لوٹ آئی اور وہ شمس الدین کے پاس چلے گئے۔ ”ارے شمس الدین صاحب! آپ میں پہچانے نہیں؟“

”نہ پہچانے کی کیا بات ہے، آپ کے سلوک کو بھول سکتا ہوں کبھی؟“ شمس الدین نے منہ بنا تے ہوئے کہا۔

”کیا بتاؤں، شمس الدین صاحب! میں ان دنوں بیمار تھا۔ طبیعت بڑ بڑی ہو رہی تھی۔ مگر جب آپ چلے گئے تو مجھے بڑی شرمندگی ہوئی۔“ شاہ صاحب بولے۔

”مگر اب کیا ہو سکتا ہے شاہ صاحب! میری بیٹی کی شادی ہو گئی ہے۔“

”لا حول ولاقوة۔“ شمس الدین صاحب ہمیں آپ کی بیٹی سے کوئی دیکھ نہیں ہے بلکہ بہت اچھا ہوا کہ آپ نے اس کی شادی کر دی۔“

”چند کداری ضرورت ہوگی؟“

”ہرگز نہیں۔“ وہ بولے۔

”تو پھر باورچی کا کام دو گے۔ آخر بات کیا ہے؟“

شمس الدین التفات کا راز جاننے کے لیے بے چین تھے۔

”دیکھو شمس الدین! کیا آپ نے ہمارا پڑوس چھوڑ دیا؟“

”نہیں، کوئی مکان ہی نہیں ملا، مجبوری تھی۔“

”اور یہ اچھا ہی ہوا۔ ورنہ ہم آپ کو کہاں سماش کرتے؟“

”لیکن خادموں کی ضرورت کیوں پیش آئی شاہ صاحب؟“ شمس الدین نے بے چین ہو کر سوال کیا۔

”بس کچھ کام ہے، لیکن آپ کو ہمارے ساتھ ہر چلنا ہوگا۔“ شاہ صاحب نے کہا اور تھوڑی سی پس و پیش کے بعد شمس الدین راضی ہو گئے۔ شاہ صاحب انہیں اپنے ساتھ حوالی لے آئے۔ اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر شمس الدین صاحب کو پیلائی اور پھر مطلب کی بات پر آ گئے۔

”بات یہ ہے شمس الدین صاحب! کہ اس علاقے میں آپ کے علاوہ ہمارا کوئی شماسا کوئی دوست نہیں ہے۔“

”اجی، ہم تو دوستی کرنے آئے تھے۔ آپ نے خود ہی بگاڑ دیا۔“

”میں بہت شرمندہ ہوں، لیکن یہ تو دیکھیے کہ جب کوئی مشکل پیش آئی تو ہماری نگاہ آپ کی طرف ہی اٹھ گئی۔“

جذبے کی قدر

ایک عالی دانشمندی کی صحبت ہر مرد

کے لئے اچھی چیز ہے۔ عورتوں کا ضمیر نہیں بلکہ

ان کے دلوں میں بھرا ہوا محبت اور ہمدردی

کا جذبہ مجھے ان سے محبت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

مسٹر شیکسپیر

”اوہ کیا بات ہے؟ کیا مشکل پیش آئی ہے تمہیں؟“

شمس الدین یکدم ”آپ“ سے ”تم“ پر آ کر آئے۔

”کیا کہیں شمس الدین صاحب! ایک ناممقول آدمی نے پریشان کر رکھا ہے، دھمکیاں دیتا رہتا ہے اور رقم مانگتا ہے، ہم تو زندگی سے عاجز ہیں۔ نہ جی سکتے ہیں نہ مر سکتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری مدد کریں، دو چار ہزار روپے خرچ ہو جائیں مگر ہمیں کسی طرح اس ناممقول سے نجات دلادیں۔“

”بس اتنی سی بات ہے، کون ہے وہ بد بخت پندرہ قتل کر چکے ہیں جوانی میں۔ مگر اب تو یہ کہہ کر لی ہے لیکن اپنا پردیزس دن کام آگے گا، دیکھا ہے کبھی اسے؟“

”نہیں، اتفاق نہیں ہوا کبھی۔“ شاہ صاحب نے انکار میں سر ہلایا۔

”چھ فٹ کا جوان ہے، بارہ انچ کا چاقو رکھتا ہے۔ مجال ہے کسی کی جو آنکھ ملے اس سے۔ رعب ہے پوری ہستی پر، بس ذرا لاپٹی ہے۔ ممکن ہے، ناچ چھ ہزار میں مان جائے۔ گردن اتار دے گا اس سالے کی۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“ شاہ صاحب دانت چپن کر بولے۔

”تو لکھو ہزار کا نوٹ، کل بات کرادیں گے اس سے تمہاری۔“ شمس الدین بولے۔

”ہزار روپے؟“ شاہ صاحب حیرت سے بولے لیکن پھر پندرہ ہزار روپے کا خیال آ گیا اور انہوں نے جلدی سے ہزار کا نوٹ نکال کر انہیں دے دیے۔

”بس سمجھو کام ہو گیا تمہارا اور کوئی مشکل ہو جاتا؟“

شمس الدین نوٹ جیب میں ڈالتے ہوئے بولے۔

”نہیں بس یہ کام کرادو۔ بڑا احسان ہوگا شمس

الدین صاحب!

سینئر ذی الحجت 228 ستمبر 2011ء

پرویز نے بڈل کھول کر شاہ صاحب کے سامنے ڈال دیا اور جمال شاہ خوف سے اچھل پڑے۔ "یہ کیا ہے؟"

"وہ جس کام کا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ پرویز نے گردن اڑا کر کہا۔

"تو تو تم نے اسے قتل کر ڈالا؟" شاہ صاحب خوف سے کانپتے ہوئے بولے۔

"ہاں۔۔۔ اس نے تمہاری چیز دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے جھگڑائی ختم کر دیا۔"

"مگر وہ ڈائری؟"

"جب وہ ختم ہو گیا تو ڈائری کس کے کام کی رہے گی؟"

"ارے۔۔۔ مگر تم نے اس کے گھر کی تلاشی تو لی ہوتی۔"

"لی تھی مگر نہیں ملی۔"

"آہ۔۔۔ اس نے کہا تھا کہ اگر میں نے اسے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو ڈائری پولیس تک پہنچ جائے گی۔ اس کی موت سے مجھے کیا فائدہ ہوا پرویز! مجھے تو ڈائری چاہیے۔"

"کیا تم اپنی بات سے بھرپور چاہتے ہو شاہ جی اتم نے پہلے مجھے یہ بات نہیں بتائی تھی۔" پرویز نے کڑکتے ہوئے کہا۔

"ارے واو۔۔۔ ایک تو خون کراتے ہو اور پھر میرا کام بھی نہیں کیا، میں تمہیں معاوضہ کس بات کا دوں۔ میں۔۔۔ میں تو بس ڈائری چاہتا ہوں۔"

"شاہ جی! میں ایک قتل اور بھی کر سکتا ہوں۔" پرویز نے پھنکارے ہوئے اپنا چاقو نکال لیا اور جمال شاہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

"تم مجھے قتل نہیں کر سکتے۔ میں پولیس کو اطلاع دے دوں گا۔" وہ بھلائے۔

"میری رقم لاکھ لو شاہ جی اور نہ۔۔۔ پرویز غرایا۔

"یقیناً کرو پرویز میاں! پورے مکان کی تلاشی لے لو۔ میں تلاش آدھی ہوں، پھولی کوڑی نہیں ہے میرے پاس، بس یہ جیب میں کچھ روپے پڑے ہیں، میں پچاس ہزار روپے کہاں سے دوں گا۔ مجھے سرت مارو۔"

"وعدہ کیوں کیا تھا؟" پرویز مسکرایا۔

"بس ڈائری حاصل کرنا چاہتا تھا۔"

"ہوں۔۔۔ نکالو، کیا ہے تمہارے پاس؟" پرویز بولا۔

اور شاہ جی نے جیبیں خالی کر دیں، پھر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "درست ہے، شاہ جی! اتم سے وہی گئے گا، ٹھیک ہی کہتا تھا سالہ۔ اچھا ہی ہوا جو میں نے اس کی بات مان لی ورنہ تمہارے گندے خون سے بھی ہاتھ دھو لیتا پڑتا۔"

"کون سی بات مان لی؟" شاہ جی نے چونک کر پوچھا۔

"یہ بات وہ خود ہی تمہیں بتائے گا۔ میں تمہارا خون ضرور کر دیتا۔ مگر اس سے مجھے نقصان ہو جائے گا۔" پرویز نے کہا اور مسکراتے ہوئے واپس پلٹ گیا لیکن اس کے آخری الفاظ نے شاہ جی کو بے چین کر دیا تھا۔

پچاس ہزار روپے ان کی کمر سے بندھے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر پرویز نہ مانا تو پھر اسے یہ رقم دے دیں گے لیکن بلائی گئی تھی۔ جہاں انہیں پچاس ہزار قلم جانے کی خوشی تھی، وہاں پرویز کے الفاظ انہیں بے چین کر رہے تھے۔ خون آلود قمیص اب بھی ان کے سامنے پڑی تھی اور وہ اس قمیص کو پچھانتے تھے اور انہوں نے ایک بار اسے پہنے ہوئے بھی دیکھا تھا لیکن پرویز کی اس بات کا کیا مطلب تھا کہ وہ خود ہی بتائے گا؟ جب وہ مر گیا تو۔۔۔ تو۔۔۔

اس بات کا مطلب دوسرے دن ہی کچھ آگیا۔ جب وہ شاہ صاحب کی نشست گاہ میں داخل ہوا۔ شاہ صاحب اسے دیکھ کر دہشت سے اچھل پڑے۔

"بھو۔۔۔ بھوت۔۔۔ بھوت۔۔۔ وہ دہشت سے چیخے اور وہ ہنسنے لگا۔

"نیک شاہ جی! میں بھوت نہیں ہوں، زندہ ہوں اور آپ کے سینے پر مونگ دینے کے لیے ہمیشہ زندہ رہوں گا۔"

"م۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر۔۔۔"

"پرویز نے تو مجھے قتل کر دیا تھا۔ یہ کہنا چاہتے ہیں ناں؟" وہ پھر نہیں پڑا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں کیا؟" شاہ صاحب کھٹی ہوئی آواز میں بولے۔

"نہیں شاہ جی! وہ آپ کی طرح بے وقوف نہیں تھا۔ آپ نے وعدہ خلافی کی ہے شاہ جی! اس لیے آج میں مجبور ہوں کہ یہ ڈائری پولیس کے حوالے کر دوں، آپ کے پاس سے میں سپر جاؤں پولیس اسٹیشن۔"

"نیک نہیں۔۔۔ خدا کے لیے نہیں۔ میں شرمندہ ہوں، معافی چاہتا ہوں مگر اس کہنت نے تو تمہاری قمیص ہائے اس کا مطلب ہے کہ اس نے دھوکا دیا ہے۔ معاف کر دو۔ بس ایک بار معاف کر دو۔"

"سوچ لیں شاہ جی! ویسے اب آپ کو اس کی زبان بھی بند کرنا پڑے گی، آپ نے جو قلمی کی ہے، اس کی وجہ سے آپ کو اس ماہ سے تیس ہزار روپے دینے پڑیں گے۔ پندرہ ہزار اس کے اور پندرہ ہزار میرے۔ ورنہ آپ سمجھتے ہیں، خدا حافظ۔"

شاہ جی اسے آواز میں دیتے رہ گئے لیکن وہ باہر نکل گیا۔ تیس ہزار ہر ماہ۔ تیس ہزار۔۔۔ وہ اپنا سر پیٹنے لگے۔ وہ بس سوچتے رہے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

پہلی تاریخ کو آئی تو انہیں جبکہ مار کر تیس ہزار روپے کی خلیفہ رقم اس نوجوان کے ہاں پہنچانا پڑی لیکن جب وہ یہ ہماری رقم دے کر واپس آ رہے تھے تو گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یوں کام نہیں چلے گا۔ کچھ کرنا ہی ہوگا ورنہ اس طرح تو ساری دولت رفتہ رفتہ اس کی جیب میں منتقل ہو جائے گی اور وہ ایک دن بالکل قلعش ہو جائے گا۔

"تو پھر۔۔۔ کیا میں اسے قتل کر دوں۔" کیا ایک بار پھر میں جمال بن جاؤں؟" انہوں نے اپنی کلاسیاں دیکھیں لیکن اب ان پر چرمیوں اور پھری ہوئی نسوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ان کی کلاسیوں میں اب اتنی جان نہیں تھی کہ کسی کا گھادبا سکے۔ اگر وہ کامیاب نہ ہوتے تو۔۔۔؟

تو پھر ضرورت ہے ایک ایسے انسان کی جو ان کے دست راست کی حیثیت سے کام کرے۔ خواہ کچھ بھی خرچ ہو جائے۔ اس خوف سے تو نجات ملے لیکن ایسا انسان، ایسا شخص انسان کہاں سے ملے گا جو معاوضہ لے کر اسے حلال بھی کرے؟

آج جمال شاہ کے سوچنے کا انداز بہت مختلف تھا۔ آج وہ پوری ذہانت سے آخری فیصلے کر رہے تھے اور ان کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

اس دن کے بعد شاہ جی کی زندگی کے معمولات میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اب وہ لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے بھی لگے اور بہت سے لوگوں سے ان کی شناسائی بھی ہوگئی۔

دراصل وہ کام کے آدھی کی تلاش میں تھے۔ پھر وہ چند دنوں کے لیے شہر سے باہر چلے گئے اور جب وہاں سے واپس آئے تو ایک حیرت انگیز راز ان کو جاننے ملا۔

شاہ جی نے لوگوں کو بتایا کہ رحمان ان کا بھانجا ہے اور باری دنیا میں اس بھانجے کے سوا ان کا کوئی نہیں ہے؟ اب اس آخری وقت میں وہ اہم کی کے ساتھ رہے گا۔

"اور آپ کے بعد آپ کا وارث بھی ہوگا؟" کسی نے سوال کیا۔

"ارے اب رہ ہی کیا گیا ہے۔ سوائے اس کوئی پھولی ہوئی کے۔ سو ظاہر ہے کہ یہ اس کے علاوہ اور کس کی ہوگی؟"

شاہ جی نے جواب دیا۔ لیکن یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے ان کا دل کانپ گیا۔ یہ شخص الفاظ انہیں نہیں ادا کرنے چاہیے تھے۔ رحمان سے ان کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ بس وہ ایک جاکب ہی مل گیا تھا انہیں۔ شاہ جی کو اس میں ذہانت کی چمک نظر آئی تھی اور نہ جانے کیوں ان کے دل میں یہ احساس جاگ اٹھا تھا کہ یہ نوجوان ان کی مدد کر سکتا ہے۔ معلومات حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ ابھی تین سال قید کاٹ کر جیل سے رہا ہوا ہے اور شاہ جی کے خیال میں یہ اس کی خصوصی صلاحیت تھی۔

چنانچہ انہوں نے اسے اپنے لیے کام کرنے کی پیشکش کی۔ ضروری محنت کو کے بعد انہوں نے بھانپ لیا کہ شخصیت کیسی ہے اور اس سے کیا حاصل کیا جاسکتا ہے؟ چنانچہ فوراً ہی دونوں کے درمیان معاملات طے ہو گئے۔ رحمان نے ایک لاکھ روپے میں انہیں بلک میٹر سے نجات دلانے کا ٹھیکہ لے لیا تھا اور پھر وہ شاہ جی کے ساتھ ان کی حویلی میں آگیا۔ شاہ جی دل ہی دل میں مطمئن تھے کہ جب پرویز جیسا خونی انسان ان سے پچاس ہزار روپے لے گا تو رحمان ایک لاکھ بھلا کیسے وصول کر پائے گا؟ لیکن رحمان دوسری قسم کا آدمی ثابت ہوا۔ اسے حویلی میں ان کے بھانجے کی حیثیت سے رہنا تھا۔ اس لیے تھوڑی سی ٹپ ٹاپ ضروری تھی۔ اس کے لیے اس نے دس ہزار روپے طلب کیے۔

"گنگ۔۔۔ کیا مطلب؟ دس ہزار کس لیے چاہئیں؟" شاہ جی نے گھبرا کر پوچھا۔

"شاہ جی! کیا آپ کا بھانجا جو پھرے لگے پھرے گا۔ لوگ کیا کہیں گے؟ آپ خود سوچئے کام کرنا ہے تو سلیفے سے کیا جائے۔ بس آپ مجھ سے سوال نہ کریں۔ جو کچھ میں کہوں وہ خاموشی سے کرتے جائیں اور پھر یہ رقم تو حساب میں لکھی جائے گی؟"

"کون سا حساب؟" شاہ جی نے پوچھا۔

"ایک لاکھ کا ٹھیکہ ہے ناں؟"

"اوپ۔۔۔ ہاں۔۔۔ ایک لاکھ کا ہے۔" شاہ جی جیسے کڑوی کوئی گل کر رہے۔

"تو بے ہزار روپے گئے۔ لکھ لے دس ہزار۔" اور پھر شاہ جی کو دس ہزار روپے دینے ہی پڑے۔

رحمان کے قلمی بات دیکھنے کے قابل تھے۔ شاہ جی اسے اپنی چتا ستا چکے تھے اور رحمان نے چمکی بھا کر کہا تھا کہ وہ ان لوگوں سے ڈائری یوں حاصل کر لے گا اور شاہ جی کو

قد چھوٹا ہے تو کیا ہوا؟

گروٹال

جو ہے!



ایک ماہ کی پالی صرف Rs. 495/-



اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!

ملک بھر کے ہر اچھے میڈیکل مشور، دوسرے طبی مشور اور دوا خانہ پر دستیاب
 HELPLINE 042-35789145 & 6.0334-4266255
 Email: toptreatments@gmail.com, Website: www.toptreatments.net
 معلومات حاصل کرنے کے لیے

ہمیشہ کے لیے اس عذاب سے نجات دلا دے گا۔
 رحمان کو آتے ہوئے چند روزہ دن ہو چکے تھے لیکن اس نے سوائے کھانے اور اڑانے کے کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔
 شاہ جی تو جان پر مبنی ہوئی تھی۔ وہ خود تو روکی سوچی کھا کر گزارہ کر لیا کرتے تھے لیکن رحمان نے کہہ دیا تھا کہ وہ کھانے پینے کا شوقین ہے۔ چنانچہ اس کے لیے کھانا ہمیشہ اچھا پکنا چاہیے۔
 شاہ جی نے پہلے تو بڑی رد و قدح کی لیکن پھر یہ طے ہوا کہ کھانے کے اخراجات بھی ٹھیکے کی رقم سے منہا ہو جائیں گے اور یہ بات شاہ جی کے لیے قدرے سکون کی تھی۔ اس لیے وہ طوعاً اور کرہاً اس پر راضی ہو گئے۔
 ”آخر تم کیا کر رہے ہو رحمان، پہلی تاریخ قریب آ رہی ہے اور ابھی تک۔“ ایک دن شاہ صاحب نے کہا۔
 ”شاہ جی! پہلی تاریخ ہی کا تو انتظار کر رہا ہوں۔ اس بار تم نے کرشمے جانوں گا اور ان لوگوں سے بات کروں گا۔“
 ”کیا مطلب، کیا رقم اس بار بھی دینی پڑے گی؟“
 ”نہیں، میرا کیا جاتا ہے۔“
 ”کیا بھوس کر رہے ہو تم، پھر تمہیں یہاں لانے سے فائدہ؟“ شاہ جی نے جھپٹلاتے ہوئے کہا۔
 ”میں بھی کام کے فائدے فوری حاصل نہیں ہوتے شاہ جی! آپ کو اس ماہ کی رقم تو ادا کرنی ہی ہوگی۔“ رحمان نے پرسکون لہجے میں کہا۔
 ”لیکن وہ تمہارے حساب میں لگے گی ورنہ پھر تمہیں یہاں لانے کا فائدہ؟“ شاہ جی نے کہا۔
 ”چلیے درست ہے۔ آپ بڑے سکون آ دی ہیں۔ بہر حال میں آپ کی مدد کا فیصلہ تو کر ہی چکا ہوں۔“ رحمان نے کہا اور شاہ جی خاموش ہو گئے۔
 مہینے کے اخیر دن بھی رحمان نے بڑی خاموشی اور طمأنینہ سے کھاتے پیتے اور ایڑتے ہوئے گزار دیے۔
 اگلے تب اس نے شاہ جی سے رقم مانگنا چھوڑ دیا تھا اور شاہ جی بڑے خوش تھے۔ پہلی تاریخ کو انہوں نے تیس ہزار روپے نکال کر رحمان کو دے دیے اور شہزاد کا پتا بھی اچھی طرح سمجھا دیا۔ رحمان مسکراتا ہوا اپنی مہم پر روانہ ہو گیا۔
 ☆☆☆☆
 شہزاد اور پرویز میں خوب گھٹ رسی تھی۔ دونوں بہترین دوست بن گئے تھے۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ایک مخصوص وقت پر، پرویز، شہزاد کے کمر پر پہنچتا تھا۔ شاہ صاحب آتے، تیس ہزار روپے دیتے اور دونوں چندہ چندہ ہزار



حضرت یرمیاہ

رسموئے ساجد

ہتی اسرائیل کی تاریخ رفتہ رفتہ صدیوں کے سینے پر سفر کرتے ہوئے بالآخر اس مقام پر آگئی جب ان کے سروں سے یزرگی کا تاج اترنے والا تھا... ایسے میں حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے ایک بار پھر انہیں متنبہ کیا... ”اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کھار اپنے چاک پر مٹی رکھتا ہے اور کوئی برتن بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی وہ برتن بگڑ جاتا ہے۔ کھار اس مٹی کو ضائع نہیں کرتا بلکہ اس سے جیسا مناسب سمجھتا ہے ایک دوسرا برتن بنا لیتا ہے۔ سو تم بھی بگڑی ہوئی مٹی ہو... خدا اس مٹی سے تم جیسی کوئی اور قوم بنائے گا۔“

بنی اسرائیل کی سرکشی... بت پرستی اور انبیائے کرام کی جہد مسلسل کا احوال

جب سے محاصرہ اٹھا تھا، کابھوں نے حضرت یرمیاہ علیہ السلام کے خلاف منصوبہ باندھنے شروع کر دیے تھے۔ وہ یہ کہتے پھر رہے تھے کہ ہم سچے ہیں اسی لیے محاصرہ ختم ہو گیا۔ حضرت یرمیاہ علیہ السلام تو کہتے تھے یہ وٹلم ڈیل ہوگا۔ ان باتوں کا فائدہ ہوئی۔

ان لوگوں نے حضرت یرمیاہ علیہ السلام کے خلاف رائے عامہ ہوا کر لی تھی۔ اب انہیں یہ خطرہ نہیں تھا کہ یرمیاہ علیہ السلام کے حق میں کوئی آواز بلند ہوگی ویسے بھی ان کو تسلیم کرنے والوں میں غریب اور مساکین تھے جن کی کوئی آواز نہیں تھی۔

تک چھوڑنے آئے۔

رحمان کے جانے کے بعد انہوں نے جیب میں رکھی ہوئی ڈائری اور نوٹوں کو ہینٹ لیا اور ان کے بدن میں مسرت کی لہریں اٹھنے لگیں۔ ”مہنت تیس ہزار روپے کیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ انسان سے بھی ایسی گفلی ہو جاتی ہے کہ اسے بڑا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔“ وہ یہی سوچتے سوچتے حویلی کے اس کمرے کی طرف بڑھے جہاں ان کی تجوری زمین میں دفن تھی۔ زیادہ رقم جیب میں رکھنا خطرناک ہو جاتا ہے۔ انہوں نے سوچا اور تجوری کھولی۔ لیکن... لیکن تجوری اتنی تاریک کیوں ہے، اس میں تو سفیدی جگمگاتی تھی۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا اور پھر جب تک تجوری میں ہاتھ ڈال دیا۔

ایک لمحے کے لیے ان کے دل کی حرکت رک سی گئی۔ ان کا ہاتھ تجوری کے خالی پینڈے سے ٹکرایا۔ انہوں نے تیزی سے ہاتھ ادھر ادھر مارا لیکن پھر پوری تجوری میں سے صرف ایک چیز ملی اور وہ تھا ایک لفافہ۔ ہاتھ لفافہ اٹھا کر باہر آ گیا لیکن حالت اس قابل نہ تھی کہ لفافہ کھول سکے۔ دیر تک وہ لفافہ لیے بیٹھے رہے۔ کچھ امن کو آتا تھا۔ نہ جانے کتنے لمحوں کے بعد انہوں نے لفافہ کھولا۔ اپنی جگہ سے ٹھکے اور زمین پر گھسٹتے ہوئے روشنی میں آ گئے۔ پاؤں اس قابل نہیں تھے کہ کھڑے ہو سکیں۔ اندر سے نکلنے والے پرہے کی تحریر مشکل ہی سے پڑھی گئی۔

”شاہ جی!“

میں آپ کا بچا ہمدرد ہوں۔ آپ کو یہ بات مانتی ہے کہ اس بے پناہ دولت نے آپ کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ ہر کوئی اس کی وجہ سے آپ کو ستا رہا تھا۔ یہ آپ کی سب سے بڑی دشمنی تھی اس لیے ان دونوں بلیک میٹروں کے ساتھ ساتھ میں آپ کو آپ کے اس دشمن سے بھی نجات دلا رہا ہوں۔ ڈائری آپ کے پاس آگئی ہے اسے فوراً تلف کر دیں تاکہ اس کے بعد اطمینان سے جی سکیں۔ دیکھ لیجیے آپ کو اس تیسرے دشمن سے نجات دلانے کا میں نے کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا۔ جو رقم آپ کے پاس ہے اس سے آپ زعمی کے چھ دن سکون سے گزار سکتے ہیں اور اب آپ کی زندگی ہی بھلائی ہو گئی ہے۔

امید ہے آپ جب تک زعمہ رہیں گے میرے احسان مند رہیں گے۔

آپ کا رحمان

انہیں سولی پر لٹکا دیا تھا۔ خوشی سے ان کے پیٹ میں سانس نہیں سار رہا تھا۔ آج تو زمانے بھر کی خوشیاں ان کے حصے میں آگئی تھیں۔ رحمان نے بہت سے نوٹ نکال کر ان کے سامنے ڈال دیے۔

”یہ کیا؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ کی وہ رقم جو آپ نے ان بلیک میٹروں کو دی تھی۔ سچی رقم وہی تھی آپ نے آج تک انہیں؟“

”نہیں... تقریباً ایک یا ڈیڑھ لاکھ۔“ شاہ جی بولے۔

”دوسرے ڈیڑھ لاکھ ہیں مگر لیں اور ہاں... میرا حساب بھی کرویں۔“

”اوہ... تم تو... جا دو گھر اور رحمان رقم نے وہ کر دکھایا ہے جو کوئی نہ کر سکا تھا مگر... مگر یہ سب ہوا کیسے... یہ سب؟“ شاہ صاحب نوٹ سینٹے ہوئے بولے۔

”بس اپنا ٹھیل ہے شاہ صاحب! اب آپ میرا حساب کرویں۔“

”ہاں... ضرور کرو، دس ہزار روپے کے رقم نے کپڑے بنوائے، یوٹو ہاں۔“

”ہاں۔“ رحمان نے گردن ہلائی۔

”دس ہزار کھانے پینے میں خرچ ہوئے۔ یوٹو ہاں۔“

اور رحمان نے اعتراف کیا۔ ”میں ہزار روپے تم کل لے گئے تھے ان کے لیے۔ وہ رقم اس تیس ہزار سے علاوہ تھی۔“

”درست ہے۔“ رحمان سکون سے بولا۔

”کل ہوئے ستر ہزار روپے اور تمہارے روٹے تیس ہزار روپے۔“

درست ہے۔ آپ مجھے تیس ہزار روپے دے دیں۔“

رحمان نے جواب دیا۔

”یہ لو اپنی رقم رحمان! تمہاری بڑی مہربانی ہوگی، میں بڑے عا آدمی ہوں، ہاتھ جو تو بلا نہیں سکتا۔ جو کچھ کہہ رہا ہے اسی میں گزارہ کرنا ہے۔“ شاہ جی لجاجت سے بولے۔

”ٹھیک ہے شاہ صاحب تیس ہزار ہی دے دیں۔“

رحمان راضی ہو گیا اور شاہ جی نے نہایت دھکی دل سے ایک لاکھ کی رقم سے تیس ہزار نکال کر رحمان کے حوالے کر دیے۔ رحمان نے نوٹ جیب میں رکھے اور اٹھ گیا۔ ”تو اب مجھے اجازت دیں شاہ صاحب! میرا کام ختم ہو گیا۔“ اس نے کہا اور شاہ جی اٹھ کھڑے ہوئے۔ رحمان کے ساتھ وہ اس کمرے میں آئے اور رحمان نے اپنا سوٹ کیس اٹھا لیا۔ شاہ جی بڑے پر تپاک انداز میں اسے حویلی کے دروازے

امرا بھی ان کے خلاف تھے اور محاصرہ اٹھ جانے کے بعد بادشاہ کے دل میں ان کی طرف سے بال آگیا تھا۔ اب وقت آگیا تھا کہ سازش پر عمل کیا جائے۔

فقہور بن امیر کا بن جو حضرت یرمیاہ علیہ السلام کا سب سے بڑا مخالف تھا اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کچھ نہیں رہا۔ اس نے اپنے چیلوں کو یرمیاہ علیہ السلام کے تعاقب میں روانہ کر دیا کہ انہیں جس طرح ممکن ہو اس کے پاس لے آئیں۔ ان میں یروشلم کے چھپے ہوئے بد معاش تھے جن سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

حضرت یرمیاہ علیہ السلام ابھی یروشلم سے لٹکی ہی تھے کہ ان بد معاشوں نے انہیں گھیر لیا۔ چاروں طرف حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور نہایت حقیرانہ انداز میں تعجب مارنے لگے۔

”ہم نے سنا ہے آپ سچے نبی ہیں۔“

”مجھے کسی گواہی کی ضرورت نہیں۔“

”چلو ان لیا کہ آپ ہی سچے نبی ہیں۔ پھر یہ کیا ہوا۔ محاصرہ تو ختم ہو گیا۔ آپ تو کہتے تھے یروشلم ختم ہو جائے گا۔“

”اس وقتی مہلت پر خوش نہ ہو جاؤ۔ خیر آمدنی آنے والی ہے۔ شیر اپنی کھجارت سے پھر لٹکے گا۔ محاصرہ پھر ہوگا۔ جیسا کہ آپ نے لکھی۔ لاشوں کو پرندے کھا دیں گے۔ شاہی محلات زمیں یوں ہو جائیں گے۔“

”بس آپ کی یہ لفاظی زیادہ دیر نہیں چل سکتی۔ دنیا کا ہر آدمی اپنے وطن کے حق میں ہوتا ہے آپ غیروں کے حق میں یوں رہے ہیں آپ باطل کے ہاتھوں تک تھے ہیں۔“

”مجھے کسی سے کوئی غرض نہیں۔ مجھ پر وہی آتی ہے۔ میں خدا کے کلام کو دوسروں تک پہنچانا ہوں۔“

”ذرا ایسی پیغام ہمارے سردار کا بن تک بھی پہنچائیے۔ ہم آپ کو لینے آتے ہیں۔“

”کیا تم نے مجھی سوچا وہ کیسا کا بن ہے جسے کچھ بھی نہیں معلوم۔ کیا میں بتاؤں گا تو اسے معلوم ہوگا؟“

”اسے کس معلوم۔ آپ چل کر بتائیے۔“

”اب میرے بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وقت بہت نزدیک ہے۔ خود دیکھ لو کہ کون سا چاقا کون کھوٹا ہے؟“

”ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ انتظار کریں اور آپ کو یروشلم سے بھاگ جانے دیں۔ آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”میں تم لوگوں سے کہہ چکا کہ اب میرے نہیں جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”جانا تو پڑے گا۔“

ان اداشوں نے آپ کو زور و کوب کرنا شروع کر دیا اور اسی حالت میں کھینچتے ہوئے کا بن کے پاس لے گئے۔ فقہور بن امیر نے یہ ظاہر کیا جیسے سب کچھ اس کی مرضی کے بغیر ہوا ہے۔ ان اداشوں سے آپ کی جان چھڑائی اور نہایت مٹھے لہجے میں آپ سے گفتگو کرنے لگا لیکن آپ سمجھ رہے تھے کہ یہ سب اس کی شرارت ہے۔

”آپ اگر میرے عہدے پر براجمان ہونا چاہتے ہیں تو میں بادشاہ سے آپ کے لیے سفارش کر سکتا ہوں۔“

”تمہاری تلک ہونا تو مجھ ہی کو چاہیے تھا لیکن شاہ بیوداد مجھ سے وہ کام نہیں لے سکتا تھا جو تم سے لے رہا تھا اسی لیے تمہیں بتایا گیا۔ یہ عہدہ بھی کو مبارک ہو۔“

”پھر ایسی باتیں کیوں کرتے پھرتے ہو جس سے قوم مجھ سے اور بادشاہ سے بدگن ہو جائے۔ تم نے شاہ باطل سے ساز باز کر لی ہے اور کوئی بڑا انعام وصول کیا ہے۔ اسی لیے یروشلم والوں کے حوصلے پست کرتے رہتے ہو۔“

”میں کسی کا حامی یا کسی کا مخالف نہیں ہوں۔ میں تو وہ کہتا ہوں جو خداوند مجھے بتاتا ہے۔“

”اس نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں تمہیں قید کرنے والا ہوں۔“

”یہ تو نہیں بتایا لیکن یہ ضرور بتایا ہے کہ وہ میری حفاظت کرتا رہے گا۔ تم کچھ بھی کرو، میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

فقہور نے سب امرا کو طلب کیا اور ان کے سامنے یرمیاہ علیہ السلام کے بارے میں جھوٹی جی باتیں سن کر انہیں آمادہ کر لیا کہ وہ یرمیاہ علیہ السلام کے حلق کوئی فیصلہ ہونے تک انہیں قید میں رکھیں۔

جو جن فتنی کے گھر کو ان لوگوں نے قید خانہ بنا رکھا تھا۔ اس میں ایسے لوگوں کو رکھا جاتا تھا جو حکومت کے خلاف نڈاری کے مرتکب ہوتے تھے یا کسی امیر کو قتل کرنے کا الزام ہوتا تھا۔ ایسے قیدی کسی رعایت یا نرمی کے حق دار نہیں ہو سکتے تھے۔ حضرت یرمیاہ علیہ السلام کو بھی اس گھر میں پہنچا دیا گیا۔

حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے دعا فرمائی۔

”مجھ پر رحم کرنے والے شرمندہ ہوں پر مجھے شرمندہ نہ ہونے دے۔ وہ ہر اسان ہوں پر مجھے ہر اسان نہ ہونے دے، مصیبت کا دل ان پر لا اور ان کو شکست پر شکست دے۔“

خدا نے آپ سے وعدہ کیا۔

”میں تیری حفاظت کروں گا اور تجھے رہائی دوں گا۔“ ہاں میں تجھے شرمندہ ہوں کے ہاتھ سے رہائی دوں گا اور خالوں کے پٹے سے چھڑاؤں گا۔“

یہ ایسا وعدہ تھا کہ حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی تقاضی ہو جانا لازمی تھی۔ آپ نے اس وعدے کو دل سے لگایا اور دل کا ہر دوسرے پرندہ بن کر اڑ گیا۔

حضرت یرمیاہ علیہ السلام کو اس قید میں رہتے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ بادشاہ کو ان کے مشورے کی ضرورت پڑ گئی۔ ایک مرتبہ پھر سننے میں آ رہا تھا کہ یروشلم پر چڑھائی کی تیاری کر رہا ہے۔ اس نے اپنے ایک آدمی کو قید خانے میں بھیجا اور حضرت یرمیاہ علیہ السلام کو اپنے گل میں بلا لیا۔ یہ بادشاہت خفیہ تھا۔ چند پہرے داروں کے سوا کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا اور انہیں بھی ہدایت کر دی کہ کسی کو کچھ نہ بتائیں۔

حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے بادشاہ کو دیکھتے ہی منہ پھیر لیا۔

”میں نے تمہارا ہاتھ مارا ہے ملازموں کا کیا کیا ڈاکھا جو میں قیدی کی مصوبت اٹھانے پر مجبور ہوں؟“

”میرے امرا میرے قابو میں نہیں۔ ان سب کا خیال یہی تھا کہ آپ کو قید میں رکھا جائے۔“

”اور خود آپ کا کیا خیال ہے؟“

”آپ اگر یروشلم کے لوگوں کا حوصلہ بڑھائیں تو آپ آزاد گھوم سکتے ہیں مگر آپ جو ان کے حوصلے پست کر رہے ہیں۔“

”میں کیا کروں کہ خدا مجھ سے یہی کہلواتا ہے۔“

”اب خدا اس معاملے میں کیا کہتا ہے؟“

”اب تمہارے ہی کہاں ہیں جو تم سے نبوت کرتے ہیں اور کہتے تھے کہ شاہ باطل اس ملک پر چڑھائی نہیں کرے گا؟“

”وہ تو اب بھی یہی کہتے جا رہے ہیں۔ میں تو آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”خداوند فرماتا ہے کہ تو شاہ باطل کے حوالے کیا جائے گا۔ جو کوئی اس شہر میں رہے گا وہ کھوارہ کال اور وہاں سے مرے گا اور جو کسہ اس سے معاملے کا وہ زندہ رہے گا اور اس کی جان اس کے لیے قیمت ہوگی اور وہ عیار رہے گا۔“

باتیں بہت مٹھت تھیں لیکن صد قیاد نے انہیں گل سے سنا بلکہ ان سے پوچھا کہ قید میں ان کے ساتھ برا سلوک تو نہیں کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کسی کی شکایت نہیں کی لیکن جو کچھ کہا وہی شکایت تھی۔

”اے بادشاہ! میری درخواست قبول کر اور مجھے پوتن فتنی کے گھر میں واپس نہ بھیج۔ ایسا نہ ہو کہ میں وہاں مری جاؤں اور الزام تمہارا ہو جائے۔“

صد قیاد بادشاہ سے حکم دیا۔ اس کے بعد سے حضرت یرمیاہ علیہ السلام کو قید خانے کے گھن میں رکھا گیا اور ان باتوں کے گھن سے ایک روٹی لے کر دیتے رہے۔

اس اثنا میں خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ شاہ باطل یروشلم پر چڑھا آ یا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ اس مرتبہ وہ اپنے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ لشکر لا رہا تھا۔ صد قیاد کے فوجی مقابلہ کرنے کو بالکل تیار نہیں تھے۔ وہ پہلے کی طرح ایک مرتبہ پھر دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔ باطل کے لشکر نے شہر کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور ایسے اطمینان سے خیمہ زن ہو گئے جیسے اب یہیں قیام کرنا ہے۔

اس محاصرے کو دیکھ کر کافروں اور جھوٹے انبیاء کو سخت شرمندگی ہوئی۔ حضرت یرمیاہ علیہ السلام کہتے رہے تھے کہ محاصرہ بارہ ہوگا۔ اب ان کا کہنا سچ ثابت ہو گیا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ بادشاہ ان سے خفیہ ملاقاتیں کرتا رہتا ہے۔ اس ناسرے کے بعد بادشاہ کی حقیقت کا بڑھ چاٹا لازمی تھا۔ انہیں ڈر ہوا کہ انہیں بادشاہ ان کے بہکاوے میں آکر اکتھار نہ پہنچ سکے۔

چند باشر داروں نے بے طے کیا کہ انہیں قید کر دیا جائے۔ انہوں نے منصوبہ سازی کی اور حضرت یرمیاہ علیہ السلام کو قید خانے کے گھن میں جے ہوئے ایک حوض میں لٹکا دیا۔ اس

حوض میں پانی نہیں تھا بلکہ کچھ تھی۔ ان شورش پسندوں کا خیال تھا کہ وہ کچھ میں وحش جائیں گے یوں کسی کو ان کی موت کے بارے میں معلوم بھی نہیں ہو سکے گا۔

موت ان یہودیوں کے سروں پر منڈلا رہی تھی۔ بائبل کا صرہ ڈالے ہوئے تھے اور یہ بد بخت اپنے نبی کی جان کے ورپے تھے لیکن خدا کا وعدہ ان کے ساتھ تھا۔ ایک مرتبہ پھر ان کی جان بچ گئی۔

شاہی محل کا ایک خواجہ سرا عبد ملک حضرت یرمیاہ علیہ السلام کا عقیدت مند تھا۔ اس نے سنا کہ اس کے آقا کو بد بختوں نے رسول کی مدد سے حوض کی کچھڑ میں اتار دیا ہے تو وہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی خدمت گزار کی کا واسطہ دے کر ان کے حق میں سفارش کی۔

”مقدس شہر کے مقدس بادشاہ۔ میں نے اگر کبھی تیرے حق میں کوئی نیکی کی ہے تو اس کے عوض میں کچھ کہنے کی جسارت کرتا ہوں۔“

”کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”ان لوگوں نے حضرت یرمیاہ کو کچھڑ کے حوض میں ڈال دیا ہے۔ وہ وہاں کچھڑ سے نہیں تو بھوک سے ضرور مر جائیں گے۔ ان کے خون ناحق کو آپ اپنی گردن پر کیوں لیتے ہیں؟“

”تو کیا چاہتا ہے؟“

”میں چاہتا ہوں اسے حوض سے نکال کر محسن میں رکھا جائے جہاں وہ پہلے تھا۔“

”تو اپنے آدمیوں کو لے کر جا اور حضرت یرمیاہ علیہ السلام کو حوض سے نکال لے۔ کوئی پوچھے تو کہنا صدقہ کا یہی حکم ہے۔“

عبد ملک گوشہ میں اپنے آدمیوں میں سے تیس آدمی ساتھ لیے اور رسول کی مدد سے حضرت یرمیاہ علیہ السلام کو حوض سے باہر نکال لیا۔ یرمیاہ علیہ السلام نے ایک مرتبہ پھر خدا کا شکر ادا کیا کہ خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا اور ان کی حفاظت کی۔

بائبل کے فوجی رد و شک کا محاصرہ رکھے ہوئے تھے۔ ایک سال ہو گیا تھا۔ اس عرصے میں صرف ایک مرتبہ صدقہ کا یہاں پہنچنے کے لیے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن جلد ہی انہیں اپنی طاقت کا اندازہ ہو گیا اور چند سپاہی گنوا کر واپس پلٹ آئے۔

یرشلیم کے لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ محاصرہ ختم ہو جائے گا لیکن جب ایک سال گزر گیا اور شہر میں خوراک کی کمی ہونے لگی۔ لوگ بھوک سے مرنے لگے۔ بغاوت کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور یہ خدشہ پیدا ہونے لگا کہ لوگ اپنی ہی فوج سے نڈر پڑیں۔

صدقہ کو قہنہ آنے کا تھا کہ حضرت یرمیاہ علیہ السلام ٹھیک کہتے رہے ہیں۔ خدا، یہوداہ سے واقعی ناراض ہے۔ اس نے سوچا، ایک مرتبہ پھر یرمیاہ علیہ السلام کو اپنے پاس بلاؤں اور ان سے پوچھوں کہ اب کیا کرنا چاہیے؟

بادشاہ نے حضرت یرمیاہ علیہ السلام کو بلا بھیجا۔ یرمیاہ علیہ السلام دیکھ رہے تھے کہ اب بادشاہ کی وہ اکثر قسم ہو گئی ہے جو پہلے دیکھنے میں آتی تھی لیکن جھوٹے انبیاء اب بھی اس پر اثر ہے اس لیے اسے پورا قہنہ نہیں ہے کہ وہ براہ ہو سکتا ہے۔ وہ اب بھی فرعون مصر کا نام عقیدت سے لے رہا تھا۔

”میں تجھ سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ تو مجھ سے وعدہ کر کہ کچھ چھپائے گا نہیں۔“ بادشاہ نے کہا۔

”میں کچھ نہیں چھپاؤں گا مگر یہ بتا تجھ میں سچ سننے کا حوصلہ ہے؟ ایسا تو نہیں کہ تجھے قتل ہی کرادے اور جو کچھ میں کہوں تو اسے نہ مانے۔“

”میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ نہ تو تجھے قتل کروں گا اور نہ ان کے حوالے کروں۔ جو تیری جان کے خواہاں ہیں۔“

”تو پھر سن۔“ حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے نہایت اطمینان سے کہا شروع کیا۔ ”خداوند لکھروں کا خدا، اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ یقیناً اگر تو کل کر شاہ بائبل کے امرا کے پاس چلا جائے گا تو تیری جان بچ جائے گی اور یہ شہر آگ سے جلا دیا جائے گا اور تیرا گھرانہ زلزلہ سے گرا۔“

”میں اپنے امرا سے ڈرتا ہوں۔ وہ مجھے ایسا نہیں کرنے دیں گے۔“

”میں تیری منت کرتا ہوں تو خداوند کی بات جو میں تجھ سے کہتا ہوں، مان لے۔“

”اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں کیونکہ اس طرح تو لوگ مجھے طعن دیں گے۔“

”تو کسی کے طعن کی پروا مت کر ورنہ پھر یہی ہوگا کہ وہ سب عورتیں جو شاہ یہوداہ کے محل میں باقی ہیں شاہ بائبل کے امرا کے پاس پہنچائی جائیں گی۔“

”یہ تو اس سے بھی زیادہ شرم کی بات ہوگی۔ میں ضرور شاہ بائبل کے پاس پہنچوں گا۔ تو اب جا۔“

حضرت یرمیاہ علیہ السلام پھر اسی قید خانے کے محسن میں آگئے۔ پتا ہر مطمئن بھی تھے کہ بادشاہ نے ان کی بات مان لی تھی۔ اب انہیں صرف یہ انتظار کرنا تھا کہ صدقہ بادشاہ بائبل کے پاس جائے، محاصرہ ختم ہو اور شہری سکون کا سانس لیں۔

اب دو سال گزر گئے تھے۔ قید اپنے عروج پر تھا۔ غذا کے تمام ذخائر ختم ہونے کو تھے۔ صدقہ کسی نتیجے پر اب تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس دوران ہی حضرت یرمیاہ علیہ السلام سے اس کی کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں لیکن وہ ان کے مشوروں پر عمل کرنے سے قاصر رہا۔ اس کے امرا کی رائے یہ تھی کہ حالات کچھ بھی ہوں آخری وقت تک ڈٹے رہیں گے۔ وہاں کی ضرورت طبیعت کا تھا کہ امرا سے ملنا تھا تو ان کی باتوں میں آجاتا تھا، یرمیاہ علیہ السلام کا مشورہ سننا تھا تو اس پر عمل کرنے کا عہد کرتا تھا۔ وہ دو کشتیوں میں سفر کر رہا تھا جسے بالآخر وہ بٹا ہی تھا۔

☆☆☆

حضرت یرمیاہ علیہ السلام قید خانے کے محسن میں بیٹھے تھے کہ ان کے چچا کا بیٹا حمایل ان کے پاس خریداری کا ایک سودا لے کر آیا۔ یہ ایسا وقت تھا جب کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اس کے کھیت کب جلا دیے جائیں گے۔ وہ خود بھی زندہ بیٹھا ہے یا نہیں؟

”میرا کھیت جو محنتوں میں تبصیر کے علاقے میں ہے خریدے کیونکہ یہ تیرا موروثی حق ہے اور اس کو چھڑانا تیرا کام ہے۔ اسے اپنے لیے خرید لے۔“

غریب بیٹھے ہوئے لوگ دم بخود رہ گئے۔ کون ایسا ہے وقوف ہوگا کہ اس وقت جا نکدا خریدے جبکہ شہر برباد ہونے کو ہے۔ لوگ چلا وطن ہونے کو ہیں۔

حضرت یرمیاہ علیہ السلام اس پیشکش کو قبول کرتے ہیں تو لوگوں کو قہنہ آجاتا ہے کہ یرمیاہ علیہ السلام کا دماغ چل گیا ہے۔ حضرت یرمیاہ علیہ السلام ایک مرتبہ پھر نبوت کے فرائض انجام دیتے ہیں اور لوگوں کو خدا کا حکم سناتے ہیں۔

”خداوند فرماتا ہے کہ جس طرح میں ان لوگوں پر یہ تمام بلائے عظیم لایا ہوں اسی طرح وہ تمام نیکی جس کا میں نے ان سے وعدہ کیا ہے ان سے گروں گا۔ میں سب کو جمع کروں گا۔ پھر کھیت خریدے جائیں گے۔ میں یہوداہ اور اسرائیل کو امیری سے واپس لاؤں گا اور ان کو پہلے کی طرح بنائوں گا۔“

حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے خدا کا قول بیان کر کے فرمایا۔ ”تم نے خداوند کی باتوں کو جھٹلایا لیکن میں ان پر اعتبار کرتا ہوں اور یہی بتانے کے لیے میں کھیت خرید رہا ہوں کہ میری نبوت سچی ہے اور میں خدا کی ہر بات پر اعتبار کرتا ہوں۔“

حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے اپنے دوست باروک کو بلوایا جو ان کا شفیق بھی تھا۔ اس نے ستر شقال چاندی فراہم کر دی۔ ایک قیل لکھا اور اس پر مہر کی اور گواہ بنہرائے۔ پھر ان کا خدا کو باروک کے حوالے کر دیا۔

”ان کو مٹی کے برتن میں رکھنا تاکہ یہ بہت دنوں تک محفوظ رہیں کیونکہ رب الافواج اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ اس ملک میں پھر گھروں اور کھیتوں اور تانکوں کی خرید و فروخت ہوگی۔“

اس کے بعد حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے دعا کی۔

”یہ شہر تھوڑے کے حوالے ہونے کو ہے۔... اے خداوند تو نے مجھ سے فرمایا اور میں نے نقد چاندی دے کر کھیت خرید لیا اور گواہ بنہرائے حالانکہ یہ شہر کس دیوں کے حوالے کر دیا گیا۔“

☆☆☆

صدقہ، حضرت یرمیاہ علیہ السلام سے آخری ملاقات کر کے لوٹا تھا۔ اس ملاقات میں حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے نہایت سخت باتیں کہی تھیں۔ انہوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔

”میں نے جو کچھ کہا آپ نے اس پر قہنہ نہیں کیا۔ اب میں آپ کی آنکھیں ملٹ میں رکھی دیکھ رہا ہوں۔ جو آنکھیں دیکھی نہ سکیں ان کے رہنے کا فائدہ ہی کیا۔“

یہ باتیں ہی تھیں جنہیں سن کر اس کا غصہ آسان سے باتیں کرنے لگا تھا۔ اس نے آتے ہی فوجوں کو باہر نکل کر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔

”نوکلہ نصر کی شان و شوکت میرے قدموں تلے۔ دیکھتے ہوں یرمیاہ علیہ السلام کی باتیں کتنی جگہ ہیں؟ ہا ہر کھو اور دشمن کے دانت کھٹے کر دو۔“

یہ صرف حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی گفتگو کا ہی نتیجہ نہیں تھا بلکہ اب اس کے سامنے دو ہی راستے رو گئے تھے۔ ہتھیار پھینکنا یا مقابلہ کرنا۔ خوراک کے ذخیرے بالکل ختم ہو گئے تھے۔ اب بھی وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچتا تو رعایا لوٹ مار پر اتر آتی۔ جو کچھ دشمن کی فوج نے کیا، عوام کے ہاتھوں ہو جاتا۔

کھلے ہوئے سپاہیوں نے غم مان تو لیا لیکن ان میں اتنی سکت نہیں تھی کہ دشمن کو ایک قدم بھی پیچھے دھکیل سکتے۔ پھر بھی وہ چاہنا زاری سے لڑے۔ مگر اہم سردار اس حملے میں خاک چاٹنے پر مجبور ہو گئے۔ صدیقہ کی فوج پیچھے ہٹتے ہٹتے دروازے کھلے چھوڑ کر خود ہی شہر میں داخل ہو گئی۔ ان کا تقاب کرتے ہوئے باہل کی فوج بھی ہمتی ملی آئی۔

فوجیوں نے داخل ہوتے ہی قتل عام شروع کر دیا۔ یہودیوں کا خون بہنے لگا۔ بیکل سیمانی کو آگ لگا دی گئی۔ جتنی عروق لوٹ لیے گئے۔ خداوند کے گھر کے خزانے، بادشاہ اور سردار کے خزانے سب لوٹ لیے گئے۔ یروشلم میں جتنے ملامت تھے، سب جلادے۔ آسمان کی طرف اٹھنے والے آگ کے شعلوں اور زمین پر بہتے ہوئے خون کے سوا وہاں کچھ نہ تھا جو باقی چتا۔

بادشاہ ابھی تک کسی کو نہیں ملا تھا جبکہ نوکلہ نصر کا حکم تھا کہ صدیقہ کو زندہ گرفتار کر کے اس کے حضور پیش کیا جائے۔ اس کے سپاہی اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔

ڈھونڈنے والے فوجیوں نے بالآخر شاہی باغ کے برابر، دو فصیلوں کے درمیان وہ خفیہ راستہ تلاش کر لیا جہاں سے کہا جاسکتا تھا کہ بادشاہ فرار ہوا ہوگا۔ فوجوں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ اس کے بیٹے اور شرفا کی ایک جماعت پر بیگناہی ملائے تک پہنچ چکی تھی کہ فوجیوں نے گھیر ڈال لیا۔ یہ فوجی تعداد میں زیادہ نہیں تھے۔ بادشاہ اور اس کے ساتھی باغ بھی تھے لیکن اتنی ہمت نہیں تھی کہ کھوار میں قیام سے نکلتے۔ اس کے برخلاف ان معمولی سپاہیوں کے سامنے گولہ زار زندگی کی بھیک مانگنے لگے۔ فوجیوں کو بھی مذاق نہ تھا۔ انہوں نے کہا، ایسے نہیں۔ سب زمین پر بیٹھ کر ہمیں نفسی سجدہ کرو پھر ہم نہیں جانے دیں گے اور اپنے سرداروں سے کہیں گے کہ وہ فرار ہو گئے۔ ہمارے ہاتھ نہیں آئے۔

سب سے پہلے صدیقہ نے اپنا سر زمین پر رکھا۔ اس کی دیکھا دیکھی سب نے پیشانیاں ٹیک دیں اور سپاہی قہقہے برساتے لگے۔

صدیقہ یقیناً اس وقت سوچ رہا ہوگا کہ اگر حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی بات مان لی ہوتی تو اتنی ذلت نہ ہوتی، جواب ہو رہی ہے۔ بہر حال وہ اب بھی خوش ہوگا کہ جان بچوت جائے گی۔

انہوں نے پیشانیاں اوپر اٹھائیں تو ماجرا ہی دوسرا تھا۔ گردن اٹھاتے ہی گردنوں میں طوق پڑ گئے۔ ان کے کھنوں میں رسیاں ڈال دی گئیں۔

نوکلہ نصر اس وقت رملہ میں اپنا تخت چھائے چھائے چھائے۔ ان سب قیدیوں کو اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ نوکلہ نصر نے ان لوگوں پر انفر ڈالی اور صدیقہ کو پکچھانے میں اسے دیر نہیں گئی۔

”تیرے بیٹے کہاں ہیں؟“ نوکلہ نصر نے پوچھا اور صدیقہ کی نشانی دی پر انہیں الگ کر لیا۔

”مجھے اپنے بیٹے بہت عزیز ہوں گے۔“

”بیٹے کے عزیز نہیں ہوتے۔“

”وہ بھی تو کسی کے بیٹے ہوں گے جو تیری ہٹ دھرمی کی وجہ سے میرے لشکر کی کھواروں کا نشانہ بنے۔ اگر میں ان کے خون کا بدلہ تیرے بیٹوں سے لوں؟“

صدیقہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ نوکلہ نصر نے اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے بیٹوں کو ذبح کیا اور یہود اور کے سب امرا بھی رملہ میں قتل کر دیے گئے۔

”نوکلہ نصر اس خوبی میل سے منت چکا تو صدیقہ اسے مخاطب ہوا۔“ کیا تیرے درمیان کوئی نمی نہیں تھا جو تجھے سیدھی راہ دکھا؟“

”اس کا تو تیرا ہی یہ تھا کہ منہوں خبریں سنا رہے۔“

”پھر آج تو کیا دیکھ رہا ہے؟“

”اس کی منہوں خبریں حرف بہ حرف درست ثابت ہو رہی ہیں۔“

”اس نے آخری بات تجھ سے کیا کی تھی؟“

”میری آنکھیں تیری پشت میں رکھی جا چکی گی۔“

”اگر میں اس پر عمل کر لوں؟“

”میں تیرے قابو میں ہوں۔ یوں بھی اب کیا رہ گیا ہے جو ان آنکھوں سے دیکھوں گا۔“

”تو نے سچ کہا۔ جو آنکھیں خدا کی نشانیں کو نہ دیکھ سکیں ان کا نہ رہتا ہی ٹھیک ہے۔“

نوکلہ نصر نے فوراً حکم دیا کہ صدیقہ کی دونوں آنکھیں نکال لی جائیں۔ اس کے ساتھ ہی حکم دیا کہ یرمیاہ نبی کو جو یروشلم میں قید ہے اس کے سامنے پیش کیا جائے۔

حضرت یرمیاہ علیہ السلام قید خانے سے رملہ لے جائے گئے تو ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ نوکلہ نصر ان سے نہایت تپاک سے ملا اور حکم دیا کہ ہتھکڑیاں کھول دو۔

”میں یروشلم کے ہزار ہا افراد کو غلام بنا کر باہل لے جا رہا ہوں۔ کیا آپ ہمارے ساتھ چلیں گے؟“

حضرت یرمیاہ نے اس پیشکش کو ٹھکرا کر وہیں قیام کا فیصلہ کیا۔

”آپ یہاں رہ کر کیا کریں گے۔ یہ اب شہر نہیں ویرانہ ہے۔“

”میں اس شہر کے آباد ہونے کا انتظار کروں گا۔“

”آپ تو نبی ہیں کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اب اس ویرانے کو کوئی آباد نہیں کرے گا اور اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو کیا آپ اسے دیکھنے کو زندہ ہو گئے؟“

”میں رہوں یا نہ رہوں لیکن اتنا جانتا ہوں، ایک بادشاہ باہل پر چڑھائی کرے گا۔ اس وقت تک میری قوم سزا کے دن پورے کر چکی ہوگی۔ یہ بادشاہ انہیں آزاد کر دے گا اور یروشلم دوبارہ آباد ہو جائے گا۔ میرے خدا کا مجھ سے یہی وعدہ ہے اور اس وعدے کے ایفا کا مجھے انتظار ہے۔“

”آپ کی مرضی۔ جن لوگوں کو میں غلام بنا کر لے جا رہا ہوں۔ شاید وہ اس وقت تک رہا ہو جائیں۔“ نوکلہ نصر نے کہا پھر کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”میں تجھے رہائی دیتا ہوں۔ اگر میرے ساتھ باہل چلنا منظور ہو تو باہل اگر باہل چلنا تیری نظر میں برا لگے تو نہیں رہا اور جو غریب اور کھیتوں میں کام کرنے والے یہاں رہ گئے ہیں ان کے ساتھ رہ۔ دیکھ میری صلاح یہ ہے کہ تو جدلیاہ بن اختتام کے پاس چلا جاتے ہیں۔ یہوداہ کے شہروں کا حاکم کیا ہے۔ ویسے تیری مرضی جو آزاد ہے۔“

حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے اس تجویز کو پسند کیا اور جدلیاہ کے پاس مصفاہ چلے گئے اور ان لوگوں کے درمیان رہنے لگے جو اس ملک میں باقی رہ گئے تھے۔

یروشلم ایک کمزور تھا جو ابھی تک سگ رہا تھا۔ فلتہ درود یوار پر وحشیانہ رقص کر رہی تھیں۔ بیت المقدس کے ستون ٹوٹے پڑے تھے، محکم منی کے پہاڑ ٹکڑے ہو گئے تھے۔ اس دہکن کا سارا زور نوچ لیا گیا تھا۔

نوکلہ نصر چار ہزار سے زیادہ یہودیوں کو اسیر بنا کر، بھیل بکریوں کی طرح بانک کر باہل کی طرف لے گیا۔ اس قافلے میں زخمیوں میں جھڑا ہوا شہداء، صدیقہ بھی تھا۔ خوب نام تھا۔ اس طرح وہ بظاہر متنازعہ پیش گوئیاں پوری ہو جاتی ہیں کہ صدیقہ اس ملک کو نہیں دیکھ سکے گا جہاں اسیر ہو کر جائے گا۔

☆☆☆

حضرت یرمیاہ علیہ السلام مصفاہ میں رہ رہے تھے اور ان سکینوں سے مخاطب تھے جو اسیر ہو کر باہل نہیں گئے تھے۔

”تم کس دیوں (باہل کی ایک قوم) کی خدمت گزار سے نہ ڈرو۔ اپنے ملک میں بسو اور شاہ باہل کی خدمت کرو تو تمہارا ہلا ہو۔“

حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی موجودگی نے تیز تر یہودیوں کو متوجہ کرنے میں بڑا کردار ادا کیا۔ وہ سب جو مختلف علاقوں میں ادھر ادھر بک رہے تھے مصفاہ پہنچنے لگے۔

یہ شہر یہودیوں کی ایک چھوٹی سی ریاست بن گیا تھا کہ بعض دیوتا کے پجاریوں نے ایک سردار اسمعیل بن یحییٰ کو استعمال کیا اور سازش کر کے جدلیہ کو سردار دیا۔

جدلیہ کے قتل کے بعد اسمعیل کا خیال تھا کہ وہ ان اسیر یہودیوں کو اپنے علاقے عمون میں لے جائے گا لیکن ایک اور سردار یوحنا نے انہیں چھڑا لیا لیکن اب وہ مصفاہ میں جا سکتے تھے۔

اچانک تدبیریں کے باعث باقی ماندہ لوگ سخت بے دل ہوئے۔ چند مہینوں میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ انہوں نے یروشلم کو کھنڈر بننے دیکھا اور اب مصفاہ میں ان کی نفی رہائش گاہیں بھی ان سے چھین لی گئیں۔ اب انہیں رہنمائی اور ہدایت کی سخت ضرورت تھی چنانچہ وہ یرمیاہ علیہ السلام کی طرف رجوع ہوئے۔

یہ لوگ بائبل سے خوفزدہ تھے اور مصر جانا چاہتے تھے۔ وہ حضرت یرمیاہ علیہ السلام کو بھی اس ہجرت پر آمادہ کرنے پر تھے ہوئے تھے لیکن یرمیاہ علیہ السلام اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے خدائی کہ مستقبل کے بارے میں خدا سے دریافت کرو۔ اپنے لوگوں کی درخواست پر حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے خدا سے دعا کی۔

”خود دیکھتا ہے ہم بہتوں میں سے چند ہی رہ گئے ہیں۔ ہمیں بکھرے ہوئے۔ تو ہمیں وہ راہ دکھا کہ ہم آئندہ نسلوں کے لیے مثال بنیں۔“

دس دن کے طویل انتظار کے بعد اس دعا کا جواب آگیا۔ خدا نے فرمایا۔ ”اگر تم اس ملک میں ٹھہرے رہو گے تو میں تم کو برباد نہیں بلکہ آباد کروں گا اور اکھاڑوں گا نہیں بلکہ لگاؤں گا۔ شاہ بائبل جس سے تم ڈرتے ہو نہ ڈرو کیونکہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر تم واقعی مصر میں جا کر بسنے پر آمادہ ہو تو میں ہوں گا کہ وہ نکوارجس سے تم ڈرتے ہو ملک مصر میں تم کو تلاش کرے گی اور وہ کال جس سے تم ہراساں ہو مصر تک تمہارا پیچھا کرے گا۔“

حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے یہ تمام باتیں ان تک پہنچا دیں۔ ان لوگوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ مصر جانے کا فیصلہ کر چکے تھے لہذا اب کوئی بات ان کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ پیغام خدا نے نہیں دیا ہے بلکہ تم اپنے دل سے گھڑتے ہو اور مصر جانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ جب یرمیاہ علیہ السلام اور ان کے شاہی پاروک نے دیکھا کہ سارے لوگ مصر کو جا رہے ہیں تو انہیں بھی ان کے ہمراہ ہونا پڑا۔ فلسطین اب یہودیوں سے بالکل خالی ہو گیا۔

مصر پہنچ کر حضرت یرمیاہ علیہ السلام پر خدا کا کلام نازل ہوا۔ اس وحی کے بعد یرمیاہ علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ انہیں ممانعت کے باوجود مصر کیوں لایا گیا ہے۔ خدا فرما رہا تھا۔

”بڑے پتھر اپنے ہاتھ میں لے اور ان کو فرعون کے قتل کے مدخل پر یہوداہ کی آنکھوں کے سامنے چھپانے سے فرس میں لگا اور ان سے کہہ کہ رب الانواج اسرائیل کا خدا میں فرماتا ہے کہ دیکھو میں اپنے خدمت گزار شاہ بائبل کو نکال کر بلاؤں گا اور ان پتھروں پر جن کو میں نے لگا یا ہے اس کا تخت رکھوں گا اور وہ ان پر اپنا کالین بچائے گا اور وہ آکر ملک مصر کو شکست دے گا۔“

مصر میں آنے کے بعد ان یہودیوں نے وہ سب کچھ بھلا دیا جو ان پر گزرا تھا۔ وہ دیدہ دلیری سے کہنے لگے اے یرمیاہ! ہم تیری بات نہیں مانتے گے۔ ہم پر مصیبت اس لیے آئی کہ ہم نے آسمان کی ملکہ کی پرستش کرنا چھوڑ دی تھی۔ حضرت یرمیاہ علیہ السلام انہیں سمجھاتے رہے لیکن وہ نہ مانے۔

خدا کا کلام نازل ہوا۔ ”یہوداہ کے سب لوگ جو ملک مصر میں ہیں نکو اور کال سے ہلاک ہوں گے یہاں تک کہ وہ بالکل نیست و نابود ہو جائیں گے اور نکو تھوڑے سے خفا کر ملک مصر سے یہوداہ کے ملک میں واپس آئیں گے، تھوڑے سے ہوں گے۔ دیکھو میں فرعون مصر کو اس کے مخالفوں اور جانی دشمنوں کے حوالے کر دوں گا جس طرح میں نے شاہ یہوداہ صدفیا کو شاہ بائبل کے حوالے کر دیا۔“

اس کے بعد بھی ان کی قوم اپنے مشرکانہ خیالات پر ڈٹی رہی اور ان رسوں کی طرف دوبارہ لوٹ گئی جن کی وجہ سے یروشلم میں ان پر مصیبت آئی تھی اور وہ ہر سے بے گھر ہوئے تھے۔

اب ان کی اصلاح کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ان کی تباہی ان کا مقدر بن گئی تھی۔ وہ کھٹکتا اذیت ناک ہوتا ہے جب کسی قوم سے خدا مایوس ہو جائے۔ یہی اس قوم کے ساتھ ہوا۔

خدا نے اپنے نبی کو ان کے درمیان سے بٹالیا۔ حضرت یرمیاہ علیہ السلام کو غالباً عجم ملا ہوگا کہ آپ اپنی گدھی پر سوار ہوئے اور مصر سے فلسطین آ گئے۔ یروشلم سے گزر ہوا تو دل دھک سے رہ گیا۔ نہ کوئی یمن تھا نہ مکان و محل مسافر، شاہ و عمارتیں

ہلے کا ڈھیر، پردوں نے لاشوں کا گوشت فوج لیا تھا لیکن ہڈیاں اب بھی پڑی تھیں۔ ہولناک سنا تھا اور چیخ چلاتی ہوا میں۔ آپ کی فریاد دلجو بن گئی۔

وہ سختی جو طاقت سے معمولی تھی یہی خالی پڑی ہے

وہ خاتون اقوام یہودی ہو گئی

وہ ملکہ ممالک باکبار بن گئی

وہ رات کو زار زار روتی ہے

اس کے آنسو رخساروں پر بہتے ہیں

اس کے چاہنے والوں میں کوئی نہیں

جو اسے ٹکی دے

اس کے سب دوستوں نے اسے دعا دی

وہ اس کے دشمن ہو گئے۔

☆☆☆

سو کیا ہے آپ ہو گیا، کندن کیسا بدل گیا

مقدس کے پتھر تمام گئی کوچوں میں پڑے ہیں

گیدڑ بھی اپنی چھاتیوں سے

اپنے بچوں کو دودھ پلاتے ہیں

لیکن میری دختر قوم

بیابانی شرمسرا کے آئندہ بے رحم ہے

شیر خوار کی زبان بیاس کے مارے تالو سے جا گئی

بچے روٹی مانگتے ہیں لیکن ان کو کوئی نہیں دیتا۔

☆☆☆

آپ مردوں کی ہڈیوں کے ڈھیر پر کھڑے تھے۔ خدا کے الفاظ ان کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ”میں یہوداہ اور اسرائیل کو اسیری سے واپس لائوں گا اور ان کو پہلے کی طرح بناؤں گا۔“

اس کلام پر یقین بھی تھا لیکن وہ پھر بھی سوچ رہے تھے کہ ایسا کھنڈر اور تباہ حال دیر اندہ کیسے آباد ہوگا اور یہ مردہ بستی کس طرح دوبارہ زندگی اختیار کرے گی۔ میں دیکھ سکتا تو مجھے یقین آ جاتا۔

آپ اپنے گدھے کو لے کر جنگل میں چلے گئے۔ گدھے کو ایک درخت سے باندھ دیا۔ اپنے ساتھ لائے ہوئے انجیر اور انجور کا شیر و ایک طرف رکھ کر وہیں زمین پر لیٹ گئے۔ نیند کا ایسا نلبہ ہوا کہ ہوش ہی نہ رہا۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی آنکھوں کو آپ سے کھیر دیا۔ کوئی بھی آپ کو نہ دیکھ سکا۔

آپ کی آنکھ کھلی تو دن چڑھ چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا، بتاؤ کتنے عرصہ اس حالت میں رہے ہو؟ آپ نے جواب دیا

ایک دن یا اس سے بھی کم۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ایسا نہیں بلکہ تم سو برس تک اسی حالت میں رہے ہو۔ اب تم اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو کھ لو ان میں ذرا تغیر نہیں ہوا اور اپنے گدھے کو بھی دیکھو۔ آپ نے دیکھا تو گدھے کی جگہ ہڈیوں کا ڈھانچا پڑا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ان ہڈیوں پر گوشت آگیا اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آوازیں لگاتے لگے۔ سورہ بقرہ میں اس واقعے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

”اور کیا تم نے اس شخص کا حال نہ دیکھا جس کا ایک بستی پر گزر ہوا چنانچہ پتھروں سمیت زمین پر ڈھیر تھا تو وہ کہنے لگا، اس بستی کی موت کے بعد اللہ تعالیٰ کس طرح اس کو زندگی دے گا؟ پس اللہ نے اس شخص پر سو برس کی موت طاری کر دی اور پھر زندہ کر دیا۔“

اللہ نے دریافت کیا تم یہاں کتنی مدت پڑے رہے؟ اس نے جواب دیا، ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ اللہ نے کہا، ایسا نہیں ہے بلکہ تم سو برس تک اسی حالت میں رہے ہو۔ پس تم اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ وہ بگڑی تک نہیں اور پھر اپنے



کیا۔ اس کے ذہن پر ایک ہی چیز سوار تھی وہ دوشیزہ جسے اس نے بار میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔

میٹ واپس پیچھے پٹھا اور سیدھے پار کا رخ کیا۔ جب وہ بار میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ خود دوشیزہ تھا نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک مرد بھی بیٹھا ہوا تھا جو اس سے کہہ رہا تھا۔

”کم آن وہی ایہ چشم پوشی اچھی نہیں۔ میں تمہارے لیے ڈرنک کا آرڈر دیتا ہوں۔ تم ایک بار مجھے جان لوگی تو اس طرح تجاہل سے کام نہیں لوگی۔ تم مجھے پسند کرو گی۔ ہر کوئی مجھے پسند کرتا ہے۔“

میٹ اس دوران ایک خالی میز پر بیٹھ چکا تھا۔

اس کی نگاہیں ایک بار پھر اس نوجوان خوب رو حسینہ کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔

وہ دوشیزہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے، تم کہاں جا رہی ہو؟“ اس کے غیر مطلوبہ ساتھی نے قدرے تیزی سے پوچھا۔

دوشیزہ میٹ کی میز پر آکر رگ گئی اور بولی۔ ”ہائے! میں نے جنہیں اندر آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے ہم دونوں ایک دوسرے کو کس کر گئے۔“

پھر وہ دوشیزہ میٹ پر اس طرح جھک گئی کہ اس کی سنہری دھنسیں میٹ کے چہرے سے ٹکرائیں۔ ساتھ ہی اس نے میٹ کے کان میں سرگوشی کی۔ ”پلیز مجھے تمہاری دیر کے لیے اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت دے دیں۔ بار میں موجود وہ گھنٹاؤں میں مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا۔“

میٹ نے اس دوشیزہ کی چمکدار نیلی آنکھوں میں جھانک کر متوجہ نہ انداز میں ہنسی ہوئی اور اس کے جواب کی منتظر رہی۔

”یہ خوشی!“ میٹ نے اٹھ کر اس کے لیے کرسی تھپینے ہوئے کہا۔

تب بار میں بیٹھا ہوا وہ شخص آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کی میز پر آگیا۔

”تو یہ تمہارا دوست ہے؟“ اس نے دوشیزہ سے مخاطب ہو کر تجھے لہجہ میں کہا۔

”ہاں۔“ دوشیزہ نے جذبات سے عاری لہجہ میں جواب دیا۔

تب میٹ تیزی سے بولا۔ ”اگر آپ پرانے نامیں تو ہمیں تنہا رکھنا ہے۔“

”میں کچھ رہا ہوں۔ بہر حال میں بیٹھنے کے لیے اس سے بہتر اور جگہیں بھی ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ شخص وہاں

سے چلا گیا۔

”خیر!“ اس دوشیزہ نے میٹ سے کہا۔ ”میں محض نہیں ہونا چاہتی تھی لیکن مجھے کسی نہ کسی طرح اس سے جان چھڑانا مقصود تھی اور آپ ایک اچھے آدمی دکھائی دے۔“

میٹ یہ سن کر مسکرا دیا۔ یہ جملہ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار سن چکا تھا۔

دوشیزہ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس کی انگلیوں کے ناخن خوب صورت تراشیدہ تھے۔

”میرا نام تانیا ہے۔“ اس دوشیزہ نے ایک دل آویز مسکراہٹ نکھیرتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک ماڈل ہوں اور کل صبح یہاں میرا ایک فیشن شو ہونے والا ہے۔“

میٹ نے اس کا مصافحے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ قلم لیا اور بولا۔ ”میرا نام میٹ ٹائمر ہے اور میں بھی یہاں بزنس کے مسئلے میں آیا ہوا ہوں۔ چونکہ آج کی شب ہم دونوں ہی تنہا ہیں تو پھر ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میرے خیال میں کارنر پر جو ریستورنٹ ہے وہاں قرض کا انتظام بھی ہے۔“

”یہ تو بہت عمدہ رہے گا۔“ تانیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی اس کے رخساروں پر دو ڈھیل نمایاں ہو گئے۔

میٹ سوچنے لگا کہ کیا تانیا کو اس بات کا علم ہے کہ اس کی مسکراہٹ کے ساتھ ابھرنے والے ڈھیل کتنی اچلی رکھتے ہیں؟ وہ کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر پارکاش ادا کرنے کے بعد وہ دونوں بول سے نکل کر بیٹھے ہوئے پلاک کے کارنر پر واقع ریستورنٹ کی جانب روانہ ہو گئے۔ بول کی لابی سے باہر قدم رکھتے ہی انہیں فضا میں ٹھکی کا احساس ہوا۔ تانیا نے اپنا بازو میٹ کی ہاتھوں میں ڈال دیا تھا۔ تانیا کے جسم کی حدت اسے اپنے کوٹ کے پار بھی محسوس ہو رہی تھی۔

رات تیزی سے بیت رہی تھی۔

ایک عمدہ ڈنر کے بعد وہ دونوں دیر تک ہاتھوں میں ہاتھیں ڈالے قرض کرتے رہے۔

پھر اچانک تانیا چوتھے ہوئے بولی۔ ”اوہ، مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ اتنی رات ہو چکی ہے۔ مجھے واپس جانا ہوگا۔“ ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر ایک معذرت آمیز مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”مجھے صبح جلدی لگتا ہے۔“

”کیا تم دن بھر مصروف رہو گی؟“ میٹ نے پوچھا۔ وہ اس وقت تک ایک دوسرے سے غامضے سے گفتگو کر رہے تھے۔

”میرا خیال ہے کہ مجھے شاید فی فرسٹ مل سکے۔“ تانیا نے اپنی ڈھیل آمیز مسکراہٹ سے جواب دیا۔

پھر وہ دونوں ریستورنٹ سے نکل کر پیدل میٹ کے بول

واپس آگئے۔ جب وہ لابی میں پہنچے تو میٹ نے فیصلہ کیا کہ کچھ جاننے کا کچھ وقت بھی ہے۔ وہ رستورنٹ ہوتی ہے یا نہیں؟

”کیا سونے سے پہلے ایک گرم شراب کے لیے تم میرے کمرے میں آہندہ کرو گی؟“ میٹ نے پوچھا۔

تانیا کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

”مجھے آنا تو نہیں چاہیے لیکن شاید میں ایک اچھے دوست کی پیشکش کو ٹھکرانیں سکتی۔“ یہ کہہ کر وہ کاؤنٹر کی جانب گھوم گئی اور بولی۔ ”لیکن اس سے پہلے میں کاؤنٹر پر یہ چیک کرنا چاہتی ہوں کہ میرے لیے کوئی پیغام تو نہیں ہے۔ جب تک تم ادھر اپنے کمرے میں جا کر مشروب کا آرڈر دو۔ میں تمہارے کمرے میں پہنچ جاؤں گی۔“ تانیا نے اسے حوصلہ افزا نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے!“ میٹ نے سر ہلا دیا۔ ”تم سے چند لمحوں میں دوبارہ ملاقات ہوگی۔“

یہ کہہ کر میٹ لفٹ کی جانب چل دیا۔ ساتھ ہی اس کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے اپنے پتے درست پسینے لگائے تو یہ بازی اس کے حق میں رہے گی جیسا کہ اس نے منصوبہ بنایا تھا۔

اس جدوجہد کی سسٹی اسے اپنی شریاٹوں میں دوڑتے ہوئے خون کی پیش سے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جلد از جلد اپنے کمرے میں پہنچنے کے لیے بے چین تھا۔ لفٹ میں سوار ہونے کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ جیسے لفٹ نے اس کے ٹھونک پیچھے میں ایک عرصہ لے لیا ہو۔

اپنے فلور پر پہنچ کر وہ تیز حیرتوں سے اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔

کمرے کے دروازے پر پہنچ کر میٹ بے تابی سے اپنی جیبیں ٹوٹنے لگا۔ پھر چابی ہاتھ میں آتے ہی اس نے تالا کھولا اور ایک جھٹکے سے دروازے کو کھلی دیا۔

کمرے کا منظر دیکھ کر اس نے ہنسی کا حیرت آمیز جھوڑ کر لیا تھا۔ اس کا سوٹ کیس بستر پر کھلا پڑا تھا اور چیزیں بیڈ پر بکھری ہوئی تھیں۔ میٹ سوٹ کیس کا جائزہ لے بغیر بھانپ گیا کہ اس کے اندر رکھی ہوئی تمام گرم غائب ہو چکی ہے۔

وہ تیزی سے پلٹا اور لفٹ کی جانب لپکا۔

جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو لفٹ کا دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ نیچے لابی میں پہنچ کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔

تانیا کا کیمس نام نشان نہیں تھا۔

تب وہ ڈیک ٹرک کے پاس پہنچا۔ ”کیا کچھ دیر

پہلے سنہری بالوں والی ایک نوجوان دوشیزہ نے تم سے اپنے پیغامات کے بارے میں دریافت کیا تھا؟“ میٹ نے ٹرک کے لیے پوچھا۔

ٹرک کے چہرے پر ابھرنے کے جراثیم ابھر آئے۔

”نہیں سرا!“ اس نے جواب دیا۔ ”کچھ دیر پہلے تک تو یہاں میرے پاس کوئی بھی نہیں آیا۔“

ٹرک کے جواب نے میٹ کے شہجے کی تصدیق کر دی۔

یہ پہلے سے طے شدہ ایک چال تھا جس میں اسے پھنسا دیا گیا تھا۔ بار میں موجود شخص تانیا کا ساتھی تھا۔ جس دوران تانیا نے اسے اپنے ساتھ مصروف رکھا تھا، اس دوران اس کا ساتھی اس کے کمرے کا تالا کھول کر اس کی لفٹ کی اور دیگر قیمتی سامان لوٹنے میں کامیاب رہا تھا۔ یہ سب ایک طے شدہ منصوبے کی کارروائی تھی۔

اور تانیا نے مفت میں اس سے ایک عمدہ ڈنر بھی لے لیا تھا۔

یہ ایک قدیم چال تھی۔ ایک خوبصورت لڑکی اور ایک بھولا بھالا شخص۔ اور اس نے چمکی کی طرح ان کی ذور کے چارے کو گل لایا تھا اور ان کا شکار بن گیا تھا۔

ان کا میٹ اب پرانیٹ تھا اور میٹ تھوٹے مشق بن چکا تھا۔

”کیا میں تمہارا فون استعمال کر سکتا ہوں؟“ میٹ نے کاؤنٹر ٹرک سے کہا۔

”نہیں سرا!“ ٹرک نے ایک جھٹکا ہوا فون سیٹ اس کی جانب بڑھا دیا۔

میٹ نے تیزی سے ایک نمبر ڈائل کیا۔

”نہیں؟“ دوسری جانب سے ایک درشت آواز سنائی دی۔

”سارنٹ؟“ میں میٹ کا کٹز بول رہا ہوں۔ کیا انہیں دھریا گیا ہے؟“

”یقیناً وہ دھرے چھاپ گئے ہیں۔ اس جوڑے کے بارے میں آپ کا گمان بالکل صحیح تھا، لیفٹیننٹ! راجہ نے ابھی ابھی فون کیا تھا۔ ان لوگوں نے لابی سے اس لڑکی کا تعاقب کیا جو آگے سوگ پر جا کر اپنے اس ساتھی سے مل گئی جو وہاں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ کے کمرے سے چوری کی ہوئی تمام چیزیں ان کی کار میں موجود تھیں۔ ہم نے انہیں واپس دھریا اور سہا سہ کر دیا۔ ان کا تعلق ای گروہ سے لگتا ہے جو بول میں قیام کرنے والے ہیں اور تنہا تاجروں کو لوٹا کرتے تھے۔ شاید اب اس گروہ کا قلع قمع ہو جائے۔“

”گمہ ورک، سارنٹ!“ میٹ نے سناٹے لہجہ میں کہا۔ ”تم سے ہیڈ کوارٹر میں ملاقات ہوگی۔“

ٹارگٹ کلنگ

احمد اقبال

قدم قدم، غلغلہ، بل بل خوف و ہراس کے درمیان گہری حیرت کا وحشت اور اندھا نا

جب ٹھنڈی چھانٹوں سے کوئی ایک دم دھوپ میں آجائے... جب بیمار کی کتاب سے زندگی کا ورق پھٹ جائے... جب انمول شے بے مول ہو جائے تو ہر چیز سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ گمان پر بار کھتا ہے... سفر یہ کس بلا کا ہے... نہ جانے کس جگہ جاؤں یہ سب رستے ہی کھو جائیں، بچھڑ کر ہم کہاں جائیں۔ غبارِ راہ ہو جائیں، مگر ہے زندگی باقی، تو پھر اک داستان ہوگی... اور جب زندگی ہی نہ رہے تو فقط داستان رہ جاتی ہے۔ جسے دل تنہائی میں بار بار دہرائتا رہتا ہے... وہ بھی دہرا رہی تھی اور ساتھ ہی سقم بھی تلاش کر رہی تھی اور ایک دن... بالآخر اس کے ہاتھ وہ سرا لگ ہی گیا جس کی بدولت اس کی زندگی کی داستان ادھوری رہ گئی... خواب بکھر گئے اور محبت کا تاج محل چمکا چور ہو گیا... اس کا محبوب، اس کا شریک سفر جب ایذی نیند سویا تو وہ پڑنا کر جاگ اٹھی اور جب اس نے دکھتے ہوئے کانچ کے ٹکڑوں کو آئینہ بنایا تو اسے وہ خاص چہرہ بھی نظر آگیا جس کی اسے تلاش تھی۔



وقار کا فون دوپہر کے بعد سے بند تھا۔ اگرچہ وقفے وقفے سے اس نے کئی بار کوشش کی لیکن ہر بار سے وہی غیب کیا ہوا جواب سننے کو ملا تھا۔ "معاف کیجیے آپ کے لمائے ہوئے نمبر سے فی الحال رابطہ ممکن نہیں۔"

یہ کوئی انوکھی یا انہونی بات نہیں تھی۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔ وہ بھی کاروباری میننگ کے دوران میں اپنا موبائل فون بند کر دیتا تھا اور پھر آن کرنا پھول جاتا۔ تاہم اس سے دفتر کے فون نمبر پر بات ہو جاتی تھی۔ دفتر میں ایک ہی فون تھا جو دفتر سمیت آٹھ افراد استعمال کرتے تھے۔ لہذا یہ نمبر اکثر مصروف تھا تھا۔ وہ بھی وقار سے کہتی تھی کہ آخر یہ کیا مصیبت ہے۔ آج کل تو فون... ٹکشن اتنی آسانی سے مل جاتے ہیں اور پھر وائرس فون ہیں کہ بازار سے اٹھاؤ اور استعمال شروع کر دو۔ تو وقار ٹال جاتا تھا کہ بلبل جان یہ دفتر کے معاملات ہیں، دفتر والے جانیں۔ میرا دفتر ہوتا تو ایک لائن صرف تمہاری آواز سننے کے لیے وقف کر دیتا۔ جیسے وی آئی ٹی لوگوں کی بات لائن ہوتی ہے۔ ہاں موبائل نمبر آن کرنا مجھے یاد نہیں رہا۔ اس کے لیے قصور وار ہیں۔ آئندہ یہ لگتی نہیں ہوگی۔ لیکن مینے میں ایک دو بار ایسا ہو جاتا تھا۔

آج بھی کچھ ایسا ہی مسئلہ ہوا تھا موبائل فون سے مایوس ہو کے اس نے آفس کا نمبر ملا تو ہر بار وہی انجنگ فون سنائی دی۔ بات اتنی اہم نہیں تھی۔ زیادہ تر شادی میں شرکت کا دعوت نامہ میز پر پڑا ہوا دیکھ لیا تھا۔ وہ نہ دعوت نامہ دینے والے کو جانچتی تھی اور نہ وقار نے اس سے کہا تھا کہ تیار رہے۔ رات کو ایک تقریب میں جانا ہے۔ ایسے دعوت نامے آتے ہی رہتے تھے جو غیر اہم سمجھے کہ نظر انداز کر دیے جاتے تھے۔

اصل بات یہ تھی کہ آج ان کی شادی کی سالگرہ کا دن تھا۔ وقار میں اچھے شوہروں والی بہت سی عادتوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ نہ وہ زیادہ کی سالگرہ بھولتا تھا اور نہ اپنی شادی کا دن۔ اس دن وہ آفس سے خالی ہاتھ واپس نہیں آتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پھولوں کا گلہزست ہوتا تھا جو وہ کسی انداز میں چمک کر اسے پیش کرتا تھا۔ جب وہ شرمائے اور فیس کے پھول لے لیتی تھی تو وہ دوبارہ چمک کر اسے جھد دیتا تھا اور بڑے والہانہ جذبہ بانی انداز میں اسے چومتا تھا۔

خود زیادہ پوری تیاری کے ساتھ وقار کی واپسی کا انتظار کرتی تھی اور لباس کے ساتھ میک اپ کے خصوصی اہتمام سے اپنے خدا داد حسن و شباب کی جلوہ سامانی کا اثر وقار کی محبت میں نظر آتا تو زیبا کا انگ انگ ایک فرد آمر خوشی

سے سرشار ہو جاتا تھا۔ پھر وہ دفتر کے لیے باہر نکل جاتے تھے اور جب کسی قافیہ استار ہوئی کے رون ٹاپ گاؤں ریٹورن سے آجی رات کے بعد لوٹتے تو انہیں لگا کہ ایک بار پھر شب عروسی ان کے لیے چشم براہ ہے۔

زیادہ معلوم تھا کہ وقار شادی کی سالگرہ کو بھول ہی نہیں سکتا اور یہ ناممکن ہے کہ وہ کسی غیر اہم شادی کی تقریب کو اس رات سے زیادہ اہمیت دے۔ جسے سالگرہ کے بجائے شب عروسی کا نام بھی خود اس نے ہی دیا تھا۔ بس وہ اس کی زبان سے یہ سننا چاہتی تھی کہ بلبل جان... ہماری شب عروسی کے مقابلے میں کی تقریب کی کوئی اہمیت نہیں ہو سکتی۔ یہ تم بھی جانتی ہو۔ لیکن اس کی وقار سے بات ہی نہ ہو سکی اور اب رات کے نو بجتے کو تھے، وہ زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک آفس سے لوٹ آتا تھا۔ وہ دروازے کے باہر اس کی گاڑی کے آنے کی آواز پر کان لگائے رہتی تھی۔ ہارن کی آواز کے ساتھ ہی وہ دروازہ کھول دیتی تھی اور وہ مسکراتا ہوا اندر آ جاتا تھا۔ کچھ دیر دم بخود کھڑا اسے یوں دیکھتا رہتا تھا جیسے آج پہلی بار دیکھا ہو۔ پھر جھک کر اسے پھول پیش کرتے ہوئے کہتا تھا۔ "تم کس قدر حسین لگ رہی ہو۔" اور اسے اپنی آغوش میں لے لیتا تھا، سین اسی طرح جیسے برلن کی ہر عورت جانتی ہے کہ اس کا شوہر ایسے ہی محبت کرے، ہمیشہ کرے قطع نظر اس سے کہ ان کی شادی کو کتنے سال ہو چکے ہیں۔ یہ معاملہ نہ عمر کا ہے نہ ماہ و سال کا۔ یہ معاملہ ہے جذبات کا اور اس خوشی کا جو نہ کم ہوگی، نہ بھی ختم ہوگی اور نہ ماند پڑے گی۔ اگر کوئی چاہے، کوئی سمجھے تو... اور وقار اب تک ایسا ہی سمجھتا تھا کہ ان کی شادی کو چھ سال ہو گئے تھے۔ مگر کیا درحقیقت ایسا ہی ہے، یہ خود اس کا فریب آرزو نہیں ہے؟ خواہشوں کا ظلم نہیں ہے؟... ممکن ہے وقار ایک اچھا اداکار ہو، جو جانتا ہو کہ بیوی کو کیسے اتنا خوش رکھا جاسکتا ہے کہ اس کا خیال کسی اور طرف نہ جائے۔ اس کی نظر کچھ نہ دیکھے، اس کی عقل پر جذبات کے پردے پڑ جائیں۔

میوزیکل کلاک کی آواز نے اسے چٹکا دیا، ایک بار پھر اس نے خود کو شرمندہ محسوس کیا کہ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ وقار وہی ہے جو نظر آتا ہے۔ اگر آج بھی وہ اس سے اتنی ہی شرت سے محبت کرتا ہے جتنی شادی سے پہلے کرتا تھا تو اس میں ناممکن کیا ہے۔ اگرچہ آس پاس صرف سال دو سال بعد شادی شدہ جوڑوں کے درمیان اسے ایسی جذباتی وابستگی نظر نہیں آتی تھی۔ کیونکہ وہ رفتہ رفتہ ایک دوسرے کے عادی ہونے لگتے ہیں، پھر یکسانیت سے بیزاری جنم لیتی ہے

اور ان کے اختلافات لڑائی کی صورت میں سامنے آنے لگتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ زیادہ وقار جیسے لمبی جھون دینا میں نہیں بھی نہیں ہوتے۔

اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ رات کے دس بجے تک وقار گھر کیوں نہیں آیا۔ وہ بتائے بغیر کہاں غائب ہے، اس کا آفس تو کب کا بند ہو چکا تھا۔ موبائل فون پر وہ کم سے کم پچاس بار وہی ایک جواب سن کر کے بیزار ہو گئی تھی۔ آخر وہ کس سے پوچھے، کہاں سے معلوم کرے۔ مشکل یہ تھی کہ خود زیادہ سے پاس نہ وقار کے کسی دوست کا فون نمبر تھا اور نہ آفس کے ساتھی کا۔ اسے بھی کسی اور سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وقار اپنے مخصوص وقت پر آفس جاتا اور رات ہونے سے پہلے گھر لوٹ آتا تھا۔ سینے میں چار پانچ مرتبہ وہ کاروباری دوروں پر اسلام آباد آیا لاہور جاتا تھا تو ایک دو دن میں لوٹ آتا تھا۔ سینے دو سینے میں زیادہ اسرار کرتی تھی تو وہ اسے بھی ساتھ لے جاتا تھا۔ وہ کسی بہت عالی شان ہوٹل میں قیام کرتے تھے۔ وہاں زیادہ کے پاس ریٹن اسے کار والوں کی گاڑی ہوتی تھی اور اس کا دن شاپنگ کرتے گزر جاتا تھا۔ وقار کی مصروفیت سارا دن کیا ہوتی تھی، یہ جاننے کی زیادہ تر کوشش ہی نہیں کی۔

اس کی پریشانی اب تشویش میں ڈھلنے لگی تھی۔ بالائی منزل پر کرائے دار تھے، تین سال پہلے رہنا پڑے ہوئے والے پروفیسر صاحب کے ساتھ اب صرف ان کی بیوی تھی۔ ایک بیٹی کو دھست کرنے کے بعد انہوں نے گزشتہ سال بیٹے کی شادی کی تو صرف چھ ماہ میں بھو اپنے شوہر کو لے کر دوسرے گھر میں شفٹ ہو گئی تھی۔ مینا بھر پہلے وہ امریکا شفٹ ہو گئے تھے۔ کیونکہ بیوی گرین کارڈ ہولڈر تھی اور بیٹے نے بھی شادی گرین کارڈ ہی سے کی تھی ورنہ دوبارہ کی طلاق یافتہ اور اسے سے زیادہ عمر کی لڑکی کے قبول ہوتی ہے۔ اب بڑھا بڑھیا اکیلے تھے، وہ زیادہ کی کیا بد کرتے۔ آس پاس رہنے والے بھی سب اپنی دنیا میں مگن لوگ تھے۔ کوئی کسی کے معاملات سے سروکار نہیں رکھتا تھا۔ کچھ تو اخلاقی میں سلام دعا کے بھی رد ادا نہ تھے۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، زیادہ کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا، وہ لاکھ خود کو سمجھاتی کہ وقار کا موبائل فون خراب یا پوری ہو گیا ہوگا، اسے چاہیے کہ دفتر کے کام سے باہر جانا پڑا ہوگا۔ اس کی گاڑی خراب ہوگی۔ لیکن ذہن کی دلیل کو قبول کرنے سے منکر تھا۔ وہ دوسرا موبائل خرید سکتا

تھا۔ کسی اور کے فون سے بات کر سکتا تھا۔ بغیر بتائے اس کے کہیں جانے کا تو سوال ہی نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ زیادہ کی پریشان ہوگی اور پھر آج کے دن... ناممکن۔ وہ نوکری چھوڑ سکتا ہے اپنی شب عروسی نہیں۔ گاڑی خراب ہونے والی نہیں اور ہو جائے تو کیا وہ ٹیکسی میں نہیں آ سکتا۔

برسے اور دہشت زدہ کرنے والے خیالات تھے کہ دماغ کا ہر درپہ بند کر دینے کی کوشش کے باوجود یوں گھسے پھلے آرہے تھے جیسے سیلابی پانی کا ریلے کے گھر میں درازیں اور شگاف بنانا اندر بھرتا جاتا ہے۔ اس کا ذہن ازخود سڑکوں کے حادثات کا شکار ٹوٹی پھوٹی شکت اور خون آلود لاشوں، اسپتال کے مردہ خانوں اور تھانوں کی طرف جارہا تھا جہاں جرائم کا شکار ہونے والوں کو لایا جاتا تھا۔ شہر کے حالات ایسے تھے کہ صبح خیر سے نکلنے والے کسی خیر سے واپسی کی کوئی ضمانت نہ تھی۔ صرف ایک موبائل فون مانگنے والے بعض اوقات کا خیر یا سزا موت کے شے پر کوئی مار دیتے تھے تاکہ یہ خبر شائع ہو تو دوسرے نکلنے والے عبرت پکڑیں اور موبائل کے ساتھ گھڑی، پرس سب حوالے کرنے میں ڈرا دیر نہ لگائیں۔ ان کی دہشت کا چرچا ہی ڈیڑھ پہلی والے نو عمر لٹوں کی کاروباری کامیابی کو کھینچتا رہا تھا، ان بڑھ، بے روزگار اور بگڑے ہوئے نوجوانوں کے لیے یہ بڑا منافع بخش کام بن گیا تھا، کیا ضرورت سے محنت کرنے کی اور غلامی کر کے سینے بھر بعد چند ہزار کی خواہ میں ہی...۔

گزرا وقت کرتے کی... دو چار ہزار میں کہیں سے بھی اصلی نقلی کوئی ریالوٹی پائی ٹی خرید لو۔ باقی اپنی قسمت اور ہمت۔ ایک ہی دن میں لگایا ہوا اکملیا ورنہ سارا شہر اپنا ہے، جہاں چاہو قسمت آزمائو۔ شہر کیا بے ہمتی لگتا ہے، اب کون اس میں ہاتھ دھوتا ہے، کون نہاتا ہے اور کون ڈوب جاتا ہے، اپنا اپنا نصیب ڈیڑھ کروڑ کی آبادی میں موبائل فون، گھڑی اور تھوڑا بہت مال تو سب ہی کے پاس ہے۔ اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے کہ کسی کے پاس بندوق کے مقابلے میں توپ گل آئے۔ اسے موقع ہی کون دیتا ہے کہ توپ چلائے۔ موت کا فرشتہ سامنے نظر آتا ہے تو سب کی جھلون ڈھکی اور کھلی ہونے لگتی ہے۔ سب جان بچاتے ہیں اور اب تو اسے بزدل، بے حس یا خود غرض ہو گئے ہیں کہ نہ کوئی تھانے جاتا ہے، نہ کوئی کسی کو قتلے دیکھے تو بچانے آتا ہے اور نہ بعد میں شامت کرتا ہے۔

زیادہ کے جسم پر سردی کے باوجود دھندلاہٹا ہوا لگا تھا۔ اس کا شک اب سین میں بدل جا رہا تھا کہ ہونہ ہو وقار کے

ساتھ کوئی انہونی بات ہوتی ہے۔ وہ ایک کمرے سے دروازے تک جا کے باہر جھانکتے جھانکتے تھک گئی تھی۔ اسے اپنا وقار کی پسند کے رنگ کا عروسی لباس اور دو گھنٹے کی محنت سے کیا ہوا میک اپ زہر لگ رہا تھا۔ اب اسے ایک موبائل فون کی ضرورت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس میں سارے نمبر محفوظ ہوتے ہیں، آنے جانے والی ہر کال کا ریکارڈ رہتا ہے۔ وہ خود ڈرتی تھی کہ کوئی اس کا نمبر معلوم کر لے گا ورنہ وہ کبھی تو وقار خود اسے قلعے میں خود بخود اور جیسی موبائل فون لادیتا۔ جیسے جانے کے ڈر سے کیا خواتین نے موبائل فون رکھنے چھوڑ دیے ہیں؟ ایک سے ایک دلکش ڈیزائن والے جدید ترین سیٹ کی نمائش کرتی پھرتی ہیں۔ یہاں خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ اب تو ان کے پاس ایک چھوڑا ہوا گاڑیاں تھیں، وقار کے پاس ایک نئی اور بڑی گاڑی تھی، اس کی پرانی گاڑی بھی دو سال پہلے کا ماڈل تھا جواب زبیا چلاتی تھی۔ اس کو بھی میں پیش آرام کی ہر چیز تھی اور بیش قیمت تحائف میں وقار نے سب سے زیادہ زیورات دیے تھے۔ طلائی سیٹ، ہیرے کا لاکٹ، آئینے اور انگوٹھی۔

ایک بار پھر اس نے فون کا ریسیور اٹھا لیا اور بے دھیانی میں اس کی فون پر کان لگائے بیٹھی رہی۔ آخر وہ کس کا نمبر ملائے، کس سے بات کرے، کیا کہے؟ پرانے وقتوں میں ٹیلی فون ڈائریکٹری ہوتی تھی، لوگ اپنے گھر میں فون کے پاس ذاتی ڈائری رکھتے تھے جس میں سب جاننے والوں کے نمبر لکھے جاتے تھے۔ مگر اب موبائل فون نے یہ سب ختم کر دیا تھا۔ اب اس کے پاس کسی کا نمبر نہیں ہے، سوائے ان چند نمبروں کے جو اسے یاد ہیں لیکن ان سے رابطہ نہیں۔ وہ بات بھی کرے تو کیسے۔

سوچتے سمجھتے بغیر وہ سڑھیاں چڑھ گئی۔ خود پروفیسر نے دروازہ کھولا۔ ”کیا بات ہے زبیا؟“ انہوں نے چشمہ اتار کے اسے تشویش سے دیکھا۔

”موری۔۔۔ اکل۔۔۔ آپ سو تو نہیں رہے تھے۔“

زبیا نے بڑی مشکل سے کہا۔

”نہیں بھی، تم جانتی ہو۔۔۔ اس عمر میں نیند کم آتی ہے اور میں تو در تک بڑھنے کا عادی ہوں۔“

”وہ۔۔۔ اکل۔۔۔ دراصل وقار ابھی تک گھر نہیں آئے۔“

”جہیں جا رہا تھا کہیں اس کے ساتھ۔۔۔ کسی شادی وغیرہ میں؟“ انہوں نے زبیا کے لباس اور سنگار پر نظر ڈالی۔

”ارے نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے جی۔۔۔ دراصل۔۔۔“

تھوڑی شادی کی سالگرہ تھی آج۔۔۔ وقار بھی دیر نہیں کرتے، ہم بارہ بجے جاتے ہیں لیکن آج ان کا کوئی پتا نہیں۔“

”ارے یہ بھی اس میں اتنی پریشانی کی کون سی بات ہے لڑکی۔۔۔ آفس کے کاموں میں دیر بھی ہو جاتی ہے، فون کر لو۔“

زبیا کی آنکھوں سے آنسو چمک پڑے۔ ”شام سے کر رہی ہوں اکل، ان کا فون بند ہے۔“

”اوہو۔۔۔ اتنا سہرا نے کی کون سی بات ہے، آؤ اندر آؤ، روٹا بند کرو۔“ جیسے سے پروفیسر کی بیگم نے شفقت سے کہا اور ہاتھ پکڑ کے اسے صوفے پر بٹھادیا۔

”لڑکی۔۔۔ تم نے اس کے دفتر فون کیا ہوتا۔“

”کیا تھا اکل۔۔۔ دو پہر سے کر رہی ہوں، پہلے نمبر بڑی تھا، اب کوئی اٹھانیں رہا۔“ اس نے دوپٹے کے پلورے آنسو پونچھے۔ ”میرا دل بہت گھبرا رہا ہے، وقار نے پہلے بھی ایسا نہیں کیا۔“

”بھئی اس کے گھر والے اور عزیز واقارب ہوں گے۔“

زبیا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کوئی نہیں اکل یہاں۔“

”اچھا تو اس کے دوست، آفس کے ساتھی۔۔۔ ان سے پوچھو۔“ پروفیسر نے کہا۔

”مجھے۔۔۔ کسی کا نمبر نہیں معلوم۔“

میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”اچھا۔۔۔ ہونا چاہیے تمہارے پاس موبائل فون میں۔“

وہ آہستہ سے بولی۔ ”موبائل فون نہیں ہے میرے پاس۔“

انہوں نے پھر سوالیہ انداز میں بے یقینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ”کیوں نہیں ہے؟“ خیر چھوڑو۔۔۔ پروفیسر نے کہا۔

”اکل۔۔۔ کیا مجھے پولیس کو رپورٹ کرنا چاہیے۔ مجھے ڈر لگتا ہے، تمہارے جانے سے۔“

”افو لڑکی۔۔۔ ابھی سے تمہارے میں رپورٹ درج کرانے جاؤ گی تو مذاق ہے گا، دو تین گھنٹے شوہر گھر نہ پہنچے تو وہ گمشدگی کی رپورٹ نہیں لکھتے، چوبیس گھنٹے بعد آنے کا مشورہ دیتے ہیں۔“

”مگر چھ سال میں ایسا بھی نہیں ہوا۔“

”بالکل نہیں ہوا ہوگا مگر یہ کوئی اس بات کی ضمانت تو نہیں چھوڑا کہ آئندہ بھی نہیں ہوگا۔ ایسے ہی ہوتے ہیں شوہر، رفتہ رفتہ بے پروا ہونے لگتے ہیں، سب پہلے دن جیسے کہاں

رہتے ہیں۔“ پروفیسر کی بیگم نے لچکر کے انداز میں کہا۔ وہ پہلے ہی کالج میں نفسیات کی لچکر تھیں۔

”بھئی ہم تو ویسے ہی ہیں۔“ پروفیسر نے غیر متبیدہ لہجہ میں۔۔۔

بیوی نے انہیں گھور کے احساس دلایا کہ مذاق کا یہ کوئی موقع نہیں ہے۔ زبیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”معاف کیجیے میں نے اپنی پریشانی میں آپ کو بھی ڈسرب کر دیا۔“

پروفیسر نے کہا۔ ”بیٹھو بیٹھو۔۔۔ یہ بھی تمہارا اپنا ہی گھر ہے بنی۔ تم نے کسی کو پریشان نہیں کیا۔“

ان کی بیگم نے کہا۔ ”بیٹھو، میں چائے لاتی ہوں تمہارے لیے۔ تم بہت زوریں ہو۔“

وہ پھر بیٹھ گئی۔ ”میری کچھ مجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، میں کسی کو جانتی نہیں، میرا مطلب۔۔۔

ایسی دوستی نہیں ہے کسی سے، بس رکی تعلقات ہیں۔۔۔ کوئی اپنا نہیں۔۔۔“

”اور تمہارے گھر والے۔۔۔؟“

”گھر والے؟“ زبیا نے یوں دہرایا جیسے ان الفاظ کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آیا ہو۔

”ہاں۔۔۔ تمہارے ماں باپ، بہن بھائی۔۔۔ ان میں سے کوئی ہے یہاں۔۔۔؟ تم انہیں بتا سکتی ہو، انہیں بلا سکتی ہو، دیئے تو ہم بھی ہیں۔“

وہ کم کم بیگم غلام میں دیکھتی رہی۔ کلاک نے اس دن کے ختم ہونے کا اعلان شروع کیا جو شادی کی سالگرہ کا دن تھا۔ تاریخ بدل گئی تھی، دن بدل گیا تھا لیکن وہ ہنوز بے خبر تھی، اچانک بچے والی کال تیل بنی۔

وہ چوکی۔ ”وقار۔۔۔ آگیا۔“ وہ بدحواسی میں نیچے بھاگی اور زبیا پر گرتے گرتے بیٹی۔

دروازہ کھولتے ہی اس نے چلا کے کہا۔ ”وقار۔۔۔“

اور پھر ایک جھٹکے سے رک گئی، وہ خود کو کنٹرول نہ کر پاتی تو یہیں ممکن تھا دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے پولیس انسپکٹر سے چٹ جاتی۔

چند لمبے خاموشی میں گزر گئے۔ پھر بے حس اور کسی حد تک سفاک چہرے والے انسپکٹر نے اپنی بیگم کی ہولی آواز میں کہا۔ ”وقار الدین آپ کے شوہر تھے؟“

زبیا نے کچھ دیر میں سر ہلایا۔ اس کے ذہن اور اعصاب کو جیسے ایک الجھانے خوف نے جکڑ لیا تھا۔ اس کی پچھلی حس نے پولیس کو اپنے دروازے پر دیکھتے ہی اسے بہت کچھ بھگایا تھا۔ وہ سب جو ہو سکتا تھا یا ہو چکا تھا۔

انسپکٹر نے اسی لہجے میں کہا۔ ”آپ کو تمہارے چلتا ہوگا۔“

”تمہارے؟“ آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔

”کیوں؟ وہ تو خیریت سے ہاں۔۔۔ وقار۔۔۔؟“

انسپکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے نہیں معلوم وہ کون ہے، آپ کا شوہر۔۔۔ یا کوئی اور۔۔۔“

”پھر آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟“ تمہارے جانے کا کیوں کہہ رہے ہیں۔۔۔؟“ زبیا نے احتجاج کیا۔

”دراصل۔۔۔ ہمیں ایک لاش ملی ہے، پوری میں بند۔۔۔ اس کے ویلٹ میں جو شہنی کاغذات تھے ان میں اس کا قومی شناختی کارڈ بھی تھا۔ اس پر نام کے ساتھ رہائشی پتا یہاں کا تھا، ایسا لگتا ہے کسی نے اسے لوٹ کے کل کر دیا ہے۔ اس کے ویلٹ میں کوئی رقم نہیں تھی۔ اس کے پاس موبائل فون تھا اور نہ کھڑی۔ آپ تمہارے چل کے لاش کو شناخت کریں کہ وہ آپ کے شوہر ہی ہیں۔“

زبیا کو جیسے تاریکی نے گل لیا تھا، وہ کسی اندھے کنویں میں گرتی چلی جا رہی تھی اور اندھیرے میں بے بسی سے ہاتھ پیر چلا رہی تھی لیکن اس کنویں کی گہرائی کی کھنکھ سے ہونے کا نام ہی نہیں لگتی تھی۔ اس کے کانوں میں آنے والی آخری انسانی آوازوں میں انسپکٹر کی آواز تھی۔ اوپر سے اترنے والے پروفیسر نے چلا کے کہا تھا۔ ”زبیا۔۔۔ کیا بات ہے بیٹا۔۔۔“

”ہوئی میں آؤ۔۔۔“ مگر وہ پھر کے سرد فرس پر بے حس گر پڑی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنے سونے بیڈروم کی ڈنٹے والی تنہائی اور خاموشی میں سیدھی بیٹھی اپنے مقابل کی دیوار کو دیکھے جا رہی تھی، اس کے دائیں ہاتھ پر وہ جگہ خالی اور دیران تھی جہاں بھی وقار ہوتا تھا لیکن اس کے وجود کی خوشبو اور اس کے قرب کا لمس زبیا کے تصور میں اب بھی باقی تھا۔

باہر ڈرائنگ روم اور لاؤنج میں سے بٹایا جانے والا فرنیچر پھر اپنی پرانی ترتیب کے ساتھ رکھ دیا گیا تھا۔ دو دن وہاں درزی پر سفید جامدنی بیگم کی رسی تھی اور دیوار کے ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے لوگ خاموشی سے وقار کو ایصال ثواب کے لیے سیارے پڑھتے رہے تھے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے آتے تھے۔ درمیان میں رگی رگی ہوئی دو چھوٹی میزوں پر۔

کوئی سپاہیہ اٹھاتے اور کسی جسم کی رگی سلام دعا کے بغیر ایک طرف بیڈ کے تلاوت کرنے لگتے تھے۔ ایک میز پر وہ سپاہیہ تھے جو پڑھے جانیے تھے، دوسری پر وہ جو ہنوز

سپیس ڈائجسٹ 246 ستمبر 2011ء

سپیس ڈائجسٹ 246 ستمبر 2011ء

سپیس ڈائجسٹ 246 ستمبر 2011ء

سپیس ڈائجسٹ 246 ستمبر 2011ء

سپیس ڈائجسٹ 246 ستمبر 2011ء

سپیس ڈائجسٹ 246 ستمبر 2011ء

سپیس ڈائجسٹ 246 ستمبر 2011ء

پڑھنے والے تھے۔ آخری سپارہ دوسری سیر پر مشتمل ہونے سے پہلے ہی یہ عمل دوبارہ شروع ہو جاتا تھا۔ خواتین لاؤنج میں تھیں، حضرات ڈرائنگ روم میں۔ اگر بی بی کا ناقابل برداشت حد تک تیز خوشبو والا دھواں پورے گھر میں سوگ پھیلا رہا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں مقید تھی۔ ایک بیوہ کی حیثیت سے وقار کے کسی بھی دوست کمرے سے تو اس کے گلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن اس نے خواتین سے بھی ملاقات نہیں کی تھی، ان سب کی ایک بھی رگی باتوں سے زینا کی وحشت بڑھنے لگی تھی۔ اس نے گھر میں کام کرنے والے شوہر چوکیدار گلاب خان اور اس کی بیوی ریشم سے کہہ دیا تھا کہ اس کے دروازے پر دستک بھی کوئی نہ دے۔ اگر وہ ضرورت محسوس کرے گی تو انہیں خود بلا لے گی۔ ان دونوں نے دو دن تک بڑی ذمہ داری کے ساتھ تمام معاملات کو سنبھالا تھا۔

اب جیسے سب ختم ہو گیا تھا۔ قریب اور دور کے سب ہی جاننے والے آگے جا چکے تھے، لاؤنج میں رکھے فون پر گلاب خان سب فون کرنے والوں کو ایک ہی جواب دیتا رہا تھا کہ ٹیکم صاحبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ آرام کر رہا ہے، ہم آپ کا نام بتا دے گا۔

زینا کے دن رات سو جاتے جاتے گزر رہے تھے۔ جاتے جاتے وقت اس کا ذہن اسی تواتر کے ساتھ ایک ہی آواز کی گونج سن رہا تھا، کیوں۔ کیوں۔ جیسے جیسے چرچ کا گھٹنا کسی کی موت پر بڑی یکسانیت سے بھج رہا ہے، سن۔ سن۔ اور فضا میں منتشر ہونے والی صدا اعلان کرتی رہتی ہے۔ سنو۔ وہ سب جو زندہ ہیں اور جن کے کان من سکتے ہیں۔ ایک شخص مر گیا۔ وہ زندوں میں نہیں رہا اور سننے والے کاروں، موٹر سائیکلوں اور دیکھوں میں گزرتے رہتے ہیں، یوں جیسے انہوں نے کچھ نہیں سنا۔ مسجد کے لاؤنج آئینہ سے اعلان نشر ہوتا رہتا، حضرات۔ ایک ضروری اعلان سنئے۔

جب وہ خواب آور گولیاں کھا کے سونے میں کامیاب ہوتی تھی تو وہ اکثر ختم ہونے تک لاشعور اپنے خوابوں کے قریب میں الجھائے رکھتا تھا۔ وہ وقار کو دیکھتی تھی، اپنے قریب۔ خود کو اس کی باتوں کے حصار میں محسوس کرتی تھی۔ اس کی آواز۔ اس کی ہنسی، اس کے وجود کی خوشبو سب ماضی سے نکل کے حال کا حصہ بن جاتی تھی۔ پھر وہ اس کا یاد ختم ہونے لگتا تھا اور حقیقت کا بے رحم ہاتھ اسے جھجھوڑ کے

جگا دیتا تھا۔ زینا نے تھوڑا بہت کھانا بھی کھایا تھا۔ کافی اور چائے بھی لی تھی اور آج جبکہ وقار کو زمین میں اتارے ہوئے دودن گزر چکے تھے۔ وہ اس بات پر دھکی اور شرمسار تھی کہ وہ ابھی تک زندہ ہے۔ آخری رسوم کی طرح اس کے آنسو بھی ختم ہو چکے ہیں۔ کیا صرف اتنے ہی آنسو تھے وقار کے لیے اس کے پاس۔ جس کے ساتھ محبت تھی تو اس کے جذبات کی گہرائی اسے سمندر جیسی محسوس ہوتی تھی۔ مینے بھر بعد اس کا جہولم ہو گا تو کو کیا اختتامی تقریب۔ جیسے ورلڈ کپ میں اور اوپنکس میں ہوتا ہے، شادی ان کی ازدواجی رفاقت کی اختتامی تقریب تھی۔ جہولم کے بعد سب ختم؟۔ وہ اس دنیا میں اکیلی بیٹھی؟

دروازے پر دستک سن کر وہ چونکی۔ "کون ہے ریشم؟"

ریشم نے دروازہ کھول کے ہماں لگا۔ "ٹیکم صاحبہ۔ وہ تھانے والے پھر آئے ہیں، کیا کہوں؟"

زینا نے ایک گہرا سانس لیا۔ "بھلاؤ انہیں۔" صد مذہنی ہے، سو فیصد اس کا اپنا معاملہ ہے مگر ایک غلط جو سوال بن کے کانٹے کی طرح اس کے دل میں ٹھنک رہی ہے، اس کا جواب بھی کسی کے پاس ضرور ہونا چاہیے۔ پولیس سے توجہ مبثوبہ ہے، وہ ریکی کارروائی کے بعد کیس کھول کر نے کی جلدی میں ہوں گے۔ آج کل تو شارٹ کٹ سے نارگٹ ٹکنگ کا نذر آخر وہ کیوں جا میں گہرائی میں، حقیقت کی جستجو میں۔ حقائق کی تلاش میں۔ کیوں تفتیش کا رخ صحیح سمت میں رہیں، وہ مٹی سے سونا بنانے کے لیے سخت کیوں نہ کریں، کیا رکھا ہے فرض شناسی کے مظاہرے میں۔ نارگٹ ٹکنگ کا نشانہ تو وہ بھی بن رہے ہیں۔

منہ دھونے کے بعد اس نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد خفیف سے چلتے تھے جو جبک اپ سے ٹھیک کیے جاسکتے تھے، خشک اور بے رونق ہونٹ لپ اسٹک سے پہلے جیسے ہو سکتے تھے۔ لباس بدلتے ہوئے ایک لمحے کے لیے اسے رسم دیا کا خیال آیا، اب وہ بیوہ ہے۔ اسے رنگین نہیں سلیڈ اور سادہ کپڑے پہننے چاہئیں۔ لیکن اس کے سارے لباس شوخ رنگ اور جدید ترین فیشن کے تھے۔

تو کیا اب مجھے اس دنیا کی مرضی کے مطابق جینا ہوگا؟ اس نے مٹی سے سوچا۔ یہ دنیا مقرر کرے گی میرے اطلاق و کردار کے معیار ہمیں لے گئے ہیں کیا ہے، جس نے وقار کو قبر

میں لٹا دیا ہے، کسی وجہ کے بغیر۔ اب تک اس دنیا نے مجھے کیا دیا ہے، دکھ کے سوا اور کینے والوں نے بھی کیا نہیں کہا ہے۔ خوشی کا سرچشمہ تو وہی ایک شخص تھا جس کو مجھ سے چھین لیا گیا ہے اور اب کوئی نہیں بولتا کہ کیوں؟ اس کی جیسی سب کی۔ جو کہنا پانی ہے وہ بھی کہہ نہیں، مجھ سے پہلے کسی کی پروا تھی نہ آئندہ ہوگی۔ اس نے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگاتے ہوئے مٹی سے سوچا۔

ایک نیا انکسپٹر بڑی بے زاری سے صوفے پر بیٹھا تھا۔ "بڑے افسوس کی بات ہے جی۔" اس نے کسی قہید کے بغیر حکایتی لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "آپ ہم سے بالکل تعاون نہیں کر رہے ہو تفتیش میں۔"

زینا کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔ "میں سوری تھی۔" وہ تیز ہو کے بولا۔ "لونی تم خواہر ہو رہے ہیں قتل کا سراغ لگانے کے لیے اور آپ مزے سے سوری ہو۔"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

انکسپٹر نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "اب یہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ملی ہے۔ اس میں لکھا ہے متول کو چار گولیاں ماری گئیں۔ ایک سر میں۔"

"انکسپٹر صاحب۔ اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے جبکہ اسے پہلے ہی ہارٹ ٹکنگ کا کیس قرار دے دیا گیا ہے اور ایف آئی آر میں بھی قتل یا معلوم قاتلوں سے منسوب ہے۔"

انکسپٹر نے اسے غور سے دیکھا۔ "یہ نارگٹ ٹکنگ کا کیس بن سکتا ہے، میرا مطلب ہے بنا جاسکتا ہے۔"

"میں آپ کا مطلب بالکل نہیں سمجھتی۔"

"مطلب بھی سمجھ آ جائے گا جب تفتیش شروع ہوگی۔ تفتیش ادھر بھی کی جاسکتی ہے۔ اور اس کے لیے آپ کو تھانے بھی بلایا جاسکتا ہے۔ اگر آپ کا نام بھی مشکوک افراد کی فہرست میں ڈال دیا جائے۔"

زینا کے دماغ کا فیور اڑ گیا۔ "میرا نام۔" مشکوک افراد میں؟ تمہارا دماغ خراب ہے انکسپٹر۔ یا تم نشے میں ہو؟ اس نے شخص ہو کے انگریزی میں کہا۔

انکسپٹر کے روپے میں کچھ زنی آئی۔ "بعض اوقات دنیا کی نظر دھوکا کھا جاتی ہے۔ میں آپ کے ساتھ رعایت کر سکتا ہوں، اگر آپ مجھ سے تعاون کریں۔"

زینا نے اپنے آنسوؤں کو ہتھیلی سے صاف کیا۔ "میں آپ سے پورا تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

انکسپٹر نے ایک رجسٹر کھولا۔ "یہ قانونی معاملہ ہے جی۔ ہم بھی مجبور ہیں، مجھ سے کیا کہہ کر آپ کے شوہر کو کسی نے لوٹنے کے لیے قتل کیا۔ میں نے کہا کہ تفتیشی المیر میں ہوں، مجھے معلوم ہے کہ ایک موبائل فون، گھڑی، ویلٹ کے لیے کوئی قتل نہیں کرتا۔ اطلاع کسی نے فون پر دی تھی کہ فلاں جگہ ایک لاش پڑی ہے۔ اب کیا پتا اس نے سب نکال لیا ہو جس نے سب سے پہلے لاش دیکھی۔ یا اس نے جو اطلاع ملنے پر کیا۔"

"انکسپٹر۔ لاش کسی پوری میں پڑتی تھی۔"

"اچھا جی؟۔ آپ نے خود دیکھی تھی؟" وہ عیاری سے بولا۔

"جوتھانے سے یہ اطلاع دیے آیا تھا، وہ بھی کوئی انکسپٹر تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔" زینا نے کہا۔

"میرے پاس تو ایسی کوئی اطلاع نہیں۔ ایف آئی آر میں بھی اس کا ذکر نہیں۔"

"ایف آئی آر میں نے نہیں دیکھی۔" زینا نے اعتراف کیا۔

"اچھا جی۔ اب مجھے کچھ سوالات کا جواب چاہیے، آپ ایسا کریں، رات نو بجے تھانے آ جائیں۔"

زینا کا رنگ اڑ گیا۔ "رات نو بجے۔" تھانے میں؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا انکسپٹر صاحب کہ جو چھپتا ہے آپ یہیں پوچھ لیں۔

"ہو سکتا ہے جی۔ لیکن تھانے میں بندہ جھوٹ نہیں بولتا۔ جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔ اس کے اندر سے صرف جگ لگتا ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"دیکھیے۔ میں یہاں بھی آپ کو کچھ بتاؤں گی۔"

انکسپٹر نے سر ہلایا۔ "فرض کرو۔ میں آپ کو یہ رعایت دوں، تو بدلے میں مجھے کیا ملے گا۔ دیکھو ناہی۔"

دنیا سودے کی جگہ ہے اور مفت تو کچھ بھی نہیں ملتا۔"

زینا نے ایک گہری سانس لی۔ وہ اب سمجھ گئی تھی کہ پولیس بے وجہ بدنام نہیں۔ تفتیش کے نام پر بندہ چھروں کو چیرتے ہیں اور نہ قاتلوں کو۔ وہ ان سے ایسا زنا لگ وصول کرتے ہیں۔ لٹے والوں اور قتل ہونے والوں کے

لواحقین سے الگ۔

”جو کچھ مجھ سے ہو سکا۔۔۔ میں کروں گی انیسٹر صاحب۔“ زینا نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے۔۔۔ مجھے کوئی تجربہ نہیں۔ آپ خود بتادیں۔“

وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔ ”میں ذرا بندہ ہوں دوسری قسم کا۔۔۔ کوئی اور ہوتا تو فطرت کے علاوہ بھی آپ سے بہت کچھ وصول کر لیتا۔“ خیر سے آپ جوان اور خوبصورت ہو۔ لیکن ہم نے خدا کو بھی منہ دکھا ہے، اتنی انسانیت ہے مجھ میں کہ ایک بیوہ کے سامنے غلط بات بھی گناہ کبیرہ سمجھتا ہوں۔“

زینا نے کہا۔ ”صاف بتائیں آپ کو کتنے پیسے دوں؟“

”یہ بات بھی کر لیں گے۔ جلدی کیا ہے؟“ وہ بولا۔ ”کارروائی پوری کرنے کے لیے مجھے سوالوں کے جواب چاہئیں، یہ بتائیں، کیا مقتول کی کسی سے کوئی دشمنی تھی؟“

”وقار کا کوئی دشمن نہیں تھا۔“ زینا نے پورے وثوق سے کہا۔

”اچھا جی! ایسا بندہ ہم نے تو کبھی دیکھا نہیں، خیر۔۔۔ وہ کام کیا کرتا تھا۔۔۔؟“ انیسٹر نے نظر اٹھائے بغیر لکھنا جاری رکھا۔

”وہ بہت کچھ کرتا تھا۔“

”اوپنی کام کیا کرتا تھا۔۔۔؟“ انیسٹر ہنسی سے بولا۔

”کسی دفتر میں ملازم تھا۔ دفتر کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں کہ اس کا عہدہ کیا تھا، کام کیا تھا، اس کی تنخواہ اچھی تھی۔ اس نے ترقی بھی بہت تیزی سے کی تھی۔ ظاہر ہے اس کی جھٹکا نتیجہ تھا۔ اس کی کارکردگی اچھی تھی۔ اپنی ساری تنخواہ وہ ہر ماہ کے میرے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔“

”آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟“ انیسٹر لکھتا رہا۔

”پچھ سال۔۔۔ جس دن اس کا قتل ہوا۔ ہماری شادی کی پچیس سالگرہ تھی۔“ زینا کی آواز بھرا گئی۔

”آپ کے بچے کتنے ہیں۔؟“

”کوئی نہیں۔ ایک ہوا تھا سال بھر بعد۔ کسی وجہ کی کے باعث وہ مر گیا۔ چند گھنٹے بعد۔ اور آئندہ کے لیے میرے ماں بچنے کے امکانات ختم ہو گئے۔ لیکن اس سے وقار کی محبت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔“

”آپ اور وہ رشتے دار تھے، میرا مطلب ہے یہ شادی والدین نے طے کی تھی؟“

زینا نے کہا۔ ”یہ جانتا آپ مکے کے لیے کیوں ضروری ہے؟ اس کا تعلق سے کیا تعلق؟“

”یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام نہیں میڈم! میرے سوال کا جواب دیں ٹھیک ٹھیک۔“ انیسٹر سخت لہجے میں بولا۔

زینا نے ایک گہری سانس لی ”ہم نے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔“

انیسٹر نے قلم رکھ دیا۔ مجھے شک تھا۔ ”اس پر گھر والے ناراض بھی ہوں گے۔“

”جی!“

”کس کے گھر والے۔۔۔ آپ کے یا وقار کے۔؟“

”دونوں کے۔۔۔ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔“

انیسٹر نے تشویش سے سر ہلایا۔ ”اس شادی سے پہلے کسی کارشر سے ہوا تھا، خاندان میں یا باہر۔۔۔ آپ کا یا وقار کا۔۔۔“

”مجھے بالکل ٹھیک ٹھیک جواب دیں۔“

زینا نے پریشانی سے کہا۔ ”یہ تو پرانی بات ہو گئی۔“

انیسٹر دبا ہوا۔ ”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“

زینا ڈر گئی۔ ”مختگی میری بھی کر دی گئی تھی۔ میرے پاسوں زاد کے ساتھ۔ اس وقت میں وقار سے نہیں ملی تھی، خود وقار کی نسبت طے تھی۔“

انیسٹر نے برہمی سے کہا۔ ”اور اس کے باوجود تم کہتی ہو کہ وقار کا دشمن کوئی نہیں تھا۔ غلط بیانی کرتی ہو۔“

”انیسٹر صاحب۔ میں نے کہا یہ تو پرانی بات ہے۔“

”بات پرانی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے اوچی آواز میں کہا۔ ”تھہراؤ واماں زاد۔ کیا نام ہے اس کا۔ کہاں رہتا ہے وہ؟“

”وہ۔۔۔ سیم احمد۔ اس کی تو شادی ہو گئی تھی سال بھر بعد۔ ان کے دو بچے ہیں اور وہ بہت خوش ہے بیوی کے ساتھ۔“

”دیکھو بی بی۔ یہ جو دشمنی کے جذبات ہوتے ہیں، یہ چھانٹش نی کے دائرے کی طرح ہوتے ہیں جو برسوں پڑے رہتے ہیں خون میں۔ ایسے ہی دشمنی برسوں میں اپنی ہے۔ یہاں۔“ اس نے اپنے دل کی جگہ سینے پر اٹھی رکھی۔

”وہ ایسا آدمی نہیں ہے۔“ زینا کمزور لہجے میں بولی۔

”یہ تو اس سے مل کے ہی پتا چلے گا۔ اب اسے شامل تفتیش کرنا ضروری ہے۔ تم اس کا پتا بتاؤ۔“

”مجھے نہیں معلوم۔ پہلے ہاتھ مارنا آنا ضروری ہے۔“

”خیر۔ ہم پتا کر لیں گے۔ یہ معاملہ ہے خاندانی دشمنی کا۔ ہمیں دونوں خاندانوں سے پوچھنا پڑے گا۔“

زینا پھر رونے کے قریب ہو گئی۔ ”انیسٹر صاحب، ہمارا کسی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔“

”دیکھو جی۔۔۔ ابھی کل کی بات ہے۔ ایک باپ نے سات سال بعد اپنی بیٹی کو اور داماد کو مار دیا۔ وہ کیس بھی میرے پاس ہے اور اخبار میں ایسی خبریں آتی رہتی ہیں، یہ بڑا محبت کی فلمی شادی کرنے والے چلے جاتے ہیں عدالتوں میں۔ تحفظ مانگتے۔ اور عدالت سے انہیں تحفظ ملی بھی جاتا ہے کہ اپنی مرضی سے زندگی گزاریں مگر کیا اس کے بعد وہ محفوظ ہو جاتے ہیں۔ عدالت کے کمرے میں یا عدالت سے باہر نکلنے ہی غیرت کے نام پر ان کے بھائی اور باپ انہیں قتل کر دیتے ہیں۔ دشمنی کون ہوتا ہے۔“

زینا کی آنکھوں سے اب مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

”پلیز انیسٹر صاحب۔ ہمارے گھر والوں کو بخش دیں۔ میں نے تو ابھی تک کسی کو یہ بھی نہیں بتایا کہ میں بیوہ ہو چکی ہوں۔“

”لیکن مارگٹ ٹھٹک کے کیس میں ان کا نام نہ آئے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم دونوں مارگٹ تھے۔ دونوں خاندانوں کے لیے، کیا پتا کس کو پہلے موقع ملا۔ پوچھنا تو پڑے گا۔“

زینا نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”خدا کے لیے انیسٹر صاحب! اس کے اور میرے گھروالوں کو معاف کرنے کی جو قیامت چاہیں مجھ سے لے لیں۔“

انیسٹر خاموشی سے کچھ دیر سوچنے کی اداکاری کرتا رہا۔

”مشکل تو بعد میں میرے لیے ہوئی، اگر شواہد سامنے آئے۔“

”دیکھیے۔۔۔ ان میں سے کسی نے وقار کو قتل نہیں کیا۔ جن کو آپ شامل تفتیش کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی دشمنی میں اس حد تک آگے جانے والا نہیں ہے، وہ ہمیں بھول گئے ہیں۔ ان کے لیے ہم مر گئے تھے اسی دن جب ہم نے شادی کی تھی۔ جس لڑکی سے وقار کی شادی طے ہو چکی وہ بھی اب وہی میں ہے اور خوش ہے اپنے شوہر کے ساتھ، ان کے دو بچے ہیں۔“

انیسٹر نے طنز سے کہا۔ ”واہ۔۔۔ ہاں سب سے جنہیں اور کبھی تو مجھے کسی کا پتا نہیں۔ خیر انہیں دفع کرو، اپنے شوہر کا بتاؤ۔ وہ کس دفتر میں تھا۔ کیا کام کرتا تھا۔“

”میں جھوٹ نہیں کہہ رہی ہوں، مجھے نہیں معلوم۔“

”یہ ماننے والی بات ہے کہ بیوی کو شوہر کا پتا ہی نہ ہو اس کامیاب کیا کام کرتا ہے؟“

”میں کچ کہہ رہی ہوں۔ دو دفتر کی کوئی بات گھر میں

کرامت

اورنگزیب عالمگیر کو ایک بہروپ نے دھوکا دینا چاہا۔ بادشاہ نے فرمایا۔ ”اگر دھوکا دے دیا تو جو مانگے گا وہ دے گا۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن اورنگزیب عالمگیر نے جب دیکھا پہچان لیا۔ طویل عرصے کا بھلاؤ دے کر صوفی زاہد عابد بن کر ایک پہاڑی کو میں جانیٹھا، پھر امر اوزر اسب آتے اور یہ کسی طرف انتقام نہ فرماتے آہستہ آہستہ بادشاہ تک خیر پہنچی۔ سلطان کو اہل اللہ سے خاص محبت تھی۔ خود تشریف لے گئے، بہروپ نے دور سے دیکھا کہ بادشاہ کی سواری آ رہی ہے گردن جھکا کر اور مراد آباد میں مشغول ہو گیا۔ سلطان منتظر رہا، دیر کے بعد نظر اٹھائی اور جبکہ کرامت کیا کہ جہاں پناہ میں فلاں بہروپ بیٹھا ہوں۔ بادشاہ ٹھٹک ہوا اور فرمایا۔ ”واقعی اس بار میں نے نہ پہچانا اب مانگ جو مانگتا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”اب میں آپ سے کیا مانگوں! میں نے اس (یعنی رب مزویل) کا نام جھوٹے طور پر لیا اس کا تو یہ اثر رہا کہ آپ سیما میل القدر بادشاہ میرے دروازے پر باادب حاضر ہوا۔ اب سچے طور پر اس کا نام لے دیکھوں۔“ یہ کہا اور کپڑے پھاڑ کر جھٹک چلا گیا۔

اقباس الملوکات اعلیٰ حضرت (رحمۃ اللہ علیہ) (محدوم خالد محمود جلد ۱۰) کا نام لیا، برادرین اس کے آ رہے۔

نہیں کرتا تھا اور میں نے اس سے کبھی پوچھا نہیں تھا، وہ کبھی کبھی دور سے پہنچ جاتا تھا۔ لاہور اور اسلام آباد توں بھی اس کے ساتھ کئی بار جا چکی تھی مگر میں اس میں رہتی تھی اور شاپنگ کرتی تھی۔ وہ اپنی مینٹل اینڈز کرتا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے وہ ملک سے باہر بھی جاتا ہوگا۔“

”ہاں۔۔۔ وہ انکسٹر جاتا تھا۔“

انیسٹر نے کہا۔ ”پاپیورٹ کہاں ہے اس کا؟“ اس نے اس کے ہر اعتراض کو ہٹا دیا۔

”جو بریف کیس وہ صبح لے کر گیا تھا وہ مجھے واپس

نہیں ملا۔ اسی میں روتی تھی ہر چیز۔“ وہ زیا کو گھورتا رہا۔ ”دیکھو جی بیگم صاحبہ۔ یہ دینی جانے والے عموما شریفانہ کاروبار نہیں کرتے آپ بتا سکتی ہو کون لوگ اس سے ملنے آتے تھے؟“

”اس کے دوست گھر نہیں آتے تھے۔ وہ عموماً باہر مل لیتے تھے۔ کسی ہوٹل میں ڈنر کے وقت۔“

”ان کے فون تو آتے ہوں گے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ لیکن اس کے موبائل فون پر۔۔۔۔۔ اگر وہ مل جاتا تو آپ کو معلوم ہو جاتا۔“

انسپیکٹر پھر دھمکی پر اتر آیا۔ ”بی بی۔۔۔۔۔ تم تعاون نہیں کر رہی ہو۔“

زیارہ بانسی ہو گئی۔ ”اس سے زیادہ میں کیا تعاون کروں، جو مجھے نہیں معلوم وہ میں کیسے بتا سکتی ہوں؟“

”یہ تو کاروباری رقابت کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے معلوم کرنا پڑے گا اس کے دھندے کیا تھے۔“

”یہ میں جانتی ہوں کہ وہ کوئی غیر شریفانہ کام نہیں کرتا تھا۔“

انسپیکٹر ہنسا۔ ”ابھی آپ نے کہا تھا کہ مجھے کچھ پتا نہیں، پھر یہ الہام کیسے ہوا کہ اس کا جو کام تھا، شریفانہ تھا؟“

”انسپیکٹر صاحب۔۔۔۔۔ جو ملکا کام کرتے ہیں، ان کی صورت بتاتی ہے، وہ جرم کی غلطی کو چھپا نہیں سکتے، سکون سے سو نہیں سکتے۔“

”آپ کتنی پڑھی ہو زیارہ بیگم۔۔۔۔۔؟“

”زیادہ نہیں۔۔۔۔۔ ایم اے کیا تھا میں نے جب وقار سے ملاقات ہوئی وہاں کتابیں ضرور پڑھتی ہوں۔“

”اسی لیے کتابی باتیں کرتی ہو۔ بڑے بڑے لوگ ہیں یہاں۔۔۔۔۔ خاندانی شریف زادے۔۔۔۔۔ فرشتہ سیرت اور معصوم صورت۔ عزت دار، ان کے کثوت سنو تو یقین نہ آئے تھیں مگر اس ملک میں۔۔۔۔۔ خیر چھوڑو، ہم معلوم کریں گے تمہارے شریف شوہر کی اصلیت، ایک امکان یہ بھی ہے کہ وہ دفتر میں پایا ہو سرکاری لڑکی کے چکر میں پڑ گیا ہو۔“

وہ رو پڑی۔ ”آپ ایسی دل دکھانے والی باتیں کیوں کرتے ہیں؟ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتا تھا، میں آپ کو کیا بتاؤں۔ اس نے کسی اور کی طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھا بھی۔“

”اچھا ابھی کرو یہ رو دکھانا، وہ ایک ہی فرشتہ پیدا ہوا تھا، جس نے تم سے شادی کر لی۔۔۔۔۔ روتی تم جیسی عورت ہی ہیں جو اپنے مرد کی طرف سے آنکھیں کان سب بندھتی ہیں۔“

زیبا نے اپنے آنسو پونچھے۔ ”میں آپ سے درخواست کر چکی ہوں۔ میں آپ کو نہ مانگی قیمت دوں گی، بس آپ میری اور مرنے والے کی عزت کو قضا شانہ بنا لیں۔“

”نہ مانگی قیمت تھی ہوگی، اس کا کچھ اندازہ ہے۔ تمہیں؟ اگر میں کھوں ایک کروڑ۔۔۔۔۔ پھر؟“

”زیبا کی آنکھیں پھلک نکلیں۔“ ایک کروڑ۔۔۔۔۔“

”ساری دسے داری پھر میری ہوگی۔ یہ صاف قتل عمدہ کا کیس ہے، اس کو اگر گن گنک کا معاملہ بنانا میرا کام ہوگا، بات نہیں قسم ہو جائے گی۔“

”لیکن میں ایک کروڑ کیسے دے سکتی ہوں۔“

”وہ ہنسا۔“ وہ بات تو مذاق کی تھی، آپ جیسا چاہتی ہو ویسا ہو سکتا ہے۔ یہ بتاؤ آپ کے پاس گھر میں اسلحہ ہے۔“

”اسلحہ؟“ ”زیبا ہنسی۔“ ”نہیں۔۔۔۔۔ کوئی نہیں۔“

”ریو اور بے تمہارے پاس۔۔۔۔۔ اس کا اسلحہ جس بھی نہیں ہے۔ غارتہ تلاشی میں برآمد ہو جائے گا۔“

زیبا نے اپنی فکرت مان لی۔ ”ایک ریو اور ہے، وقار نے میری حفاظت کے لیے لاکے دیا تھا۔ میں اس کیلئے تھی۔ اور شاؤدی کے بعد کچھ عرصہ مجھے خطرہ بھی تھا، اس نے استعمال بھی سکھایا تھا مجھے۔“

”کہاں ہے وہ ریو اور۔۔۔۔۔؟“

”پڑا ہے میری ڈریسنگ ٹیبل کی دروازے میں۔۔۔۔۔ برسوں سے۔۔۔۔۔“

انسپکٹر نے کہا۔ ”مجھے دکھائیں۔“

دوا کارنارہ کر سکی لیکن اسے اندازہ ہوا کہ اپنی بے وقوفی میں وہ انسپکٹر کو ضرورت سے زیادہ ہی بتاتی ہے۔ گراب شاید کچھ نہیں ہو سکتا تھا، وہ پولیس کے رحم و کرم پر تھی۔ اس کی عزت کے ساتھ وقار کی ٹیک نامی داؤ پر لگ چکی تھی، اسے بچانے کے لیے انسپکٹر کو نہ مانگی قیمت ادا کرنے کے علاوہ اس کی ہر بات ماننا ضروری تھی۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کی دروازے سے ریو اور نکال کے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ریو اور کو اپنے دوپٹے کے پلو سے رگڑ کر صاف کیا تاکہ اس پر انگلیوں کے نشانات نہ رہیں۔ وقار نے بتایا تھا کہ اس میں سات گولیاں ہیں۔ تمہیں یہ سیٹھی کچھ پہلے بتانا ہے، پھر خطرے کے وقت رخ حمد آدر کی طرف کر کے یوں ٹریڈر ہوا دیتا ہے اور بس۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔۔۔۔۔ اب وہ چاہتی تھی کہ گولیاں نکال لے مگر اسے میگزین الگ کرنا ہی نہیں آتا تھا۔

انسپکٹر نے ریو اور کا معائنہ بڑے غور سے کیا۔ ”روی

ہارمونائک ٹوٹھ پیسٹ سے منہ، مسوڑھے اور دانت بہترین صاف ہوتے ہیں
ہارمونائک ٹوٹھ پیسٹ سے خون، پیپ، بدبو، درد، پان، نسوار، سگریٹ کے داغ ختم

صرف ایک بار کے استعمال سے بھی آپ واضح فرق محسوس ہوگا۔ ایک دن چھوڑ کر ایک دن ضرور استعمال کریں

[illegible]

تیار کردہ: اے۔ کے۔ کاسکوپاٹڈ، میٹورہ (سوات)

042-37666818
0300-9486848

ت: ۱۵۷۸۶۰۴۲۳۹۰۰۰ (پبلک) ، ڈیزائن ، پروڈکشن اور گرافکس کی کئی کئی بریل مارک وغیرہ بحق رفیق شاہ محفوظ ہیں۔ 0946-723586

لوں گا۔..... رقم آپ کے اکاؤنٹ سے ان کے اکاؤنٹ میں

سپیس ڈائجسٹ ۱۹۸۵ء

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسپکٹر بہت غیبت تھا۔ اس

ستمبر 2011ء

pdfbooksfree.pk

سیدنا ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں نے اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے لیے سب سے پہلے پیش کیا تھا۔ اگر شیطان سرکشی نہ کرتا..... مگر وقار اسے نہ ملا۔

نئے خود صاحب کے کہنے پر لگوا دیا تھا۔ شہر میں گاڑی چوری کی

وارد تھیں بہت بڑھ چکی تھیں اور یہی گاڑی تو بہت قیمتی تھی۔
زیادہ کم صورت حال کا علم تاہم کے بعد ہوا۔ مزید
خبرانی یہ ہوئی کہ... ماما بھی اپنی گاڑی میں وحید کے ساتھ کہیں
نکل گئی تھیں۔ سالانہ ان کی گاڑی کی بیڑی پورا پورا ہفتہ
کھڑے رہنے سے ڈیڑھ ہو جاتی تھی۔ انہیں کہیں جانا ہوتا تو
وحید آفس سے گاڑی لے کر آ جاتا تھا۔

زیانے فون کیا تو ماما کی سبیلی کے گھر بیٹھی چائے پی
ری تھیں اور ان کا ارادہ وہ پہرے کے بعد واپس آنے کا
تھا۔... زیانہ کی گاڑی اس وقت ایر پورٹ کے پارکنگ ایریا
میں کھڑی تھی۔ ماما کی فوری واپسی ممکن نہیں تھی اور اگر وہ کہہ
دیتی کہ میں پاپا کی گاڑی لے جا رہی ہوں تو دوسری طرف
سے ماما کی سخت جھڑپ پڑتی کہ خبردار جو ایسی حماقت کی... اتنی
بڑی گاڑی تم کیسے سنبھالو گی، میرے آنے کے بعد چلی جانا
اور ابھی جانا اتنا ہی ضروری ہے تو کسی میں چلی جاؤ۔

زیانہ کو اپنی ذرا نیوٹنگ کی مہارت پر پورا اعتماد تھا۔
ہنڈ اسوک سے پہلے پاپا کے پاس جو نو بیو کلاسی وی ایب می کے
پاس تھی اور زیانہ اکثر اسے بیڑی چارج کرنے کے بہانے
لے جاتی تھی لہذا زیانہ بڑے اطمینان سے جانی لگا کے کار
اسٹارٹ کی اور سڑک پر آگئی۔ یونیورسٹی میں ایک آفس کی
فرائض تھی جہاں اس نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کے فی
اسٹال لگا رکھا تھا۔ ان کو چائے بنانے سے سرو کرنے اور برتن
دھونے تک سارے کام خود ہی کرنے تھے۔ زیانہ نے بڑی
چالاک سے گاڑی کے ڈیسے داری لے لی تھی، یعنی پیسے کون
لے گا کابھوں سے۔

اسے اچھا موقع ملا تھا دوستوں کو مرعوب کرنے کا۔
سب کی آنکھیں پھٹ جائیں گی۔... یار زیانہ... کیا گاڑی
ہے، جہاز ہے جہاز۔ اینڈ پیئرز ڈونٹ مائنٹ۔ تم سے کہیں
زیادہ خوبصورت۔... زیانہ اپنے خیالوں میں گمن ہوا کہ دوش
پر حیرتی چلی جا رہی تھی۔ وی ٹی آئی انہیں کی بھرپور قوت
اسپیڈ اسٹیرنگ سے کنٹرول ہونے والی گاڑی جگ جگ کسی بے
آواز ہوائی جہاز کی طرح بھیجے وہ کسی ماہر اور تجربہ کار
پائلٹ کی طرح کنٹرول کر رہی تھی۔

پھر وہ ہوا جو غیر متوقع تھا یعنی حادثہ۔ وہ نیچا چڑھی سے
یونیورسٹی کی جانب نکلتی جا رہی تھی کہ بائیں بازو ٹرننگ کی طرف
سے آنے والی ایک ایسی ہی گاڑی خوفناک دھماکے سے اس کی
گاڑی میں گھس گئی۔ دونوں کے ہونٹ اور پیچھڑکرائے، اس
کے ساتھ ہی شیشو ٹوٹ کے بھرنے کی آواز آئی۔... دہشت
میں زیانہ کے مقل سے جو جھجھکی دو خود اس کے سوا کسی نے نہیں

سکتی۔ چند لمحوں کے لیے اس کے حواس جواب دے گئے۔
ہوش آنے پر اس نے دیکھا۔ سارا ٹریفک رک گیا
تھا۔ لوگ ہر طرف سے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ زیانہ نے
جھکا تو محسوس کیا تھا لیکن اس کی سیٹ بیلتا ہندھنے کی عادت
نے اسے جسمانی گزند سے محفوظ رکھا۔ اس کی گاڑی کا بائیں
حصہ تقریباً ختم ہو گیا تھا اور اس سے ٹکرانے والی دوسری گاڑی
کو سامنے سے نقصان پہنچا تھا، اس کی گرل اور ہیڈ لائٹس چور
چور ہو گئی تھیں۔ ہونٹ چپک گیا تھا اور ریڈی ایٹر نوٹس سے سارا
... نیکیبل سڑک پر بیٹھ لگا تھا۔

مطلبی کو فیصد دوسری گاڑی والے شخص کی تھی جس نے
نگلن بند ہونے کے باوجود سامنے سے گزرنے والی ٹریفک
میں سے اپنا راستہ بنانا چاہا اور شاید اسے یقین تھا کہ اپنی
پھر جی اور مہارت سے وہ دو دگاڑیوں کے درمیان سے گزر سکتا
ہے لیکن اب وہ اپنی مطلبی سامنے کے بجائے زیا پر آگ بگولا
ہو رہا تھا۔ ٹریفک پولیس چوکی والوں کے سامنے بھی وہاڑ رہا
تھا۔ "ارے یہ دھان پان چھو کر یاں جن سے خود کو نہیں
سنبھالا جاتا آجانی ہیں سڑک پر جہازی سازی کی گاڑیاں لے
کر۔... دیسوں کی بکڑی اولادیں۔"

اس کے شور میں زیانہ نے جھج کر کہا۔ "شٹ اپ
منسٹر۔... نگلن بند تھا جب تم نے گزرنے کی کوشش کی۔"
"یہ جھوٹ ہے۔"

"خدا کا خوف کرو۔"
اس شخص نے پولیس کی طرف پلٹ کے کہا۔ "دورا
دیکھو لائسنس بھی ہے اس کے پاس، ذرا نیورسٹی پھر رہی ہے،
الٹا مجھ پر الزام لگا رہی ہے کہ میں نے نگلن توڑا۔"
"تم نے نگلن توڑا۔" زیانہ نے جھج کر کہا۔

"اسے تو لال ہرے کا فرق پتا نہیں چلتا، یہ بکر بلائینڈ
ہو گی سار جنت۔" اس آدمی نے اپنی شخصیت اور مرد ہونے
کا فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی۔

پولیس اور تماشائی سب انہیں گھیرے تھے مگر کوئی کسی
کی طرف سے گواہی دینے کے لیے تیار نہ تھا کہ ج کون بول
رہا ہے۔ نگلن کرن تھا یار۔ وہ اس دوران میں دس
بار رنگ بدل چکا تھا لیکن چوک میں جیٹ آنے والے حادثے
نے ٹریفک کنٹرول کا سارا نظام درہم برہم کر دیا تھا۔ گاڑیاں
ہر طرف بھس گئی تھیں اور بارن کے شور میں کان بڑی آواز
سنائی دے رہی تھی۔ پولیس کی بے بسی قابل دیدی۔
فصے سے زیادہ اس خوف سے زیانہ کی جان جا رہی تھی کہ
اب اسے ماما، پاپا اور پورے گھر کے عتاب کا سامنا ہوگا،

کرنے کے باوجود وہ محض ضد اور بے وقوفی میں بالکل ہی گاڑی
لے کر نکل آئی تھی۔ محض سو روپے خرچ کر کے وہ یونیورسٹی پہنچ
جاتی، اب جو نقصان ہوا وہ تین لاکھ کا تھا یا شاید اس سے
زیادہ۔... اور انشورنس کمپنی ساری رقم ادا کر دے پھر بھی گاڑی
اور بیکش نہیں رہے گی، یہی ہوتی کہلائے گی۔

اس شور میں جب اونچی آواز والا شخص تمام تر الزام
صرف زیانہ پر ڈال چکا تھا اور ٹریفک پولیس سار جنت سخت
نالاں نظر آ رہا تھا کہ۔۔۔۔۔ اچانک کسی نے اونچی آواز میں
کہا۔ "اللہ کا عذاب مول نہ لیں بڑے صاحب۔... مطلبی سو
فیصد آپ ہی کی تھی۔"

زیانہ نے پلٹ کر اس نوجوان کو دیکھا جو موٹر سائیکل
روکے ہاتھ میں ہیلمٹ اٹھائے کھڑا تھا۔ اس نے پرانی جینز
اور چپک والی شرٹ پہن رکھی تھی۔
"تم کہاں سے آگئے اس کے حمایتی۔۔۔۔۔" صوفی
چائپ شخص چلایا۔

"میں میں اسی جگہ سے گزر رہا تھا، میں چشم دید گواہ
ہوں بڑے صاحب اور آپ میں بہت ہے مجھے جھگڑانے کی
تو ادھر آفس میں آئیے۔ میں خیر ہی مسجد سے قرآن لے کر آتا
ہوں، آپ اسے ہاتھ میں اٹھا کے کہہ دیجیے۔"
وہ شخص چلایا۔ "قرآن کو جگ میں مت لاؤ۔"

"کیوں؟۔۔۔۔۔ ابھی جھوٹ جگ کا فیصلہ ہو جائے گا اور
آپ نے حلف اٹھا لیا تو نقصان کی ڈیسے دار یہ خاتون۔۔۔۔۔"
اس نے تائید طلب نظروں سے زیانہ کی طرف دیکھا۔
زیانہ کا حوصلہ بڑھ گیا۔ "ہاں۔۔۔۔۔ پھر نقصان میں پورا
کروں گی۔"

سار جنت انہیں اپنے کہیں نما آفس میں لے گیا۔ وہ
نوجوان بھی ساتھ ہی آیا جو چاہتا تو خاموشی سے نکل جاتا لیکن
اس نے گواہ بننے کی پوری ڈیسے داری قبول کر لی تھی۔ مخالف
شخص کے غم و غصے کا غبار ہوا لگنے کے بعد بہت عجیب لگا تھا۔
"یہ کیا نقصان پورا کر رہے گی۔۔۔۔۔ میری گاڑی انشورڈ
ہے۔"

"گاڑی میری بھی انشورڈ ہے مگر بڑے صاحب۔
ذرا سوچیے، بیکینڈ کے ہزاروں حصے کے فرق سے میری جان
بچ گئی ورنہ آپ نے کون سی کسر چھوڑی تھی، آپ کی گاڑی
دروازے کوٹ کر تکی تو میرا کیا بننا۔" زیانہ کا پتہ ہوئے
کہا۔ "یہ مر رہا ہوتا۔۔۔۔۔ قتل عمد۔"
"زیادہ قانون مت بگھا روڑ کی!"
اس نوجوان نے اچانک زیانہ کو سپرل وارنر کی چھوٹی

بول چیش کی۔ "انہوں نے غلط نہیں کیا، آپ کی یہ حرکت
غیر ارادی نہیں تھی۔"
اب سار جنت نے برہمی سے کہا۔ "تم کیا ہو، اس کے
سامنے کے پترا۔"
"میں پتا چکا ہوں کہ میں ایک چشم دید گواہ ہوں اور اپنی
گواہی ضرور دوں گا۔" اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔
"چلو دفع ہو جاؤ۔۔۔۔۔ ہمیں کسی چشم دید گواہ کی ضرورت
نہیں۔"
نوجوان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ "اس کے علاوہ انشور۔
صاحب، میں ایک انشورنس کمپنی کا سروریز ہوں، یہ ہو سکتا ہے
کہ دونوں کی انشورنس اسی کمپنی سے ہو، وہ سب سے بڑی
کمپنی ہے۔۔۔۔۔ میرا نام ہے وقار الدین۔" اس نے اپنا کارڈ
پیش کر دیا۔
صورت حال یکدم بدل گئی۔ زیانہ نے اپنی ماما کو فون
کیا۔ وحید آدھے گھنٹے میں گاڑی روڑا تار ہوا آیا اور اسے لے
گیا۔ تو جگ کے خلاف ماننے اسے کچھ نہیں کہا۔ حادثے کا سن
کے ان کی اپنی حالت غیر ہو گئی تھی، وہ رو رہی تھیں اور زیانہ کو
فونل کر دیکھتے ہوئے بار بار پوچھ رہی تھیں۔ "تجھے کچھ ہوا تو
نہیں۔۔۔۔۔ گاڑی جائے ہمارا نہیں۔"
زیانہ کے انکار کے باوجود کہ اسے کچھ نہیں ہوا وحید
اسے ایک اسپتال لے گیا جہاں ڈاکٹر نے ماما کے امراض پر
اس کا چیک اپ کیا اور اسے ایک سکون آور گولی لکھ دی۔ وہ
گھر پہنچنے ہی سو گئی، جب وہ جاگی تو رات ہو چکی تھی۔ پاپا
اس کے کمرے صوفی پر نیم دراز، جو تے کھول رہے تھے۔
وہ ابھی ابھی اسلام آباد سے پہنچے تھے اور می سے فون پر
حادثے کی رپورٹ لینے کے بعد خفا ہو رہے تھے کہ انہیں یہ
سب فوراً فون پر کیوں نہیں بتایا گیا تھا۔
زیانہ کی شامت دوسرے دن آئی۔ اس نے بھی ملے
کر لیا تھا کہ اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہے گی اور کہنے کو کچھ تھا
بھی نہیں۔ وہ سر جھکا کر اس نوجوان کے بارے میں سوچتی
رہی جو بروقت اس کا واحد ماہر حمایتی بن کے نمودار ہوا
تھا۔ باقی سب تماشہ دیکھ رہے تھے۔ مگر وہ انشورنس کمپنی کا
ایجنٹ بھی تھا۔ کیا اتفاق ہے۔
انشورنس کمپنی کے معاملات ملے کرانے کے لیے وہ کئی بار
پاپا سے ملا اور اس نے کوئی ایسا پیکر چلایا کہ کارٹین اٹھتے ہی
بے تار ہو کے نکل تو پھر جی جی گئی لیکن وہ پاپا کے دل سے اتر چکی
تھی اور ماما سے محسوس قرار دے چکی تھیں۔ پاپا نے گاڑی کو
اسی شوروم میں چھوڑا اور اپنے لیے نئی گاڑی لکھوائی۔

سپینس ڈائجسٹ 259 ستمبر 2011ء

”وہ شہباز کی اور تمہاری بات کی کرتا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اب تو لوگ نے ایم اے بھی کر لیا، اب کیا مشکل ہے۔“
 زینا نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ ”پھر آپ انہیں منع کر دیں۔“

”منع کروں۔ کیا مطلب؟“
 ”مطلب صاف ہے ماما۔ میں نے فارسی تو نہیں بولی، میں شہباز سے شادی نہیں کر سکتی۔“
 ماما نے ہلکی سے کہا۔ ”کوئی وجہ بھی ہو۔“
 ”وجہ ایک نہیں کئی ہیں جو آپ بھی جانتی ہیں، ایک تو وہ ان پر ہے۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو، بی اے تک پڑھا ہے اس نے۔ پاس نہیں کر سکا تو کیا ہوا، باپ کا سارا کاروبار سنبھال رکھا ہے۔“
 ”اس سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ عیاش اور بدکردار ہے۔“

”ماما چلتے گلیں۔“ زینا۔ ”جو منہ میں آتا ہے ہک دیتی ہو۔“

”ماما۔ کیا میں آپ کو تفصیل بتاؤں۔ اس کے ایک ایک اسٹینڈل کے بارے میں بتاؤں، یہ بتاؤں کہ اس کے کس کس قماش کے دوست ہیں۔“
 ماما کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ”دیکھو بیٹا، شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ یہ میری سہیلی ہوتی ہے۔“

”اگر اس عمر میں آپ کی بیٹی کے بھی کروت مشہور ہوتے تو کیا پھر بھی وہ مجھ سے شادی کرتا۔ بے شک وہ پاپا کے دوست ہیں اور دونوں کی خواہش بھی ہے لیکن زندگی میری ہے، میں پوچھ لوں گی خود پاپا سے کہ کیا اپنی بیٹی کی زندگی تباہ کر کے انہیں خوشی ملے گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میری خواہش پر اپنی خواہش کو قربان کر دیں گے۔“ زینا مسلسل بولتی گئی۔

ماما نے اسے غور سے دیکھا۔ ”تم کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہو؟“
 ”جی ماما۔“

”بہت پہلے سے شک تھا مجھے۔ تم سمجھتی ہو کسی کو معلوم نہیں مگر تمہارے اطوار سے پتا چلتا تھا، کون ہے وہ؟“
 ”وقار الدین۔ ایک کانٹن میں پڑھتا ہے۔“ زینا نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”کل وہ پاپا سے ملنے آئے گا۔“
 ماما کے لیے یہ اطلاع کسی قامت سے کم نہیں تھی۔ وہ بیٹی سے زیادہ شوہر کی مزاج آشنا تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ

بیٹی سے لاڈ میں کس حد تک جا سکتے ہیں اور اپنی خدمت میں کس حد تک۔ وہ دیکھنے میں ایسے نہیں لگتے تھے لیکن ان کا وجود کسی خاموش آنکھ کشاں کے مانند تھا جس کی سطح پر ہریالی اور سبزے کی بھاری بھر پور تھیں جو اس میں خندک اترے تو اندر آگ بھری تھی جو اس پڑے تو سب کو خفا کتر کر دے۔

اس کے بعد وہ ہوا جو زینا کے لیے واقعی غیر متوقع اور بے حد فحشی تھا۔ وقار اپنی موٹر سائیکل پر اس کے پاپا سے ملنے آیا اور پاپا نے اس بات کا خیال کیے بغیر کہ وہ مہمان ہے، اسے دل ہول کے ڈسک کیا۔ اسے دو ٹکے کا سٹر کہا۔ اپنی اوقات یاد دلانی کہ وہ پورے مہینے میں جتنا کھاتا ہے اس سے دو گنا ان کی بیٹی کے میک اپ کا خرچ ہے، اس سے چار گنا گھر کے ملازموں کی تنخواہ بنتی ہے۔ اس پر ان کا لگاؤ کہ اس نے دولت کے لیے ان کی بیٹی پر ڈورے ڈالے۔ غربت کے گٹر سے ایک جست میں دولت مندی کے آسمان پر پہنچنے کا خواب دیکھنے والے یہ فحشی شارٹ کٹ استعمال کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

وہ کچھ نہیں بولا اور خاموشی سے لوٹ گیا۔ اس کے بعد زینا کی شامت آئی اور زینا نے تن تنہا سب کا مقابلہ کیا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ ہر صورت میں وقار کے ساتھ شادی کرے گی اور اسے بتا دیا گیا کہ یہ ناممکن ہے اور اس نے گھر سے بھاگ کے شادی کی تو پھر یہ گھر اس کا نہیں رہے گا، نہ وہ لوٹ کے آسکے گی اور نہ اسے باپ کی دولت میں سے پہونی کوڑی ملے گی۔ زینا نے ترکی پر ترکی جواب دیا کہ یہ رشتہ اتنا ہی کمزور ہے تو اسے ٹوٹ جانا چاہیے، نہ اسے دولت چاہیے اور نہ اس گھر سے تعلق۔ وہ اپنی زندگی کی خود مالک ہے اور اسے اپنی مرضی سے گزارے گی، کسی اور کی خوشی پر قربان نہیں کرے گی۔

گھر میں بڑا رونا دھونا ہوا۔ بھائی گرے برے بلکہ بڑا اتوار سے مارنے دوڑا۔ ماما نے اسے روکا نہ ہوتا تو وہ زینا کا گلا گھونٹ دیتا۔ ”یہ سب اسے بہت زیادہ آزادی دینے اور ایم اے تک پڑھانے کی نذر ہے۔“ اس نے کہا۔

”خود تم نے پڑھ لکھ کے کیا سمجھا۔ یہی کہ بہن کو مارو، اس کی خوشی کے دشمن ہو جاؤ، ایسے ہوتے ہیں بھائی۔ تمہاری مرضی کے خلاف تمہاری شادی کر دی جائے کسی گاؤں کی ان پڑھ بد صورت لڑکی سے تو تم کرو گے؟ پھر تم اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کی بات نہیں کرو گے؟ یہ ضابطہ اخلاق صرف میرے لیے کیوں۔ صرف مجھ پر جبر کیوں کہ شوہر جیسا بھی ہو میں اسے اپنا مجازی خدا مان لوں۔“

تمہارے فیصلے پر۔۔۔۔۔“ وہ بہت روٹی دھوئی۔
 چھ دن وہ گھر سے نہیں نکلی۔ اسے اندیشہ تھا کہ شاید اسے لگنے ہی نہیں دیا جائے گا۔ وقار سے اس کی فون پر بات ہوئی۔ اس نے تفصیل بتانے سے گریز کیا لیکن یہ ضرور کہا کہ ”اب ہمیں اپنی مرضی سے شادی کرنی ہوگی، ماما باپ سے مجھے کچھ نہیں لگا۔ شاید ان سے کوئی رشتہ بھی نہ رہے۔ تم تیار ہو اس کے لیے؟“

وہ اپنے ارادے میں مضبوط تھا ”جان۔۔۔۔۔ اسی لیے میں نے کسی سے کچھ کہنا لا حاصل سمجھا۔ کہ سب کچھ تمہارے فیصلے پر منحصر ہے، ہوگا وہی جو تم چاہو گی، صرف میرے ارادے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔“

موقع پاستے ہی وہ گھر سے نکل گئی۔ اس نے وقار کو پہلے ہی اپنے ارادے سے مطلع کر دیا تھا۔ وہ گاڑی سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ سیدھے ایک دوست کے مکان پر گئے جہاں اس کے چند دوست مع اپنی فیملی کے موجود تھے، کلاخ خواں نے اسی رشتے کو جواز عطا کیا۔ رات کو ایک ریستورنٹ میں اس کے کسی دوست کی طرف سے تو ضیع کا بندوبست تھا۔ وقار کا آبائی گھر فروخت ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی دہن کے لیے دہلی ایک مکان کرائے پر لیا تھا، رخصتی کے بعد وہ اسی چھوٹے سے گھر میں پہلی جسے وقار نے کسی حد تک ڈیکوریت بھی کیا تھا۔

زینا اپنے گھر سے صرف تن کے جوڑے میں نکلی تھی۔ اس نے والدین کی دی ہوئی ذاتی استعمال کی چیزیں بھی دہلی چھوڑ دی تھیں۔ ان میں جدید ترین فیشن کے لباسات، جو توں اور جیولری سے بھری ہوئی وارڈروپ تھی، گاڑی بھی اور پلینسٹری کرینٹ کا ڈرڈر تھے۔ یہیں بھی کچھ بڑا درم تو اس کے بیگ میں ہر وقت موجود رہتی تھی جو وہ ساتھ لے کر نکلتی تھی اور ایسے درجنوں بیگ تھے مگر اس نے بھی اپنے باپ کی بیٹی ہونے کا ثبوت دیا، وہ جیسی کا کراہے تک نہیں لے گی۔

اپنے گھر سے اس نے ماما کو فون کیا۔ ”ماما۔۔۔۔۔“
 ماما نے گھبراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔ ”کہاں ہو تم زینا۔۔۔۔۔؟“

”اپنے گھر میں۔۔۔۔۔ اپنے شوہر کے ساتھ۔“
 ”شوہر۔۔۔۔۔؟“ انہوں نے قح ماری۔ ”یعنی تم۔۔۔۔۔؟“

”جی۔۔۔۔۔ یہی بتانے کے لیے میں نے فون کیا ہے، میں نے وقار سے نکاح کر لیا ہے اور یہ میرا ذاتی فیصلہ ہے۔“
 ”کہاں ہوں۔۔۔۔۔؟“ یہ ابھی آپ کو نہیں بتا سکتی۔ آج کے بعد

میرا یہ فون نمبر بھی نہیں ہوگا۔“
 ”زینا۔۔۔۔۔ یہ تم نے کیا کیا۔۔۔۔۔“ ماما نے رونا شروع کیا۔

”میں نے کچھ غلط نہیں کیا مگر اپنی زندگی کو تباہی سے بچایا ہے۔ شرعی اور قانونی حق استعمال کیا ہے اپنا۔ میں نے آپ سے کچھ نہیں لیا اور نہ لوں گی۔ پاپا شوق سے اپنا وہ حق استعمال کریں جس کی مجھے دھمکی دی تھی جی، اگر آپ میں سے کوئی مجھ سے تعلق رکھنا چاہے تو اس کی مرضی۔ نہ رکھنا چاہے تو میں کیوں گی کہ مجھے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔“
 ماما نے چٹا کے کہا۔ ”تم نے ہمیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا زینا۔۔۔۔۔؟“

”بہت استعمال ہو چکا یہ ڈائلاگ ماما۔ فیسوں میں اور انڈین ڈراموں میں اب آپ اس بات کو نہیں ختم سمجھیں اور مجھے بھول جائیں۔ بے شک پاپا کے بڑے ریسورس ہیں۔ وہ چاہیں تو ہمیں تلاش کر سکتے ہیں، پولیس کے پاس جا کے وقار کے خلاف افوا کا مقدمہ درج کر سکتے ہیں، مجھے اٹھوا سکتے ہیں لیکن بدنامی انجلی ہوگی، آپ سب کی ہوگی۔ اپنی حفاظت میں خود کر سکتی ہوں۔ اور وقار میرے ساتھ ہے، میری قانونی اور اخلاقی یا شرعی پوزیشن صاف ہے۔“

اسے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ دوسری طرف ماما کو روتا دیکھ کے فون پاپا نے لے لیا ہے۔ وہ بولتی رہی اور وہ سب کچھ سنتے رہے آخر میں انہوں نے کہا۔ ”ایسا ہی ہوگا زینا۔۔۔۔۔ اس گھر سے تمہارا تعلق اور ہم سب سے تمہارے رشتے ختم ہو گئے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ تم آج سے ہمارے لیے گھر میں، سمجھ لوں گا کہ میری کوئی بیٹی بھی نہیں۔ نہ تمہیں کچھ ملے گا۔“

”مجھے صرف آپ کی اجازت کی ضرورت تھی۔ وہ نہیں دی آپ نے تو باقی سب میرے لیے بے کار ہے، میرے نصیب میں آپ کی دعا بھی نہیں تو نہ کسی۔ لیکن ایک آخری بات پاپا۔ آپ نے جس شخص کو دو ٹکے کا سٹر کہہ کے گھر سے نکال دیا تھا۔ صرف اس لیے کہ وہ ایک پرانی موٹر سائیکل پر آپ کے قصر عالی شان میں گھسا تھا، آپ کے خیال میں صرف آپ کی دولت بھیانے۔ میں اسی کے ساتھ ایک بار پھر آؤں گی۔ اس موٹر سائیکل پر نہیں۔ انشائیہ کسی شاعر کا ڈیڑی میں، جو براؤ بھی ہو سکتی ہے اور مرشدین بھی۔ آپ چاہیں تو پھر ہمیں دروازے کے باہر سے ہی دھکا دیں۔“

دوسری طرف بالکل خاموشی رہی۔ پاپا بن رہے تھے

اور آخر میں تھا.....
دوست ماں باپ اور بھائی بہن
مل کے تیری کسی اڑا میں گئے
یہ سہارے یہ سوت کے دھما گئے
ایک جھٹکے میں لوٹ جائیں گے
اور فی الحقیقت ایسا ہی ہوا تھا۔ وقت اپنی رفتار سے

اس رات وقار نے کہا۔ ”زیبا..... کیا تم اس زندگی سے مطمئن ہو؟“

”ضرور ملے کی، تم میں صلاحیت ہے..... اور محنت کی

ن اب کچھ

ایک پمچ شاہی رمضان میں کھون ہون خواتین بحال سحر اور افطار



ہر مل بیلٹہ ٹانگ

قدرتی اثر اور جزی بوئیں سے تیار شدہ

گھر کے ہر فرد کیلئے



طبی

دواخانہ (ہوائیوٹ) لمیٹڈ

High Views Designs

سات کروڑ... ستالی لاکھ انجانو سے ہزار دو سو گیارہ...
زیاس کی صورت دیکھتی رہی۔ "کتنی... ذرا پھر
دیکھیے... سات کروڑ ہیں یا سات لاکھ...؟"
"آپ خود دیکھ لیں..." اس نے چہن چہن دبائے اور
ایک پرت سے بینک اسٹینٹ نکال کے زیبا کو بکڑا
دی۔ "دیکھ تو ہم ہر چہ ماہ بعد اکاؤنٹ اسٹینٹ ارسال
کرتے ہیں... لیکن وقار صاحب عمو آتے تھے خود ہی ہم
سے لے جاتے تھے۔"
زیبا نے گزشتہ چند ماہ کی ٹرانزیکشن پر سرسری نظر
ڈالی۔... وقفے وقفے سے دو چار دن چھوڑ کے اس میں
لاکھوں ڈالے گئے تھے اور لاکھوں نکالے بھی گئے تھے۔
ایک وقت میں بینک نوکر ڈکھائی تھا... زیبا کے لیے یہ
ناقابل یقین تھا۔ اس کے دماغ نے لاکھوں سے آگے بھی
سوچا ہی نہیں تھا۔ سات کروڑ کیا یہ تقریباً آٹھ کروڑ تھے،
اس کے تصور سے بعید۔
جسوال اس کے ذہن میں سب سے پہلے آیا یہی تھا
کہ وقار کے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی؟ وہ کسی دفتر
میں ملازم تھا اور عہدے کے لحاظ سے بینک ڈائریکٹر کیا،
ڈائریکٹر بینک نہیں تھا۔ لی آئی اے، اسٹیل مل یا پی ٹی وی
کے چیئرمین کی تنخواہوں کے بارے میں پڑھ پڑھ کے وہ
حیران ہوتی تھی اور سوچتی تھی کہ میں تیس لاکھ روپے ماہانہ اور
اتنی مراعات کے ساتھ ان کے پاس اتنی دولت کیسے ہوگی۔
وقار سے اس نے بھی پوچھا تو نہیں تھا کہ اس کو کتنی تنخواہ
ملتی تھی مگر اس کا اندازہ تھا کہ وہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ ضرور کماتا
تھا۔ یہی تو اس کا ہاتھ کھلا ہوا تھا، اس نے بھی زیبا کو کسی خرچ
سے نہیں روکا تھا اور ان کا معیار زندگی روز بروز بہتری کی
جانب گامزن تھا تو ظاہر ہے یہ وقار کی آمدنی سے ہونے والی
بچت کا کرشمہ تھا۔ اگر وقار کو شراب، جوئے یا عورت بازی
پیسے شوق ہوتے تو اسے معلوم ہو جاتا اور پھر حالات میں یہ
بہتری کہاں آتی۔
عام بیویوں کی طرح وہ شوہر کی ٹوہ میں رہنے سے گریز
کرتی تھی کہ وہ کیا کرتا ہے، کہاں جاتا ہے، کس سے ملتا ہے اور
کیا کماتا ہے، کیا خرچ کرتا ہے۔ وقار کے ساتھ اعتماد کا یہ
رشتہ دو طرفہ تھا لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وقار نے یہ
ضرور کیا تھا کہ زیبا سے عہد وفا کی تقدیس پر حرف نہیں آنے دیا
تھا اور اسے خوش رکھنے کی کوشش بھی عام شوہروں سے بڑھ کر
کی تھی۔ لیکن اس نے ایک جھوٹ بھی بولا تھا جو اس کی مرگ
بگاہی پر آٹھارہ ہوتا تو نہ جانے کب تک بچ رہتا۔

یا سوسائٹی۔"
نیکم نے انہیں گھورا۔ "یہ آدھا سحر ہو گیا۔"
"بھئی! صوفیہ نے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔... تم
مجھ پر چھوڑ دو، میرے شاگرد سارے شہر میں ہیں۔... مگلی
کلی۔... وہ پتا لگائیں گے، تم جاؤ بینک۔... دیکھو اکاؤنٹ
میں رقم کتنی ہے، یہ اچھا ہوا کہ وقار مرحوم نے بیشتر کاکاؤنٹ
رکھا۔ تم بھی آپریٹ کر سکتی ہو ورنہ گڑبڑ ہو جاتی۔... جب تک
عدالت سے تمہیں حق وراثت حاصل نہ ہو جاتا۔"
گلاب اسے بینک لے گیا۔ یہ بینک موجودہ گھر سے
دور تھا۔ ان کا اکاؤنٹ اسی برانچ میں چل رہا تھا جہاں پرسوں
پہلے کھولا گیا تھا۔ برانچ بھی اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ وہ
سیدھی نیچر کے کمرے میں گئی اور اپنی چیک بک اس کے
سامنے رکھ دی۔
"میں زیبا وقار ہوں۔ مرحوم وقار صاحب کی۔...
یہ وہ۔... یہ ہمارا جو اکاؤنٹ ہے۔"
نیچر نے چیک بک سے اکاؤنٹ نمبر دیکھا۔ "کب
افتعال ہوا وقار صاحب کا۔...؟"
"چار دن ہو گئے۔"
"اوہ۔... آئی ایم سوری۔... کیا کوئی ہارٹ
ایفیک۔..."
زیبا نے نفی میں سر ہلایا۔ "پولیس کہتی ہے، مارگٹ
کلنک۔..."
نیچر کے لہجے میں بے یقینی آگئی۔ "مارگٹ
کلنک۔... لیکن وہ تو بڑے بے ضرر سے آوی تھے۔"
"یہ اب اس شہر کا دستور بن گیا ہے نیچر صاحب۔...
کوئی کسی کو بھی مار دے۔... ذاتی دشمنی میں۔... قرض ادا نہ
کرنے کے لیے، رقابت میں۔... سب مارگٹ کلنک ہے،
آسان نام۔..."
اس نے سر ہلایا۔ "صحیح فرمایا آپ نے۔... یہاں
میری برانچ میں ایک شخص نے ہاس کے پھل دیکھ کر کے
لاکھوں لکھوائے اور جب راز قاش ہونے کا وقت آیا تو ہاس کو
مار دیا۔... اس کی لاش پوری میں ڈال کے دور پھینک آیا تاکہ
الزام ان پر جائے۔... جو ایسا سیاسی وجوہ پر کر رہے ہیں۔..."
"ان کی لاش کو بھی پوری میں ڈالا گیا تھا۔... نیچر۔...
میں اس وقت یہ معلوم کرنے آئی ہوں کہ ہمارا اکاؤنٹ بینک
کیا ہے۔"
نیچر نے سر ہلانے اپنے سامنے گلے کپیر کر کے کچھ نہیں
دباے اور فور سے اسکرین کو دیکھ کے بولا۔ "یہ ہے۔..."

وہ لوٹ کے گھر آئی تو اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

اچانک وہ قاروہ نہیں رہا تھا جو اس نے سمجھا تھا۔ اس کے ایک جھوٹے لکڑی کے سوال اٹھا دیے تھے۔ اگر اس نے اپنی آمدنی کو زیا سے چھپایا تھا تو پھر پتہ پتہ یہ بھی چھپایا تھا کہ وہ کرتا کیا تھا۔ ویسے تو اسے خوش ہونا چاہیے تھا کہ مرنے والا اس کے لیے اتنا کچھ چھوڑ گیا جس کا وہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کی موت ایک نقصان نہیں انعام ثابت ہوئی تھی مگر اس کا دل بوجھل تھا۔ وہ خوش فہمی کے جس شیش محل میں رہتی تھی اسے حقیقت کے ایک سنگ گراں نے پتھن چور کر دیا تھا۔ اس کے لیے بے مدد سے کے ساتھ بے عزتی اور شرمندگی کی بات بھی کر دقار نے اسے مکمل اعتماد کے قابل نہیں سمجھا۔ صرف وہ باہل بھی کر اندر سے جسے اسے اسے ظاہر کو باطن مانتی تھی۔ اس کو ج تسلیم کرتی رہی جو بتا دیکھا۔

ریشم نے اسے بند کمرے میں سرگرداں دیکھا۔ اس کو خدمت گزار اور وفا شعار کی جذبات نے بار بار مجبور کیا کہ وہ جائے کافی یا کھانے کے لیے پوچھے مگر اسے ہر بار بڑی درستی سے انکار ہی سننے کو ملا۔ شوہر کی موت کا یہ رد عمل خاصا مختلف تھا۔ ریشم نے اپنے شوہر گلاب خان سے بات کی تو اسے پتا چلا کہ بیگم صاحبہ بیگم کی نہیں۔ ریشم کی کچھ میں سب بات آنے لگی۔ شاید بیگم صاحبہ مستقبل کے خیال سے پریشان تھیں کہ اب گزارہ کیسے ہوگا، خرچ کیسے چلے گا، بیگم میں اتنی رقم نہیں ہوگی کہ پہلے ہی زندگی گزارنے کے لیے کافی ہو۔ یہ گارنٹیاں۔ نوکر چاکر۔ روزمرہ کے اخراجات سب کے لیے بڑی اور باقاعدہ آمدنی چاہیے جو وہ قار صاحب کے مرنے ہی تک نہیں ہو سکتی تھی، اب صرف اوپر والے حصے کا کرایہ آئے گا، وہ بھی اصل سے آدھا۔ قار صاحب نے محض بیگم صاحبہ کے ساتھ کسی کو رکھنے کے لیے اپنے استاد پروفیسر صاحب اور ان کی بیوی کو رکھ لیا تھا، انہیں اس سے ملنا کرایہ ضرور مل سکتا تھا جتنا پروفیسر صاحب دیتے تھے مگر قار صاحب کا مقصد کمائی کہاں تھا، ایک پروفیسر کے لیے اپنی اور بیوی کی پنشن میں سے اتنی رقم لانا بھی بہت تھا۔ اب بیگم صاحبہ بھی مروت جاری رکھیں گی۔ یہ تو ناممکن ہے کہ وہ پروفیسر صاحب کو چھان کر دیں کہ مجھے زیادہ کرائے کی ضرورت ہے۔

سہ پہر سے شام ہو گئی تو ریشم نے بھر سمجھا کہ وہ پروفیسر صاحب کو بتائے۔ "بیگم صاحبہ نے مجھ سے کچھ کھایا یا نہیں ہے۔"

"یہ تو ہوگا ریشم۔ ڈپریشن کے دورے جاری رہیں گے۔ جب تک یہ غم بھی وقت کے مرہم سے مندرل نہیں

ہوتا۔" بیگم صاحبہ نے بھی اپنے میاں کی طرح ایک مشکل بات کی۔

"وہ غصے میں ہیں بیگم صاحبہ۔ جب سے بیگم سے ہو کے آئی ہیں۔ دھی تو نہیں وہ۔ یہ مجھے کچھ اور معاملہ لگتا ہے۔" ریشم نے کہا۔

"اور معاملہ کیا ہوگا۔ بیگم اکاؤنٹ میں کچھ نہیں ہوگا، اسی کا مدد ہو گا پوجاری کو کہ مرنے کے بعد ہوگی۔"

پروفیسر صاحب نے ناک میں انگلی کھاتے ہوئے فرمایا۔ "ہاں۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا اور جس پر تم بیٹھیں چھپا رہی ہو۔ یا بڑا بڑا رہی ہو۔"

"جی نہیں اس سے کہیں کہ حوصلہ کرے۔" ان کی زوجہ نے تنک سے کہا۔

زیبا آنکھیں بند کر کے لیت گئی تھی۔ سوچتے سوچتے اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ دروازہ کھلنے سے روشنی آئی تو وہ اٹھ بیٹھی۔

پروفیسر صاحب نے کہا۔ "معاف کرنا بیٹی، میں علم نہیں تھا کہ تم سو رہی ہو۔"

"نہیں اکل۔ میں سو نہیں رہی تھی، آپ نے اچھا کیا خود ہی آگئے ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ آپ سے بات کروں۔"

"وہ کیا ہے نور چشم۔ کہ اول طعام بعدہ کلام۔ اگر پہلے تم کچھ کھا پانی لو ہمارے سامنے تو بات نکلی سے ہو۔"

"اکل۔ مجھے بھوک نہیں ہے، دل نہیں چاہتا۔"

"دل نہ چاہے۔ کھانا تو جائے گا پیٹ میں۔ دل کو کو کہ اپنے کام سے کام رکھے، بات کرنے کے لیے دماغ کا ٹھکانہ ہونا ضروری ہے۔"

ان کے اصرار پر زیبا نے ریشم سے کہا کہ چائے کے ساتھ کچھ کھانے پینے کو لے آئے۔ میاں بیوی نے بڑی محبت اور شفقت سے ڈائٹ ڈنٹ کے زیبا کو کھانے پر مجبور کیا۔ پروفیسر صاحب کے ہاتھ میں کرنے کا پتا انداز تھا۔ ان کی گفتگو بیانی بعض اوقات بے عمل بھی ہو جاتی تھی۔ عموماً ان کی باتوں پر زیبا کو ہنسی آتی تھی۔

"تمہاری اس چٹل خود خادمہ سے ہم تک یہ بات پہنچائی ہے کہ بیگم سے آنے کے بعد سے مزاج کچھ برسم ہے، خدا خواستہ وہاں کسی نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی جس پر اسے درے لگائے جا سکیں۔ سرعام۔"

وہ مسکراتے پر مجبور ہو گئی۔ "یہ بات نہیں اکل۔ جو مجھے معلوم ہوا، اس نے مجھے چکر دیا۔ آپ یہ دیکھیے۔" اس

نے بیگم کی اسٹینٹ پروفیسر صاحب کو پکڑا دی۔

انہوں نے بیگم لگا کر اس کا مطالعہ شروع کیا تو ان کی بیگم نے بھی جھک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ "بھئی تمہاری کچھ میں کیا آئے گا، انگریزی میں ہے۔"

بیگم نے سخت برا مانا۔ "فاری میں ہوتی تو تم بھی کچھ لیتے۔"

"بھئی زیبا۔ یہ تو گویا باث سرت و اطمینان ہونا چاہیے تمہارے لیے کہ مرحوم نے تمہارے لیے اتنا چھوڑا۔" پروفیسر صاحب بولے۔ "آٹھ کروڑ تقریباً۔"

"آٹھ کروڑ۔" ان کی بیگم نے سانس روک کے کہا۔ تعجب کے لیے پروفیسر صاحب سے کاغذ لے لیا۔

"میں اسی لیے پریشان ہوں اکل۔ وقار کی میں کیا تعریف کروں اور کتنی تعریف کروں۔ آپ نے سب دیکھا ہے کہ اس کی زندگی کا ہر لمحہ میری خوشی کے لیے وقف تھا لیکن اتنی بڑی رقم اس کے پاس کہاں سے آگئی۔ یہ سوال میرے لیے سوالیہ روح بنا ہوا ہے۔ میں کسی صورت اس کا جواز تلاش نہیں کر سکتی۔ دو اور دو کو میں چار سے بڑھا کر پانچ چھ سات بھی مان لوں مگر یہ تو سو سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں۔"

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد پروفیسر صاحب نے کہا۔ "تم سمجھتی ہو اتنی بڑی رقم وہاں کہاں سے آگئی کہ سکتا تھا۔"

"یہ ناممکن تھا۔ ہم خرچ بھی کبھی سے نہیں کرتے تھے، جوڑی بہت بچت ہوگی۔ لیکن یہ آٹھ کروڑ کہاں سے آگئے اس کے پاس۔ وہ کسی دفتر میں کام کرتا تھا، انخواہ یقیناً اچھی ہوگی، میں نے بھی پوچھا نہیں۔ مگر پہلے دو سال میں تو ہم نے بڑی مشکل سے پرانی مہران لی اور مکان بھی کرائے کا تھا۔ یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں، گھر، گاڑیاں اور یہ ٹھاٹھ ٹاٹھ۔ یہ صرف چار سال میں ہوا، مانا کہ اس نے کر لیا لیکن اس کے ساتھ ہی آٹھ کروڑ پس انداز بھی کر لیے۔ کیا انخواہ میں یہ ممکن ہے؟ خواہ وہ کتنے بھی اعلیٰ عہدے پر فائز ہوتا۔"

میاں بیوی اس کی صورت دیکھتے رہے۔ پھر بیگم نے کہا۔ "وہ کس دفتر میں ملازم تھا۔؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ کام کا بھی مجھے پتا نہیں۔"

"تم سمجھتی ہو؟ خدا خواستہ۔ یہ حرام کی کمائی ہے؟ اس نے رشوت لی ہوگی؟"

"بھئی وہ بے چاری کیسے بتائے۔ اب یہ تو معلوم کرنا پڑے گا لیکن میرا خیال ہے اس میں فکری کوئی ضرورت نہیں۔ آدمی کو آدم کھانے چاہئیں۔ اور بہت کھانے

چاہئیں۔ چور کن کے کیا ملے گا۔ بالفرض حال یہ رشوت یا حرام کی کمائی تھی۔ تو کتنا خواب سب مرحوم کا۔ رقم نے کبھی اس کو فائدہ کام پر اکسایا، نہ اس کی توقع رہی اور نہ نہیں کبھی شک ہوا کہ تم پر اسے نہ روکنے کا الزام بھی آئے۔ جنہیں کسی طرح بھی مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا، نہ کوئی یہاں تم سے پوچھے گا اور نہ وہاں تم سے پرسش ہوگی۔ آئی بات سمجھیں۔" پروفیسر صاحب نے یوں کہا جیسے وہ کلاس روم میں پچھڑے رہے ہوں۔

زیبا نے غمی میں سر ہلایا۔ "ان دلائل سے میرا اطمینان نہیں ہو سکتا۔ مجھے دکھ ہوا یہ جان کر۔ کہ میں وقار کے لیے قابل اعتماد نہیں تھی، میں اسے کچھ نہ سکتی۔"

بیگم صاحبہ نے اسے ڈانٹا۔ "زیبا۔ کیوں خواہوا خود کو اذیت میں مبتلا کرتی ہو، وقار نے تم سے کیا چھپایا۔ کچھ نہیں۔ کون سا اس کا باہر کے کسی ملک میں غفہ اکاؤنٹ تھا، سب اس نے ایک ہی جوائنٹ اکاؤنٹ میں ڈالا۔ تم جب چاہیں بیٹلس دیکھ سکتی تھیں مگر نہیں دیکھا تو اس میں وقار کا کیا قصور۔؟"

"اکل۔ میں معلوم کرتا چاہتی ہوں کہ وقار کیا کرتا تھا۔" زیبا نے مطمئن ہو جانے کے باوجود کہا۔

"ہاں۔ ضرور معلوم کرو۔ دیر آید درست آید۔ یہاں تمہارے بھی کہاں ہوتی ہیں کہ شوہر پر اندھا اعتماد کر لیں۔ اب یہ بیٹھی ہیں؟ ان کو پتا ہوتا تھا کہ ہم کس وقت کس کلاس روم میں کیا پڑھا رہے ہیں۔ کسی کو پتی تو نہیں پڑھا رہے، ہمارے سامنے کون ہے اور ہماری نظر کس پر ہے۔ وہ جو کندھے پر دو فرشتے ہوتے ہیں؟ تیسری ہری تھیں لہذا فرشتہ۔"

بیگم نے سخت ناراضی کا اظہار کیا۔ "موقع محل دیکھے بغیر تم ہمیشہ بولتے آئے ہو۔ اب سمجھا بھی گئے ہو۔"

کسی نے کال تیل بجائی۔ "اس وقت کون آگیا۔"

ریشم نے چند سیکنڈ بعد کہا۔ "بیگم صاحبہ۔ کوئی وقار صاحب کے دوست ہیں۔ آغا سکندر۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"بے وقوف۔ تم نے کہا نہیں کہ میرا مدت کا زمانہ ہے۔" زیبا نے نگلی سے کہا۔

"کہا تھا جی۔ انہوں نے کہا کہ وقار صاحب کے کچھ انتہائی اہم کاغذات ہیں۔ وہ آپ کے سوا کسی کو نہیں دے سکتے۔"

زیبا بادل نا خواستہ بھی۔ ڈرائنگ روم میں جو شخص

بیٹھا تھا اس سے وہ پہلے مل چکی تھی لیکن اسے فوراً یاد آ گیا کہ ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی۔ شاید دوستوں کے کسی مجلسی ڈنر میں۔

”معاف کرنا چاہتا ہوں۔ یہ وقار صاحب کی امانت تھی۔“ اس نے ایک بریف کیس آگے بڑھایا۔

زیبا نے حلقہ امتداز میں کہا۔ ”اسے کھول کے دکھائیے۔“

آغا سکندر نے بریف کیس کھولا۔ ”یہ دیکھیے۔“

فائلیں ہیں اور کاغذات ہیں۔ ”اس نے بریف کیس پھر بند کر دیا۔“

”آپ ان کے ساتھ ہی کام کرتے تھے؟“

”جی۔ ایک سال پہلے شیرین میں ڈنر پر ہم چار افراد تھے اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ۔“

”وقار کا کیا کام تھا۔ وہ کس آفس میں تھے۔ ان کی کیا تنخواہ تھی۔“ آپ جانتے تو ہوں گے۔“

وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ ”ان کاغذات کو دیکھنے سے آپ کو اپنے سارے سوالات کے جوابات مل جائیں گے۔ اچھا۔ خدا حافظ۔“

زیبا کو اس کے ایک دم اٹھ کر جانے پر بھانسنے کا شہ ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کسی سوال کا جواب دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔ جب تک وہ ان کو اس کر کے گیت تک پہنچی اس کی جی سیادہ کار حرکت میں آچکی تھی۔ ”زیبا اس کا نمبر پڑھ لے۔“

واپس اپنے بیڈ روم میں آ کے اس نے بریف کیس کو پروفیسر صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ ”یہ وقار کے دیے ہوئے کاغذات ہیں۔ معلوم نہیں اس شخص کے پاس کیوں تھے۔“

”اسی سے پوچھنا تھا۔“ پروفیسر نے کہا۔

”یہ بھی پوچھتی لیکن میں نے دو سوال ہی کیے تھے کہ وہ اٹھ کر بھاگ گیا۔ کیسے لگا ان کاغذات سے سب معلوم ہو جائے گا۔“

”تم نے اسے کھول کے دیکھا تھا۔ خدا نخواستہ ایسا نہ ہو کہ بریف کیس کھولنے کے بعد آٹھ کھلے جنت میں ہماری بیگم کی اور جہنم میں ہم گناہ کاروں کی۔“ پروفیسر نے کہا۔

”میں نے دیکھ لیا تھا۔ دھماکا ہوتا تو آپ کو بھی ستائی دیتا۔“ زیبا نے سکرا کر کہا۔

پروفیسر نے بریف کیس کھولا۔ اس میں اوپر تین فائلیں تھیں۔ ان کے نیچے بریف کیس کے اندر لگے ہوئے براؤن پلاسٹک جیسے ایک شیٹ تھی۔ شیٹ خود الگ ہوئی، پروفیسر نے اسے ہٹا کے دیکھا۔ اس کے نیچے نوٹ ہی نوٹ

بھرے ہوئے تھے۔ یہ سب پرانے نوٹ تھے۔ کچھ پانچ جزاؤں والے، کچھ ہزار والے۔ وہ دم بخود بیٹھے رہے، پھر انہوں نے فائلوں کو دیکھا۔ ان کے اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف سادہ کاغذ اور اخبار لگے ہوئے تھے۔ پھر انہی بے مصرف کاغذات میں سے ایک سلب باہر مڑی۔

پروفیسر نے اسے اٹھایا۔ کاغذ کے اس پھولے سے ناکارہ پرزے پر ناپ میں ایک مختصر سا پیغام ناپ کیا گیا تھا۔ ”جو مجھے دینا تھا وہ میں دے رہا ہوں، ضروری نہیں کہ دوسرے بھی میری طرح ہوں۔ آپ کو خطرہ وصول کرنے والوں سے ہے۔“

زیبا بڑے غور سے پروفیسر کے چہرے کے بدلنے ہوئے تاثرات کا مشاہدہ کر رہی تھی۔ ”میرے خیال میں تو یہ ہے۔“

پروفیسر نے اسے ڈانٹا۔ ”کیسی کم عقل لڑکی ہے اور اس سے بھی ہامقوت سوال۔“

”بھی کہاں ہے خیریت۔ یہ جو نوٹ برس رہے ہیں اور گویا اللہ تعالیٰ پچھر بھار کے دے رہا ہے اسے تم خیریت سمجھو اور بات ہے، مجھے تو قیامت معفری کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔“

زیبا نے ان سے وہ سلب لے لی اور اس کی تحریر کو دوبار پڑھا۔ ”کچھ تو میں سمجھتی ہوں اگلے!“

سلب پروفیسر کی بیگم نے لے لی۔ ”آخر ایسی کیا بات لکھی ہے اس میں۔“ لیکن سوال مکمل ہونے سے پہلے وہ عمارت پڑھ چکی تھیں، ان کا رنگ اڑ گیا۔ ”کیا مطلب ہے آخر اس کا؟“

”مطلب میں بتاتا ہوں۔ دیکھو، متل کل میں بھی نہیں ہوں۔ جو صورت حال مجھ پر عیاں ہو رہی ہے اچھی نہیں ہے اور ممکن ہے زیبا کو دکھ کے بعد عمارت اور پریشانی اٹھانی پڑے۔“

میرا خیال ہے۔ وقار وہ نہیں تھا۔ جو تم اسے سمجھتی رہیں۔ یاد دلاتا رہا۔ میرا مطلب ہے۔ اس کا برس۔ وہ پہلے پچھرا ہوا ہوگا۔ مگر بعد میں وہ کسی غلط راستے پر چڑ گیا۔ کسی نے اسے بڑباغ دکھائے جو ذاتی ہیز تھے۔ لیکن راستہ انکاروں کا تھا۔“

”آپ کو جو کہنا ہے صاف، کہیے۔“

”صاف بلکہ شفاف بات ہی تو کر رہا ہوں میں۔“

لاچے نے اسے کسی غلط غیر قانونی اور مجرمانہ راستے پر ڈال دیا۔ اتنا پراسخت اور حق طلال کی کمائی سے کوئی سات جنم میں جمع نہیں کر سکتا۔ وہ خود اس راستے کی تلاش میں تھا یا کسی نے اسے تلاش کر کے غلط راہ پر ڈال دیا، اس سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ وقار کے انجام کو دیکھتے ہوئے میرا یہ مفروضہ

اتفاقہ بھی نہیں ملتا۔ شریف لوگ شرافت سے مرمت ہیں اور شرافت سے مارے جاتے ہیں۔“

”آپ بھی کیا بات کرتے ہو۔ شرافت سے کون مارا جاتا ہے۔“ ان کی بیگم نے حسب عادت ٹوکا۔

پروفیسر نے سر ہٹایا۔ ”بھئی۔ جیسے ہم مارے جاتے، اگر تمہارے ابا کے پاس اصلی ہندوق ہوتی۔“

کہا تو انہوں نے یہی تھا اور ہم نے بھی سر جھکا دیا تھا کہ سر تسلیم خم ہے۔ اب تم مجھے اس وارننگ لیٹر کی تشریح کرنے دو۔

نور بیگم زیبا، پہلے ایک ناقابل وضاحت بینک بینکس۔ پھر یہ نوٹول بھرا سوٹ کیس۔ اور آخر میں یہ خط۔ یہ تمہارے لیے صاف خطرے کی گھنٹی ہے بلکہ گھنٹا گھر ہے۔

یہ جو ابھی ابھی تمہیں یہ کروڑوں روپے دے کر فرار ہوا ہے، ہماری وفات میں کوئی شریف اور وضعدار شخص تھا۔“

ان کی بیگم نے پھر بات کاٹی۔ ”عد ہے آپ کی بھی۔“

ایسے شخص کو شریف اور وضعدار کہہ رہے ہیں۔“

”بیگم۔ شرافت اور وضعدار ہی چوروں اور ڈاکوؤں میں بھی ہوتی تھی۔“

اپنا دارا بن پڑا اور بہرام ڈاکو اس کی مثال تھے کہ صرف امیروں کو ملوٹے تھے اور غریبوں کی مدد کرتے تھے۔

چور اپنے مکے میں چوری نہیں کرتا تھا اور غلطے بد معاش اپنی گلی میں سے سر جھکا کر گزرتے تھے۔ تو یہ بھی

بندہ کوئی ایسا ہی تھا۔ اسے وقار کو کچھ پیسے دینے ہوں گے۔ وہ چاہتا تو اس کی موت کے بعد گول ہو جاتا۔ کون اس سے وصولی کا دعویٰ کرنے جاتا۔ کوئی وجہ تو تھی کہ وہ خود ا کے اپنا قرض چکا گیا۔“

یادہ احسان مند ہوگا یا اصول پرست۔ اس نے صاف بتا دیا ہے کہ وقار کے بھائی جات دوسرے لوگوں کی طرف بھی ہیں مگر ضروری نہیں کہ اب وہ ادا جی کے لیے آئیں۔ زیادہ قابل توجہ آخری جملہ ہے۔ خود وقار بھی مقروض ہوگا۔ ممکن ہے اس کے اوپر بھی لوگ ہوں،

بیچے سے لاکھوں وصول کر کے وہ اوپر کروڑوں پہنچاتا ہو۔“

اپنے کاروبار کے سلسلے میں اسے کچھ لوگوں سے لینا ہوتا کچھ لوگوں کا دینا بھی ہو۔ دینے والے بھاگ جائیں تو خطرے کی بات کوئی نہیں۔ لیکن لینے والے یہاں آسکتے ہیں۔

وقار کا قرض زیبا سے وصول کرنے۔ اور یہ لوگ وصولی کے معاملے میں قاعدے قانون اور شرافت کی زبان نہیں سمجھتے۔ اسی لیے میں نے کہا کہ وہ شریف آدمی تھا کہ

خطرے سے خبردار کر گیا کہ بھاگ جاؤ اپنی جان بچا کے روپوش ہو جاؤ۔“

پروفیسر کے خاموش ہوجانے کے بعد اب کی کوئی

مچھلی نہ رہی تھی۔ زیبا مستقبل کے خطرات کو ای طرح دیکھ رہی تھی جیسے کینسر کا علاج سرعیل موت کو منہ لانا دیکھتا ہے۔ جس نتیجے پر پہلے سے وہ گریز اس جی وہ پروفیسر صاحب نے بڑی وضاحت سے بیان کر دیا تھا۔

”شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں اگلے۔“ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

”اب بھی کتنی ہوشیاری۔“ پروفیسر نے انہوں سے سر ہٹایا۔

”یہ تو ریکورڈ کرتی ہے۔“

”یہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔“ پروفیسر نے ہر امر مجبوری کی اور نوٹوں کو ترتیب وار اٹھا اٹھا کے باہر کھینچے۔ ”زیبا اپنے اندیشوں کی زد میں تھی جو ہر طرف سے اس پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کچھ کچھ کر دے۔ وقار سے پوچھنے کہ یہ تم نے کیا کیا؟ میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا؟

اب میں کیا کروں گی اس دولت کا۔ تم خود اپنی جان سے گئے اور میری جان بھی سولی پر چڑھا گئے، اب میں کیا کروں، کہاں جاؤں۔ اس دولت کے ذخیرہ میں دین ہو جاؤں؟ ابھی تو بہت زندگی باقی تھی ہماری۔ نہ تم جی سکے نہ مجھے جینے کے قابل چھوڑا، زندہ رہی تب بھی وہ اعتماد کہاں ہوگا جو مجھے تمہاری محبت پر تھا۔

”یہ ہوئے دو کروڑ ستر لاکھ۔ مزید۔“ پروفیسر نے کہا۔

زیبا نے جیسے ستائی نہیں۔ ”مجھے ڈر لگ رہا ہے اگلے۔ جنہوں نے وقار کو مارا وہ مجھے بھی مار دیں گے۔ لیکن میں عورت ہوں۔ صرف مرنا ہی ہوتا تو میں ڈرتی کیوں۔ خود مجھے جینے کی تمنا کب ہے اور پھر ایسی زندگی۔“

دورونے لگی۔

”زیبا۔ برغور دار۔ تمہاری زندگی خود تمہارے لیے ایک نعمت ہے۔ خدا کی دی ہوئی، اس کی قدر کرنا اور حفاظت کرنا تمہارا فرض ہے، جذبات سے نہیں عقل سے کام لو۔ بیچے مڑ کے مت دیکھو آگے چلو۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

زیبا کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ ”یہ کس دلدل میں پھنسا دیا ہے مجھے وقار نے۔“

پروفیسر کی بیگم نے کہا۔ ”اس نے تو جو کیا تمہارے لیے ہی کیا۔“

زیبا چلائی۔ ”نہیں۔ یہ الزام نہ لگائیں مجھ پر۔ میں نے اس سے کبھی کچھ نہیں مانگا، کچھ نہیں کہا کہ مجھے دولت

سہنس ڈائجسٹ 271 ستمبر 2011

مندی کی وہ زندگی دو جو مجھے باپ کے گھر میں میسر تھی۔
 ”اچھا اب میری بات سنو دھیان سے۔ پہلا کام تو تم یہ کرو کہ یہاں سے چلی جاؤ۔“
 ”کہاں چلی جاؤں، جہنم میں؟“
 ”میرا مطلب، یہ گھر چھوڑ دو۔۔۔ اپنے ساتھ کچھ مت لے جاؤ۔۔۔ صرف یہ بریف کیس ہی کافی ہے، تم جب تک چاہو روپوش رہ سکتی ہو۔ تمہاری ساری ضروریات کی نگہداشت ہو سکتی ہے۔“
 ”کیسی باتیں کرتے ہیں جی آپ۔۔۔“
 ”آپ ذرا توقف فرمائیں۔ آپ تو یہی کہیں گی تاکہ میں وہی بے وقوفی کی باتیں کر رہا ہوں جو ساری مگر کرتا آیا ہوں۔ میں بھی جانتا ہوں کہ اس معاشرے میں ایسی عورت نہیں رہ سکتی۔ اس کا ابھی یہی ایک گھر تھا۔ ماں باپ بہن بھائی سب ہیں فی الحال لاہور میں، نہ یہ کرائے پر مکان لے کر رہ سکتی ہے، نہ کوئی گھر خریدے۔“
 ”پھر آپ خود ہی بتائیں۔ یہ جائے تو کہاں جائے؟“

پروفیسر صاحب نے بیگم کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔
 ”نور جہنم زیبا تمہارے پاس کوئی پاسپورٹ وغیرہ ہے؟“
 اس نے ٹی ٹی میں سر ہلا دیا۔ ”میں نے بھی ضرورت محسوس نہیں کی اور پاسپورٹ ہوتا بھی تو میں بھاگ کے کہیں نہ جاتی۔“
 ”یہ مکان کس کے نام پر ہے؟“ وہ سوچ کے بولے۔
 ”دقار نے یہ میرے نام رکھا تھا۔“
 ”یہ بھی اچھا ہوا۔۔۔ خیر۔۔۔ مکان تمہیں مل ہی جاتا تھا۔ بالآخر مکان کہیں نہ جاتا۔ لیکن جان ہے تو جہاں ہے اور مکان ہے، وہی آخری ٹھکانا تو سب کا ایک ہی ہے۔ فی الحال یہ جو مہلت ہے تمہارے پاس اسے قیمت چانوا اور نکل جاؤ۔“
 ”پھر وہی بات، یہ کھل کے کہاں جائے؟“
 ”جہاں سینگ سمائیں۔ میرا مطلب ہے یہاں اس کے لیے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ یہ کہیں بھی رہ سکتی ہے، میں بندوبست کر سکتا ہوں۔ بغیر دس دن کی ہول میں روکتی ہے۔ ایک بہت اچھا درکنگ ویمن ہاسٹل ہے۔ وہ میرے ایک کونیک ہیں، ان کی پہلی کے ساتھ۔ کوئی ہم سے پوچھنے آئے گا تو ہم کہہ دیں گے کہ دقار کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ کہیں چلی گئی۔ کچھ بات کہیں گئی، تم تو صرف کرائے دار ہیں۔“
 زیبا خود بھی خطرے کو ہر طرف محسوس کر رہی تھی جو نامعلوم طریقے پر اسے محصور کر رہا تھا۔ اس نے پروفیسر کی

بات مان لی۔ اپنے ساتھ اس نے بیٹے کے کپڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں لیا۔ دقار کی کسی گاڑی میں پھرنا بھی اسے غیر محفوظ لگتا تھا۔ دوست ہی نہیں دشمن بھی گاڑی پہچان کے اس کے پیچھے چل سکتے تھے۔
 ☆☆☆
 پروفیسر کی وہ کونیک بھی ریٹائرمنٹ کے بعد تیار ہوتی تھی جن کے ساتھ زیبا کو رہائش اختیار کرنے کے لیے جھوٹ بولا پڑا۔ وہ کالج میں پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہوئی تھیں۔ مزاج ایسا تھا کہ شوہر کے ساتھ ان کی بھی نہیں رہنا اور جب ان کی طبیعت کی ہوتی تو بچوں نے بھی ان کے ساتھ رہنا منظور نہیں کیا۔ وہ باپ کے ساتھ چلے گئے۔ اب ان کی شادیاں ہو چکی تھیں تو بیٹے بھی نام کارہو گیا تھا۔ ان کا شوق بھی ان کا بیٹا بننا تھا۔ اب یہ عادت تھی اور مجبوری۔ صبح سے شام تک ان کے پاس ٹیوشن پڑھنے والے لڑکے لڑکیاں آتے رہتے تھے۔ گزرا س کے لیے ان کو پشیمانی بھی کافی تھی لیکن ایک تو فارغ رہنے میں ان کا وقت نہیں کتنا تھا، دوسرے انہیں مزید آمدنی کی ہوس تھی۔

ان کا پروفیسر صاحب سے کالج کے زمانے کا ساتھ تھا اور یہ سفارش کافی تھی۔ پھر بھی ایک کمرانچا تھا کہ ساتھ رہنے کے لیے دیا تو انہوں نے دس ہزار پہلے وصول کیے اور واضح کر دیا کہ اس میں مل شامل نہیں ہیں جو اسے آدھے دینے ہوں گے۔ ایک ملازمین سے شام تک سارے کام کرتی ہے۔ کھانا بھی پکاتی ہے مگر اس کے اخراجات زیبا الگ سے برداشت کرے گی۔
 دو کروڑ ستر لاکھ کے ہوتے، زیبا کے لیے اس رقم کی کیا اہمیت تھی، اس نے خدا کا شکر ادا کیا جب اس نے اپنا سامان جو صرف ایک سوٹ کیس پر مشتمل تھا، ایک کمرے میں رکھا۔ کمرہ اچھی طور پر فرنیچر تھا۔ پرانا بیڈ، الماری جس کے ایک پٹ پر آئینہ تھا، اسے ڈریسنگ ٹیبل کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ سب سے اچھی بات اس کے ساتھ درم تھا۔ کمرے میں ایک چھوٹی سی وی اور فریج بھی تھا۔ زیبا سے پہلے اس کمرے میں کوئی ڈاکٹر بھی جس نے اب شادی کر لی تھی۔ خاتون کے پاس دو کمرے تھے جن میں وہ بے ایک گیٹ رکھتی تھیں لیکن اپنے پورے اطمینان کے بعد۔
 پروفیسر صاحب پر انہیں اعتبار تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ لڑکی ماں باپ کے بعد اپنے بھائی کے ساتھ لاہور میں رہتی تھی مگر بھائی کی شادی کے بعد اس کا گھر میں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کے والد سے پروفیسر صاحب کی دوستی تھی، یہاں

آکے وہ کچھ دن ان کے ساتھ رہی مگر وہ خود اکیلے تھے اور ان کے گھر میں گنجائش نہیں تھی، وہ یہاں رہے گی تو لڑکی تلاش کرے گی اور شکایت کا موقع بالکل نہیں دے گی۔ خاتون کو بالکل علم تھا کہ پروفیسر صاحب کی رہائش کہاں ہے۔ دونوں ریٹائر ہونے کے برسوں بعد ملے تھے، زیبا کا نام زیب النساء بتایا گیا تھا تاکہ لفظی سے زیبا نکل جائے تو بیٹا کا نام لگے۔
 زیبا کا پہلا دن ہی انتہائی مشکل اور صبر آزما ثابت ہوا۔ وہ اپنے کمرے میں بند ہو چکی رہی کہ آخر قدرت نے اسے کس گناہ کی پاداش میں گھر سے بے گھر کیا۔ پہلے ماں باپ کے گھر سے۔ پھر اپنے گھر سے۔ شاید والدین کی نافرمانی اور دل آزاری ہی اس کا گناہ تھی۔ آج وہ کروڑ ہتی ہے مگر اس کے پاس کچھ نہیں۔ نہ گھر بار۔ نہ ماں باپ اور بھائی بہن۔ نہ شوہر اور نہ کوئی درو آشن۔
 آخر وہ جان کے خوف سے روپوش رہے کہ کب تک زندگی گزار سکتی ہے۔ یہ سفر تو ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ دقار نے رفاقت چھوڑ دی۔ آنے والے وقت میں اس کا ہم سفر کون ہوگا؟ اکیلے یہ گھر کا لبا سفر کیسے طے ہوگا، اس تمام دولت کا وہ کیا کرے گی؟ اس کی حالت تو پر امنی کا اس کے اس نئے بچے جیسی تھی جس کو ایک ہزار کا نوٹ مل جائے تو اسے تک شاپ جا کے کچھ لیتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ اس سے پوچھا جائے گا تو وہ کیا کہے گا کہ اس کے پاس یہ نوٹ کہاں سے آیا۔
 خدام نے اس کے لیے کھانا میز پر رکھا اور پہلی مینی لینڈ لینیڈی پرنسپل سارا دن علم کے غولے ٹاٹھتی رہی اپنے کمرے میں تنہائی سے سکون حاصل کر رہی تھیں۔ یہ بڑی اچھی بات تھی کہ وہ خود آدم بیزار تھیں اور ان میں نوہ لینے کی عادت نہیں تھی ورنہ وہ زیبا کی کہانی خود اس کی زبانی سننے آجاتیں اور سوالات کا طومار باندھ دیتیں۔
 رات گئے زیبا نے سونے کی کوشش کی۔ نہ جانے کیوں آج اسے لائٹ بجھاتے ہوئے خوف آ رہا تھا حالانکہ دقار کے ساتھ وہ مکمل اندھیرے کو غلطی کی پناہ کا سمجھتی تھی۔ کھڑکیوں پر دھڑ سے پردے ڈال کر وہ پورا انتظام رکھتی تھی کہ صبح کے اجالے کی کوئی کرن اس کے بیڈروم پر دستک دے کر انہیں بیدار نہ کر سکے۔
 فون کی گھنٹی سن کے وہ چوکی۔ سوائے پروفیسر کے ابھی تک کسی کو اس موبائل فون کے نمبر کا علم نہیں تھا جو اس نے آج ہی خریدا تھا۔ بالآخر۔
 اسکرین پر انکل لکھا دیکھ کے اس نے خوفزدہ لہجے میں

سوال کیا۔ ”میلو۔۔۔“
 ”زیبا۔۔۔ تم سو رہی تھیں۔۔۔“
 ”کیسے انکل۔۔۔“ اس نے جھوٹ بولا۔ ”خیریت ہے؟“
 ”ہاں۔۔۔ ابھی تک تو ہے۔“ انہوں نے سرکشی میں بتایا۔ ”آج دن میں دو لوگ تمہیں پوچھتے ہوئے آئے تھے۔ کھٹی بھاتے رہے، میں نے اوپر سے ہی بتایا کہ مسز دقار چلی گئی ہیں، کچھ بتائے بغیر۔ معلوم نہیں کہاں۔۔۔ اور ہم تو کرائے دار ہیں۔ ان میں سے ایک خاصا بدخیز تھا، کہنے لگا کہ نیچے آؤ تم سے کچھ پوچھتا ہے۔ میں نے کہا کہ کیا پوچھتا ہے پوچھو۔ میں یہاں سے ہی جواب دے سکتا ہوں۔ وہ جانا چاہتے تھے کہ کیا کچھ کسی عزیز رشتے دار کا نام، بتا اور فون نمبر معلوم ہے جہاں سے تمہارے بارے میں پوچھا جاسکے۔ میں نے کہا کہ مجھے معلوم ہوتا ہے میں نہ جانتا۔ لیکن میں اور میری بیوی کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد سے یہاں رہنے آئے تھے، ہمیں ان سبیاں بیوی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ان سے ہماری بات ہی بہت کم ہوتی تھی۔“
 ”پھر۔۔۔ انہوں نے آپ کے ساتھ کیا بدخیزی کی۔“
 ”بس۔۔۔ اس کا بچہ ذرا دھمکی والا تھا، وہ گستاخ اور بدلتا شخص قلعی شریف آدمی نہیں تھا۔“
 ”آپ نے ان سے کچھ پوچھا، وہ کیا چاہتے تھے؟“
 ”میں نے بس اتنا کہا کہ آپ کا نام۔۔۔ اگر زیبا آجائے تو کیا کہوں۔۔۔ اس نے کہا کہ جب وہ آئے گی تو ہم دیکھ لیں گے، معلوم نہیں وہ گاڑی کہاں کھڑی کر کے آئے تھے۔ گیٹ کے اوپر سے اندر جھانکتے رہے۔ انہیں شک تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں کیونکہ گاڑیاں وہیں کھڑی تھیں۔“
 ”انکل۔۔۔ آپ ذرا محتاط رہیں۔۔۔ بہتر ہوگا کہ خود بھی وہ گھر چھوڑ دیں۔“
 ”بھئی ہم بھی بھاگ لے تو پتا کیسے چلے گا کہ کون مہربان نامہربان دوست اور دشمن آئے گئے۔ بس تم فی الحال اپنے کمرے سے مت نکلنا، طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے دو چار دن اندر ہی رہو۔“
 زیبا نے باقی رات جاتے ہوئے گزاری۔ صبح اس کی طبیعت اتنی مستحکم تھی کہ وہ کھٹیں چاہی نہیں سکتی تھی۔ اس نے ناشا کیا اور بلیک کافی کے ساتھ صبح کا احساس مٹانے والی دوا کھائی۔ اس کی لینڈ لینیڈی پرنسپل کو اس کی حالت سے قطعی کوئی غرض نہ تھی، صبح دس بجے سے انہوں نے شاگردوں کو

پڑ جانے کا سلسلہ شروع کیا جو شام تک جاری رہا۔
زیبا کسی وحشت زدہ پرندے کی طرح کمرے میں
پہر پھڑائی رہی اور سوچتی رہی کہ آخر وہ کب تک یہاں بند رہ
سکتی ہے۔ اسے کچھ تو کرنا چاہیے۔ معلوم کرنا چاہیے کہ وقار کیا
کام کرنا تھا، اس کے سامنے کون تھے۔ بھینسا لائی میں سے کسی
نے وقار کو مارا ہوگا۔ لیکن دین کا جھگڑا۔ کاروباری
دھنی۔ اٹھائے راز کا خوف، غداری کا ڈر۔ جرائم کی دنیا
میں سزا سے موت اور کیسے دی جاتی ہے۔

وقار کے دوستوں و دشمنوں سے ہٹ کے اس کے اپنے
گھر والے تھے۔ وہ کہاں لپٹا ہو گئے، یقیناً ان کا سراغ لگایا
جاسکتا ہے۔ لیکن سراغ لگانے سے کیا ہوگا۔ اب یہ غرور
ہی ہے یعنی ہوگا کہ وہ خالی ہاتھ نہیں بلکہ کروڑ پتی بن کے آئی
ہے۔ وہ شخص جو اس کے غرور کا سراپا تھا پتہ نہ خاں ہو چکا
تھا، سب کچھ گنوا کے یہ چھپن کروڑ کی چوٹائی کیا ہے۔ ہوسٹل
ہے کہ اسے معاف نہ کرنے والے پھر دھکا دیں کہ جاؤ اب
اکی دولت کے درشتے پر غرور کے ساتھ جیو۔

رات کو پھر پروڈیوسر کا فون آیا "زیبا بیٹی۔۔۔ وہ دونوں
پھر آئے تھے، انہوں نے مجھے دھمکی دی اور گالیاں بھی کہی میں
جانتے ہو جیسے تمہارا پتا نہیں بتا رہا ہوں۔ میں نے اپنے اسی
شاگرد کو فون کیا جو ایس ایس پی ہے۔ میں نے کیا، میری بیوی
نے میرے کہنے پر کیا۔۔۔ میں نے انہیں باتوں میں لگا گئے
رکھا۔۔۔ وہ صبح بعد پولیس آئی، ان دونوں کو پکڑ کے لے
گئی تفتیش کے لیے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے خلاف
ریپورٹ لکھواؤں مگر میں نے اپنی جان چھڑائی کہ میں کہیں
نہیں صرف ان سے جان چھڑانا چاہتا ہوں، یہ مجھے پریشان
کر رہے ہیں لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا انکل۔۔۔"
"بڑا عجیب سا احساس ہوا مجھے۔۔۔ کہ ڈی ایس پی جو
پولیس پارٹی کے ساتھ آیا تھا، بعض ڈراما کر رہا تھا۔ ایس
ایس پی کے کہنے سے اس کو آنا پڑا تھا۔ لیکن ان کے
درمیان کوئی انڈر اسٹینڈنگ تھی؟ خاموش مفاہمت۔"
"انکل۔۔۔ آپ پلیز وہ جگہ چھوڑ دیں۔"
"ہاں۔۔۔ میری بیوی بہت خوفزدہ ہے۔ شاید کل ہم بھی
چلے جائیں براست مانا بیٹی، ہم بوڑھے اور کمزور لوگ ہیں۔"
ایک بار پھر آدھی رات کے بعد فون نے چلانا شروع
کیا۔ زیبا جاگ رہی تھی۔ "بی بی انکل!"
پروڈیوسر نے سرگوشی میں کہا۔ "وہ۔۔۔ وہ پھر آگئے
تھا۔۔۔ یو ار پچا نند کے تمہارے گھر میں تھے ہیں۔"

زیبا کا دل ڈوبنے لگا۔ "اوہ مائی گاڈ۔۔۔ آپ نے
پولیس کو ریپورٹ کی۔۔۔ میری بیٹی نہیں ملایا۔؟"
"آدھا ٹھٹھا ہو گیا۔۔۔ کسی نے رسپانس نہیں دیا۔ پھر
نمبر ۱۱۱ پر مل رہا ہے۔ اس ایس ایس پی کا فون بند ہے۔ شاید
رات کو وہ بند کر کے سوتا ہوگا۔ ہم لائش آف کر کے دم
سادے پڑے ہیں، دروازے بند کیے۔۔۔ نیچے سے
آوازیں آ رہی ہیں۔ وہ ڈر ڈر سے باہر نکلتے ہیں۔
جس رہے ہیں، انہیں کسی کا ڈر نہیں۔۔۔ اور وہ غالباً نشے میں
ہیں۔ اللہ سے دعا کہ آج کی رات خیریت سے گزر جائے۔"
ان کی یہ دعا راتوں کی صبح اس نے پی وی کھولا تو
ایک میوزیکل پران ہا بڑا بڑھاکے قتل کی بریکنگ میوزیکل
رہی تھی۔ ان کو یہ معلوم انفرادی گزشتہ رات بڑی بے دردی
سے قتل کر دیا تھا۔ ریپورٹرز نے تمام واقعات کو ایک سنسنی خیز
استوری میں ڈھال دیا تھا۔ کچھ عرصہ قبل اس گھر کے مالک
وقار الدین بھارت گٹنگ کا لٹائنڈ بے تھے۔ ان کی پوری بند
لائش ایک معروف چورنگی کے قریب لیٹی تھی۔ سوئم کے بعد سے
ان کی بیوی بھی غائب یا ریپوش تھا۔ پروڈیوسر اور ان کی
بیوی جو محض کرائے دار تھے اور اس عمر میں غلوٹیشن کی
زندگی گزار رہے تھے گزشتہ رات پراسرار حالات میں قتل کر
دے گئے۔ پتھار یہ ایجنسی کی واردات نہیں تھی کیونکہ قاتل
کچھ بھی لوٹ کر نہیں لے گئے۔ پروڈیوسر اور ان کی بیوی کا
کوئی بھی دشمن نہیں تھا۔

زیبا کی مالک مکان اپنی دنیا میں مکن رہنے والی
عورت تھی، سارا دن طالب علموں کو زندگی بھر کے پڑھے
پڑھائے سبق سکھانے یا روتنے کے بعد وہ رات کو تھک کر
کے اپنے کمرے میں بند ہو جاتی تو اس دنیا میں پہنچ جاتی تھی
جو اس کے خوابوں کی دنیا تھی۔ جہاں وہ سب کچھ ہوتا تھا
جس کی وہ تمنا کرتی تھی مگر ملتی زندگی میں بھی خواہش اس کی
سب سے بڑی ناگاہی بن گئی۔ اب وہ اسٹار پولس کے
ڈراموں کی دنیا میں رہتا پتہ نہ تھا کہ جہاں شاندار رولنگ ماسٹر
تھے۔ نوکر چاکر، جدید اور پیش قیمت ملبوسات اور زیورات
والی خواتین جس جو عمر دوں کے دلوں پر بیٹھیں خاندانوں اور
گھروں پر بھی حکومت کرتی تھیں۔ اپنی سازشی عقل سے۔۔۔
تربیا چلتے تھے۔ حسن و شباب کے اور ناز و انماز کے اسٹے
کی قوت سے۔ ایسا نہیں تھا وہ تھا نہ ہوسکتا تھا مگر وہ ایسا ہی
چاہتی تھی چنانچہ اس نے گروڈیش کی جتنی دنیا سے تعلق ختم
کر لیا تھا۔ وہ نہ خبریں دیکھتی تھی نہ سنتی تھی۔ نہ اخبار پڑھتی تھی
اور نہ فارغ وقت میں رسالے۔ اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ

پروڈیوسر اور اس کی بیوی کا قتل ہو چکا ہے۔
زیبا درود کے پاگل ہو گئی۔ اس کا ڈپریشن اس انتہا
کو پہنچ گیا کہ اس نے باقی ماندہ تمام سکون آور خواب آور
گوپیاں کھائیں اور اپنی طرف سے دنیا کو خدا حافظ کہہ دیا۔ صبح
اس کا اٹھنے کا کوئی نہ ارادہ تھا نہ خواہش۔ چنانچہ جب آٹھ بجے
پر اس نے خود کو پھر اسی دنیا میں دیکھا تو اسے یقین نہ آیا۔
ڈوبنے جاؤں تو دریائے پایاب مجھے۔۔۔ میں جی نہیں سکتی تھی
اس لیے مرنا چاہتی تھی۔ کیا اپنی مرضی سے میں مر بھی نہیں سکتی۔
جیسا کہ بعد میں اسے یاد آئے۔ پتہ چلا وہ ان دونوں کی
جتنی عادی ہو چکی تھی کہ ایک معمول سے دکنی خوراک نے اسے
صرف بے ہوش کیا۔ وہ مری نہیں۔ نہ زہر اگر خوراک کا حصہ
بن جائے تو کیا اثر کرے گا۔ درمیان میں ملازمہ دوبارہ کچھ
کے چاکلی تھی کہ وہ سو رہی تھی۔ وہ تیسری بار آئی تو زیبا نے اس
سے بلیک کافی منگوائی، کافی پینے کے بعد اس نے خود کو خاصا
پرسکون اور توانا محسوس کیا۔ یہ ایک رات میں موت کی دلیلیز
تھک جا کے لوٹ آنے والی زیبا کے لیے نئی زندگی کا آغاز تھا۔
اس نے تہہ کیا کہ اب وہ بھاگے گی نہیں۔۔۔ وہ مقابلہ
کرے گی، لڑے گی اور زندہ رہے گی، انہی اصولوں پر
زندگی کو آگے بڑھائے گی جن پر وقار کے اور دو بوزھوں کے
قاتل بنی رہے تھے، وہ اپنے ذہن کی کایا پلٹ پر خود حیران
تھی کہ شب بھر میں کیا ماجرا ہو گیا۔ اس کی سوچ کا دھارا
اچانک انہی سمت میں کیوں بہنے لگا۔ شاید ایسا ہوتا ہے۔
درد کا حد سے گزرتا ہے دور ہو جانا۔

☆ ☆ ☆
اس نے ٹیکسی کو سڑک پر ہی چھوڑ دیا جہاں سے گلی
شروع ہوتی تھی۔ جس گھر میں اس کی زندگی کے کم از کم دس
سال گزرے، اس کا راستہ وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ اس گھر میں
آنے سے پہلے وہ جس گھر میں رہتے تھے وہ بھی اسے یاد تھا
مگر اس کا راستہ نہیں تم ہو گیا تھا۔ وہ مارکیٹ کے درمیان کوئی
گلی تھی جو اندر جا کے دائیں بائیں شاخوں کی طرح پھوٹنے
والی گلیوں میں بٹ جاتی تھی۔ وہ سارا نقشہ اب بدل چکا
تھا، باہر سے بھی اور اندر سے بھی۔
لیکن یہ جگہ دیکھی تھی، یہاں وہ چھ سال بعد آئی تھی
مگر اسے کسی خاص تبدیلی کا احساس نہیں ہوا۔ شاید اس لیے کہ
یہاں کوئی مارکیٹ نہیں تھی جہاں کمرشل بلازا اکٹھے ہو جاتے
یا دکانوں کی ظاہری شباهت بدل جاتی۔ یہ سو فیصد شہر میں
اپرمل کلاس کی وہ آبادی تھی جہاں اخلاقی اقدار کو آج بھی
مادی اقدار پر فوقیت حاصل تھی۔ کم از کم ترقیاتی طور پر۔

وہ گلی میں آگے بڑھتی گئی۔ یہ ایک بڑی گلی تھی جس پر
دونوں طرف سے رکشا، ٹیکسی، کاریں اور موٹر سائیکلیں
آ جا رہے تھے۔۔۔ وہ کنارے پر چلتی رہی۔ بہت کم مکانوں
کے نقشے بدلے تھے۔ اکثر کا تو رنگ بھی برسوں پرانا ہو چکا
تھا۔ کچھ گھر دیں میں قانونی پابندیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے
دکانیں نکال لی تھیں۔
سیاہ برقعے میں اس نے بڑی خوبصورتی سے اپنے
چہرے کو یوں چھپایا تھا کہ صرف اس کی (وقار کے الفاظ
میں) برقی جیسی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ اس کا سراپا
برقعے میں سے بھی چھلکی اٹھا تھا اور آنکھیں دیکھنے والے اس
کے جمال و کشش کا تصور کرتے رہ جاتے تھے۔ تاہم یہ ناممکن
تھا کہ کوئی اسے پہچان سکے۔ اس نے کئی آشنا چہرے دیکھے،
گلی کی بیشتر پرانی دکانوں پر وہی لوگ روزمرہ کی ضروریات
فروخت کر رہے تھے جن سے وہ خود بھی کم عمری میں سرچ
مسالے سے مانی بن کر تک سب خریدتی رہی تھی۔ چھ سالوں
نے ان کی عمر پر زیادہ اثر نہیں کیا تھا۔

چھ سال میں بہت کچھ ہوا ہوگا۔ بہت سے لوگ
موجود نہیں ہوں گے۔ بچے بچیاں جوان ہو چکے ہوں گے،
جوانوں کی شادیاں بھی ہوئی ہوں گی اور وہ خود اب بچوں
والے ہوں گے۔ جیسے جیسے اس نے سودا سلف لانے کے
لیے نکلنے والی دو خواتین کو شاخت کیا۔
پھر وہ اپنے گھر کے دروازے پر ٹھہر گئی۔ گیٹ کارنگ
وہی تھا۔ مکان کی کھرا مکھ سنے مالک نے بدل دی تھی پختہ
سے پورچ میں ڈرائیو سے پر ایک مہمان کار کے ساتھ ایک
موٹر سائیکل بھی کھڑی ہوئی تھی۔ باہر نام کی کوئی تھی نہیں تھی
لیکن کال بیل گئی ہوئی تھی۔

اس نے بٹن پر ابھی رکھی تو اندر سے ڈنگ ڈانگ کی
جگتی گونج سنائی دی۔ گاڑی کے پیچھے والے دروازے سے
ایک عورت نے جھانکا اور باہر آئی۔ وہ اٹھائیس تیس سال کی
تھوڑے سے بھاری بدن کی عورت تھی جس کا حسن و شباب
اسور خانہ داری جہاں میں صرف ہو رہا تھا۔
"کس سے ملنا ہے بی بی آپ کو۔؟" اس نے نکھرے
بالوں کو سمیٹ کر جوڑے کی شکل دیتے ہوئے پوچھا۔
"بی بی۔۔۔ وہ یہاں پہلے ٹیکس الدین صاحب رہتے
تھے۔ ان کا بزنس تھا۔ ٹیکس الدین ایسوی ایشن لڈ۔"
عورت نے گلی میں سر ہلانے میں دیر نہیں کی۔ "یہاں
تو ہم رہتے ہیں چار سال سے۔"
زیبا نے کہا۔ "دیکھیے۔۔۔ شاید انہی سے آپ نے یہ

MEDICAM

FOR MEN

Smart Choice Every Day!

میڈی کیم

شیونگ کریم

جو چلنے کے بالوں کو نیچے کی تہہ تک نرم کر دے
شیونگ کریم آسان اور آرام دہ



Optimum Formula For Smart Shave

MEDICAM

SHAVING CREAM

Optimum Formula For Smart Shave

MEDICAM

SHAVING CREAM

FOR MEN

BTS

705

زیانے گھبرا کے کہا۔ ”مجھے بتائیے تو کسی آخر ان کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

زیرینہ نے کہا۔ ”سب تو اخبار میں آیا تھا۔“
”میں نے نہیں دیکھا۔ مجھے نہیں معلوم۔“ زیانہ کا حوصلہ جواب دینے لگا۔ ”آخر آپ بتاتی کیوں نہیں ہیں۔“

آنٹی نے آہ بھری۔ ”کیا بتاؤں بیٹا، کیا خوش و غرم اور خوشحال گھرانہ تھا تمہارا، ہم تو تمہارے گھر کے کپڑے ہی گری ناز کرتے تھے۔ بس تمہارا اس گھر سے جانا بدلتی اور تباہی کا آئینہ بن گیا۔“

زیانہ نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”کیا میری وجہ سے؟“

”نہیں نہیں۔ تم غلط سمجھ رہی ہو، نہ ان کا انتقال اس صدمہ کی وجہ سے ہوا، نہ انہوں نے خدا خواستہ اپنی رسوائی اور بے عزتی پر کوئی ایسا قدم اٹھایا۔ وہ تو بس یہاں سے چلے گئے تھے۔ زمانہ ایسا آگیا ہے کہ لڑکیوں کے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کرنا اور گھر چھوڑ جانا کوئی انوکھی بات نہیں رہی۔ یہ گھر گھر کی کہانی ہے۔“

”کیا۔۔۔ خدا خواستہ وہ بھی مارگٹ کٹنگ کا نشانہ بنے تھے؟ ڈاکو مار گئے انہیں۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ زیانہ نے کہا۔

”حوصلہ رکھو بیٹی۔ یہ مارگٹ کٹنگ کا خونی کھیل تو ابھی نازل ہوا ہے اور ہم تو اللہ سے پناہ مانگتے ہیں۔ سڑک پر لوٹنے والے کیا کم تھے کہ اب یہ انوکھا برائے تارواں والے ہم پر عذاب بن کر نازل ہو گئے ہیں۔ ان کے۔۔۔ تمہارے گھر والوں کے یہاں سے جانے کے بعد ہم سے تو ان کا رابطہ رہا نہیں تھا۔ ہم سے کیا، سب سے کٹ گئے تھے وہ لوگ۔ بس ایک دن اخبار میں خبر دیکھی۔“

زیرینہ نے قہر دیا۔ ”کوئی چھ مہینے بعد۔“
”اب ہمیں تو بیٹی وہی معلوم ہے جو اخبار والوں نے لکھا۔ اور انہیں پولیس نے بتایا۔“

زیرینہ نے سر ہلایا۔ ”اور ان دونوں کا ہوتا ہے گھڑ جوڑ۔ جو کس پولیس کو بتاتا ہوتا ہے اس پر اخبار کے کرائم رپورٹر سے معاملہ طے ہو جاتا ہے، اسی کے مطابق خبر آتی ہے۔“
”خبر میں کیا تھا زیرینہ۔“ زیانہ نے بے مہربانی سے پوچھا۔

”خبر میں یہ تھا۔ کہ تمہارے بڑے بھائی نے اپنے باپ کو قتل کر دیا۔“

دیکھانے کے لائق نہیں رہے تھے۔ وہ اوندے پونے یہ گھر چلے گئے تھے۔ سنا ہے کشن کی طرف یا شاید سوسائٹی میں تھے۔ انہوں نے اس ٹکے کے لوگوں سے تعلق ہی نہیں رکھا۔ اور کیسے رکھتے۔“

زیانہ نے ایک گہری سانس لی۔ ”نہ میں بڑا بول بول رہی ہوں، نہ ان کا سرجہ کم کرنا چاہتی ہوں۔ کشن میں میری کوئی چھوٹ پر ہے، اوپر کرانے دار ہیں۔ میرے پاس اس وقت تین گاڑیاں ہیں۔ لاکھوں نہیں کروڑوں کا بینک بیلنس ہے، سب کچھ ہے لیکن وہ سب نہیں ہیں۔ میں انہی کی تلاش میں اپنے پرانے گھر کی جی، میں پاؤں پکڑ کے ان سے معافی مانگنا چاہتی ہوں، میں بنی ہوں، ماں باپ کا مقام بہت بلند ہے۔ ان سے مجھے کچھ نہیں لینا۔ ہوسکتا ہے وہ اب بھی مجھے معاف نہ کریں۔ لیکن اب مجھے ان کا سہارا چاہیے کیونکہ میں خود بے سہارا ہوئی ہوں، مجھے پناہ چاہیے۔“ زیانہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔
زیرینہ کی امی پریشان نظر آنے لگیں۔ ”بہت دیر سے خیال آیا تمہیں زیانہ!“

”اسکی بات نہیں آتی۔ خیال مجھے ہمیشہ رہا لیکن میں نے ان سے کہا تھا کہ ایک دن میں واپس آؤں گی یہ بتانے کے لیے کہ انسان کسی کی تقدیر نہیں لکھتے اور نہ تقدیر کے ٹکے کو بدل سکتے ہیں۔ میرا شوہر جو آج اس لیے حقیر ہے کہ وہ پرانی موٹر سائیکل پر آیا تھا، وہ میرے ساتھ مسٹر سڈز میں آئے گا۔ انہوں نے کہ ایسا ہونہ سکا۔“ اس کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔

”میں نے کہا تھا۔ تم نے بہت دیر کر دی آنے میں۔“

زیانہ نے کہا۔ ”ہاں۔ اب وہ اس گھر میں نہیں ہیں۔ پہلے میں وہیں گئی تھی۔“

”اس کا مطلب ہے تمہیں کچھ معلوم نہیں۔“
”مجھے واقعی کچھ معلوم نہیں۔ کس اب وہ کہاں ہیں۔“

زیرینہ کی ماں نے سخت دھکی لیجے میں کہا۔ ”وہ اب کہیں بھی نہیں ہیں زیانہ۔ اس دنیا میں ہی نہیں ہیں۔“
”کیا؟“ چائے کا کپ زیانہ کے ہاتھ سے گر گیا۔ ”وہ مر چکے ہیں۔“

”ہاں۔ اگر تم یہاں ہو تو پتا چلا۔ مگر تم نے کہا کہ وہی میں تھیں، یہاں کی خبر وہاں کیسے ملتی۔“ آنٹی لکھت بے حد افسردہ اور غمگین نظر آنے کی کوشش میں مصروف ہو گئیں۔ ”بس اللہ کی مرضی۔“

زیبا کے حلق سے گھٹی گھٹی چٹائی نکلی۔ "قتل کرو یا۔۔۔؟"
 "ہاں۔۔۔ کیا نام تھا اس کا۔۔۔ زمین۔۔۔ وہ کچھ تھا شروع سے ہی ایسا۔ میرا مطلب ہے قبر سے دار۔۔۔
 آوارہ حراج۔۔۔ اس کی صحبت خراب تھی، پھر اس نے پڑھنے لکھنے میں دل نہیں لگایا۔"
 "لیکن وہ جرائم پیشہ نہیں تھا۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ باپ کو قتل کر دے۔ یہ سب پولیس کی کہانی ہوگی۔" زیبا چلائی۔
 خاموشی کا ایک اور سہا طویل اور بوجھل وقفہ آیا۔
 حقیقت کا کچھ ہمیں بھی پتا نہیں۔ اخبار میں یہ تھا کہ جب اس نے پڑھا نہیں تو باپ نے اسے کاروبار میں شامل کر لیا لیکن اس نے کاروبار بھی خراب کیا۔ اس کے اخراجات بہت زیادہ تھے، باپ کی روک ٹوک پر اس نے نہیں کیا۔ باپ نے نہیں کے راستے بند کر دیے اور عیاشی کے لیے رقم دینے سے انکار کیا تو ان کے بھگڑے ہوئے گلے۔ اب پتا نہیں اس روز کیا بات ہوئی تھی جو اتنی بڑھ گئی۔ اس نے باپ کو گولی مار دی، رہا اور کسی کے نام پر نہیں تھا۔ مطلب یہ کہ غیر قانونی تھا، پہلے یہ آیا کہ باپ نے بیٹے کو نشانہ بنایا۔ پہلا قاتل ہوا تو کواڑ پر ماں دوسرے کمرے سے بھاگی۔ زمین نے پولیس سے کہا کہ باپ نے اسے قتل کرنا چاہا تھا۔ گولی اس کے بازو پر گئی پھر اس نے رہا اور چھین کے گولی چلائی، اس نے باپ کو نشانہ نہیں بنایا تھا۔ وہ اسے دور رکھتا چاہتا تھا لیکن گولی اسے لگ گئی۔ اس نے خود کو بچانے کے لیے قتل کیا۔ اپنے دفاع میں اور یہ قتل غیر ارادی تھا۔ یہ کہانی پولیس نے بنائی تھی۔ ظاہر ہے زمین نے ان سے مک مکا کر لیا ہوگا۔ مرنے والا انہیں کیا دے سکتا تھا۔ جو جیگ کیا تھا، اس سے زندگی کا سودا ہو سکتا تھا۔" زمین نے ماں کو مشکل سے بچانے کے لیے واردات کی پرورنگ خود کی۔
 "اور اس کا بھائی۔۔۔ وہ کہاں تھا۔" زیبا کسی بت کی طرح چینی چینی آنکھوں سے زمین کو دیکھ رہی تھی۔
 آئی نے ایک بار پھر آغاز کیا "وہ مہر میں نہیں تھا۔ زمین گرفتار ہوا اور اس نے بڑے اچھے دو ویس کیے لیکن قہاری ماں کی گواہی نے کورٹ میں کیس کو الٹ دیا۔ اس نے کہا کہ زمین جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے سب دیکھا تھا، میں پہلے قاتل کی آواز پر پہنچی تھی، میں دوسرے کمرے میں زمین کی ہونے والی سانس سے فون پر بات کر رہی تھی، جب میں نے دیکھا تو زمین اپنے باپ کو قتل کر چکا تھا۔ باپ اٹھ کر اس کی طرف دوڑا تھا۔ یا جان بچانے کے لیے بھاگا تھا، اس نے سامنے سے باپ کو گولی مار دی۔ پھر میرے سامنے اس

نے خود اپنے بازو پر گولی چلائی۔"
 زیبا نے بڑی مشکل سے خود کو بے ہوش ہونے سے بچایا۔ "آئی نے یہ سب عدالت میں کہا؟"
 "ہاں۔۔۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ اب تک وہ کیوں خاموش تھیں تو انہوں نے کہا کہ یہ بد بخت باپ کا قاتل کیا مجھے چھوڑا۔ اس نے بڑی منت سماجت کی کہ اسے بچا لوں۔ لیکن ساتھ ہی مجھے دھمکی بھی دے دی کہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جہاں ایک خون کیا ہے وہاں دوسرا بھی کر سکتا ہوں، بھائی تو ایک باری ہوئی تا۔۔۔ میں بس موقع کے انتظار میں تھی کہ کب میری باری آئے اور میں بتا سکوں کہ میرا سہاگ اجاڑنے والا خود میرا اپنا بیٹا ہے۔"
 زمین نے کہا۔ "یہ بیان اخبار میں تھا۔"
 "پھر زمین کو سزا ہوگئی؟" زیبا نے بند بات سے عاری میا کی لہجہ میں سوال کیا۔ یوں جیسے اس کا احساس مرچکا ہے۔
 "وہ تو ہو گئی۔" آئی نے نظر چراگے کہا۔
 "کیا۔۔۔ کیا سزا ہوئی اسے؟" زیبا نے پوچھا۔
 "پھانسی؟"
 زمین اور اس کی ماں نے ایک ساتھ اقرار میں سر ہلایا۔
 "مگر اس کی سزا پر عمل درآمد سے پہلے قہاری ماں مر گئی تھی۔ اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے اور اس کی ذہنی کیفیت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اس کے کنزروں کے لیے ایک کے بعد ایک مسموم برداشت کرنا ممکن نہیں تھا۔ پہلے پٹی پٹی، پھر شوہر کیا۔۔۔ وہ بیٹے کے جانے سے پہلے خود چلی گئی۔" زمین نے گویا کہانی مکمل کی۔
 دکھ کے آلسوں کا سیلاب جسے زیبا نے روک رکھا تھا، یوں اسے بہا لے گیا جیسے بند ٹوٹنے سے آنے والا سیلابی ریل گاڑی بجتی کوئٹہ ونا پور گرد رہا ہے۔ وہ روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔
 ہوش میں آنے کے بعد اس نے صرف ایک سوال کیا۔
 "میرے دوسرے بھائی کے بارے میں آپ نے بھی کچھ سنا؟"
 جواب ملی میں تھا۔ ظاہر ہے اسی نے مقدمے کے تمام معاملات کو۔۔۔ پھر کاروبار کو اور اس کے بعد ماں کو سنبھالا۔ لیکن اب وہ کہاں ہے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ زیبا نے اس کے بعد نکلنے کے کسی فرد سے ملنا حاصل سمجھا۔ اس نے برج اوڑھا اور منہ چھپا کر نکل گئی۔
 ☆☆☆☆
 پرائیویٹ سکیورٹی کمپنی کا مالک زیبا کے سامنے بیٹلی

ملی بنا بیٹھا تھا اور وہ اس پر برس رہی تھی "بھانجھو نکلتے ہیں آپ سکیورٹی کے نام پر، صرف پیسے وصول کرنا جانتے ہیں۔۔۔ آخر یہ کیسے ہوا؟ گاڑی یہاں سونے کے لیے آتے ہیں۔ آپ کیا ان سے ڈبل ڈیوٹی لینے ہیں یا وہ گاڑی نشہ کرتا ہے؟"
 "اسکی کوئی بات نہیں میڈم۔ نہ ہی ہم ڈبل ڈیوٹی لیتے ہیں نہ میڈیکل چیک اپ کے بغیر کسی کو کوکری دیتے ہیں۔ سکیورٹی چیف نے سوچ پاتے ہی کہا۔ "ان کے کچھ اپنے مسائل ہوتے ہیں جن کے بارے میں یہ بتاتے نہیں۔ اس ڈر سے کہ کوکری چلی جائے گی۔ جس گاڑی کو آپ نے سوتے ہوئے پکڑا۔ اس کو ہم نے برطرف کر دیا ہے۔ ڈیوٹی کے دوران میں غفلت پر سننے نہیں، حقائق چھپانے پر۔ اس کی بیوی کینسر میں مبتلا تھی۔ گھر میں چھوٹے بچے تھے، علاج کا خرچ اپنی جگہ۔ وہ رات بھر بیمار داری میں جا رہا تھا، مگر کے سارے کام کرتا تھا۔ اگر وہ بتا دیتا تو ہم اس کی مدد کرتے۔ اسے چھٹی دیتے یا بیوی کا علاج کراتے۔ ہم ملازم کو بھی انسان سمجھتے ہیں کیونکہ خود بھی انسان ہیں۔"
 زیبا نے کہا۔ "آئی اہم سواری۔۔۔ مجھے بھی اس نے کبھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ اب آپ یوں کریں کہ اسے میرے پاس بھیج دیں، میں اسے اور اس کی بیوی کو امیوڈیٹ کر لوں گی۔ اپنے سروٹ کو بارش میں جگہ دے دوں گی، تنخواہ اسے میں دوں گی۔ ابھی آپ یہ ایک لاکھ روپے اسے خود میری طرف سے بھجوا دیں۔" اس نے اپنا بیگ کھول کر چیک بک نکالی۔ چیک لکھا اور آگے بڑھا دیا۔
 "آپ مجھے رحم دل خاتون سے مجھے یہی توقع تھی۔" سکیورٹی چیف نے چیک کو تکرر کے جب میں رکھا اور جانے کے لیے اٹھا۔
 "ہاں۔۔۔ وہ ایک کیرے نے کام چھوڑ دیا تھا۔ اس کی بیوی کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔"
 چیف مسکرایا۔ "میشن تو مشین ہوتی ہے میڈم۔ آدی کے دل سے زیادہ مضبوط کون سا پپ بنا ہے۔ وہ بھی مل جاتا ہے۔"
 "آپ کو ایک موقع اور دے رہی ہوں میں۔ لیکن میں کسی قسم کا سکیورٹی نہیں پاگل افور نہیں کر سکتی۔" اس کے چلے جانے کے بعد زیبا نے تمام انتظامات کا پھر جائزہ لیا۔ مکان کے چاروں طرف خفیہ کلوز سرکٹ کی وی کیمروں کا حصار قائم کر دیا گیا تھا۔ اوپر کی منزل پر جہاں

پروفیسر اور اس کی بیوی رہتے تھے، ایک کمرے میں کنٹرول روم تھا جہاں دو سگاڑی جدید ترین اسٹیم کے ساتھ مانیٹر پر باہر کا سارا منظر دیکھتے رہتے تھے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی دیوار بھانڈے یا کن پوائنٹ پر ٹکرت کھلوا کے اندر آئے اور پکڑا نہ جائے یا مارا نہ جائے۔ اس کی ساری ٹیلی فون کا لار کڑا رہتی تھی اور دھمکی والی دو کالز کو فیس بھی کر لیا گیا تھا لیکن وہ غیر شناختی نم لگے کے کی گئی تھیں۔ ان رجسٹرڈ مہر جگہ مستجاب میں اور زیبا نے سنا تھا کہ پاکستان کے جیلساز ماہرین نے یہ مہارت حاصل کر لی ہے کہ کسی بھی نمبر کی سم تیار کر سکیں۔
 زیبا نے پرانی سب گاڑیاں شورومز پر رکھوا دی تھیں اور انہی سے ذاتی استعمال کی ایک بالکل نئی پراڈ لے لی تھی۔ سیاہ رنگ کی اس پراڈ کے شیشے بھی سیاہ تھے اور یہ دی آئی کی گاڑی ایسی تھی کہ سڑک پر ٹریفک والے اسے روک کے مطالبہ نہیں کر سکتے تھے کہ سادہ فیشیوں پر لگے ہوئے بلیک اسٹیکر پیچھا تارو۔ ویسے بھی پراڈ۔ سرمند بیانی ایف ایم ویلیو جیسی گاڑیوں کے لیے ان کا ہاتھ روکنے کے لیے نہیں۔ انہیں سلام کرنے کے لیے اٹھتا ہے۔
 گاڑی میں اس کا ڈرائیور اور کن مین دونوں سکیورٹی کمپنی کے پیسے ہوئے پرانے کا مڈوز تھے۔ تیسرا زیبا کے عقب میں اگلے رخ چھٹتا تھا اور پیچھے نظر رکھتا تھا۔ کئی باریوں بھی ہوا کہ پراڈ وہانی گئی اور وہ بعد میں اپنی پرانی مہرمان میں نکل گئی جو وقار نے اسے شادی کے بعد خرید کر دی تھی۔ اپنی حق حلال کی کمائی سے۔ اس کی کھڑکیوں پر کھسکے ہوئے والے اسکرین تھے جن پر پی ایچ ایم کوئی پابندی نہیں تھی۔ اگر بھی کسی چیکنگ میں یا ٹریفک کی خلاف ورزی پر کوئی اسے روکنا تو زیبا جانتی تھی کہ اسے ایک خوبصورت عورت ہونے کا فائدہ کیسے اٹھانا ہوگا۔
 آج وہ پھر مہرمان لے کر نکلی تو سرتا پیا سیاہ رہتے میں تھی۔ صرف اس کی آنکھیں ملتی ہوئی تھیں۔ اسے کچھ کچھ یاد تھا کہ وقار نے ایک بار کسی عمارت کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ یہ اس کا آفس ہے۔ اس نے گاڑی کو ٹیکسٹ لکھ کر عمارت کی پارکنگ میں روکا۔ اس کی ہدایات کے مطابق پراڈ وہاں پہلے ہی پہنچی گئی تھی۔ جب وہ عمارت میں داخل ہوئی سادہ کپڑوں والا ایک محافظ اس سے چند قدم پیچھے تھا۔ عمارت کے گراؤنڈ فلور کی ایک دیوار پر ان تمام اداروں یا دفاتر کے نام پتے لکھے ہوئے تھے جو اوپر مختلف فلورز پر تھے۔ ان میں پرائیویٹ فرم کے دفاتر بھی تھے۔ نیم

سرکاری ادارے بھی اور سرکاری آفس بھی۔ زیادہ فرسٹ فلور پر واقع ایک دفتر سے اپنی جستجو کا آغاز کیا۔ فرسٹ فلور تک جانے کے لیے اس نے لفٹ کا استعمال نہیں کیا بلکہ زینے سے گئی۔

دفتر میں سکھ رتی گاؤ نے اسے اندر جانے سے روکا تو اس نے بڑی مصیبت سے کہا۔ ”یہاں میرے شوہر کام کرتے ہیں بھائی۔“ اور گاؤ نے برقع پوش خاتون کو بے ضرر سمجھتے ہوئے اندر جانے دیا۔ زیادہ کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی، وہ کسی سے کچھ پوچھتے بغیر ایک کمرے میں گھس گئی جس کے باہر ”ایڈمن آفس“ کی تختی تھی۔

کسی تعارف کے بغیر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایڈمن آفس نے کام چھوڑ کے اسے حیرانی سے دیکھا۔ ”نبی خاتون۔۔۔“

زیادہ نے نقاب ہٹا کے پہلے دیکھنے والے کی نظر کو خیرہ کیا اور پھر وقار کی تصویر سامنے کر دی۔ ”یہ میرے شوہر ہیں۔۔۔ وقار الدین، کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟“

ایڈمن آفس نے لبی میں سر ہلادیا۔ ”میں کیسے جان سکتا ہوں؟“

”کیا یہ اس آفس میں کام کرتے تھے؟“

ایڈمن آفس نے کہا۔ ”گزشتہ دس برس سے تو میں ایڈمن آفس ہوں۔ میں نے انہیں یہاں نہیں دیکھا۔ لیکن آپ انہیں کیوں تلاش کرتی پھر رہی ہیں؟“

زیادہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے کہ یہ لاپتا ہیں اور پولیس نے ابھی تک تلاش شروع نہیں کی۔“

وہ ایڈمن آفس کو ہکا بکا چھوڑ کے کمرے سے نکل گئی۔ اس کے بعد ہر فلور کے ہر دفتر میں یہ سبک انہی ڈانٹاگ کے ساتھ دہرایا گیا۔ بس ہر جگہ جواب دینے والا آفس بدل جاتا تھا۔ زیادہ کو عورت ہونے کا قدرتی ایذا واپس حاصل تھا اور اپنی خوبصورتی کو وہ اسی طرح استعمال کرتی تھی جیسے مادی اپنی ڈانٹ کی کوتاہی بنانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

جب سہ پہر کے بعد وہ چھٹی پاری لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر پہنچی تو کچھ مایوس ضرور تھی مگر حیران نہیں۔ اسے کوئی جواب اپنی توقع کے خلاف نہیں ملا تھا۔ ان وقار میں کام کرنے والا کوئی بڑے سے بڑا افسر اتنی دولت انھیں نہیں کر سکتا تھا جتنی وقار اس کے لیے چھوڑ کر مر گیا تھا۔ دولت محفوظ تھی لیکن وہ خود کو بہت غیر محفوظ محسوس کرتی تھی۔

تھا۔ یقیناً اسے مارنے والے اس جیسے لوگ تھے یا اس سے زیادہ طاقتور۔ اسے ایک تو یہ معلوم کرنا تھا کہ آخر وہ کس کے لیے کام کرتا تھا، کیا کام کرتا تھا اور اسے کس جرم میں سزائے موت دی گئی تھی۔

کاش یہ کراچی نہیں لندن ہوتا۔ زیادہ نے واپسی پر گاڑی چلاتے ہوئے سوچا۔ اسٹاک لینڈ پارڈ والے خود ہی قاتلوں کا سراغ لگاتے۔ ورنہ وہ کسی پرائیویٹ سرافرساں کی خدمات حاصل کرتی۔ یہاں پولیس تو خود قاتلوں کے ساتھ تھی۔ دیگر سرافرساں ادارے بہت تھے۔ ایف آئی اے، سی آئی ڈی، آئی ایس آئی، آئی بی، اینٹی ٹیررسٹ فورس، وائٹ کرائم اسکواڈ جیسے انسان کے ایک جسم کے ہر حصے کا اسپیشلسٹ ڈاکٹر لگ ہے، ایسے ہی ہر جرم کے لیے فورس یا ادارہ۔ کیلی کالمیشن بنانا تو روز کا میل تھا۔ لیکن وہ سب زیادہ کی کیا مدد کر سکتے تھے۔

وہ اپنے خیالوں میں اتنی گمن تھی کہ مکمل بر گاڑی کی تو اسے دابھیں بائیں خوددار ہونے والے موٹر سائیکل سواروں کا پتہ ہی نہیں چلا۔ دائیں طرف دوڑ کے تھے، پیچھے پیچھے ہوئے نوجوان نے ریلاور سے کھڑکی پر دستک دی۔ اس نے کھڑکی کھول دی اور رضا کارانہ طور پر اپنا موبائل فون ان کی طرف بڑھا دیا۔

”بیک جی۔۔۔“ موبائل لینے والے نے کہا۔ ”جلدی کرو۔“

”ہاں ہاں۔۔۔“ لوبک۔ اپنی گھڑی اور چوڑیاں بھی دے رہی ہوں۔ گولی مت چلانا۔“ زیادہ نے گھبرائے ہوئے پیچھے میں کہا۔

دائیں بائیں بے شمار گاڑیاں، موٹر سائیکلیں اور دیکھیں رکی ہوئی تھیں لیکن کسی کو اعزاز نہ تھا کہ میں چوک میں کیا کارروائی ہو رہی ہے اگر کوئی نوٹ کر بھی لیتا۔ مداخلت کی ہمت کسی میں نہ تھی، اپنی جان بچانے کے علاوہ لوٹنے جانے والے کی سلامتی بھی اسی میں تھی۔

لوٹنے والوں کو لوٹی جانے والی خاتون کی بات پر ذرا بھی شک نہ ہوا۔ اس کی مصنوعی گھبراہٹ کو انہوں نے اصلی اور اس کے کانپنے ہاتھوں کی سست رفتاری کو انہوں نے ایک عورت کی فطری بزدلی اور کم ہمتی تسلیم کر لیا اور گھڑی وصول کرنے کے بعد چوڑیوں کو ایک ایک کر کے مال فہرست کے طور پر قبول کرتے رہے۔ انھیں ذرا بھی اندیشہ نہ ہوا کہ تقاضا ان کے سر پر منڈ لاری ہے۔

زیادہ نے کھچکھچی گاڑی سے اچانک انہیں لکھا۔

خطرہ زیادہ کے لیے بھی تھا کہ وہ کہیں کراس فائر کی زد میں نہ آجائے۔ جب ایک گاڑی گولی لوٹنے والے کو گولی تو دوسرا موٹر سائیکل سے اتر کے جان بچانے کے لیے گاڑیوں کے درمیان دوایں انجم میں سے فرار ہوا۔ دوسری طرف کے دو ڈاکوؤں نے بھی اسی میں حالیات جانی کہ وہ افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نکل جائیں۔

زیادہ کو کھچکھچی گاڑی سے اٹھارہ کیلکڑے پیچھے والی گاڑی میں چلی جائے۔ زیادہ نے سڑک پر گرے ہوئے نوجوان کو پیٹ دیا کہ خون اگلے دیکھا اور اپنی پراڈو میں سوار ہو گئی۔ اس کے ہاتھوں نے پیشہ ورانہ مستعدی کے ساتھ ایک جرم کو ارتکاب جرم کرتے ہوئے نشانہ بنایا تھا۔ زیادہ کو اس کے مرنے کا قطعی انخوس نہ تھا، اس راہ پر پہلے والوں کے لیے زندگی ہمیشہ اتنی ہی غیر یقینی رہی ہے جتنی ٹارگٹ کلنگ کی زد میں آنے والوں کی۔ اگر وہ مزاحمت کرتی تو مار دی جاتی۔ کل اس کا نام بھی ٹارگٹ کلنگ کے اسکو کا حصہ بنا، اب اس کی جگہ دوسرا نام ہوگا۔ کون قاتل بنے گا کون محتول، یہ آنے والے لمبے کا فیصلہ ہوتا ہے۔

سیکوریٹی گاڑی اپنے کام کے ماہر تھے، وہ زیادہ کو بھی بڑی مہارت سے نکال لائے اور اس کی گاڑی کو بھی۔ گھبراہٹ اور افراتفری میں بھاگنے والی پبلک نے ان کے کام میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ گاڑی نے زیادہ کی مہران کو بھی کسی سروس اسٹیشن پر پہنچایا مگر اس سے پہلے کار کی ٹیبر پائیس بدل دیں۔ ایک گھنٹے بعد زیادہ کو وہ سب مل گیا جو اس نے گواہ دیا تھا۔ اس کا نام واردات میں نہیں لکھا آیا کیونکہ پولیس وہاں لاش اٹھانے بہت دیر سے پہنچی تھی۔ ایک پرائیویٹ ایمبولینس سروس والوں نے گولی کا نشانہ بننے والے کو پہلے اٹھالیا تھا اور اسپتال لے جا کے شعبہ حادثات کے سپرد کر دیا تھا۔

زیادہ پہلی بار ٹارگٹ بنی تھی مگر کلنگ سے بچ چکی تھی۔ اس واقعے کی ذہنت اس پر کئی دن قائم رہی۔ حالانکہ اسے سیکوریٹی چیف کرل مخور نے خود بریف کیا تھا کہ کس قسم کی ایمرجینسی میں اسے کیا کرنا ہوگا، وہ اسی شام زیادہ سے ملے بچ گیا۔

”میزم۔۔۔ آپ مجھے معاف فرمائیے۔ یہ آج آپ کیا ایذا دیکھ کر گئے تھے؟“ اس نے چٹکی سے کہا۔

”مجھے ایک ضروری کام تھا۔“

”سارے کام ضروری ہوتے ہیں۔ ان میں جینے کی کوشش کریتے رہنا غالب ہے، اہم ہے۔“

لیے۔ جیسے آپ کو ٹارگٹ ہونے سے بچانا آپ کے ان ہاتھوں کے لیے سب سے اہم ہے۔ وہ خود مارے جاتے ہیں تو یہ جہراہم ہے کیونکہ وہ چاس لینے کی خواہش لیتے ہیں۔“

”اچھا اب آپ مجھے ڈانٹنا بند کریں۔ یہ بتائیں چائے پینے کے یا کافی؟“ زیادہ نے ماحول کو کچھ خوشگوار بنانے کے لیے پوچھا۔

”کافی۔“ اس نے صین کمانڈو اسٹائل میں دعاؤ کر کہا۔ ”لیکن میں یوں آپ کو بھاگتے نہیں دوں گا۔ مجھے بتائیے، ایسا کیا ضروری کام تھا؟“

زیادہ نے اسے بتا دیا۔ وہ قبل از وقت ریٹائر ہو جانے والا نوٹی تھا جس نے خطروں سے کھیلنے کی ذمہ داری نہیں چھوڑی تھی ورنہ ہر لحاظ سے وہ ایک خوش پوش اور خوش مزاج عام سولین تھا۔ اس کی عمر چالیس سے اوپر ہوئی مگر وہ اپنی عمر سے کم لگتا تھا جو ریلاور کی طاقت کے بل پرشہ زور رہتے تھے۔

”کرل مخور۔“ زیادہ نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”آپ کو نہیں لگا، ان جرائم پیشہ لوگوں اور کرائے کے قاتلوں سے ملتے ہوئے۔“

”آپ نے ایک تو ہر فوجی کی طرح میں بھی موت کو ایک حقیقت سمجھتے ہوں اور میرا پختہ اعتقاد ہے کہ جو رات قبر میں گزاری ہے وہ میں اپنی مرضی سے دنیا میں نہیں گزاسکتا۔ کوئی ٹارگٹ کلنگ کرنے والوں کے ہاتھوں مارا جائے۔ تو مقابلہ کرنے یا نہ کرنے سے فرق نہیں پڑتا۔“

یہ تقدیر کا مذاق نہیں تو کیا ہے کہ میں خود اپنی بیوی کو نہیں بچا سکا، وہ کلنگن پر کھانا کھانے لگی تھی، بچوں کے ساتھ۔ اس کا بیٹا بیک بہت جیتی تھا، وہ بیک جیتنے والوں نے اعزاز دیا کہ اس میں مال بھی زیادہ ہوگا۔ گاڑی بھی شاندار تھی۔ ان کا اعزاز غلط نہیں تھا، بیک میں تعزیر چالیس ہزار روپے تھے اور موبائل فون بھی بلیک بیرو تھا۔ میں نے کہا تھا کہ بابا یہ تم عورتوں کے کام کی چیز نہیں ہے۔ پریشیش لوگوں کے لیے ہے لیکن عورتوں کو بس نمائش سے مطلب ہے، خیر۔ جان سے زیادہ تو کچھ نہیں۔ یہ میں نے اسے ہزار بار سمجھایا تھا۔ ویٹ بیک بڑا تھا اور براٹوڈ۔ ڈاکو انہی چیزوں سے متوجہ ہوتے ہیں اور اسامی کی مالیت کا اعزاز کرتے ہیں۔ بے وقوف عورت۔“

”کرل۔“

”بہن کیا کروں۔ عادت سمجھو غصہ یا صدمہ۔“

اس نے میرے سارے کچھ بھلا دیے اور مزاحمت کی۔ اتنی

سبس ڈائجسٹ

283

ستمبر 2011

سبس ڈائجسٹ

283

ستمبر 2011

سبس ڈائجسٹ

283

کیا آپ لیوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عطر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لیوب مقوی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لیوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لیوب مقوی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی سیٹنگ

VP منگوالیں فون نمبر 10 بجے تا 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (دعوت)
(دینی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لیوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

معلوم تھا کہ سامنے کوئی نہیں مگر نہ جانے کتنے گھروں کی آنکھیں اس کو ہر قدم پر دیکھ رہی ہیں۔ وہ اعتماد کے ساتھ قدم اٹھاتے آگے بڑھتی ہی گئی۔ عمارت کے قریب پہنچ کر اس نے نجم الدین کو ایک دروازے سے باہر آکے برآمدے میں رکھنے دیکھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی۔ بہن بھائی چند سیکنڈ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

”کیسے ہو نجم الدین؟“ ”زیادہ سکون سے کہا۔“

”یہاں کیوں آئی ہو؟“ نجم نے سپات لہجہ میں پوچھا۔

”میں نے کہا تھا کہ میں آؤں گی۔ اب صرف تم ہی ہو جو دیکھ سکتے ہو کہ وہ میری پراڈو ہے۔“ ”زیادہ پیچھے مڑ کے دیکھا۔“ ”یہ میں نے نہ کسی سے مانگی ہے۔ نہ کرائے پر لی ہے۔ یہ ہے اس کی رجسٹریشن بک۔“

”اندر آؤ۔“ نجم الدین نے کہا۔

نجم الدین بدلائیں تھا۔ بس چند سال اس کے بدن پر اپنا اضافی وزن چھوڑ گئے تھے۔ شاید ایسا ہی خود اس کے ساتھ ہوا تھا۔ پیچھے چلے ہوئے وہ ایک شاندار ڈرائنگ روم میں پہنچی اور ایک صوفے پر بیگ ڈال کے بے فکر سے بیٹھ گئی۔

”بھائی کے گھر میں کتنی اپنائیت کا اور سکون کا احساس ہوتا ہے۔“ ”زیادہ نے کہا۔“ ”میں کافی بیویں گی۔ اور کچھ کھاؤں گی۔“

”تم ان کیوں ہو؟ تمہارا وہ محبت کرنے والا شوہر ساتھ نہیں آیا۔ جو پروفیسر تھا۔“

”دوباب اس دنیا میں نہیں ہے۔“

”آئی سی۔ اسی لیے تمہیں بھائی یاد آیا۔ مگر پہلے یہ بتاؤ، تم نے مجھے کیسے تلاش کر لیا؟“

”دھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے بھائی۔ اور شوہر کے بعد اس دنیا میں تمہارے سوا کون تھا جس کو میں اپنا بکھ سکوں؟ اکیلی عورت کیا اس دنیا میں رہ سکتی ہے؟ میں سہارے کے لیے تمہارے پاس آئی ہوں۔ کیا میں نے غلطی کی؟“

اس نے لمبی میں سر ہلادیا مگر اپنی نظر ایک لمحے کے لیے اس پر سے نہیں ہٹائی۔ ”سچ مجھے معلوم ہو جائے گا بہن۔“

”لگتا ہے مجھے دیکھ کے جہیں خوشی نہیں ہوئی۔ باپ کی چھوڑی ہوئی تمام جائیداد اور دولت کے تم اکیلے مالک تھے۔ اب میں آگئی ہوں لیکن گھر نہ کرو، میں تم سے اپنا حصہ بالکل نہیں مانگوں گی جو شاید ایک تہائی جتا ہے۔“

گارڈ نے اسٹرکام کار ریسیور اٹھالیا ”صاحب کو کیا بولوں۔ کون ملے آیا ہے؟“

”ان کو بولو۔ آپ کی بہن آئی ہے۔“

گارڈ اپنے ہاتھ میں ریسیور پکڑے کھڑا رہا۔ اس خیال میں کہ اگر یہ مذاق ہے تو خاتون اپنا درست نام بتائے۔ ”تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا؟“ ”زیادہ نے غراتے ہوئے سوال کیا۔“ ”تم بہرے ہو یا تمہاری کچھ بات دیر سے آئی ہے؟“

گارڈ نے پلک جھپکائی۔ ”جی۔ جی۔ مگر صاحب کا تو کوئی بہن نہیں ہے۔“

”کیوں بند کر دو اور جو میں نے کہا ہے وہ بتاؤ۔“

انتہائی حیرت اور بے یقینی کے عالم میں گارڈ نے اسٹرکام پر کہا۔ ”سر۔ وہ ایک خاتون ہیں۔ کتنی ہیں آپ کی بہن ہیں۔ جی سر۔ آپ کا نام لیا تھا انہوں نے۔“

نجم الدین۔ ”اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے سوال کیا۔“

”میڈم۔ صاحب پوچھتا ہے آپ کا نام؟“

”زیادہ کا نام الدین۔“ ”زیادہ نے مسات سے کہا۔“

”زیادہ وقار الدین سر۔ نہیں سر۔ وہ اس کی ہے۔ گاڑی میں اور کوئی نہیں۔ خود ڈرائیو کر کے آئی ہے۔ اس کا شوہر ہوتا تو ساتھ ہوتا۔ میں نے دیکھ لیا ہے سر۔“

گارڈ نے پھر کھلی کھڑکی سے اندر جھانکا اور ریسیور زیا کو پکڑا دیا۔

”کون ہو تم۔ کیا چاہتی ہو؟“ نجم نے شکی لہجہ میں پوچھا۔

”یقین نہیں تو باہر آ کے دیکھ لو۔ میں زیا ہوں، اسے سیکرٹری مقرر کر کے ہوتے بھی ڈرتے ہو، میرا خیال ہے تم مجھے آسانی سے پہچان لو گے۔ اتنا عرصہ تو نہیں ہوا میں بچھڑے ہوئے۔“

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد نجم نے کہا۔ ”اچھا۔ ریسیور گارڈ کو دو۔“

گارڈ نے دروازہ کھولا اور اس کی پراڈو اندر داخل ہوئی۔ یہ چار ہزار گز کی کھٹی جی جس میں کوڑا ایریا شاید پانچ سو گز ہی ہوگا۔ باقی لان اور باغ تھے۔ اندر والے گارڈ نے اس سے باہر آنے کی درخواست کی۔ وہ ایک واک ٹھہر گیت سے گزری جہاں سے۔ کسی کیمرے نے اس کی تصویر اندر بھیجی۔ پتیل ڈھیلے سے سگنل سے گزیر کیا کہ اس کے پاس کوئی آٹھیں اسلحہ یا دھماکا خیز مواد نہیں۔

زیادہ نے تقریباً سو گز کا فاصلہ پیدل طے کیا۔ اسے

ازدواجی کسی اس کی زندگی، ایک بیگ، موبائل فون، چالیس ہزار نقد اور دو لاکھ کے نو نو رات۔ تین لاکھ کے لیے وہ مرنے کی بجائے سامنے۔ خبر سننے سے پہلے وہ خبر بن گئی۔

”آئی ام سوسری۔ بننے اب کہاں ہیں؟“

”اپنی نالی کے گھر میں۔ وہاں خالد اور ماموں انہیں پال رہے ہیں، یہ کام میں نہیں کر سکتا تھا۔ میں ان کو بہت مس کرتا ہوں مگر کیا کروں، سب دوسری شادی کے لیے کہتے ہیں، میں ڈرتا ہوں کہ یہ دوسری غلطی ثابت نہ ہو، کسی کو سوائے اذیت کے کچھ نہ ملے۔ مجھے اچھی بیوی نہ ملے۔ بچوں کو اچھی ماں نہ ملے۔“

”اور اگر ایسی عورت مل جائے۔؟“

”کیسے میڈم۔ کوئی ایسا آلہ ایجا نہیں ہوا ابھی تک جو بتائے کہ عورت کے جذبات آج کیا ہیں اور شادی کے بعد کیا ہوں گے۔ وہ بدل جاتی ہیں شادی کے بعد۔“

زیادہ نے کہا۔ ”جس کے اپنے بچے نہ ہوں۔ اور نہ ہو سکتے ہوں۔ وہ انہیں اپنی ماسا دے سکتی ہے۔“

”کرتی منظور مسکرایا۔“ ”اگر ایسی عورت آپ کو ملے تو مجھے ضرور مطلع کریں پلیز۔“ ”تھکنس فار کافی۔ اور ہاں۔ آپ نے میرے ذمے ایک کام لگایا تھا۔ جس الدین ایسی ہی اس کے بارے میں معلوم کرتا تھا کہ ان کا آفس اب کہاں ہے؟ سو ری میڈم۔ ان کا بزنس کئی سال پہلے ختم ہو گیا تھا۔ اس کے مالک کا مرڈر ہو گیا تھا، خود اس کے بیٹے نے کیا تھا، دوسرا چاہنے کہاں چلا گیا۔ ہاں ایک فون نمبر ملا ہے مجھے۔ ایک شخص نے وہاں کام کیا تھا۔“

”کیا آپ مجھے وہ نمبر دے سکتے ہیں۔“

”کیوں نہیں۔ لیکن اس سے پھر رابطہ نہیں ہوا۔ اور میں نے بتا کیا تو معلوم ہوا موبائل فون کسی خاتون کے نام پر رجسٹرڈ تھا، وہ عورت مر چکی ہے۔“ ”اس نے کاغذ کے ایک پرزے پر نمبر لکھ دیا۔

☆☆☆☆

سیکریٹری گارڈ سیاہ رنگ کی سرخوب کرنے والی پراڈو سے متاثر نہیں ہوا۔ اس نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ زیادہ نے اپنے حسن کی آب و تاب کے علاوہ لمبوس اور آرائش جمال کی چکا چند کبھی بھر پور فنکراہٹ کے ساتھ استعمال کیا تھا۔

”تم یہ تو بتا سکتے ہو کہ نجم صاحب ہیں یا نہیں۔ زیادہ نے تنگ کے پوچھا۔“ ”میں زبردستی تو اندر نہیں کھس رہی ہوں۔“

سنة ١٤٣٢ هـ / العدد ٢٨٥ / سبتمبر ٢٠١١م

تھا، اسے مرتے دم تک پتا نہیں چلا کہ یہ کام تمہارا ہے۔“

”زیبا..... وہ جانتا تھا کہ کیا کام کر رہا ہے..... اور یہ کسی کالج کی پچھر شپ نہیں تھی، ہر ٹرپ پر اسے لاکھوں ملے تھے..... لالچ نہ ہوتا تو وہ میرے پاس کیوں آتا..... قناعت کے ساتھ اپنا کام کرتا رہتا اور وہ جو کچھ کر رہا تھا..... تمہارے لیے کر رہا تھا۔“

”نہیں بھائی..... میں نے اس سے کبھی کچھ نہیں مانگا تھا..... میرا نارگٹ محنت تھی، خوشی تھی..... یہ نارگٹ اسے تم نے دیا، اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے..... برسوں پرانی انتقام کی آگ کو شاید وقت کی راکھ نے دبا دیا تھا..... وہ تمہارے سامنے آیا تو پرانی چنگاری پھر بھڑک اٹھی۔ تم نے اسے ایک ایسے راستے پر ڈال دیا جس میں اس کا مارا جانا یقینی تھا..... ایک نہ ایک دن اسے کسی کی گولی کا نشانہ تو بننا ہی تھا۔ وہ کوئٹہ سے قندھار جانے والے ٹریڈر لوڈ کرنا تھا اور وہاں سے آنے والے کنٹینر میں سے اپنا مال نکال لیتا تھا..... اکثر کنٹینر تو سرحد پار پہنچتے ہی نہیں تھے..... مال یہیں بک جاتا تھا اور وصولی کی رسید تم تک پہنچ جاتی تھی، یہی تمہارا بزنس تھا..... شاید پاپا کا بھی ہوگا۔“

”جسم کراہا۔“ خدا کے لیے میری بات سمجھو زیبا..... وہ اپنی غلطی سے مارا گیا۔“

زیبا نے اس کے سر پر ریو اور مارا۔ ”غلط راستے پر تم نے اسے ڈالا تھا۔ تم اسے یہ بھی تو کہہ سکتے تھے کہ پروفیسر..... جاؤ حق حلال کی روزی پر قناعت کرو..... تم انکار بھی کر سکتے تھے کہ میرے پاس کوئی کام نہیں مگر تمہاری مجروح انا نے ماضی سے تمہیں پکارا کہ مجھ..... یہی ہے جس نے تمہاری عزت اور غیرت پر وار کیا تھا، محنت وہ میرے لیے تھی..... مگر میری خوشی اور زندگی سے زیادہ تمہیں اپنی بے عزتی کا خیال تھا..... انتقام کی آرزو نے پکار کے کہا کہ مجھ..... تمہارا نارگٹ تمہارے سامنے ہے..... لیکن اس پر گولی تم نے نہیں چلائی۔“

”زیبا..... غصہ اس نے کیا تھا..... وہ ایک پورا ٹرک غائب کر گیا تھا..... جھوٹ بولا تھا اس نے کہ قندھار سے آنے والے ٹرک میں جو کارٹن تھے، وہ خالی تھے۔ ان سب میں اسلحہ تھا۔“

”کچھ پتا نہیں تمہیں..... یا تم جان کے خوف سے جھوٹ بول رہے ہو۔“ زیبا نے قہقہے کے کہا۔ ”ایسا شہزادہ گلفام نے کہا تھا تم سے..... اس بھوت کے بچے تھے..... اور تم نے اس پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیا..... اس سے کہا کہ

مار دو بے ایمان کو..... یہی الفاظ تھے تا تمہارے..... اس کا ریکارڈ کیا ہوا بیان سنو گے؟“ زیبا نے ایک پاکٹ ٹیپ ریکارڈر آن کیا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔

”آئی ایم سوری برادر.....“ زیبا نے کہا۔ ”پتا نہیں وقار کو تم نے یہ موقع دیا تھا یا نہیں لیکن تم بھائی ہو میرے..... میں تمہیں یہ موقع ضرور دوں گی..... کلک پڑھ لو۔“

”زیبا..... دیکھو..... میرا سب کچھ لے لو.....“ جیم چلایا۔

”زیبا..... ایسا مت کرو۔“

”خدا حافظ بھائی..... اور فکر نہ کرنا، میں تمہارے لیے بہت آنسو بہاؤں گی..... اس سے بھی زیادہ جتنے وقار کے لیے بہائے تھے، وہ سچے تھے..... یہ جھوٹے بھی سچے لگیں گے دنیا کو..... تمہارا سوئم چہلم سب شاندار ہوگا..... ہر سال برسی بھی ہوگی۔“

☆☆☆

زیبا نے ایک فرلانگ کا راستہ پیدل طے کیا اور آگے پارک کی ہوئی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اطمینان سے وہاں سے روانہ ہو گئی۔

وہ گھر پہنچی تو وہاں کرٹل منظور اس کا منتظر تھا۔

”سب ٹھیک ہو گیا؟“ اس نے پوچھا۔

زیبا نے مسکرا کے سر ہلایا۔ ”تھینک یو ویری مچ۔“

ہمارا منصوبہ بہت کامیاب رہا۔ تم نے میرے مشن میں میری بہت مدد کی۔“

”کیسے نہ کرتا..... نہ مجھے ایسی بیوی ملتی..... نہ میرے بچوں کو ایسی ماں..... میرے پاس چوائس کہاں تھی۔“

تمہارے بچے تو میرے ہی بچے ہوں گے.....

چوائس میرے پاس بھی تھی.....“ وہ ہنسی۔

دونوں ہی اپنی اپنی جگہ درست تھے، کسی کے پاس کوئی چوائس نہیں تھی اور یہی ان کی قدر مشترک تھی جس نے انہیں یکجا کر دیا تھا۔

